فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

(اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں (الانبیاء 7)

حصہ اوّل

نقوش

http://KNOOZ-E-DIL.blogspot.com

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

کے مختلف موضوعات پر علمی بیانات سے اقتباسات

ادارہ القلم، دار الاشاعت، دار العرفان، منارہ ضلع چکوال

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب	:	نقوش
مصنف	:	امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی
ترتیب	:	محمود الحسن
باراول	:	جون 2013، بمطابق شعبان 1434ھ
تعداد	:	1000
کمپوزنگ	:	آصف ندیم
طابع	:	یمانی پرنٹنگ پریس، اُردو بازار، لاہور
ناشر	:	ادارہ نقشبندیہ اویسیہ، دارالعرفان، ضلع چکوال
قیمت	:	500روپے

اویسیہ کتاب خانہ

17۔اویسیہ سوسائٹی، کالج روڈ، ٹاؤن شپ، لاہور

انتساب

حضرت استاذی المکرم قلزم فیوضات علامہ اللہ یار خاں رحمتہ اللہ علیہ کے نام جن کی توجہات میرے الفاظ میں ڈھل گئیں

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں (الانبیاء:7)

نقوش

حصہ اوّل

امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

کے مختلف موضوعات پر مبنی بیانات سے اقتباسات

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ، دارالعرفان، منارہ، ضلع چکوال

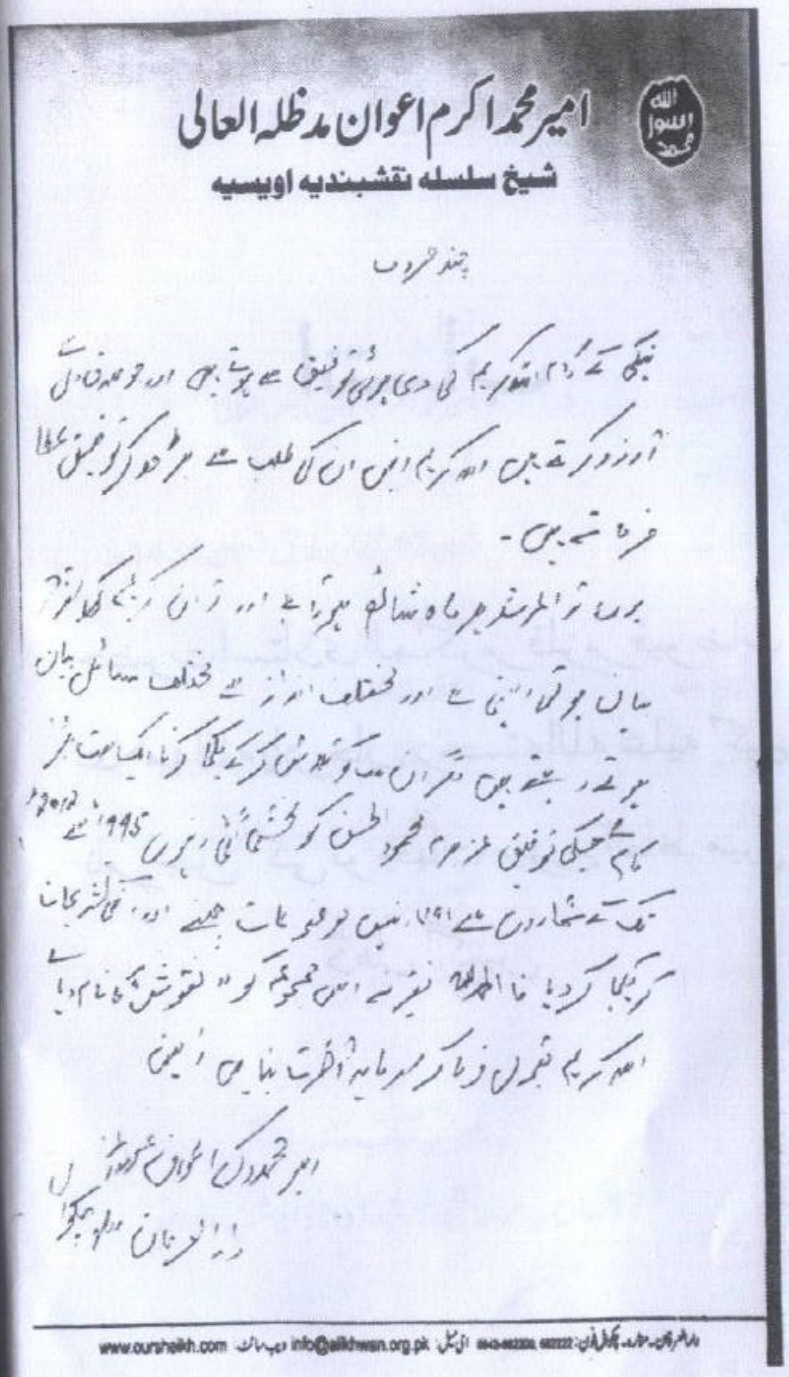

امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

چند حروف

نبیﷺ کے ذکر اللہ کریم کی بڑی توفیق سے ہوتے ہیں اور جو بھی ذکر اذکار کرتے ہیں اللہ کریم ان کی طلب سے بڑھ کر توفیق عطا فرماتے ہیں۔

بروز تراسی مرشد جو ماہ شمالی ہوتا ہے اور ان کے کچھ تربیتی سیشن جو قرآن سے اور مختلف اذکار سے مختلف مسائل بیان ہوتے رہتے ہیں ان کو مدون کر کے بکلا کرنا ایک بہت بڑا کام ہے جسکی توفیق عزیزم محمود الحسن کو بخشی ہے یہ 1995ء سے 2002ء تک کے شماروں سے 1991ء تک کے تربیتی سیشن کو مرتب کیا ہے اور اس کی اشاعت بھی کر دیا ہے الحمدللہ نیز اس مجموعہ کو "تصوف کا نام دیا ہے اللہ کریم قبول فرما کر سرمایہ آخرت بنائیں آمین

امیر محمد اکرم اعوان عفی عنہ

دارالعرفان منڈی بہاؤالدین

www.oursheikh.com ویب سائٹ info@allkhwan.org.pk ای میل 0346-6222222 :موبائل فون

فہرستِ عنوانات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	عقائد	
.1	سب کچھ وہی ہے، بندہ کچھ بھی نہیں	1
.2	اللہ کی ذات کے بارے انسان کا تصور قدیم	1
.3	اپنا جہان اور رب کا جہان	2
.4	یقینِ کامل	4
.5	اللہ کو الٰہ ماننا مشکل نہیں، رب ماننا مشکل ہے	5
.6	رب العالمین سے مانگنے کی چیز	6
.7	اسلام اور ایمان	7
.8	ایمان کی حقیقت	9
.9	Confused ایمان	10
.10	ایمان اور قلب اطہر ﷺ سے تعلق	11
.11	عقائد بنیاد ہیں	11
.12	عقیدے میں کھرا پن	12
.13	عقائد وہی رہے احکام بدلتے رہے	13
.14	عقائد میں خرابی کا نقصان	13
.15	شرک	14
.16	خواہش نفس کی عبادت سے کیا مراد ہے؟	14

.17	اسے تو ہم شرک سمجھتے ہی نہیں	15
.18	شرک انسانی وجود سے کب نکلتا ہے؟	17
.19	اللہ حاضری، اللہ ناظری	18
.20	تقدیر	19
.21	نزول عیسیٰ کیوں؟	20
.22	ختم نبوت	22
.23	فلسفۂ موت وحیات	23
.24	شہید	25
.25	عقیدہ حیات النبی ﷺ	26
.26	انک لا تسمع الموتی	29
.27	صلوٰۃ وسلام	30
.28	درود شریف	32
.29	نور کی حقیقت	34
.30	نور وبشر کی حقیقت	35
.31	تبرکات	37
.32	تبرکات کا اثر	38
.33	علم غیب کی حقیقت	39
.34	جادو اور اس کا اثر	43
.35	جادو برحق ہے۔۔ غلط العام اصلاح	47
.36	بندش	47
.37	ایصالِ ثواب	47

.38	قبر میں عذاب وثواب اور دنیوی جھگڑے	51
.39	اجتہاد	51
.40	تقلید	54
.41	فرقہ بندی	56
.42	اختلافِ رائے اور دلوں میں رنجش	59
.43	لفظ 'امام' کی تشریح	60
.44	اللہ کے لیے لفظ 'خدا'	62
.45	جنگ اور جہاد میں فرق	63
.46	ہر غلطی تقدیر کے ذمے	64
.47	عقیدت میں غلو	64
.48	خالق کی شکایت مخلوق سے	65

اسلام اور مسلمان

.1	اسلام۔۔۔ دین ھدیٰ	67
.2	دینِ اسلام اور ادیانِ باطل کا تقابل	67
.3	دینِ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے	69
.4	دین قیامت تک کے لیے اسلام ہی ہے	72
.5	دین کے تمام شعبے ضروری اور اہم ہیں	74
.6	دین اور مذہب	76
.7	مذہب کے بارے میں misconception	77
.8	ادخلو فی السلم کافۃ	79
.9	دینِ اسلام ایک متحرک زندگی کا نام ہے	80

10. اسلام، عین انسانی مزاج کے مطابق ہے 80
11. اسلام وفاؤں کا نام ہے 80
12. اسلام سب کا ہے 81
13. الگ الگ اسلام 83
14. اسلام سے پیپر میرج 85
15. ہم نے اسلام کو mystery بنا دیا ہے 86
16. ہم نے اللہ کو own نہیں کیا 86
17. بل و جد نا آ باءنا کذلک یفعلون 87
18. دین پر عمل محال نہیں 87
19. اسلام کیا ہے؟ 88
20. یہ اسلام نہیں ہے 90
21. دعوی اسلام اور ہمار عمل 90
22. ہمارے دانشوروں کا اسلام 92
23. ہم اسلامی ریاست جیسی نعمت کے قابل نہیں 92
24. اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ کون؟ 93
25. مسلمان مسکین نہیں ہوتا 93
26. کس حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حکم عدولی 94
27. ہم میں قوت برداشت نہیں 94
28. ہم پنشن یافتہ مسلمان ہیں 95
29. ہم بہت گہری نیند میں چلے گئے 96
30. ہم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں 96

31. ہم نے سمجھوتے کر لئے ہیں 97
32. اب دین کی حفاظت کے لیے ابابیل نہیں آئیں گے 98
33. مسلمان کیوں مغلوب ہو رہا ہے؟ 99
34. ہم کیا کریں؟ 100
35. ظلم کے بڑھنے کا سبب مسلمان کا کردار 101
36. مسلمان اپنی ظاہری شناخت ہی کھو چکا 102
37. دینی شعائر میں غیر مسلموں کی پیروی 103
38. ہم سے انسانی اقدار چھوٹ گئیں 103
39. آج بھیک مانگنا قابلِ فخر کیوں ہو گیا؟ 104
40. شہداء کی قربانیاں رنگ لائیں گی 106
41. اسلام پھر سے زندہ ہو گا۔۔ غزوۃ الہند 107
42. اسے غزوہ کیوں کہا گیا؟ 108
43. نہ اسلام خطرے میں ہے اور نہ پاکستان 109
44. غزوۃ الہند امام مہدی کی تشریف آوری سے پہلے ہو گا 109

عظمتِ الٰہی

1. کنت کنزاً مخفیاً۔۔ 110
2. قدرت باری کا عجیب اظہار 110
3. رازق اللہ کی ذات ہے 111
4. اللہ سے محبت کیسے کریں؟ 112
5. اللہ کی ذات ہے ہی عبادت کے لائق 112
6. الذی جعل لکم الا رض فراشا 113

7. تجری من تحتها الا نهٰر 114
8. عظمتِ الٰہی، عقلِ انسانی اور ضرورت انبیاء 115
9. رب کی تلاش 116
10. قربِ الٰہی 116
11. قربِ الٰہی کا معیار 117
12. قربِ الٰہی کی عجیب خصوصیت 118
13. قربِ الٰہی کے راستے کی مشکلات 119
14. بارگاہِ الٰہی 120
15. عشقِ الٰہی 120
16. عشقِ الٰہی کا معاملہ مختلف ہے 121
17. اللہ سے تعلق کا تقاضا 121
18. فلاسفہ کا اصول 122
19. ایک ہی آرزو 124
20. اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے 124

نبوت و رسالت / عظمتِ پیغمبر

1. شمسِ نبوت طلوع ہوا۔۔۔ 125
2. معرفتِ پیغمبر ﷺ 125
3. معرفتِ پیغمبر ﷺ کے بغیر کلام اللہ کو سمجھنا مشکل ہے 128
4. اللہ کی ذات سے آشنائی کا ذریعہ۔۔۔ 128
5. انسانی عقل آپ ﷺ کی عظمت کا ادراک نہیں کر سکتی 129
6. نبیؐ کی ذات 130

7. نبیؐ کا کمال 131
8. آقائے نامدار ﷺ کا کمال 132
9. نبوت کے دو پہلو 133
10. عصمتِ انبیاءؑ 135
11. نورِ نبوت 137
12. معیتِ رسالت کیا ہے؟ 138
13. اتباعِ سنت میں سکون 139
14. مقامِ محمود 140
15. کوئی اُس جیسا ہو تو۔۔۔ 141
16. ولادت و بعثتِ رحمت دو عالم ﷺ 142
17. ادب رسول اللہ ﷺ 145
18. معراج مصطفیٰ ﷺ، جسمِ اطہر ﷺ کی لطافت 146
19. معجزہ معراج کے حقیقی وارث 147
20. ووجدک ضالا فهدی 148
21. لقد جاء کم رسول من انفسکم 150
22. وما ارسلنک الا رحمتہ اللعالمین 151
23. ذاتِ رسول اللہ ﷺ اور اختلاف 152
24. حسنِ مصطفیٰ ﷺ 153
25. محبت و عشق 153
26. محبتِ رسول اللہ ﷺ 156
27. محبتِ رسول اللہ ﷺ کے پہلو 158

28. محبت کے لیے جاننا شرط ہے 161
29. لذائذِ دنیا اور محبتِ رسول اللہ ﷺ 162
30. دعویٰ محبت کا پیمانہ 162
31. تقاضائے محبت 163
32. محبت میں فنا ہو جانا 164
33. لا یو من احد کم۔۔۔ 165
34. محبتِ الٰہی عشقِ رسولِ ﷺ کے بغیر ممکن نہیں 166
35. نگاہِ مصطفیٰ ﷺ کا اثر 169
36. آقائے نامدار ﷺ کی ضیاء پاشیاں 171
37. نبیؐ سے مادی و روحانی نسبت 171
38. حضور ﷺ سے نسبی تعلق کا فائدہ 172
39. دعویٰ محبت اور دولتِ دنیا 173
40. ادب، محبت کے بغیر کیفیاتِ قلبی کا حصول ممکن نہیں 174
41. احترامِ نبوت 176
42. حضور ﷺ کی بے ادبی و بے احترامی کا نقصان 178
43. فضیلت بیان کریں، بے ادبی نہیں 179
44. لذتِ ہم کلامی 180
45. حکمرانی کی عمدہ مثال 181
46. متوازن زندگی 182
47. حضور ﷺ کے والدہ کریمین 184
48. آنحضرت ﷺ کی شادیاں 186

49. باب رحمت وا ہے 187
50. حضور ﷺ کے ساتھ جڑنے کی شرط 187
51. رشتۂ الفت محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ 188

عظمتِ قرآن

1. تفاسیر و تراجم 190
2. تاثیر قرآن 191
3. قرآن پڑھنے کا قرینہ 192
4. فلیقرء القرآن 193
5. قرآنِ کریم کی روزانہ تلاوت کرو 194
6. قرآن پڑھنے، سننے کا اثر 194
7. قرآن کریم کا اعجاز 195
8. عظمتِ قرآن اور لیلۃ القدر 196
9. عظمتِ قرآن اور رسومات 198
10. قرآن سے ہمارا واجبی تعلق 198
11. احکامِ قرآن سے بے خبری 199
12. قرآن کریم کا حاصل 199

عظمتِ صحابہ کرامؓ

1. صحابیؓ کی تعریف 201
2. صحابیت اعلیٰ ترین مقام 201
3. عظمتِ سیدنا ابو بکر صدیقؓ 202

4. سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی انوکھی شان 202
5. صحابہ کرامؓ کی عظمت 203
6. فتوحاتِ صحابہ کرامؓ 204
7. تاریخ کا سچ 205
8. صحابہ کرامؓ کی کرامت 206
9. انقلاب آفرین لوگ 207
10. صحابہ کرامؓ نے اللہ سے کیا مانگا؟ 207
11. صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں کیسے؟ 208
12. ہجرت صحابہ کرامؓ 210
13. سارے کا سارا اسلام 211
14. وصالِ نبوی ﷺ اور صحابہ کرامؓ 212
15. اِک نگاہ نے صحابیؓ بنا دیا 212
16. مشاجراتِ صحابہ کرامؓ 214
17. صحابہ کرامؓ پر اعتراض 215
18. کفر سے بیزاری کا جذبہ 216
19. فرش سے عرش تک 217
20. مہاجرینؓ و انصارؓ اور اُن کا اتباع 218
21. جذبات پر حکمرانی کرنے والے 219

مخلوقات / تخلیقاتِ الٰہی

1. مخلوق کی اقسام 220
2. اول: ملائکہ 221
3. دوم: شیاطین 221
4. ابلیس کا تعلق اللہ سے کیوں ٹوٹا؟ 222
5. شیطان سے دوستی 223
6. ہمزاد 223
7. سوئم: جنات 225
8. جنات میں نبوت نہیں: کیوں؟ 225
9. جنات کی کثرت، اثرات اور علاج 226
10. چہارم: انسان قدرتِ باری کا شاہکار 228
11. مقصدِ تخلیق 231
12. لقد خلقنا الا نسان فی احسن تقویم 234
13. افسوس انسان نے یہ تقویم ڈسٹرب کر دی 236
14. ان عبادی لیس لک علیھم سلطان 237
15. جسم اور روح کی شکل 239
16. شیاطین الجن والانس 241
17. انسان اور جنت کی حوریں 243
18. جنات اور جنت کی حوریں 242
19. مرد و عورت کی ذمہ داریاں 243

20. عورتِ اور حیاء 245
21. وَ جعل بینکم موٗ دۃ و رحمۃ 245
22. خواتین کے معاملے میں مَردوں کی غیر ذمہ داری 246
23. ہر فرد انسانیت کے باغ کا حصہ ہے 247
24. زندگی کی اصل کچھ دینے پر ہے 247
25. مدارجِ انسانیت 248
26. مٹی اور گارے کے انسان پر محنت، روح پر کیوں نہیں؟ 249
27. نفس، روح، ضمیر 251
28. نفسِ انسانی کی تین حالتیں 251
29. روح 252
30. ضمیر 253

دل اور دماغ

31. دل کیا ہے؟ 254
32. قلب کیا ہے؟ 254
33. دل۔۔۔ دریا، سمندروں ڈونگے۔۔۔ 255
34. دل کی بیقراری کا علاج 256
35. سکونِ دل 257
36. باتیں دل میں کیوں نہیں اترتیں؟ 258
37. دل اور دماغ 258
38. دلائل دماغ کے لیے ہوتے ہیں، دل کے لیے نہیں 260

39. دماغ دل کے تابع ہے 262
40. دل (قلب) 263
41. دل کی حیات کا تعلق ایمان سے ہے 265
42. دماغ، دل اور روح 266
43. عقلِ انسانی کی مجبوری 269
44. اولوالالباب (عقلمند) کون؟ 270
45. قلبِ مومن کی وسعت 271
46. ختمِ قلوب 271

تزکیہ، تصوف و سلوک

1. تزکیہ سے کیا مراد ہے؟ 273
2. تصوف کیا ہے؟ 274
3. شریعت اور طریقت 275
4. تصوف اور کشف 276
5. تصوف، مشاہدہ اور نظم و ضبط 279
6. کشف، الہام، القاء، وجدان 280
7. اظہارِ کشف کی حوصلہ شکنی کیوں؟ 282
8. تصوف و سلوک اور بدعت 282
9. پیری مریدی 283
10. جعلی پیر 285
11. شیخ کی تلاش 286
12. شیخ اور پیر کیا کرتا ہے؟ 286

13. شیخ اور پیر کی پہچان 287
14. شیخ کی ذمہ داری 288
15. سلوک میں شیخ اور سالک کا تعلق 289
16. روحانی تربیت کا نظام 291
17. تزکیے کا کمال 291
18. یہ عقل کا نہیں، عشق کا کام ہے 292
19. برزخ میں رابطہ 293
20. تصوف کا حاصل کیا ہے؟ 294
21. مراقبات پر وقت لگایا کریں 296
22. نسبتِ نقشبندیہ 297
23. نسبتِ اویسیہ 297
24. نسبتِ نقشبندیہ اویسیہ، تیز ترین نسبت 298
25. یہ تو نسبتِ اویسیہ نے آسان کر دیا 299
26. سرزمینِ برصغیر میں اولیاء کرام 300
27. ولایت کیا ہے؟ 300
28. صوفی کون ہوتا ہے؟ 302
29. صوفی اور تہجد 303
30. صوفی کے لیے خطرناک بات 304
31. بات بگڑتی کب ہے؟ 304
32. تصوف اور نقل 305
33. تصوف اور شعبدہ بازی 306

34. علومِ انبیاء کرامؑ 307
35. کیفیات کیا ہیں؟ 307
36. انبیاء کے علوم اور کیفیات 308
37. تعلیمات و برکاتِ نبوت ﷺ 309
38. تصوف کا تعلق کیفیات اور احساسات سے ہے 311
39. برکات کا flow 312
40. برکات و کیفیات کی نزاکت 313
41. تزکیہ کیسے ہو؟ برکات کہاں سے ملیں؟ 313
42. فیض کیا ہے اور کسے ملتا ہے؟ 314
43. گوشہ نشینی اور روحانی ترقی 315
44. ترقی درجات 316
45. تجلیاتِ باری کا مشاہدہ 317
46. فخذ ما اتیتک وکن من الشا کرین 319
47. تصوف کے بارے میں ایک غلط فہمی 319
48. ولی اللہ کی توہین و اعتراض سے بچیں 320
49. ظاہری و باطنی نظام کا توازن 320
50. روح کی عظمت اور روح کی موت 321
51. دل والوں کی نگری عجیب ہے 322
52. یہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں---- 324
53. اہل اللہ نے ہجرتیں کیوں کیں؟ 324
54. تاریخ تصوف میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مقام 325

55. اہل اللہ اور طلبِ دنیا 326
56. سب طالبِ دنیا، کوئی طالبِ آخرت نہیں 327
57. فناء فی اللہ 329
58. فنا فی الرسول ﷺ 330
59. احدیت 330
60. تعدد امثال یا کثرت امثال 331
61. معجزہ اور کرامت 331
62. توجہ اور برکت 332
63. سکر، جذب اور مجذوب 334
64. ادب واحترام اور خوشامد 336
65. تجسس اور طلب 336
66. استدراج 337
67. زندہ دل اور اس کے ثمرات 338
68. دردِ دل 339
69. بندے کی اصلاح کے درجے 340
70. اپنے آپ کو جانچنے کا آسان ٹسٹ 340
71. خود احتسابی 341

ذکرِ الٰہی

1. ذکرِ الٰہی کا حکم قرآن میں 344
2. مطلق ذکر کا حکم ہے 345
3. ذکرِ اسم ذات 347

4. ذکرِ قلبی ہی کیوں؟ 348
5. ذکرِ قلبی۔۔۔ہر حال میں اللہ کا ذکر 350
6. طریقۂ ذکر پر اعتراض اور اس طریقے کی عظمت 351
7. ذکرِ پاسِ انفاس پر اعتراض 353
8. ذکرِ پاس انفاس اور نسبت اویسیہ 355
9. مطالبہ ذکرِ کثیر کا ہے 356
10. تصوف میں ذکرِ الٰہی 357
11. ذکرِ دوام اور وجودِ انبیاء 357
12. مساجد اور ذکر اللہ 358
13. دل کے ذاکر ہونے کی پہچان 360
14. دل کو دل سے راہ 360
15. الا بذکر اللہ تطمئن القلوب 360
16. فاذکرونی اذکر کم 361
17. لکل شی صقالتہ و صقالہ القلوب ذکر اللہ 362
18. الا وھی القلب 362
19. ذکرِ الٰہی اور تسخیرِ قلب 363
20. ذکر کی برکت سے اندر کی تبدیلی 364
21. ذکرِ الٰہی کی طلب دل میں کیسے پیدا ہو؟ 365
22. ذکرِ الٰہی اور شیطان 365
23. ذکرِ الٰہی۔۔۔ڈھال 366
24. ذکرِ الٰہی۔۔۔ایک عجیب دوا 367

25. ذکرِ الٰہی کی ٹھنڈی چھاؤں 368
26. انپڑھوں کے فتوے اور سوالوں کی بوچھاڑ 369
27. مقصدِ ذکر 370
28. ذکرِ الٰہی کا حاصل 371
29. شرح صدر 371
30. چمن کی بہار صوفیوں کے دم سے ہے 372
31. اہل اللہ کو صاحب حال کیوں کہتے ہیں؟ 373
32. توفیقِ ذکر لطائف کے منور ہونے کی دلیل ہے 373
33. جمع ضدین ناممکن ہے 374
34. ثواب سے زیادہ جمالِ باری کی تمنا 375
35. پودے کا بیج ہی اس کا پھل ہوتا ہے 376
36. اصلاح کے لیے نسخہ کیمیا 376
37. عقیدہ اور ایمان بچانے کا ذریعہ 377

صحبت کا اثر

1. صحبتِ صالحین 379
2. صحبت اور متکلم کے کلام کا اثر 380
3. ماحول کے اثرات۔۔۔ اصول 381
4. اچھی اور بری صحبت کے اثرات 382
5. برائی اپنے اندر ہوتی ہے 383
6. برائی کے جراثیم کیسے فعال (activate) ہوتے ہیں؟ 384
7. پرہیز علاج سے بہتر ہے 384
8. صحبت۔۔۔ زندگی موت کا ساتھ 385

جمالِ ہمنیشن در من اثر کرد

1. مرشدنا حضرت خواجہ اللہ دین مدنیؒ 386
2. میرے مرشد، میرے شیخ 386
3. حضرت جیؒ کا مجاہدہ 390
4. حضرت جیؒ کا ایک عجیب رنگ 390
5. حضرت جیؒ کا مقام 391
6. حضرت جیؒ تصوف کا روشن مینار 391
7. حضرت جیؒ شہبازِ طریقت 392
8. ربع صدی کا تجربہ 392
9. حضرت جیؒ کی کرامت 394
10. اس بندے کا کمال دیکھو جو مجھے مسجد لے آیا 395
11. جس نے ہمیں تراشا اس نے بہت مشکل کام کیا 395
12. اللہ کرے اس قید سے کبھی آزادی نہ ملے 396
13. ہم ایسے لوگ کب تھے؟ 397
14. مشائخ سے اجازت 399
15. اللہ کریم کا احسان 400
16. دولتِ دنیا بھی مل گئی 403
17. اللہ خدمت قبول کرے 404
18. معمولات کی ابتداء 405
19. آؤ تمہارے دلوں میں چراغاں کردوں 406

20. نوٹ سیل 407
21. تحفے تحائف 409
22. توجہ دینے سے خود شیخ پر اثرات 410
23. ذکر کی برکت سے استعدادِ کار بڑھ جاتی ہے 413
24. میں کوئی رواجی پیر نہیں ہوں 413
25. بارگاہِ نبوی ﷺ میں حضوری 414
26. عجیب مشاہدہ 414
27. بارگاہِ رسالت ﷺ کا ایک ادنیٰ خادم اور چپڑاسی 415
28. ہر لمحے کا حساب 416
29. ہم عصر عموماً تنقید کرتے رہتے ہیں 417
30. قربِ الٰہی کے راستے کی مشکلات 417
31. تفسیر قرآن۔۔۔ اسرار التنزیل 418
32. میں کسی سے ناراض نہیں 419
33. دوستوں کا شکوہ 420
34. ہمارا کام، ہماری ذمہ داری 421
35. کام میں چھٹی نہیں 422
36. توازن 422
37. میری آرزو، اپنے خالی دامن بھر لو 423
38. زندگی کی چند سانسیں۔۔۔ عجیب سودا 424
39. دو باتیں میری پلے باندھ لو 424
40. اپنا محاسبہ ضرور کرو 425

41. اعلیٰ حضرتؒ کا لگایا ہوا پودا 426

علم، علماء اور ابلاغ

1. علم کا مفہوم اور مقصد 428
2. علم اور خبر 429
3. علم لدُنّی 429
4. علم ظاہر اور علم باطن 430
5. علماء ظاہر اور علماء ربانی 432
6. علم جاننے کا نام ہے، صرف لکھنے پڑھنے کا نام نہیں 433
7. دنیوی علوم کے ساتھ دینی علوم بھی 434
8. دین اور دنیا کا امتزاج 435
9. انگریز اور نظامِ تعلیم 435
10. آج کے تکلیف دہ حالات اور علامہ مرحومؒ 438
11. ہر شعبے کے افراد الگ ہوتے ہیں 438
12. مشائخ اور آزمائش 439
13. فروعی مسائل میں الجھاؤ زیادہ 440
14. سب سے زیادہ خطرہ۔۔۔ پیشہ ور علماءِ سُو 440
15. جعلی پیر خانے 441
16. دین کو پیشہ نہ بناؤ 442
17. دینی کاموں کی اجرت 443
18. تعلیم کا مقصد روزگار نہیں۔۔۔ 443
19. جہالت مفلسی سے بدتر ہے 444

20. ہم بتاتے ہیں چکھاتے نہیں 445
21. مذہبی اجارہ داری 446
22. صوفی اور غیر صوفی کی تبلیغ میں فرق 446
23. تبلیغ انانیت سے نہیں، محبت سے 447
24. قولو للناس علی قدر عقولھم 448
25. تبلیغ کا قاعدہ 449
26. حقیقی تبلیغ 450
27. بلغو عنی ولو کان آیۃ 451
28. اپنی ذات تک محدود نہ رہیں 452
29. بات کرنے میں جھجک کیوں؟ 453
30. دعوت دو، زبردستی نہ کرو 455
31. میڈیا کا جائز و ناجائز استعمال 456
32. ذرائع ابلاغ کا جائز استعمال 457
33. ذرائع ابلاغ کا ناجائز استعمال 458
34. کیا کریں؟ 458

عبادات

1. فرض عبادت کا مفہوم 460
2. عبادات کا حکم کیوں؟ 460
3. بندۂ مومن کی عظمت 461
4. عبادات کا مقصد و حاصل 461
5. عبادات میں یکسوئی و حضوری 463

6. عبادت پہ گھمنڈ 464
7. دکھاوے کی عبادت 464
8. عبادات میں سستی و لاپرواہی 465
9. عبادات کے بارے میں غلط فہمی 466
10. دوسروں کو اپنا ماتحت نہ سمجھیں 467
11. عبادات پر محنت اور اجر 468
12. عبادات اور معاملات 470
13. صوفیاء کی عبادات پر حیرت 471
14. عبادات کی قبولیت جانچنے کا طریقہ 472
15. دنیا میں جنت دوزخ کا عکس 472
16. الصلوٰۃ معراج المومنین 473
17. نماز۔۔۔ رب کے حضور مناجات 474
18. نماز سے دوری۔۔۔ اللہ کی ناراضگی کا اظہار 475
19. نماز میں وساوس 476
20. وساوس کا علاج 477
21. خُذو زینتکم عند کل مسجد 478
22. نماز کی قبولیت کا معیار اور اجر کیا ہے؟ 480
23. نماز کے لیے مساجد میں حاضری کیسی ہو؟ 481
24. رمضان المبارک۔۔۔ ہمارے لئے آئینہ 481
25. روزہ 482
26. لیلۃ القدر 483

27. حج کا مقصد 483
28. قربانی کی حقیقت 484
29. فلسفہ قربانی 485
30. قربانی پر اعتراض اور اس کا جواب 485
31. قربانی کا اجر 487
32. قربانی کا حاصل 489
33. جہاد 489
34. نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہے 490
35. نیکی کا حاصل 491
36. فلا تز کو انفسکم 491
37. گناہ کیا ہے؟ 492
38. گناہ، گناہ میں بہت فرق ہے 493
39. صدور ذنب نیک لوگوں سے بھی ممکن ہے 494
40. گناہ کی وجہ جہالت ہے 494
41. گناہ کے ثمرات 495
42. مسلسل نافرمانی کے اثرات 495
43. ثواب کیا ہے؟ 496
44. توبہ 497
45. اب ماننے کا وقت ہے اور فائدہ بھی 498
46. خدارا! اتنا تو کوئی کرلے 499
47. ارشادات 499

بدعات و رسومات

1. بدعات اور مباحات 501
2. بدعات و رسومات 502
3. بدعت کرنے والا توبہ سے محروم ہو جاتا ہے 504
4. خوشی غمی کی رسومات 504
5. رسومات دین کا لازمی حصہ بنتی جارہی ہیں 505
6. لوگ کیا کہیں گے؟ 506
7. خطرناک بات 507
8. خلافِ سنت عمل 508
9. رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی 509
10. عبادت کی قبولیت کا نتیجہ 509
11. حج رسومات کی نذر 510
12. شیطان کے فریب بھی عجیب ہیں 511

اخلاقیات و معاشرت

1. تقویٰ 513
2. تقویٰ اور کیفیاتِ قلبی 514
3. اتقو فراست المومن--- 514
4. ایمان اور بر 514
5. یقین 515

6. خلوص 515
7. تکبر 518
8. اپنی بڑائی کا مرض 519
9. صبر 520
10. خیر خواہی اور بھلائی 521
11. خود غرضی 522
12. سچ 522
13. شکوے ہی شکوے 523
14. شکر کیا ہے؟ 524
15. توکل کے معنی؟ 524
16. اصل سکون 525
17. غصہ 526
18. اسراف، انفاق اور بخل 526
19. فواحشات دیکھنے، جھوٹ سننے کے اثرات 527
20. غض البصر 528
21. حق و باطل 529
22. حسنِ کلام اور کثرتِ کلام 529
23. ادفع با لتی ھی احسن السیئۃ 530
24. بندہ مانگتا اپنی حیثیت کے مطابق ہے، وہ۔۔۔۔ 531
25. کردار 531
26. صرف کلمہ پڑھنا کافی نہیں 532

27. اعمالکم عمالکم 534
28. اندر جو کچھ ہوتا ہے، اسی کا اثر باہر آتا ہے 534
29. دینداری کے بھیس میں بے دینی 535
30. انسانی مزاج کے عجائب 536
31. کیا انسانی فکر، مزاج اور عادات میں تبدیلی ممکن ہے 537
32. وجود کے اندر کا الارم 539
33. دعویٰ کا اعتبار نہیں، اعتبار عمل کا ہے 540
34. من تشبہ بقوم فھو منھم 541
35. انسانی سوچوں کا اثر 542
36. حقوق کا مطالبہ، فرائض سے غفلت 542
37. تبدیلی دلوں کے بدلنے سے آتی ہے 543
38. آج وقت ہے مزاج بدل لو 543
39. ہر آدمی کا اپنا جہان ہے 545
40. زندگی کے نشیب و فراز 546
41. اعمال و کردار کے اثرات 546
42. کیا کیا جائے انسان بڑی ٹیڑھی مشین ہے 547
43. اطاعت میں ہی سکون ہے 548

اعتراضات

1. اعتراض اور سوال میں فرق 549
2. کیوں اور کیسے؟ 549
3. اعتراض کیوں؟ 550

4. اعتراض ہی اعتراض۔۔۔ طلب نہیں 551
5. تصوف کے بارے میں اعتراض 551
6. ذکرِ الٰہی اور اعتراض 551
7. ایک اعتراض۔۔۔ کیا صحابہ کرامؓ بھی صوفی تھے؟ 552
8. تشابہت قلوبھم 553
9. اعتراض کا نقصان خود معترض کو ہوتا ہے 554

دعا اور وظائف

1. قرآن اور درود شریف۔۔۔ سب سے بڑا وظیفہ 555
2. دعا۔۔۔ عبادت کا حاصل ہے رسم نہیں 556
3. دعا کبھی گستاخی بھی بن جاتی ہے 558
4. رب العالمین سے مانگنے کا سلیقہ 559
5. مانگنے کا سلیقہ ضرورتیں بھلا دیتا ہے 560
6. دعا کی حیثیت 561
7. دعا میں خلوص کا اثر 562
8. میری دعا۔ لذت آشنائی 564
9. والذین جاھدو فینا لنھدینھم سبلنا 564
10. دعا کو مذاق نہ بنائیں 565
11. اطاعتِ الٰہی عادتِ ثانیہ نہیں بنتی 567
12. فیصلہ ہمیں خود کرنا ہے 568
13. دعا 569
14. مومن کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی 571

15. نقش و تعویذ 572
16. میری خواہش، میری آرزو 574
17. حقیقت پسند بنیں 575
18. وظائف بھی دنیا کے حصول کے لیے 576

وسائل رزق

1. رزق کا مفہوم 577
2. حصولِ رزق کے معروف ذرائع 577
3. رزق وہی ملتا ہے جو مقدر ہے 578
4. مال واولاد کی محبت 579
5. کیا مالدار ہونا خوش نصیبی کی علامت ہے؟ 580
6. دنیا کی چیزوں میں اثبات نہیں 580
7. سکون دل میں ہوتا ہے دولت میں نہیں 580
8. دولتِ دنیا کی کوئی اہمیت نہیں 581
9. ہوسِ زر 582
10. وسائل کے مطابق خرچ 583
11. ایک مغالطہ 583
12. اعتدال 585
13. دولت مند کون؟ 585
14. دولتِ دنیا اور دولتِ آخرت 585
15. بندۂ مومن اور دنیا 586
16. پانی کشتی میں نہیں آنا چاہیے 586

17. امیری میں فقیری 588
18. افلاس و خوشحالی۔۔۔ دونوں امتحان 589
19. مال و دولت کی حرص 591
20. حرام کھانے کا اثر 591
21. طیب رزق 592
22. رزقِ حرام اور شرک 595
23. سُحت۔۔۔ رشوت کے معاشرے پر اثراتِ بد 595
24. آخرت گنوا کر دنیا کمانا سراسر گھاٹا ہے 597
25. بیع و شراء کا اصول 598
26. ارتکازِ دولت 598
27. دولت کی گردش (circulation) 599
28. سود۔۔ سب سے بدترین حرام 599
29. سُود اور سُوَر کی حرمت برابر ہے 601
30. سُود خوری کی منفرد سزا 602
31. سُود خوری۔۔۔ عجیب بہانہ 602
32. حرام۔۔۔ حرام ہے 603
33. معیشتہ ضنکا 604
34. دنیا کی طلب 604
35. اسلامی نظامِ معیشت سے ہماری بے خبری 605
36. رزق سے برکت کیوں اُٹھ گئی؟ 605
37. وقت کی قدر 606

عقائد

سب کچھ وہ ہی ہے، بندہ کچھ بھی نہیں

پنجابی کا ایک قصہ مشہور ہے کہ کوئی خانہ بدوش درویش تھا۔ غریب آدمی اللہ اللہ کرتا تھا۔ اُس نے ایک ٹٹو سا پال رکھا تھا جو ایسے ہی گاؤں کے باہر پھرتا رہتا تھا۔ رات کو کہیں بھیڑیے آئے اور اسے مار کر کھا گئے۔ اب بابا جی کو صبح پتہ چلا تو بابا جی گلی گلی پھریں اور کہیں ''ماریں آپ تے ناں بگھیاڑاں دا'' (اللہ کریم آپ نے خود مار دیا اور بھیڑیوں کے ذمے لگا دیا) تو گاؤں والے ڈر گئے۔ انہوں نے کہا یہ بابا صبح شام یہی کہتا ہے کہیں کوئی مصیبت نہ آجائے، اسے کوئی ٹٹو خرید کر دے دو، یہ خاموش تو ہو۔ تو وہ اس کیلئے چھوٹا سا ٹٹو لے آئے۔ انہوں نے کہا بابا جی! آپ یہ ٹٹو رکھ لیں اور یہ جملہ چھوڑ دیں اور اللہ کا شکر ادا کریں تو بابا جی نے جملہ بدل لیا۔ اب انہوں نے کہا ''دیویں آپ تے دین گرائیاں دے'' (عطا خود کیا اور مجھ پر احسان گاؤں والوں کا ہو گیا)۔ تو جب بندہ اس حقیقت کو پالے کہ سب کچھ اللہ ہی ہے میں کچھ نہیں ہوں، تب عشق کی چاشنی، محبت کا مزہ اور کیفیات نصیب ہوتی ہیں۔

اللہ کی ذات کے بارے انسان کا تصورِ قدیم

تاریخِ انسانی کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انسان خواہ تہذیب سے ناآشنا رہا، کھانے پینے کے آداب سے ناآشنا رہا، بھلے برے کی تمیز سے ناآشنا رہا، لیکن عقیدے سے کبھی ناآشنا نہیں رہا۔ جو لوگ جنگلوں میں بے لباس رہتے ہیں، انہوں نے بھی عبادت کے نام پر کچھ اچھل کود یا کچھ گانا بجانا اختیار کر رکھا ہے۔ اسی طرح کوئی روحوں کو پوجتا ہے، کوئی جنوں کو پوجتا ہے، کوئی کسی پہاڑ کو پوجتا ہے، کوئی کسی درخت کو۔ انسان کی

فطرت میں ہے کہ اسے کسی ایسی طاقت کا تحفظ چاہیے جو نظر بھی نہ آتی ہو، اُس کے قابو بھی نہ آتی ہو لیکن اس کی وہ ہر طرح مدد کر سکتی ہو، اُس کے حالات سے واقف ہو اور یہ جگہ رب العالمین نے اپنی ذات کیلئے رکھی ہے۔ اب انسانی سوچ اور فکر کی خامیاں ہیں کہ کوئی اس کی جگہ بت بٹھا دیتا ہے، کوئی اس کی جگہ روحیں بٹھا دیتا ہے، کوئی فرشتے بٹھا دیتا ہے تو یہ زندگی کا ایک پہلو ہے جس کو فکر، سوچ، نظریہ یا عقیدہ کہا جاتا ہے۔

اپنا جہان اور رب کا جہان

اس روئے زمین پر جہاں ہم رہتے بستے ہیں اس میں دو جہان ہیں۔

1۔ ایک جہان ہر انسان کا اپنا ہے۔ اس کی اپنی فکر، اس کی اپنی سوچ، اس کا اپنا کردار، اس کی اپنی خواہشات، ان کی تکمیل اور محرومیاں، سب مل کر ایک جہان بناتی ہیں۔

2۔ ایک جہان رب العالمین کا ہے۔ رب العالمین کے جہان میں کسی کی خواہشات کی، کسی کے غصے کی، کسی کی ناراضگی کی یا کسی کی آرزو کی کوئی حیثیت نہیں۔ رب العالمین کے جہان میں ہر کام اس کی پسند، اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ جیسا وہ چاہتا ہے ویسا ہوتا ہے، جب وہ چاہتا ہے تب ہوتا ہے۔

اب جو لوگ اپنے جہان میں بستے ہیں، ہوتا ان کے جہان میں بھی وہی ہے جو رب چاہے لیکن ان کے گردان کا اپنا جہان ہوتا ہے۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ مجھے یہاں سے دولت مل جائے، مجھے یہ عہدہ مل جائے، مجھے کوئی بیماری نہ آئے، میرے بچے افسر بن جائیں، میرا فلاں کام ہو جائے۔ یہ سب تو وہ چاہتے ہیں ہے لیکن ہوتا کیا ہے اس پہ اُن کا اختیار نہیں۔ چونکہ اُنہوں نے جو جہان بنا رکھا ہے وہ مفروضہ ہے۔ حقیقتاً تو اس کا مالک اللہ جل شانہ ہے، ہوگا تو وہی جو وہ چاہے گا۔ لہٰذا اپنے جہان میں بسنے والا بندہ ہوش

سنبھالنے سے لے کر مرنے تک دکھی رہتا ہے، پریشان رہتا ہے اور یہ اپنا جہان حقیقتاً ایمان سے محروم لوگوں کا جہان ہے۔ لوگوں کی اکثریت اپنے جہان میں بستی ہے، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کے محل تعمیر کرتی رہتی ہے۔ لیکن جہان تو رب العالمین کا ہے، اسے منظور نہ ہو تو ویسا نہیں ہوتا جیسی ان لوگوں کی آرزوئیں ہوتی ہیں اور جب ویسا نہیں ہوتا تو پھر وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔

اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دنیوی امور میں اپنے سے اوپر نہیں اپنے سے نیچے دیکھا کرو تا کہ ہر موقع پر اللہ کا شکر ادا کرو اور دین کے معاملات میں اپنے سے اوپر دیکھا کرو کہ میں نے کتنی نیکی کی اور دوسرا شخص مجھ سے کتنا آگے چلا گیا۔ تو دنیا کی ساری پریشانیوں کا حل اس ایک بات میں ہے کہ بندہ اپنا جہان چھوڑ کر رب العالمین کے جہان میں گھر بسا لے۔ پھر مسائل پیدا نہیں ہوتے، پریشانی پیدا نہیں ہوتی۔ جتنی مزید ارزندگی ہوتی ہے، موت اس سے زیادہ مزیدار ہو جاتی ہے۔ صحت اللہ کا احسان ہے لیکن پھر بیماری بھی مزا دے جاتی ہے، اس میں بھی ایک لطف ہوتا ہے۔ دولتمندی اللہ کی نعمت ہے لیکن کبھی افلاس بھی اپنی الگ سی لذت دے جاتا ہے۔ ہر چیز میں ایک رشتہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کریم کی طرف سے آ رہی ہے اور وہ رشتہ اس میں ایک لطف، ایک لذت پیدا کر دیتا ہے۔

انسانی مزاج ایسا ہے کہ ساری زندگی صحت مند رہے، اسے شمار نہیں کرتا، ایک ہفتہ بیمار ہو جائے تو وہ اس نے گنا ہوتا ہے حالانکہ زندگی شیرینیوں، تلخیوں کا مجموعہ ہے۔ جس طرح بیداری کے ساتھ نیند جڑی ہوئی ہے، زندگی کے ساتھ موت پیوست ہے، اسی طرح دولت کے ساتھ افلاس، صحت کے ساتھ بیماری، سکھ کے ساتھ دکھ، دن کے ساتھ رات جڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس کا اپنا نظام ہے اور ہر چیز کو اس نے جوڑا جوڑا پیدا فرمایا

ہے۔

اپنے جہان میں کوئی سکون سے نہیں رہ سکتا۔ وہاں اندیشے، خدشے، خطرات اور ڈر زندگی کو جہنم بنائے رکھتے ہیں، وہاں آدمی نعمتیں نہیں گنتا محرومیوں کا شمار کیے جاتا ہے۔ ذکر الٰہی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ بندے کو اللہ کے جہان میں لے آتا ہے یہاں آکر آدمی کو استغناء نصیب ہو جاتا ہے۔ بندہ جب اپنے جہان میں ہوتا ہے تو وہ گنتا ہے کہ مجھے کیا ملا ،اللہ کے جہان میں بستا ہے تو سوچتا ہے کہ میں کیا دے سکتا ہوں۔ وہ چیزوں سے بالاتر ہو جاتا ہے، اس کی سوچ یہ رہ جاتی ہے کہ میرا رشتہ میرے مالک کے ساتھ، اس جہان کے مالک کے ساتھ کیسا ہے۔ کہیں اس میں کوئی دراڑ نہ آجائے، کہیں اس میں بال نہ آجائے اور اسے قائم رکھنے کیلئے مجھے جو کچھ بھی قربان کرنا پڑے، میں کر دوں۔

یقینِ کامل

ایک بات یاد رکھیں جب تک اللہ پر اعتماد ہے، کچھ نہیں بگڑے گا۔ مصائب پر صبر کی توفیق ہوگی، آدمی برداشت کرے گا۔ ایک طرف اللہ ہو بچانے والا، دوسری طرف مخلوق ہو نقصان پہنچانے والی تو بگڑے گا کیا۔ کچھ نہیں بگڑتا۔ بندہ تب گھبراتا ہے جب اس کا اللہ پر اعتماد مکمل نہ ہو۔ پھر وہ مخالفت سے، اعتراضات سے، الزامات سے گھبرا جاتا ہے۔ بھئی! لوگ بھلا کہیں یا بُرا کہیں، لوگوں کی اپنی زبان ہے۔ کل عرصۂ محشر میں لوگوں نے اپنا جواب دینا ہے۔ آپ اس بات کے مکلّف نہیں کہ ہر بندے سے خود کو اچھا کہلوائیں۔ ہم اس بات کے مکلّف ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچاتے رہیں۔ اب اگر کوئی اچھا کہتا ہے تو اللہ اس کا بھلا کرے، کوئی برا کہتا ہے اللہ اسے ہدایت دے۔ وہ جانے اس کا رب جانے۔

آج مسلمان کی سب سے بڑی کمزوری یقین میں کمی ہے۔ یقین ایک ٹھوس

حقیقت کا نام ہے، یقین بے لچک ہوتا ہے۔ آج کے مسلمان کا یقین لچکدار ہے، اس میں کئی گنجائشیں نکل آتی ہیں اور ایسا لچکدار یقین کفر سے دبتا ہے، شک کو راہ دیتا ہے اور انسان کو استقامتِ دین سے دور رکھتا ہے۔ اسی لئے آج جب اللہ اور اللہ کے نبی ﷺ کی بات بتائی جاتی ہے، پھر کوئی شخص اس کے خلاف فضول سی بات کر دیتا ہے تو اس کا کہا مسلمان کے دل میں شبہ پیدا کر دیتا ہے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ لوگ سفارش کرانے کیلئے آجاتے ہیں کہ جی فلاں کام ہے، فلاں مقدمہ ہے، فلاں آپ کا جاننے والا ہے، اس سے سفارش کر دیں۔ اگر انہیں کوئی چٹھی وغیرہ دے دی جائے، خواہ ایک چٹ لکھ کر دے دو تو مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر کہہ دیا جائے کہ تم بھی دعا کرو، میں بھی تمہارے لئے اللہ کریم سے دعا کرتا ہوں تو پھر وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور باہر جا کر کہتے ہیں کہ ہمیں ٹرخا دیا، ہماری بات ہی نہیں سنی۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ کام وہی ہوتا ہے جو اللہ کرتا ہے اور سب سے بڑی سفارش اسی کی ذات ہے۔

اللہ کو الٰہ ماننا مشکل نہیں، رب ماننا مشکل ہے

جب تک تجلیاتِ باری قلب پر وارد نہ ہوں، عملی زندگی میں توحید مشکل ہو جاتی ہے۔ زبانی کہنا دوسری بات ہے لیکن جب عمل کی گھڑی آتی ہے تو انسان اس پہ قائم نہیں رہ سکتا۔

یاد رکھیں! اللہ کو الٰہ ماننا کچھ مشکل نہیں ہے، اللہ کو عملی زندگی میں رب ماننا بہت مشکل ہے اور رب اس نے مانا جس نے حصولِ رزق کے ناجائز ذرائع سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس لئے کھینچ لیا کہ رزق دینا تو اللہ کا کام ہے تو میں اللہ ہی کی نافرمانی کر کے رزق حاصل کرنے کی کوشش کیوں کروں۔ جو کچھ اس نے میرے حصے میں کر دیا ہے وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ میں نے جو اسباب اختیار کئے ہوئے ہیں، یہ رزق حاصل کرنے کیلئے نہیں بلکہ

ہے۔

اپنے جہان میں کوئی سکون سے نہیں رہ سکتا۔ وہاں اندیشے، خدشے، خطرات اور ڈر زندگی کو جہنم بنائے رکھتے ہیں، وہاں آدمی نعمتیں نہیں گنتا محرومیوں کا شمار کیے جاتا ہے۔ ذکر الٰہی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ بندے کو اللہ کے جہان میں لے آتا ہے یہاں آکر آدمی کو استغناء نصیب ہو جاتا ہے۔ بندہ جب اپنے جہان میں ہوتا ہے تو وہ گنتا ہے کہ مجھے کیا ملا ،اللہ کے جہان میں بستا ہے تو سوچتا ہے کہ میں کیا دے سکتا ہوں۔ وہ چیزوں سے بالاتر ہو جاتا ہے، اس کی سوچ یہ رہ جاتی ہے کہ میرا رشتہ میرے مالک کے ساتھ، اس جہان کے مالک کے ساتھ کیسا ہے۔ کہیں اس میں کوئی دراڑ نہ آجائے، کہیں اس میں بال نہ آجائے اور اسے قائم رکھنے کیلئے مجھے جو کچھ بھی قربان کرنا پڑے، میں کر دوں۔

یقینِ کامل

ایک بات یاد رکھیں جب تک اللہ پر اعتماد ہے، کچھ نہیں بگڑے گا۔ مصائب پر صبر کی توفیق ہوگی، آدمی برداشت کرے گا۔ ایک طرف اللہ ہو بچانے والا، دوسری طرف مخلوق ہو نقصان پہنچانے والی تو بگڑے گا کیا۔ کچھ نہیں بگڑتا۔ بندہ تب گھبراتا ہے جب اس کا اللہ پر اعتماد مکمل نہ ہو۔ پھر وہ مخالفت سے، اعتراضات سے، الزامات سے گھبرا جاتا ہے۔ بھئی! لوگ بھلا کہیں یا بُرا کہیں، لوگوں کی اپنی زبان ہے۔ کل عرصۂ محشر میں لوگوں نے اپنا جواب دینا ہے۔ آپ اس بات کے مکلّف نہیں کہ ہر بندے سے خود کو اچھا کہلوائیں۔ ہم اس بات کے مکلّف ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچاتے رہیں۔ اب اگر کوئی اچھا کہتا ہے تو اللہ اس کا بھلا کرے، کوئی برا کہتا ہے اللہ اسے ہدایت دے۔ وہ جانے اس کا رب جانے۔

آج مسلمان کی سب سے بڑی کمزوری یقین میں کمی ہے۔ یقین ایک ٹھوس

حقیقت کا نام ہے، یقین بے لچک ہوتا ہے۔ آج کے مسلمان کا یقین لچکدار ہے، اس میں کئی گنجائشیں نکل آتی ہیں اور ایسا لچکدار یقین کفر سے دبتا ہے، شک کو راہ دیتا ہے اور انسان کو استقامتِ دین سے دور رکھتا ہے۔ اسی لئے آج جب اللہ اور اللہ کے نبی ﷺ کی بات بتائی جاتی ہے، پھر کوئی شخص اس کے خلاف فضول سی بات کر دیتا ہے تو اس کا کہا مسلمان کے دل میں شبہہ پیدا کر دیتا ہے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ لوگ سفارش کرانے کیلئے آجاتے ہیں کہ جی فلاں کام ہے، فلاں مقدمہ ہے، فلاں آپ کا جاننے والا ہے، اس سے سفارش کر دیں۔ اگر انہیں کوئی چٹھی وغیرہ دے دی جائے، خواہ ایک چٹ لکھ کر دے دو تو مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر کہہ دیا جائے کہ تم بھی دعا کرو، میں بھی تمہارے لئے اللہ کریم سے دعا کرتا ہوں تو پھر وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور باہر جا کر کہتے ہیں کہ ہمیں ٹرخا دیا، ہماری بات ہی نہیں سنی۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ کام وہی ہوتا ہے جو اللہ کرتا ہے اور سب سے بڑی سفارش اسی کی ذات ہے۔

اللہ کو الٰہ ماننا مشکل نہیں، رب ماننا مشکل ہے

جب تک تجلیاتِ باری قلب پر وارد نہ ہوں، عملی زندگی میں توحید مشکل ہو جاتی ہے۔ زبانی کہنا دوسری بات ہے لیکن جب عمل کی گھڑی آتی ہے تو انسان اس پہ قائم نہیں رہ سکتا۔

یاد رکھیں! اللہ کو الٰہ ماننا کچھ مشکل نہیں ہے، اللہ کو عملی زندگی میں رب ماننا بہت مشکل ہے اور رب اس نے مانا جس نے حصولِ رزق کے ناجائز ذرائع سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس لئے کھینچ لیا کہ رزق دینا تو اللہ کا کام ہے تو میں اللہ ہی کی نافرمانی کر کے رزق حاصل کرنے کی کوشش کیوں کروں۔ جو کچھ اس نے میرے حصے میں کر دیا ہے وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ میں نے جو اسباب اختیار کئے ہوئے ہیں، یہ رزق حاصل کرنے کیلئے نہیں بلکہ

اللہ کے بندوں کے اسباب اللہ کی رضا کے لئے ہوتے ہیں۔اس نے اسباب کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے،اس کی مرضی کہ اس سے کیا نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔اگر توقع سے کم حاصل ہو تو یہ شکوہ نہ کرے کہ کم حاصل ہوا اور اگر زیادہ حاصل ہو تو اس بات پہ خوش نہ ہو جائے کہ میں نے کوئی بڑا تیر مارا۔یعنی صرف عبادات میں اللہ کی عبادت کرنا نہیں بلکہ ربوبیت میں بھی کسی دوسرے کو اس کے برابر نہ سمجھنا،نہ اپنی تدبیروں،نہ اپنی محنت و مشقت کو اور نہ اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ میرے رزق کا یا میری مشکلات کے حل کا یا مصیبتوں کے دور کرنے کا سبب بنے گی۔

رب العالمین سے مانگنے کی چیز

ہم بیوقوف ہیں کہ ہم اس سے وہ بات مانگتے ہیں جو از خود اس نے دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ہم اس سے رزق مانگتے ہیں،رزق دینے کا ذمہ اس نے خود لے لیا ہے۔ رب العالمین سے ہم اولاد و صحت مانگتے ہیں،ہم زندگی مانگتے ہیں۔ارے یہ ساری چیزیں اس نے اپنے ذمے لے لی ہیں اور وہ ان کو بھی دے رہا ہے جو اس کو مانتے ہی نہیں۔کافر و مشرک بھی آپ کو صحت مند نظر آئیں گے،بے دین بھی آپ کو صاحبِ اولاد نظر آئیں گے، بدکار بھی آپ کو مال دار نظر آئیں گے لیکن ہر کوئی صاحبِ درد اور صاحبِ دل نہیں ہوگا۔

مانگنے کی چیز ہے کہ دلِ زندہ مانگو،دلِ پُر درد مانگو۔وہ دل مانگو جس میں آج بھی اس کی ذات رہتی ہو،اس کی تجلیات برستی ہوں۔وہ دل مانگو جس میں عشقِ رسول ﷺ ہو۔وہ دل مانگو جو آج بھی جمالِ مصطفوی ﷺ کا طالب ہو۔وہ دل مانگو جس میں شہادت کی آرزو ہو۔وہ دل مانگو جو اس کے وصال کا طالب ہو۔وہ چیز مانگو جو صرف مانگنے پر ملا کرتی ہے۔وہ چیز مانگو جو وہ اپنوں کو دیتا ہے اور جسے دیتا ہے اسے اپنا لیتا ہے۔

یاد رکھو!ایک دلِ زندہ مل جائے تو دو عالم میں کسی چیز کے مانگنے کی ضرورت نہیں

رہتی۔ہر چیز دلِ زندہ کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔اسی طرح وہ دین خالص مانگو،وہ شعور مانگو جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پروانوں کو دیا تھا۔زندگی کے لیے ایک ہی راستہ اللہ سے طلب کرو اور وہ راستہ ہے سنتِ رسول اللہ ﷺ کا۔ہم نے دین کھو دیا ہے اور ہم نے اس کی تعبیریں گھڑ لی ہیں۔یہ تعبیریں اپنے آپ کو دھوکہ دینے کیلئے تو درست ہیں لیکن اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہوں گی۔

اسلام اور ایمان

اسلام تسلیم کرنے کا نام ہے۔جو بات رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی،جس نے اسے تسلیم کر لیا وہ اسلام لے آیا لیکن ایمان ان کیفیات میں ڈوب جانے کا نام ہے جہاں انسان کا اپنا اختیار فنا ہو جاتا ہے۔یہ اسلام سے بہت آگے گہرائی میں چلا جاتا ہے جہاں اس کی اپنی کوئی پسند نہیں رہتی،اس کی اپنی کوئی آرزو نہیں رہتی،اس کی اپنی کوئی خواہش نہیں رہتی۔وہ اللہ کے لیے جیتا ہے،اللہ کے لیے مرتا ہے۔ایمان یقین کی گہرائی کا نام ہے جہاں آدمی اپنے ارادے اور اختیار کو چھوڑ دے۔ایمانِ کامل اس کیفیت کا نام ہے جہاں آدمی مشورے دینے سے گریز کرے اور تعمیلِ ارشاد کیلئے سرگرم ہو جائے۔ایمان تب نصیب ہوتا ہے جب عظمتِ رسالت ﷺ کی پہچان کا کوئی شمہ نصیب ہو جائے۔ایمان کا خاصہ یہ ہے کہ جب نصیب ہوتا ہے تو اللہ کے روبرو کر دیتا ہے۔

اسلام کا معنی بھی وہی ہے جو ایمان کا ہے۔فرق یہ ہے کہ ایمان اس کیفیت کا نام ہے کہ جب کسی کے دل میں یقین پیدا ہو اور وہ یقین اتنا مضبوط ہو کہ اس کے اعضاء و جوارح کو اطاعتِ الٰہی پر لگا دے،یہ ہے ایمان۔اسلام یہ ہے کہ کوئی اطاعتِ الٰہی شروع کرے اور اس مجاہدے سے کرے کہ اس کے طفیل اس کے دل میں نورِ ایمان پیدا ہو یعنی اگر آپ باطن سے ظاہر کو چلیں تو یہ ایمان ہوگا اور ظاہر سے باطن کو چلیں تو یہ اسلام ہوگا۔اسلام

پل بھر کی بات نہیں، زندگی کا سودا ہے۔ اسلام پل بھر کی بات نہیں کہ آپ یہاں آئے اور بخشے گئے۔ آپ عرس پر گئے، آپ نے روٹی کھائی، پیسے جمع کرائے اور آپ بخشے گئے۔ آپ دروازے سے گزر گئے، آپ جنتی ہو گئے نہیں۔ بلکہ اسلام زندگی کا سودا ہے جب تک دم میں دم ہے۔ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (الحجر:۹۹)۔ دم واپسیں، موت کے آنے تک اللہ کی اطاعت پر کاربند رہنا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی پر جمے رہنا ہے، یہ زندگی کا سودا ہے۔ آپ نے زندگی محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں پر قربان کر دی۔ یہ دنیا کی چند روزہ زندگی تھی، وہاں سے آپ کو آخرت کی دائمی زندگی باغ و بہار بن کر مل گئی تو سودا سستا ہے۔

ایمان دل کی ایک حالت کا نام ہے۔ ایمان ایک کیفیت کا نام ہے۔ اگر ہم اسے بہت سادہ کر کے سمجھنا چاہیں جو کہ میں سمجھ سکا ہوں تو ایمان نام ہے "محمد رسول اللہ ﷺ پر اعتبار کرنے کا" یعنی ایمان، اعتماد علی الرسول ﷺ کا نام ہے اور ایمان کی آزمائش میدانِ عمل میں ہوتی ہے۔ اب جس کو حضور ﷺ پر جتنا اعتبار ہے اتنا ہی اس کا ایمان ہے اسی لئے فرمایا عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ بندے کی عملی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اسے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار ہے یا اس نے رواجاً مان رکھا ہے، عملاً نہیں مان رہا۔ انسان اللہ کریم کو بغیر حضور ﷺ پر اعتبار کیے پہچان ہی نہیں سکتا۔ تنہا انسانی دماغ ذاتِ باری کو نہیں پا سکتا۔ اللہ کے جمال کے مظاہرے، اس کی قدرت کی جو نشانیاں انسان کے روزمرہ کے مشاہدے میں آتی ہیں ان سے اور کائنات کے رواں دواں نظام کو دیکھ کر بندہ جو اندازہ لگا سکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ کوئی ہے جو اس نظام کو چلا رہا ہے، کوئی ہے جو اس کا خالق و مالک ہے۔ اس سے زیادہ سمجھنے کی استعداد کیلئے انسان کو نورِ نبوت کی ضرورت ہے۔

ایمان کی حقیقت

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ایمان تو بڑا مضبوط ہے۔ یاد رکھیے! جو ایمان اللہ کی نافرمانی سے روکنے کا کام نہیں کرتا وہ مضبوط نہیں، وہ کمزور ہے۔ جو ایمان حرام کھانے کو برداشت کر لیتا ہے اور حلال پہ اصرار نہیں کرتا اور حرام سے روک نہیں سکتا، جو ایمان فرائض کی پابندی سے محروم انسان کے ساتھ گزارا کرتا ہے، وہ کمزور ہے۔ جب اطاعتِ الٰہی کی بات آتی ہے تو ہم نرم پڑ جاتے ہیں۔ طبیعت خراب ہو تو نماز چھوٹ جاتی ہے، مہمان آ جائیں تو ذکرِ الٰہی رہ جاتا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز بہت کم کی جاتی ہے، یہ کمزور ایمان ہے۔ صدیوں کے فاصلے نے اسے کمزور کر دیا۔ بڑی جرأت کا کام ہے کہ کوئی چودہ سو سال دور بیٹھ کر آج بھی اپنے دل میں جمالِ مصطفیٰ ﷺ محسوس کرے اور اپنے دل میں ان ارشادات کی لذت محسوس کرے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمائے تھے۔ بڑی ہمت کی بات ہے کہ چودہ سو سال دور بیٹھ کر آج بھی اسے توحیدِ باری اسی طرح عزیز ہو جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی تھی۔ آج بھی اس کے سجدوں میں وہ سوز ہو، اس کی اذانوں میں وہ گرج ہو، اس کے کردار میں وہ مضبوطی ہو، اس کی فکر میں وہ حیات ہو، اس کی نگاہوں میں وہ حیا ہو اور اس کی زبان پر اسی طرح سے حق ہو۔

آج ہمارے ایمان میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ جو رسومات ہم نے خود ایجاد کیں انہیں ہم اپنے لیے باعثِ عزت سمجھ کر پوری پابندی سے ان پر عمل کرتے ہیں۔ وہ شادی کی ہوں، جنازے کی ہوں، مرنے والے کی ہوں یا پیدا ہونے والے کی، ہر ہر رسم کو ہم فرض سے زیادہ اہمیت دے کر نبھاتے ہیں اس لیے کہ اس میں ہم اپنی انا اور اپنے ذاتی وقار کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔

Confused ایمان:

مکہ میں ایک مشرک تھا۔ سرِ راہ اس کی ملاقات حضور ﷺ سے ہوئی تو اس نے کہا کہ وہ ایک گھوڑے کا بچہ پال رہا ہے جسے وہ مکئی کے دانے کھلاتا ہے یعنی مکہ میں مکئی کے دانے کھلانا بہت قیمت رکھتا تھا۔ بہر حال اس نے کہا کہ یہ گھوڑے کا بچہ جب بڑا ہوگا تو اس پر بیٹھ کر وہ حضور ﷺ کے مقابلے میں آئے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم آؤ گے اور میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوگے۔

وہ آپ ﷺ کے مقابل میدانِ جنگ میں اسی گھوڑے پر سوار آیا اس حالت میں کہ سر سے پاؤں تک لوہے کے لباس میں خود کو محفوظ کر رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے نیزہ مارا جو اس کے خود میں سے گزر کر اس کی گردن پر ہلکی سی خراش چھوڑ گیا لیکن وہ گھوڑے سے گر گیا اور تڑپنے لگا۔ اس کے ساتھی اسے اٹھا کر خیمے میں لے گئے اور اس کا خود اتارا تو ہلکی سی خراش تھی۔ وہ حیران ہوئے کہ کیوں چلا رہا ہے اور اس کے تڑپنے کی وجہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ ''دیکھنے میں یہ ایک خراش ہے لیکن مجھ سے پوچھو، لگتا ہے اس میں آگ بھر گئی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اب میں زندہ نہیں بچوں گا، میں اسی سے مر جاؤں گا۔ اس لئے کہ یہ بات اس ہستی نے کہی تھی جس کی کہی ہوئی بات آج تک غلط نہیں ہوئی'' اور وہ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی واصلِ جہنم ہو گیا۔

علماء کہتے ہیں کہ وہ بد بخت ترین انسان تھا جو حضور ﷺ کے ہاتھوں قتل ہوا اور صرف وہی ایک قتل آپ ﷺ کے ہاتھوں ہوا۔ اتنا یقین تو اس بد بخت ترین انسان کو بھی تھا کہ جو آپ ﷺ فرما دیتے ہیں، وہ سچ ہوتا ہے۔ تو جس بندے کو کلمہ پڑھ کر بھی Confusion رہ جائے اسے کیا سمجھیں کہ اس میں کیا ایمان ہے؟

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو ذکر کرتے، تہجد پڑھتے، تقریریں سنتے،

نمازیں پڑھتے برسوں گزر گئے ان پر کوئی مخالف اعتراض کر دے تو وہ کہتے ہیں کہ وہ Confuse ہو گئے اور ان کا ایمان ڈگمگا گیا۔ اتنا کمزور ایمان کیوں ہے جو بات بات پر ڈگمگا جاتا ہے اور اس کا فائدہ؟ اس کا حل یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کیا جائے۔ ایمان و یقین میں کمی اور کمزوری، شخصیت میں کمزوری پیدا کر دیتی ہے۔

ایمان اور قلبِ اطہر ﷺ سے تعلق

ایمان کا مدار تصدیقِ قلبی پر ہے۔ جب انسان کا دل تصدیق کرتا ہے تو اس دل اور قلبِ اطہر رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور اگر چشمِ بینا ہو تو دیکھا جا سکتا ہے کہ قلبِ اطہر ﷺ سے بے شمار نورانی تاریں نکلتی ہیں اور جہاں جہاں کسی دل میں ایمان ہے، وہاں وہاں تک پہنچتی ہیں۔ اگر یہ تعلق مضبوط تر ہو جائے اور اطاعتِ پیغمبر ﷺ کے ساتھ برکاتِ پیغمبر ﷺ بھی مل جائیں تو اس کی ابتداء ہی ایک بہت بڑی نہر یا ایک دریا کی صورت میں ہوتی ہے، تار کی صورت میں نہیں ہوتی اور پھر یہ سمندروں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ اب اس سے آپ سمجھ لیں کہ عمل (اطاعت) کے علاوہ برکاتِ صحبت کیا شے ہیں۔

عقائد بنیاد ہیں

یاد رکھیں! اعمال کی ساری عمارت عقائد و نظریات پہ کھڑی ہوتی ہے۔ نظریات میں جب خرابی آتی ہے تو اعمال کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ عمل تھوڑا ہو، عقیدہ اور نظریہ صحیح ہو تو وہ حیثیت پا جاتا ہے اور عمل بہت زیادہ ہو لیکن اس کے پیچھے عقیدہ درست نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم نے ہزاروں سال ہندوؤں کے ساتھ گذارے ہیں اور اس میں ایسے مسلمان حکمران بھی آئے ہیں جنہوں نے اسلام کو تبدیل کر کے ہندو مسلم

اتحاد کی کوشش کی ہے اور اسلام میں کافرانہ نظریات شامل کیے ہیں۔ مثلاً میری بہت سی ڈاک یہ ہوتی ہے کہ میری روزی کسی نے بند کر دی۔ اب یہ نظریہ اسلام کا اور مسلمان کا تو نہیں ہوسکتا۔ یہ نظریہ یقیناً ہندوؤں سے آیا ہے۔ مسلمان کا تو سیدھا سادا عقیدہ ہے کہ رازق اللہ ہے اور جو چیز اللہ دیتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جو وہ نہیں دیتا کوئی اس سے چھین کر لے نہیں سکتا۔

خالص عقیدہ، خالص دین نصیب ہو جائے، نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو، موت ہو یا زندگی، نفع ہو یا نقصان، لوگ خوش ہوں یا ناراض، بندے کیلئے صرف اللہ کی فرمانبرداری ہی میں راحت ہوتی ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ اس کے لئے اللہ کافی ہے۔

عقیدے میں کھرا پن

آج کا دور انتہائی گمراہی کا دور ہے، عقیدے کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی۔ عقیدے میں کھرا پن اور توحید باری پر قائم رہنے والے لوگ اب گنتی کے ہی رہ گئے ہیں۔ غیر مسلم کا تو توحید کے ساتھ رشتہ ہی نہیں، مسلمان کہلانے والوں میں بھی اللہ پر بھروسہ کرنے والے بہت کم ہیں۔ غیر مسلموں نے اگر پتھر کے بت بنا لیے تو مسلمان کہلانے والوں نے زندہ انسانوں کے بت بنا لئے ہیں۔ کہیں بزرگوں کی تصویر کی پرستش ہو رہی ہے، کہیں چلہ کشی اور وظیفوں کے ہی بت بنا لیے ہیں۔ پہلے چلہ کشیاں کرتے ہیں پھر پاگل ہو جاتے ہیں، شیاطین پکڑ لیتے ہیں۔ میرے پاس آتے ہیں، میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں، کیا لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ چلہ کشی کے زور سے یہ چاہتے ہیں کہ کائنات میں ویسا ہو جیسا وہ چاہیں اور بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کائنات اللہ کریم کی اپنی ہے، بڑی نازک ہے اور ہر چیز دوسرے سے ایک نظام کے تحت جڑی ہوئی ہے، بندہ اس میں کہاں مداخلت کرسکتا ہے۔

اس عمومی گمراہی کے دور میں نجات کیلئے اگر کوئی کشتی نوح ہے تو یہی ذکر اذکار اور تصوف کا شعبہ ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو بندے میں از خود یہ احساس پیدا کر دیتا ہے کہ بندے کے افکار و عقائد میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو عمل کی اصلاح کی فکر پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو عمل کی توفیق طلب کرنا سکھاتا ہے۔ اس زمانے میں جو بندہ عقیدہ بچا کر دنیا سے چلا جائے، میں سمجھتا ہوں وہ ولی اللہ ہے، اس پر اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ ذکرِ قلبی سے اگر کسی کو بہت کم فائدہ بھی ہو تو یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کے عقائد درست ہو جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر فائدہ یہ ہے کہ توفیقِ عمل بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

عقائد وہی رہے، احکام بدلتے رہے

آدمؑ سے لے کر حضور نبی کریم ﷺ تک وہی عقائد رہے جو پہلے روز نازل ہوئے تھے۔ ذاتِ باری، صفاتِ باری، آخرت، حشر نشر، جنت دوزخ، ملائکہ کے بارے تمام باتیں عقائد ہیں اور عقائد خبر ہیں، خبر کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اگر خبر تبدیل ہو تو یا پہلی خبر غلط ٹھہرے گی یا بعد میں آنے والی خبر۔ لہٰذا عقائد و نظریات تمام انبیاء کی تعلیمات میں ایک ہی رہے۔ جہاں تک احکام کا تعلق ہے تو ہر قوم کو اس کی استعداد، قوتِ کار اور حالات کے مطابق علم دیا گیا۔ آقائے نامدار ﷺ ساری انسانیت کیلئے اور ہمیشہ کیلئے مبعوث ہوئے تو انہیں ضابطے بھی ایسے عطا فرمائے جو قیامت تک کی ساری انسانیت کیلئے رہنمائی ہیں۔

عقائد میں خرابی کا نقصان

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے کاسۂ دل کو سیدھا رکھتے ہیں۔ اگر کہیں کمی ہوتی ہے تو ٹیڑھا پن کاسۂ دل میں ہوتا ہے، بارانِ رحمت میں کمی نہیں ہوتی۔ کہیں ہمارے اعتقاد کی کمزوریاں، کہیں ہماری رسومات کی پیروی، کہیں ہمارے کردار کی خامیاں ہمارے کاسۂ دل کو ٹیڑھا کر دیتی ہیں اور اس میں کجی آجاتی ہے اور خدانخواستہ عقیدے میں خرابی

آجائے تو کاسۂ دل الٹ جاتا ہے، اس میں کچھ نہیں پڑتا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے کاسۂ دل کو سیدھا رکھا اور رحمتِ باری سے بھرا۔

شرک

شرک دو طرح سے ہے۔

شرکِ جلی: یعنی علی الاعلان کسی کو اللہ کا شریک مان لینا۔ کسی بت کو، کسی دیوی کو، کسی فرضی پیر کو، کسی جن کو، سورج چاند ستارے کو یا کسی نیک بندے کو۔ کسی ہستی میں بھی وہ اختیارات ماننا جو اللہ کے لیے خاص ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی اطاعت کرنا شرکِ جلی ہے۔ صاف ہے، ظاہر ہے، سامنے ہے۔

شرکِ خفی: یہ بہت خطرناک ہے۔ بندہ اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اسے پتہ تب چلتا ہے جب اس کا دل تباہ ہو چکا ہوتا ہے۔ شرکِ خفی یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے سے نفع و نقصان کی امید رکھی جائے۔ کسی سے ڈرتے ہوئے اللہ کی اطاعت چھوڑ کر اس کی اطاعت کی جائے۔ احکامِ الٰہی کے خلاف کسی کی بات اس لئے مانی جائے کہ یہ میرا فائدہ کرے گا اور نہ مانوں گا تو وہ مجھے نقصان پہنچائے گا۔ اس کا مطلب ہے اس نے بندے کو یا اس چیز کو اپنا معبود مان لیا ہے۔ تو شرکِ خفی بہر حال شرک ہے، زہر ہے۔ زہر کسی نے زیادہ کھا لیا فوراً مر گیا جو تھوڑا تھوڑا لیتا ہے، اسے slow poisoning کہتے ہیں تو مرے گا وہ بھی۔

خواہش نفس کی عبادت سے کیا مراد ہے؟

اگر نفع کی امید اور نقصان کا خوف اللہ کے سوا کسی دوسرے سے وابستہ کریں تو یہ شرک ہے اور یہ صورت کسی دوسرے کے علاوہ خواہشِ ذات اور خواہش کی پیروی میں بھی ہے۔ اللہ پاک قرآن حکیم میں فرماتے ہیں اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ (الفرقان: 43) ''آپ نے اس شخص کی حالت دیکھی جس نے اپنی خواہشِ نفسانی کو اپنا

الٰہ یعنی معبود بنا رکھا ہے''۔ ظاہر ہے کوئی بھی شخص خواہشِ نفس کو مجسم کر کے، سامنے رکھ کر تو سجدے نہیں کرتا۔ اس کے دل میں خواہش اٹھتی ہے، اگر وہ خواہش غلط ہے تو اللہ کریم کی نافرمانی کا کام ہے۔ بندہ اللہ کریم کے روکنے سے نہیں رکتا تو تب خواہشِ نفس کی پیروی، عبادتِ نفس کہلاتی ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے کو اپنا رب مانتا ہے، اسے حاجت روا سمجھتا ہے کیونکہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا جبکہ اللہ کی نافرمانی کر لیتا ہے تو یہ بھی شرک کی صورت ہے۔

مولانا احمد علی لاہوریؒ فرماتے ہیں کہ جب اذان ہوتی ہے اور بندہ اپنی دکان نہیں چھوڑتا، کاروبار کرتا رہتا ہے۔ ذہن میں کاروبار کی اہمیت نماز سے بڑھی ہوئی ہے تو فرماتے ہیں ایسا شخص اللہ کی ربوبیت کا قائل نہیں۔ اس نے دوکان کو ہی اپنا رب سمجھ رکھا ہے اور یہ شرک ہے۔

اسے تو ہم شرک سمجھتے ہی نہیں.....!

جن لوگوں کے ساتھ دنیا میں ہمارا تعلق ہوتا ہے۔ تعلق سے میری مراد معیتِ رسالت ﷺ کا تعلق ہے۔ تو اگر مجھے کوئی بتا دے یا کہیں سے پتہ چلے کہ کوئی ایسا بندہ دنیا سے چلا گیا تو میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کیلئے دعا کر لی جائے۔ ایسا کرنا بھی چاہئے کہ یہ اس کا حق بنتا ہے۔ مجھے ایک بندہ یاد ہے۔ ہم پشاور جا رہے تھے تو ایک جگہ نماز کا وقت ہو گیا۔ میرا پستول میرے پاس تھا میں نے اسے پکڑا دیا اور اس نے گلے میں لٹکا لیا۔ نماز سے فارغ ہو کر گاڑی کی طرف آ رہے تھے تو وہ بندہ حضرت جیؒ سے کہنے لگا کہ حضرت! کمال ہے کہ فرشتوں نے میری نماز کا ثواب باقی ساتھیوں سے زیادہ لکھا ہے، ایسی کیا وجہ ہے؟ حضرتؒ نے دیکھا تو اس نے گلے میں پستول پہنی ہوئی تھی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ تم نے مسلح ہو کر نماز پڑھی ہے۔ باقیوں کی نسبت تمہاری نماز میں ایک سنت زیادہ تھی کہ

نبی کریم ﷺ نے غزوات میں اسلحہ سمیت نماز ادا فرمائی ہے، اس لئے تمہارا ثواب زیادہ لکھا گیا۔ یہ عالم تھا اس کے مشاہدات کا۔ پھر میں نے اس بندے کو دیکھا کہ وہ مرکز سے الگ ہو گیا، پھر وہ ماوشما کیلئے مشاہدے کرتا۔ ''میں تمہیں دیکھ کر بتاتا ہوں تم یہ کام کرو تمہیں اتنے پیسے ملیں گے، وہ کام کرو تمہارا کام ہو جائے گا، مجھے اس میں سے کتنے دو گے''۔ یعنی کہاں سے بات چلی، کہاں پہنچی۔ پھر بڑا عرصہ گزر گیا، ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ یار! بڑا عرصہ رفاقت رہی تھی، اب دنیا سے چلے گئے ہیں، دیکھیں کیا کر رہے ہیں؟ استغفر اللہ! میں نے دیکھا قبر میں آگ کی تاروں کی ایک جالی بنی ہوئی ہے جیسے آج کل ایک باریک تاروں کی جالی سی آئی ہوئی ہے جس میں قیمتی فروٹ بیچتے ہیں۔ میں نے دیکھا برزخ میں اس طرح کی باریک باریک تاروں کی پوری جالی بنی ہوئی ہے، اس میں اس کا وجود لٹکا ہوا ہے اور تڑپ رہا ہے۔ بڑا خوف آیا، کمال ہے یہ کیا ہو گیا!

اب ہماری دوڑ یہ ہوتی تھی حضرتؒ سے دعا کروالیں کہ حضرت! میری سمجھ میں تو نہیں آیا، یہ کیا بلا ہے اور کیوں ہے؟ میں نے کوشش بھی کی کچھ پڑھ کر بخشیں، انوارات القاء کریں، یہ عذاب ہٹ جائے لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ حضرتؒ سے عرض کیا تو فرمایا یہ شرک کی تاریں ہیں، یہ عقیدے کی خرابی ہے، یہ دعاؤں سے دور نہیں ہو گی۔ عمل میں خرابی ہو تو دعا سے دور ہو سکتی ہے، عقیدے میں خرابی ہو تو دعاؤں سے دور نہیں ہو سکتی۔

حیرت ہوئی کہ کون سا عقیدہ خراب ہو گیا؟ فرمایا، دنیا کیلئے اللہ کو چھوڑ کر لوگوں سے امیدیں وابستہ کرنا یعنی جہاں بھی آپ اللہ کے سوا کسی اور سے فائدہ اٹھانے کی امید کرتے ہیں تو ایک چھوٹا سا شرک بن جاتا ہے۔ اب دیکھو! اس بندے نے چوری نہیں کی، ڈاکہ نہیں ڈالا، قتل نہیں کیا، گناہ کبیرہ نہیں کیا، لوگوں سے امیدیں وابستہ کرنے سے اپنے لئے ایسا جال بُن لیا کہ رب جانے اور وہ جانے کہ وہاں کوئی سفارش بھی نہیں کر

سکتا۔ میں کبھی مکاشفات یا مشاہدات بیان نہیں کرتا، میں نے یہ کشف بیان کرنے کیلئے نہیں عبرت کیلئے سنایا ہے۔ اللہ پاک مجھے خودنمائی کے گناہ سے بچائے اور اسے آپ لوگوں کو سمجھانے کا سبب بنائے۔ میں نے تو سمجھانے کیلئے بات کر دی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور سے امیدیں وابستہ کرنا شرک بن جاتا ہے اور پھر جب اس میں خوشامد بھی شامل ہو جائے تو غیرتِ الٰہی برداشت نہیں کر سکتی۔

کسی کی عزت کرنا، کسی کا احترام کرنا، کسی سے ملاقات رکھنا اور بات ہے اور کسی سے امید وابستہ کرنا بالکل الگ بات ہے کہ یہ بڑا افسر ہے، اس کی خوشامد کروں میرے کام آئے گا۔ فلاں کو خوش رکھیں تو بیٹا بھرتی ہو جائے گا۔ یہ بندہ ذکر سیکھنے آیا ہے، اسے میں اپنے تک رکھوں تو میری اہمیت رہے گی۔ یہ بڑا تاجر ہے اس کے پاس بڑا پیسہ ہے، یہ میری مدد کرے گا۔ یار! یہ چھوڑ دو، صرف اللہ ہی بڑا ہے اور اللہ کا رسول ﷺ کافی ہے۔ امیدیں وہیں وابستہ رکھو، اللہ کی بارگاہ تک محدود رکھو، اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھو، یہ بڑا نازک اور بڑا خطرناک کام ہے۔

شرکِ انسانی وجود سے کب نکلتا ہے؟

یہ ایک عجیب بات ہے کہ آپ سارا فلسفہ سمجھاتے رہیں، انسان کے وجود سے شرک زائل نہیں ہوتا۔ آپ کروڑوں دلیلیں دیں، زبان سے آدمی کہہ سکتا ہے اللہ واحد ہے، لاشریک ہے لیکن جب عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اللہ پر بھروسہ کرنا محال ہو جاتا ہے۔ شرک انسان کے وجود سے تب نکلتا ہے جب اس پر عظمتِ باری کا کوئی ذرّہ بھی عیاں ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے آپ کو اللہ کے قریب نہ لے جائے اور اس کا دل جمالِ باری سے سیراب نہ ہو، اس کے وجود سے شرک کی نفی نہیں ہو سکتی۔

''دعا منہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں''

یعنی بڑے سے بڑا ملحد، بڑے سے بڑا کافر بیٹھا ہے، اس کی منت کر لیں گے لیکن اللہ کریم کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کریں گے اور اس پر اعتماد نہیں کریں گے۔

اللہُ حاضری، اللہُ ناظری

ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ جی ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے تو کیا اللہ کریم دوزخ میں بھی موجود ہے؟

لوگوں کی سادگی پہ بعض اوقات حیرت ہوتی ہے اور یہ بندہ ایک بہت بڑے محکمے کا بہت بڑا آفیسر ہے، بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میں نے کہا حضرت! مجھے ایک بات بتایئے۔ آپ اپنے آپ میں اور ربِ جلیل میں کیا فرق سمجھتے ہیں؟ کہنے لگا معاذ اللہ! اللہ، اللہ ہے میں تو اس کا ایک عاجز بندہ ہوں۔ میں نے کہا، جس طرح آپ ایک عاجز بندے ہیں، دوزخ آپ سے بھی زیادہ عاجز مخلوق ہے۔ دوزخ خدانخواستہ میرے لیے ہو سکتی ہے، آپ کے لیے ہو سکتی ہے، لیکن وہ اس کی تو ویسی ہی مخلوق ہے جیسے ہم لوگ اس کی مخلوق ہیں۔ وہ تو خالق ہے اس نے جن فرشتوں کی دوزخ میں ڈیوٹی لگا رکھی ہے، کیا دوزخ سے انہیں کوئی تکلیف ہو گی؟ کہنے لگا ہونی تو نہیں چاہیے۔ میں نے کہا اگر وہ اپنی دوسری مخلوق کو وہاں بھیج دیتا ہے اور اس کیلئے دوزخ دوزخ نہیں رہتی تو آپ رب کریم کے بارے کیا سوچ رہے ہیں؟

دنیا میں ہر ایک کو آگ جلاتی ہے لیکن اگر کسی جگہ مسلسل ایک ہزار برس تک آگ جلتی رہے، بجھے نہیں تو اس میں خاص قسم کے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جو آگ ہی سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آتش کدہ ایران میں ان کا وجود پایا گیا۔ انہیں سَمندر (م پر زبر کے ساتھ) کہتے ہیں۔ جنوں اور شیطانوں کو اس نے آگ سے پیدا کیا جیسے ہمیں خاک سے پیدا کیا اگر اس کی مخلوق آگ سے پیدا ہو سکتی ہے تو آپ اللہ کی عظمت کے بارے کیا سوچتے ہیں، آپ

اللہ کو سمجھتے کیا ہیں؟ یعنی لوگوں کا شعور یہ ہے کہ اُسے اپنی ذات پہ قیاس کیے بیٹھے ہوتے ہیں۔

کل ایک ساتھی بیٹھے تھے میرے پاس، راجن پور سے تشریف لائے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ جو مسئلہ ہے کہ نبی کریم ﷺ حاضر و ناظر ہیں، اس کے بارے آپ کیا فرماتے ہیں۔ میں نے کہا میرے بھائی! مجھے تو وہ لوگ بھی نہیں ملتے جو اللہ کو حاضر و ناظر سمجھیں، اس نے کہا کہ سارے کہتے ہیں۔ میں نے کہا! کہتے تو سارے ہیں، کوئی ایک بندہ نکال کے لاؤ جس کا کردار یہ ثابت کرے کہ وہ اللہ کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے، اللہ کے سامنے کوئی جھوٹ بول سکتا ہے؟ اللہ روبرو موجود ہو تو کوئی سودا کھا سکتا ہے، اللہ روبرو موجود ہو تو کوئی برائی کر سکتا ہے، چوری کر سکتا ہے، قتل کر سکتا ہے، گلیوں میں لوگوں کو مارتا پھرتا ہے؟ میں نے کہا! پھر مجھے تو یہ سمجھ آتی ہے کہ لوگ اللہ کو حاضر و ناظر نہیں سمجھ رہے۔ کہنے لگا جی! اگر بات واقعات پہ لائی جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔

میں نے کہا! پھر پہلے اللہ کو منواؤ، یہ اگلی بحث پھر کریں گے۔ پہلے اللہ کو حاضر و ناظر جانو کہ جہاں میں ہوں وہاں اللہ موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب سمجھ گئے کہ میں نے اس پر عمل کر لیا ہے تو تمہیں اگلا مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اگر آئی تو میرے پاس آ جانا۔

تقدیر

قدرت کے فیصلے دو طرح کے ہیں، تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔

قضائے مبرم: وہ تقدیر جس میں کمی بیشی نہیں ہوتی، جس کے حتمی فیصلے ہو چکے اور انہی فیصلوں کو نافذ ہونا ہے۔ اسے قضائے مبرم کہتے ہیں یعنی ایسی تقدیر جس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

قضائے معلق: وہ فیصلے جو معلق رکھے گئے ہیں، ان کا تعلق انسان کے کردار سے ہوتا ہے۔ یہ جو قوموں کی قومیں غرق ہوئیں تو کیا یہ ان کا مقدر تھا کہ وہ سب ایک ہی دن مریں گے یہ قضائے معلق تھی کہ اگر تمہارے گناہ اس حد سے تجاوز کر گئے تو سب تباہ ہو جاؤ گے، اگر وہ توبہ کر لیتے تو وہ مصیبت ان پر نہ آتی۔ یہ ہوتی ہے قضائے معلق۔

اب ہم ان دو میں فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے کہ مجھ پر یہ جو بیماری آئی ہے، یہ قضائے معلق ہے یا قضائے مبرم۔ ہوسکتا ہے یہ قضائے معلق ہو، میری کوئی نیکی، میری کوئی آہ وزاری، کسی وقت کی دعا اللہ کو پسند آ گئی ہو اور کوئی سخت بیماری جو مجھے لاحق ہونا تھی اس کی بجائے یہ معمولی بیماری آئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے میرا گناہ بہت بڑا ہو، میری خطا بہت بڑی ہو اور یہ چھوٹی سی سزا دی گئی ہو۔

نزولِ عیسیٰؑ کیوں؟

عہدِ نبوی ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ روشنی کے مینار تھے۔ لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ تابعین اور تبع تابعین تک خیر القرون تھا۔ پھر رفتہ رفتہ حالات بدلتے گئے، لوگوں کے دل سخت ہوتے گئے۔ علماء میں وہ قوت نہ رہی، سیکھنے والوں کے جذبے ماند پڑتے گئے لیکن جب بھی حالات بگڑتے تو اللہ کریم علماءِ حق کو، اہلِ حق کو، اولیاء اللہ کو، نیک بندوں کو پیدا کر دیتا اور وہ انقلاب آفریں ہوتے۔ لیکن جوں جوں زمانہ عہدِ نبوی ﷺ سے دور ہوتا جائے گا، روحانی قوت میں کمی آتی جائے گی کیونکہ زمانے گزرنے کے اپنے اثرات ہوتے ہیں۔

ان حقائق سے ذاتی طور پر آگاہ ہو جانے کے بعد سمجھ آ گئی کہ حضرت عیسیٰؑ کو دنیا میں نفاذِ دین کی خدمت کیلئے بھیجا جانا ضروری ہوگا اور اللہ کریم تو اس حال کو پہلے سے جانتا تھا کہ ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ لوگ اولیاء اللہ سے بھی متاثر نہیں ہوں گے اور لوگوں میں مثبت

تبدیلی لانے کے لیے رسولؐ ہی کی روحانی قوت کی ضرورت ہوگی اس لئے اس نے ایک نبیؑ کو زندہ باقی رکھا۔ یہ اس کی حکمت کا تقاضا تھا، اسے پتہ تھا کہ ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جب لوگ نہ علماء سے متاثر ہوں گے نہ اہل اللہ کی محنت سے۔ تب حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوگا اگرچہ وہ شریعت حضور نبی کریم ﷺ کی ہی نافذ کریں گے لیکن روحانی قوت اللہ کے ایک رسول علیہ السلام کی ہوگی۔

شروع میں جب ہم روایات پڑھتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ کو باقی رکھا گیا ہے تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو باقی رکھنے کا مقصد کیا ہے؟ پھر جب ہم خود میدانِ عمل میں آئے تو پتہ چلا کہ کائنات میں خیر و شر کا توازن قائم رکھنے کیلئے انبیاءؑ کے فیوضات کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ جو برکات قلبِ اطہر رسول اللہ ﷺ سے نصیب ہوتی ہیں، وہ اہل اللہ کے ذریعے کائنات میں تقسیم ہوتی ہیں۔ جوں جوں ظلمت بڑھتی ہے اس پائے کے مراتب اہل اللہ کو عطا کیے جاتے ہیں اور اتنی قوت دی جاتی ہے کہ گمراہی کے زمانے میں بھی ایک روشن راستہ موجود رہے اور چلنے والوں کو راہ ملتی رہے۔ یہ نہ ہو کہ چلنے والا تو ہو لیکن راستہ دکھانے والا نہ ہو یا راستہ دکھائی نہ دے۔ تو پھر سمجھ آئی کہ ایک ایسا دور بھی آئے گا جس میں اتنی ظلمت بڑھے گی کہ ولی اللہ کے انوارات کی روشنی شاید ناکافی ہو یا شبِ دیجور (سیاہ رات) میں ایک جگنو ثابت ہو تو وہ وقت نزولِ عیسیٰؑ کا ہوگا۔ تمام انبیاءؑ اول روز ہی سے حضور ﷺ کے امتی ہیں تو حضرت عیسیٰؑ بھی بحیثیت حضور ﷺ کے امتی زمین پر تشریف لا کر دینِ محمدی ﷺ کی ترویج کریں گے۔ آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کا نفاذ کریں گے لیکن نبیؑ کی قوت سے کریں گے۔ ان کا نور، نورِ نبوت ہوگا اور تب اتنی ظلمت ہوگی کہ اس میں راستہ دکھانے کے لیے نورِ نبوت کی براہ راست ضرورت پڑے گی۔

آخرت کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہوگا۔ حضرت عیسیٰؑ کا رفع آسمانی

(آسمان پہ اٹھائے جانے کا واقعہ) ہوا تو آپؑ بھرپور نوجوان تھے۔ اب سن عیسوی کے مطابق دو ہزار برس سے زیادہ گزر گئے، اس طرح ان کی عمرِ عزیز میں دو دن کا فرق پڑا ہوگا۔ چونکہ وہاں ایک دن گزرتا ہے یہاں ہزار سال گزر جاتے ہیں لہٰذا جب نزول فرمائیں گے تو وہی بھرپور جوانی ہوگی اور حدیث شریف میں ملتا ہے کہ آپؑ شادی فرمائیں گے، زندگی گزاریں گے۔ وصال ہوگا تو روضہ اطہر ﷺ میں دفن ہوں گے۔ یہ صحیح احادیث میں موجود ہے۔

ختمِ نبوت

ختمِ نبوت کا یہ مفہوم درست نہیں کہ نبوت ختم ہوگئی۔ اس تشریح سے گمراہ فرقوں نے ختم یا خاتم کا ترجمہ مہر لگانا کر لیا کہ جو نبی اب آئے گا وہ حضور ﷺ کی مہر سے آئے گا کہ حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں یعنی آئندہ آنے والوں پر مہر لگانے والے ہیں۔ یہ سب گمراہی ہے۔ ختمِ نبوت کا درست مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ تا قیامت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ آپ ﷺ کی رسالت تمام زمانوں پر محیط ہے۔ نبوت مکمل ہو گئی، کسی نئے نبی کی اب ضرورت ہی باقی نہیں رہی، گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ اس لیے علماءِ حق کا ارشاد ہے کہ کوئی اگر حضور ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرا اس سے دلیل مانگتا ہے کہ تمہاری نبوت کی دلیل کیا ہے تو وہ دلیل مانگنے والا بھی کافر ہے۔ نبوت کا دعویٰ کرنے والا تو کافر ہے ہی جو اس سے دلیل طلب کرتا ہے وہ بھی کافر ہے کہ اس میں بھی تذبذب ہے کہ شاید کچھ دلائل ان کے پاس ہوں تو یہ نبی ہو سکتا ہے۔ ختمِ نبوت ایمان کا حصہ ہے کہ جس میں ذرا سا شک آئے تو سارا ایمان مشکوک ہو جاتا ہے۔ ختمِ نبوت اس بات کی دلیل ہے کہ تہذیب ہو یا معاشرت، معیشت ہو یا صلح و جنگ، لین دین ہو یا سیاست، ان سب کے متعلق مکمل احکامات دیئے جا چکے، ان کے اصول و ضوابط بن چکے ہیں۔

انبیاءؑ کی حیثیت کائنات میں سورج جیسی ہے۔ تمام انبیاءؑ اپنے اپنے زمانے میں سورج کی طرح چمکے اور اپنی اپنی روشنیاں بکھیر کر اللہ کے حکم کے مطابق غروب ہو گئے۔ یعنی پہلی شریعتیں آئیں پھر ان کا وقت ختم ہو گیا لیکن یہ مہرِ جہاں تاب طلوع تو ہوا، اب غروب کبھی نہیں ہوگا، ہمیشہ روشنیاں بکھیرتا رہے گا۔ چونکہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے، کوئی نبی نہیں ہے، قرآن کے بعد کوئی کتاب نہیں ہے اور اس امتِ مرحومہ کے بعد کوئی امت نہیں ہے۔ اب جس کسی نے جو کچھ لینا ہے حضور ﷺ کی بارگاہِ نبوت سے تعلق استوار کر کے لینا ہے۔ بارگاہِ الوہیت میں جتنے دروازے کھلتے تھے وہ اپنی اپنی باری پر کھلے اور حکمِ الٰہی کے تحت بند ہوتے رہے، اب صرف ایک دروازہ کھلا ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا اور محمد رسول اللہ ﷺ وہ ذریعہ ہیں جس سے اللہ کے بندے اللہ سے آشنا ہوتے ہیں۔

جوں جوں وقت گزرا، دنوں، سالوں، صدیوں کے فاصلے بڑھنے لگے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ہم مرورِ زمانہ کا یا صدیوں کے فاصلوں کا شکار ہو گئے ورنہ برکاتِ محمد رسول اللہ ﷺ آج بھی اسی طرح برس رہی ہیں جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں برسا کرتی تھیں۔ ختمِ نبوت کا حقیقی نکتہ یہی ہے کہ آپ ﷺ نے مبعوث ہو کر ہمیشہ کیلئے انسانیت کو کسی نئے نبی کی ضرورت سے فارغ کر دیا یعنی کسی بھی زمانے میں کوئی ایسی ضرورت نہیں آئے گی کہ نیا نبی مبعوث فرمایا جائے۔ اسی لیے آپ ﷺ کی برکات ہمیشہ کی طرح تقسیم ہوتی رہیں گی۔

فلسفہِ موت و حیات

زندگی کے کئی حصے ہیں۔

۱۔ ایک حصہ عالمِ امر سے متعلق ہے جہاں تمام روحیں زندہ ہیں۔

۲۔ وہیں سے باری باری دارِ دنیا میں، مادی وجود میں، شکمِ مادر میں منتقل ہوتی ہیں۔ جتنا عرصہ روح ماں کے پیٹ میں رہتی ہے وہ اس کی زندگی کا ایک اور حصہ ہے۔ شکمِ مادر میں جب حیات پیدا ہوتی ہے تو روحِ علوی یعنی عالمِ امر کی روح اس میں پھونک دی جاتی ہے اور جب وجود کے اجزاء سے اس کا رشتہ بنتا ہے تو یہ نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔

۳۔ پھر انسان شکمِ مادر سے دارِ دنیا میں منتقل ہوتا ہے۔ بدن غذا کھاتا ہے، وجود بڑھتا ہے اور عقل و شعور، ادراک و محسوسات سب کے ساتھ کام کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا اگلا حصہ ہے۔ دنیا میں مکلف بالذات بدن اور روح اس کے تابع ہے۔ دنیا میں عمل بدن کرتا ہے، وقتی نتائج بدن وصول کرتا ہے مثلاً چوری کرتا ہے، مال لوٹتا ہے، حرام کھاتا ہے تو اس کا پیٹ تو بھرتا ہے لیکن آخرت کے عذاب اس کی ابدی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں اور یہی اثرات روح پر وارد ہوتے ہیں۔

۴۔ دنیا سے جانے کیلئے اس پر موت وارد ہوتی ہے۔ برزخ میں داخلے کے ساتھ اس کی زندگی کا ایک اور دَور شروع ہو جاتا ہے۔ بدن پر جو موت وارد ہوتی ہے، اس سے نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ موت زندگی کا خاتمہ نہیں۔ موت جب آتی ہے تو وجود بے حس ہو جاتا ہے، حیاتِ دنیوی ختم ہو جاتی ہے، روح الگ ہو جاتی ہے اور علیین میں چلی جاتی ہے یا سجین میں لیکن بدن سے رشتہ برقرار رہتا ہے۔ بدن گل سڑ کر مادے کی کسی نہ کسی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، خاک میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے، درندہ کھا جائے تو اس کے گوشت کا حصہ بن جاتا ہے، آگ میں جل جائے تو خاک ہو جاتا ہے۔ مادے کی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتا ہے اور جہاں جہاں وجود کے ذرات ہوں، ان کے ساتھ روح کا تعلق قائم رہتا ہے۔ برزخ کا عذاب و ثواب روح پر ہوتا ہے لیکن بدن کے ذرے ذرے کو پہنچتا ہے کیونکہ ہر ذرّہ بدن کے ساتھ روح کا تعلق موجود رہتا ہے خواہ وہ مٹی میں مل جائے، ہوا میں منتشر ہو

جائے یا کسی جانور کا لقمہ بن جائے۔ کہیں بھی جائے، مادے ہی کی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔ جو ذرات بدن کا حصہ تھے، ان کا تعلق روح کے ساتھ رہتا ہے۔ روح کو اگر ثواب ملتا ہے تو ذراتِ بدن تک راحت پہنچتی ہے، اگر روح عذاب میں ہو تو ذراتِ بدن کو تکلیف پہنچتی ہے۔

۵۔ قیامت بپا ہوگی، میدانِ حشر میں ساری مخلوق جمع ہوگی۔ عرصۂ محشر بھی زندگی کے ادوار میں سے ایک دَور ہے۔ میدانِ حشر میں روح اور بدن برابر مکلف ہو جائیں گے۔ دونوں کو راحت نصیب ہوگی یا دونوں کو عذاب کی تکلیف۔

۶۔ وہاں فیصلہ ہوگا، ابدی ٹھکانے نصیب ہوں گے۔ اہلِ نار، دوزخ میں اور اہلِ جنت، جنت میں جائیں گے، وہاں حقیقی زندگی شروع ہوگی۔

شہید

روح تو ہر مرنے والے کی زندہ رہتی ہے، روح پر موت وارد نہیں ہوتی۔ موت نام ہے بدن اور روح کے تعلق کو توڑ دینے کا۔ بدن سے روح الگ کر دی جاتی ہے لیکن روح زندہ رہتی ہے۔ کافر کی روح بھی زندہ رہتی ہے اگرچہ عذاب میں رہتی ہے۔ اگر شہید کو یہ مانا جائے کہ صرف اس کی روح زندہ رہتی ہے تو پھر غیر شہید اور شہید میں کیا فرق ہوا؟ فرق یہ ہے کہ شہید کی روح کا اس کے بدن سے تعلق اتنا مضبوط رہتا ہے کہ اس کا بدن گلتا سڑتا نہیں۔ اسے اللہ کی طرف سے غذا دی جاتی ہے، اس کا بدن ویسے ہی سلامت رہتا ہے جیسا کہ روح کی موجودگی سے ہوتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بے شمار شہادتیں موجود ہیں۔ شہداء کی قبریں ضرورت پڑنے پر کھولی گئیں تو وجود تر و تازہ تھے۔

مسجدِ نبوی ﷺ کی توسیع میں کئی شہداء کے وجود نکلے۔ واقعۂ احد کے 40 سال بعد وہاں سے نہر گزاری گئی اور احد کے شہداء کو عہدِ نبوی ﷺ کے مدفن سے نکال کر باہر دفن

کیا گیا۔ اگر کسی شہید کا زخم تھا تو اس وقت بھی اس سے خون رس رہا تھا اور وجود ایسے ہی تروتازہ تھے۔ 1970 کی دہائی میں مسجدِ نبوی ﷺ کی توسیع کے دوران مدینہ منورہ کے قبرستان سے حضور ﷺ کے والدِ گرامی اور چند صحابہ کرامؓ کے وجود نکال کر جنت البقیع میں دفن کیے گئے تو تمام وجودِ گرامی درست حالت میں اور دُنیوی زندگی کی طرح تروتازہ تھے۔

عقیدۂ حیات النبی ﷺ

ہم حیات النبی ﷺ کے قائل ہیں۔ انبیاءؑ کی موت عام آدمی کی طرح نہیں ہوتی۔ انبیاءؑ کا پیروکار شہید اگر زندہ ہوتا ہے، اسے مردہ نہیں کہا جا سکتا تو خود نبی کریم ﷺ کیلئے یہ لفظ کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر معاذ اللہ یہ تصور کیا جائے کہ خود حضور ﷺ کی روحِ مبارک، جسمِ اطہر ﷺ سے جدا کر کے علیین میں رکھ دی گئی تو علیین میں کونسی ایسی جگہ ہے جو بدنِ اطہر ﷺ سے افضل ہے۔ حق یہ ہے کہ جس طرح حضور ﷺ کی روح تمام ارواح میں افضل ہے، اسی طرح حضور ﷺ کا بدن مبارک بھی اللہ کی ساری مخلوق میں افضل ترین بلکہ علمائے حق فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر بہترین جگہ بیت اللہ شریف ہے کہ تجلیاتِ ذاتی کا مہبط ہے لیکن مدینہ منورہ میں روضہ اطہر ﷺ کا وہ ٹکڑا جہاں نبی کریم ﷺ استراحت فرما رہے ہیں اور جس مٹی سے بدن مبارک مس ہو رہا ہے، بیت اللہ شریف سے افضل ہے اس لیے کہ مکان کی عزت مکین سے ہوتی ہے حضور ﷺ کا وجودِ عالی کائنات کی ہر تخلیق سے افضل ترین ہے تو جو حصہ زمین حضور ﷺ کے بدنِ عالی سے مس ہو رہا ہے، وہ بھی کائنات کی ہر شے سے افضل ہے، بیت اللہ شریف سے بھی افضل ہے۔

شہید کی وفات کو موت تصور کرنے سے اللہ نے منع کر دیا تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن کی غلامی میں مرنے والوں کا یہ مقام ہے تو ان کا اپنا مقام کیا ہو گا؟ شہید کی موت، حیات کو مانع نہیں ہے تو نبیؐ کی کیسے ہو سکتی ہے؟ انبیاءؑ کی روح کا تعلق دنیوی زندگی

سے منقطع کر دیا جاتا ہے لیکن وہ رہتی وجودِ اطہر علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ہی ہے اور وہ اس طرح زندہ ہوتے ہیں کہ روح کا تعلق دنیا سے توڑ کر برزخ میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ نہ اسے دنیا کی غذا کی ضرورت ہوتی ہے، نہ دنیا کی نیند آرام کی، نہ دنیا کی گرمی سردی کی بلکہ اس کا وہ تعلق برزخ سے جڑ جاتا ہے اور مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے جیسے بلب پر آپ فانوس رکھ دیتے ہیں، نبیؐ کی موت ایسے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ شہید کو مرنے کے بعد اعلیٰ رتبہ نصیب ہوا اور ان کی ارواح دنیا سے اعلیٰ جگہ پر ترقی پائیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وصالِ نبوی ﷺ کے بعد حضور ﷺ کی روحِ مبارک، اعلیٰ جگہ کو چھوڑ کر کم تر جگہ پر تشریف لے جائے۔

حیاتِ نبوی ﷺ ایسی ہے کہ آپ ﷺ کا اس دنیا سے انتقال ہوا، عالمِ دنیا کے ساتھ مادی رشتہ منقطع ہوا، حضور ﷺ برزخ میں جلوہ افروز ہوئے۔ آپ ﷺ کا وصال ایسا نہیں جیسے عام انسان پر موت وارد ہوتی ہے۔ آپ ﷺ جس طرح بدنِ اطہر ﷺ کے ساتھ دنیا میں جلوہ افروز تھے اسی طرح برزخ میں جلوہ افروز ہیں۔ جو ادب حیاتِ دُنیوی میں بارگاہِ نبوی ﷺ کا تھا آج بھی روضہ اطہر ﷺ کا وہی ادب ہے۔ آج بھی اسی ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلام پیش کیا جاتا ہے۔ وہاں آواز بلند کرنا حرام ہے، بے ادبی ہے اور توہین کرنا کفر کے زمرے میں آتا ہے۔

آپ ﷺ کی نبوت و رسالت ہمیشہ کیلئے ہے، اس لئے آپ ﷺ کی تمام برکات ہمیشہ کیلئے اور ساری انسانیت کیلئے ہیں۔ جب حضور ﷺ اس عالمِ فانی میں جلوہ افروز تھے تو جو فیضان تھا، جو برکات تھیں، آج بھی وہاں ویسے ہی انوارات بٹتے ہیں جیسے اس وقت بٹتے تھے۔ برزخ میں حضور ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد بھی موجود ہیں، ان میں کوئی تغیر، کوئی تبدل، کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ حضور ﷺ کے سامانِ برکات میں، نہ آپ ﷺ کی

نبوت و رسالت میں، نہ آپ ﷺ کے وجودِ مبارک میں، نہ آپ ﷺ کی روحِ اطہر ﷺ میں۔ وجودِ اطہر ﷺ برزخ میں ویسے ہی زندہ ہے، جیسے دنیا میں زندہ تھا، یہ اور بات ہے کہ دنیا کی زندگی میں احکامات دنیا کے تھے۔ گرمی سردی، کھانا پینا، سونا جاگنا یہ اِس عالم کا تھا، جب وہاں تشریف لے گئے تو ساری چیزیں اُس عالم کی ہوگئیں لیکن زندگی میں کوئی تغیر نہیں آیا، زندگی ویسی کی ویسی ہے۔

بات صرف یہ ہے کہ ہم اپنی انا کے اسیر ہیں۔ خود کو اوپر نہیں لے جاسکتے، اوپر والوں کو نیچے لانے کی فکر میں رہتے ہیں جو ممکن نہیں ہوتا۔ ہماری یہ بشری کمزوری ہے کہ خود کو کسی اعلیٰ مقام پر نہیں لے جاسکتے، جنہیں نصیب ہے انہیں نیچے لانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سب ایک ہی جیسے ہیں۔ ارے بھائی! سب ایک جیسے کہاں؟ جہان کے اندر جہان ہے، وجود کے اندر وجود ہے، زندگی کے اندر زندگی ہے۔

ہمارے کچھ بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں محفلِ نعت منعقد کرتے ہیں، حضور ﷺ وہاں تشریف لے آتے ہیں۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ کائنات حضور ﷺ کے قدموں میں جاتی ہے، حضور ﷺ کہیں تشریف نہیں لے جاتے کیونکہ حضور ﷺ کائنات کے مرکز ہیں۔ اب مرکز جدھر ہلے گا سارا دائرہ ہلے گا۔ مرکز کبھی کسی دائرے کے کسی حصے سے جا کر نہیں ملتا بلکہ ہر چیز اس سے ملحق ہوتی ہے، اس سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ حضور ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو قدومِ اقدس ﷺ زمین سے اٹھے تو کائنات کا نظام رک گیا اور واپس قدومِ مبارک زمین پر رکھے تو نظام چل پڑا۔ اگر حضور ﷺ اپنے مرکز سے کہیں بھی تشریف لے جائیں گے تو یہ ہر چیز رک جائے گی۔

بعض خوش نصیب لوگوں کو خواب میں زیارت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے گھر آ گئے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ہم باہر نکلتے

ہیں تو سورج کو دیکھ لیتے ہیں۔ ہر بندہ کہتا ہے میرے صحن میں سورج ہے، دوسرا کہتا ہے میرے گھر میں بھی ہے لیکن سورج کیا وہاں ہر گھر میں ہوتا ہے؟ سورج اپنی جگہ پر ہے آپ کو اپنی جگہ پر نظر آ رہا ہے۔ عکسِ جمال ﷺ اسی طرح ہوتا ہے۔ مرنے والے سے سوال ہوتا ہے ماکنت تقول فی حق ھذا الرجل حضرتؒ اس کی تعبیر فرمایا کرتے تھے کہ قبر سے لے کر روضہ اطہر ﷺ تک زمین صاف کر دی جاتی ہے، حجاب ہٹا دیا جاتا ہے، اسے نظر آنے لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہر مرنے والے کی قبر میں حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں۔ مرنے والا تو بے دین بھی ہوتا ہے، کافر بھی ہوسکتا ہے چونکہ سارے امتی ہیں۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے، ہوتا یہ ہے کہ زمین شیشے کی طرح شفاف ہو جاتی ہے لیکن نظر پھر بھی اس کو آتا ہے جس کے دل کا تعلق حضور ﷺ سے ہوتا ہے۔ دوسرا تو کہتا ہے ھیھات ھیھات لادری ہائے خرابی! مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تم کیا پوچھے جا رہے ہو، کس کے بارے پوچھ رہے ہو، کون ہے، کہاں ہے؟ حضور ﷺ کا نظر آ جانا ہی نجات کیلئے کافی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دل کا تعلق بارگاہِ رسالت ﷺ سے ہے۔

انک لاتسمع الموتی

وہ جو قرآن حکیم نے فرمایا "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" (النمل:80) اے میرے حبیب ﷺ! یہ مُردے آپ ﷺ کی آواز نہیں سنتے۔ حضور ﷺ کبھی قبرستانوں میں وعظ فرمانے نہیں جاتے تھے۔ اس سے مراد وہی مُردے ہیں جو مادی زندگی میں چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہیں اور جن کے ساتھ حضور ﷺ محنت فرماتے تھے مگر ان پر آپ ﷺ کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ عنداللہ اگر تعلقِ الٰہی کے پیمانے سے ماپا جائے تو وہ لوگ مر چکے ہیں۔ جنہیں اللہ سے تعلق نصیب ہوتا ہے وہ موت کی رسائی سے آگے ہوتے ہیں، ان کیلئے موت صرف ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہونے کا نام ہے۔

اگر کسی پر اللہ کے حبیب ﷺ کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا، قرآن حکیم اسے مُردہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں موت یہ ہے کہ کوئی کھاتا پیتا ہو، چلتا پھرتا ہو، سوتا جاگتا ہو، لیکن نبی پاک ﷺ کی بات اس پر اثر نہ کرے۔ فرمایا! "اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی" (النمل:80). یاد رہے اس آیتِ کریمہ سے جو یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قبر میں مدفون مُردے نہیں سنتے، اس کا یہاں ذکر ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ لوگ جو روحانی طور پر مر چکے ہیں۔

یاد رکھیں! موت ان کیلئے ہے جو اللہ سے دُور ہو جاتے ہیں خواہ وہ مادی دنیا میں چلتے پھرتے ہوں، کھاتے پیتے ہوں لیکن دراصل وہ مر چکے ہیں۔ عربی کے ایک شعر کا مصرعہ ہے **واجسامھم قبل القبور قبورھم** ان کے جسم قبر میں جانے سے پہلے روح کیلئے قبر کا روپ دھار چکے ہیں۔ یہ چلتی پھرتی قبریں ہیں، جن پر نبی کریم ﷺ کے ارشادات کا اثر نہیں ہوتا۔ اُن کی مثال ایسی ہے وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ (النمل:80) جس طرح کوئی بہرہ بھی ہو اور وہ پیٹھ پھیر کر دوسری طرف جا رہا ہو، سننا بھی نہ چاہتا ہو تو اسے کوئی کیا سنوائے گا؟ یہی حال ان مُردوں کا ہے جو بظاہر میڈیکلی (Medically) زندہ ہیں لیکن عنداللہ مُردار ہیں۔

صلوٰۃ وسلام

حضور ﷺ پر صلوٰۃ اور سلام پڑھنا فرض ہے۔ قرآن نے حکم دیا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (الاحزاب:56) صلوٰۃ بھی بھیجو، سلام بھی بھیجو۔ تسلیماً، ایسے بھیجو جیسے بھیجنے کا حق ہے جبکہ ہم تو اس حد تک بے تکلف ہو گئے ہیں کہ ہم تو مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر بات کرتے ہیں اور حضور ﷺ کو حاضر و ناظر بھی مانتے ہیں۔

مجھ سے کسی نے ایک دن مسئلہ پوچھا کہ جی ہم جو لاؤڈ سپیکر پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے

ہیں، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ تو میں نے اسے کہا کہ تمہارا گھر مسجد سے کتنی دُور ہے، آواز پہنچتی ہے؟ کہنے لگا جی پہنچتی ہے۔ تو میں نے کہا ایک دن مسجد کے سپیکر سے اپنے والدِ گرامی کو سلام بھیجنا اور مسجد میں زور زور سے کہنا کہ ابا جی! السلام علیکم، پانچ منٹ کہتے رہنا تمہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، ابا جی خود مسجد میں پہنچ جائیں گے اور تمہیں مسئلہ سمجھا دیں گے۔ تو اگر کسی والد کو بیٹا وہاں سے پکار کر کہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرے ساتھ گستاخی کر رہا ہے تو اس بارگاہِ عالی میں آپ اس بے تکلفی سے چلاتے ہیں، ایک ایسی ادب گاہ جو عرش سے نازک تر ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید ابوبکرؓ و عمرؓ اینجا

یہ دربار آسمان کے نیچے ہے لیکن اس کا معاملہ عرشِ عظیم سے نازک تر ہے۔

شاعر نے تو کہا تھا "جنید و بایزید اینجا" لیکن میں اس میں تصرف کیا کرتا ہوں کہ

نفس گم کردہ می آید ابوبکرؓ و عمرؓ اینجا

وہ ہستیاں جنہوں نے عالمِ کفر پہ لرزہ طاری کر دیا، جب اس بارگاہ ﷺ کا رخ کرتی ہیں تو ان کے چہرے سے پسینہ چھوٹ جاتا ہے، رنگت سفید پڑ جاتی ہے، آواز نہیں نکلتی۔ وہ بارگاہ ایسی ہے کہ عشق کے جذبے بھی وہاں بے لگام نہیں ہو سکتے، وہاں کوئی رانجھا نہیں بن سکتا، کوئی مجنوں نہیں بن سکتا۔ وہاں عشق و محبت بھی حدود و قیود کے پابند ہیں، ادب و آداب کے محتاج ہیں۔

اللہ کریم کی بارگاہ میں رابطے کا ایک ہی ذریعہ ہے، محمد رسول اللہ ﷺ۔ وہ ہستی کتنی عظیم ہے۔ اگر زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ ہو جس میں بندہ آپ ﷺ پر درود و سلام نہ بھیج رہا ہو تو بھی زندگی کم پڑ جائے گی اور صلوٰۃ و سلام کا حق ادا نہ ہو گا لیکن وہاں صلوٰۃ و سلام بھیجنے کا بھی ایک ادب ہے۔ روضہ اطہر ﷺ کے ساتھ گلی تھی۔ گلی کے اُس پار ایک گھر تھا اس میں

ایک خاتون اپنی دیوار میں ایک کیل ٹھونکنے لگی۔ کوئی چیز لٹکانی ہوگی، کچھ ضرورت ہوگی۔ ٹھک ٹھک کی آواز آئی، سیّدہ عائشہ صدیقہ ام المومنین نے انہیں فوراً پیغام بھیجا اور آپؓ کے الفاظ یہ تھے لاتؤذو رسول اللہ ﷺ کہ نبی کریم ﷺ کو پریشان نہ کرو۔ بارگاہِ نبوت کا اپنا ادب ہے، ایک احساس ہے اور مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ مسجد نبوی کی توسیع ہو رہی تھی، بہت بھاری مشینری کام کر رہی تھی، ستونوں کا کام ہو رہا تھا، سترفٹ نیچے تک بنیاد تھی۔ کرینوں کے ساتھ ستونوں کو باندھے، پورا مدینہ منورہ مشینری اور تعمیر کے شور سے گونج رہا تھا لیکن ہم جیسے ہی مسجد نبوی کے دروازے پر جاتے تو اندر قدم رکھتے ہی بھول جاتا کہ باہر کوئی شور بھی ہے۔ اللہ گواہ ہے، میں منبر پر بیٹھا ہوں اور قرآنِ حکیم میرے سامنے کھلا ہے۔ یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ کہیں شور بھی ہے، سنائی دینا تو دور کی بات ہے خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ جب مسجد نبوی سے باہر آتے تو پھر اس شور سے سابقہ پڑتا۔ یہ اللہ رب العالمین کا اپنا نظام ہے۔ یہ ادب ہے بارگاہ نبوی ﷺ کا کہ شور کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ جس قادرِ مطلق نے اس شور کو روک رکھا تھا، یہ شور جو آپ سپیکروں پر کرتے ہیں وہ ایسے ہی جانے دے گا؟

درود شریف

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (الاحزاب:56)

سب سے بڑی اور پہلی بات آپ ﷺ کے مقام و مرتبے کے مطابق احترامِ نبوت ﷺ ہے۔ صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی کوشش کرو، مزے لے لے کر پڑھو، اپنے دل میں پڑھو، بیٹھ کر پڑھو، اللہ نے آپ ﷺ کو جو طاقت دی ہے وہ اس سے سنیں گے، اللہ وہاں تک بات پہنچائے گا۔ اللہ نے ایسے فرشتے مقرر کر دیئے ہیں کہ جہاں کوئی درود پڑھتا ہے وہ لے لیتے ہیں، اسے جنت کے خوبصورت ریشمی لفافوں میں، غلافوں میں اور خوبصورت ٹرے میں رکھ کر باادب جا کر پیش کرتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ یہ فلاں جگہ سے، فلاں نام

کے بندے نے، فلاں کے بیٹے نے پیش کیا ہے۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ درود اس طرح پڑھو کہ ایک فرشتہ لے کر نکلے، پیچھے دوسرا، اس کے پیچھے تیسرا تاکہ تم سے لے کر روضہ اطہر ﷺ تک ایک قطار بن جائے۔ صرف اس ایک بات سے اندازہ کر لیجیے کہ درود شریف پڑھنے والے کا کتنا مقام ہے کہ وہ خود وہاں نہیں ہے پر اس کا ذکر تو وہاں ہوتا ہے۔ اور کسی کا ذکر بارگاہِ عالی ﷺ میں ہو، اس سے بڑا مقام اس دنیا میں اس کے لئے اور کیا ہے۔ جو اللہ کے بندے مسلسل درود پڑھتے ہیں، دنیا کے کسی حصے یا زمین کے کسی خطے میں بیٹھے ہیں تو وہاں سے لے کر روضہ اطہر ﷺ تک فرشتوں کی قطار بن جاتی ہے۔ پڑھو بھئی! درود سے کون منع کرتا ہے۔ درود تو ہر مرض کا علاج ہے۔

مجھ سے جب کوئی خط لکھ کر پوچھے یا زبانی پوچھے تو میں یہی کہتا ہوں کہ ذکر، نماز اور فرائض کے علاوہ درود شریف پڑھا کرو۔ اس سے بڑا کوئی وظیفہ ہے ہی نہیں۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے، ہر وقت درود پڑھتے رہو۔ رحمتِ الٰہی سے ایک رابطہ رہے گا، ہر مصیبت سے تحفظ رہے گا، قبر کے اندھیروں میں روشنی ہوگی، منکر نکیر کے سوالوں کا جواب دینے کی ہمت پیدا ہوگی، دوزخ سے بچائے گا، جنت کا راستہ دکھائے گا، دنیا میں دُنیوی مصیبتوں سے ڈھال ہے، گھر میں برکت ہوگی، کاروبار میں برکت ہوگی، خاندان میں برکت ہوگی۔ لیکن ادب سے پڑھو، یقین اور لذت سے پڑھو جو درود کا خاصہ ہے۔

راحت ایک قلبی کیفیت کا نام ہے، دکھ ایک قلبی کیفیت اور احساس کا نام ہے۔ ایسے خوش نصیب جو شب و روز درود شریف پڑھتے رہتے ہیں، ان پر بظاہر دکھ بھی آ جائے، اللہ کریم انہیں قوتِ برداشت بھی دے دیتا ہے اور ان کا دل اس دکھ کو محسوس نہیں کرتا، دل پر سکون ہوتا ہے۔ وہ سینے، وہ دل جو درود شریف سے روشن رہتے ہیں، وہ زبانیں جو درود شریف سے تر رہتی ہیں، وہ آنکھیں جو عشق میں روتی ہیں، وہ آنکھیں جو وصالِ

ایک خاتون اپنی دیوار میں ایک کیل ٹھونکنے لگی۔ کوئی چیز لٹکانی ہوگی، کچھ ضرورت ہوگی۔ ٹھک ٹھک کی آواز آئی، سیّدہ عائشہ صدیقہؓ ام المومنین نے انہیں فوراً پیغام بھیجا اور آپؓ کے الفاظ یہ تھے لاتؤذو رسول اللہ ﷺ کہ نبی کریم ﷺ کو پریشان نہ کرو۔ بارگاہِ نبوت کا اپنا ادب ہے، ایک احساس ہے اور مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ مسجدِ نبوی کی توسیع ہو رہی تھی، بہت بھاری مشینری کام کر رہی تھی، ستونوں کا کام ہو رہا تھا، سترفٹ نیچے تک بنیاد تھی۔ کرینوں کے ساتھ ستونوں کو باندھے، پورا مدینہ منورہ مشینری اور تعمیر کے شور سے گونج رہا تھا لیکن ہم جیسے ہی مسجد نبوی کے دروازے پر جاتے تو اندر قدم رکھتے ہی بھول جاتا کہ باہر کوئی شور بھی ہے۔ اللہ گواہ ہے، میں منبر پر بیٹھا ہوں اور قرآنِ حکیم میرے سامنے کھلا ہے۔ یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ کہیں شور بھی ہے، سنائی دینا تو دور کی بات ہے خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ جب مسجد نبوی سے باہر آتے تو پھر اس شور سے سابقہ پڑتا۔ یہ اللہ رب العالمین کا اپنا نظام ہے۔ یہ ادب ہے بارگاہ نبوی ﷺ کا کہ شور کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ جس قادرِ مطلق نے اس شور کو روک رکھا تھا، یہ شور جو آپ سپیکروں پر کرتے ہیں وہ ایسے ہی جانے دے گا؟

درود شریف

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (الاحزاب:56)

سب سے بڑی اور پہلی بات آپ ﷺ کے مقام و مرتبے کے مطابق احترامِ نبوت ﷺ ہے۔ صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی کوشش کرو، مزے لے لے کر پڑھو، اپنے دل میں پڑھو، بیٹھ کر پڑھو، اللہ نے آپ ﷺ کو جو طاقت دی ہے وہ اس سے سنیں گے، اللہ وہاں تک بات پہنچائے گا۔ اللہ نے ایسے فرشتے مقرر کر دیئے ہیں کہ جہاں کوئی درود پڑھتا ہے وہ لے لیتے ہیں، اسے جنت کے خوبصورت ریشمی لفافوں میں، غلافوں میں اور خوبصورت ٹرے میں رکھ کر باادب جا کر پیش کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ فلاں جگہ سے، فلاں نام

کے بندے نے، فلاں کے بیٹے نے پیش کیا ہے۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ درود اس طرح پڑھو کہ ایک فرشتہ لے کر نکلے، پیچھے دوسرا، اس کے پیچھے تیسرا تاکہ تم سے لے کر روضہ اطہر ﷺ تک ایک قطار بن جائے۔ صرف اس ایک بات سے اندازہ کر لیجیے کہ درود شریف پڑھنے والے کا کتنا مقام ہے کہ وہ خود وہاں نہیں ہے پر اس کا ذکر تو وہاں ہوتا ہے۔ اور کسی کا ذکر بارگاہِ عالی ﷺ میں ہو، اس سے بڑا مقام اس دنیا میں اس کے لئے اور کیا ہے۔ جو اللہ کے بندے مسلسل درود پڑھتے ہیں، دنیا کے کسی حصے یا زمین کے کسی خطے میں بیٹھے ہیں تو وہاں سے لے کر روضہ اطہر ﷺ تک فرشتوں کی قطار بن جاتی ہے۔ پڑھو بھئی! درود سے کون منع کرتا ہے۔ درود تو ہر مرض کا علاج ہے۔

مجھ سے جب کوئی خط لکھ کر پوچھے یا زبانی پوچھے تو میں یہی کہتا ہوں کہ ذکر، نماز اور فرائض کے علاوہ درود شریف پڑھا کرو۔ اس سے بڑا کوئی وظیفہ ہے ہی نہیں۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے، ہر وقت درود پڑھتے رہو۔ رحمتِ الٰہی سے ایک رابطہ رہے گا، ہر مصیبت سے تحفظ رہے گا، قبر کے اندھیروں میں روشنی ہوگی، منکر نکیر کے سوالوں کا جواب دینے کی ہمت پیدا ہوگی، دوزخ سے بچائے گا، جنت کا راستہ دکھائے گا، دنیا میں دُنیوی مصیبتوں سے ڈھال ہے، گھر میں برکت ہوگی، کاروبار میں برکت ہوگی، خاندان میں برکت ہوگی۔ لیکن ادب سے پڑھو، یقین اور لذت سے پڑھو جو درود کا خاصہ ہے۔

راحت ایک قلبی کیفیت کا نام ہے، دکھ ایک قلبی کیفیت اور احساس کا نام ہے۔ ایسے خوش نصیب جو شب و روز درود شریف پڑھتے رہتے ہیں، ان پر بظاہر دکھ بھی آ جائے، اللہ کریم انہیں قوتِ برداشت بھی دے دیتا ہے اور ان کا دل اس دکھ کو محسوس نہیں کرتا، دل پرسکون ہوتا ہے۔ وہ سینے، وہ دل جو درود شریف سے روشن رہتے ہیں، وہ زبانیں جو درود شریف سے تر رہتی ہیں، وہ آنکھیں جو عشق میں روتی ہیں، وہ آنکھیں جو وصالِ

محمد رسول اللہ ﷺ کی طلبگار رہتی ہیں، ان دِلوں کو وہ سکون عطا کر دیا جاتا ہے کہ دُنیوی پریشانیاں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ اپنی زبان کو درود شریف سے مزیّن کر لیں پھر دنیا اور آخرت میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ مانگنے کی حاجت نہیں رہے گی۔ وہ قادر ہے اگر سارا جہان بھی بدامنی کی لپیٹ میں آ جائے تو جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اطاعت گزار ہے ،اس کے دل میں سکون ہی سکون ہوگا، اسے بدامنی متاثر نہیں کرے گی۔ اسی طرح جس طرح اللہ کریم نے آتشِ نمرود میں حضرت ابراہیمؑ کیلئے تحفظ فراہم کر دیا۔

نور کی حقیقت

نور بنیادی طور پر دو طرح کا ہے

1۔ ایک نور وہ ہے جو اللہ نے تخلیق فرمایا جو مخلوق ہے جیسے فرشتے نوری مخلوق ہیں۔ وہ نور بجائے خود مخلوق ہے۔

2۔ ایک وہ نور جو اللہ جل شانہٗ کا ہے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور:35) جو اللہ کی صفت ہے اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔

2A۔ ایک وہ جو اللہ کی ذات کی تجلی ہے، اس کی ذات کا نور ہے۔

2B۔ دوسرے اس کی صفات کے بے شمار نور ہیں۔ ہر صفتِ باری کا الگ طرح کا ایک نور ہے۔ رزاقیت کا الگ نور ہے، خالقیت کا الگ نور ہے، رحیمیت کا الگ نور ہے، قادر اور عزیز ہونے کا الگ ہے یعنی جتنے اوصاف ہیں اتنے انوارات ہیں۔

لیکن اگر ذاتی یا صفاتی تجلی ہو تو ہر شخص کی ذات پر وہ تجلی اس کی استعداد اور مقام و مرتبہ کے مطابق نازل ہوتی ہے۔ اگر عین ذات کی تجلی ہو تو وہ تجلی جو ولی پر آتی ہے وہ اس تجلی کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہو سکتی جو نبیؑ پہ آتی ہے۔ نبیؑ پہ بحیثیتِ نبیؑ آتی ہے، ولی پہ

بحیثیتِ ولی آتی ہے۔

نور و بشر کی حقیقت

حق یہ ہے کہ جب کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نور ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتا کہ حضور ﷺ اولادِ آدم سے نہیں ہیں معاذ اللہ، بلکہ اس سے یہ مراد ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں انوارات و برکاتِ الٰہی کے وہ خزانے ہیں کہ آپ ﷺ ساری کائنات میں روشنی کا سبب ہیں، ساری کائنات کی رہنمائی کا سبب ہیں۔ دل کی روشنی کا سبب ہیں، اللہ کی معرفت اور اس کی پہچان کا سبب ہیں۔ اللہ کریم کا بنایا ہوا وہ نور ہیں کہ کائنات اس نور کے سبب سے روشن ہے لیکن آپ ﷺ کی ذات عالیہ عالمِ انسانیت میں سے ہے اور حضرت آدمؑ کی اولاد میں سے ہے اور بشر بھی ایسے ہیں کہ کوئی دوسرا اُن جیسا نہیں۔ حضور ﷺ خیر البشر ہیں۔ بشریت میں وہ ہستی ہیں کہ جن کے جیسا کوئی دوسرا بشر ہو ہی نہیں سکتا۔

1۔ اس لیے بشریتِ پیغمبر ﷺ کا انکار بھی نبوت کا انکار ہے یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ حضور ﷺ بشر نہیں ہیں تو پھر اس نے نبوت کا انکار کر دیا کیونکہ نبوت تو صرف اولادِ آدمؑ کو، بشریت کو اور انسان کو ملی۔

2۔ اور اگر کوئی کہے کہ حضور ﷺ کی تخلیق ہی نور سے ہے تو پھر یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ

i) ایک نور اللہ کا ذاتی نور ہے اور اللہ کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں۔

ii) دوسرا نور جو مخلوق ہے اللہ کی تخلیق ہے، اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔

تو یہ بات اس طرح ماننا درست ہے کہ حضور ﷺ کی بشریت اس قدر روشن، اتنی منور اور اتنی لطیف ہے کہ تمام تخلیقات سے بلند ترین ہے اور آپ ﷺ کی بلندی و نعمتوں کے بارے میں کوئی سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہ معاملہ بہت ہی نازک ہے اور

بات بین بین ہے۔

3۔ اسی طرح اگر کوئی کہے کہ حضورﷺ اس طرح نور ہیں جس طرح فرشتے نور ہیں تو فرشتے تو حضورﷺ کے خادم ہیں اور فرشتوں کے سردار جبرائیل امینؑ شبِ معراج سدرۃ المنتہیٰ پر جا کر رک گئے اور اجازت چاہی کہ اس سے آگے میں نے ایک قدم بھی بڑھایا تو میرے پر جل جائیں گے، یہی میری حد ہے، آگے آپﷺ تشریف لے جائیں۔ سو فرشتہ جو نوری مخلوق ہے وہ تو راستے میں رہ گیا اور حضورﷺ اپنی بشریت کے ساتھ، وجودِ اطہرﷺ کے ساتھ آگے، جہاں تک اللہ نے چاہا تشریف لے گئے۔ وہ تجلیات جنہیں نورانی مخلوق برداشت نہ کر سکی، نبی کریمﷺ ان تجلیات کو وجودِ عالی میں لیے جہاں تک اللہ نے چاہا تشریف لے گئے۔ قرآن حکیم میں آپﷺ کی بشریت کی عظمت یوں بیان ہوئی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (النجم:17) آپﷺ نے جب تجلیاتِ باری دیکھیں تو آپﷺ کی نگاہ نہ بھٹکی، نہ حد سے بڑھی یعنی جس طرح مشاہدہ ہونا چاہیے تھا ویسا ہی مشاہدہ حضورﷺ نے فرمایا۔

تو جو لوگ حضورﷺ کی بشریت کا انکار کرتے ہیں وہ شاید اپنی بشریت پر قیاس کر کے آپﷺ کی بشریت کا انکار کر دیتے ہیں کہ وہ بھی بشر ہیں اور نبیﷺ بھی بشر۔ نبیؑ بھی بشر ہوتے ہیں، ان میں بشری خصوصیات ہوتی ہیں لیکن ان کی بشریت عام انسانوں جیسی بشریت نہیں ہوتی۔ اس فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔

انسانوں کی بشریت کے بارے قرآن حکیم میں آتا ہے اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ (الاعراف:179) کہ بداعمالیوں کے سبب انسانوں کی اکثریت حدِ بشریت سے گر کر، انسانی خصوصیات کھو کر، حیوانی صفات کی حامل ہو جاتی ہے اور انبیاءؑ بشریت کے اس کامل

درجے پر ہوتے ہیں کہ وہ معصوم عن الخطاء کہلاتے ہیں۔ عصمت صرف انبیاءؑ کی صفت ہے جو انہیں عام انسانوں سے ممیز کرتی ہے۔

تبرکات

ہمارے ہاں افراط و تفریط کا رویہ اختیار کرنا عادت بن چکا ہے۔ کچھ لوگوں نے اشیاء کو اتنا بے اثر سمجھا کہ ان کی تردید کر دی اور کچھ لوگوں نے انہیں اتنا مؤثر سمجھ لیا کہ شرک کی حد تک چلے گئے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ جو وجود بابرکت ہوتے ہیں، تجلیاتِ باری کے حامل ہوتے ہیں، ان کے وجود سے مس کرنے والی چیزوں میں اللہ کریم برکت پیدا فرما دیتے ہیں۔

☆ حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے کہا کہ میری قمیض لے جاؤ اور میرے والدِ گرامی کی آنکھوں پر پھیر دو تو وہ ان شاء اللہ درست ہو جائیں گی۔ یہیں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بزرگانِ دین کی استعمال شدہ چیزیں اور تبرکات بھی شفاء کی حامل ہوتی ہیں۔

☆ اللہ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہاری فتح کی دلیل یہ ہے کہ فرشتے تمہارے پاس حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے تبرکات لائیں گے۔ اس تابوتِ سکینہ میں کیا تھا؟ حضرت موسیٰؑ کے لاٹھی کے ٹکڑے تھے، ٹوٹی ہوئی تختیاں تھیں، استعمال شدہ لباس کے حصے تھے، پرانے جوتے تھے جو صدیوں سے کفار کے قبضے میں رہے اور جن کے بارے میں فرمایا کہ اللہ کے فرشتے انہیں لے کر آئیں گے، بنی اسرائیل کو دیں گے جس سے انہیں جالوت پر فتح حاصل ہو جائے گی۔ ان پرانے جوتوں، کپڑوں اور لاٹھی کے ٹکڑوں میں کیا رکھا ہے؟ فرمایا: یہ پرانے جوتے، پرانے کپڑے اور ٹوٹی ہوئی لاٹھی نہیں، یہ اللہ کے نبیؑ کی استعمال

شدہ چیزیں ہیں، انہیں اللہ کے نبیؐ نے مَس کیا ہوا ہے، چھوا ہوا ہے اور اللہ نے اتنا اہتمام کیا ہے کہ انہیں فرشتے اٹھا کر بنی اسرائیل تک پہنچائیں گے، جن کی برکت کے باعث انہیں فتح حاصل ہوگی کہ ان چیزوں کے ساتھ برکات وابستہ ہیں۔

تبرکات کا اثر

تبرکات کی اپنی ایک برکت، ایک اثر تو ہے لیکن ان سے اس طرح کی امیدیں وابستہ کر لینا جو ذاتِ باری کے ساتھ منسوب ہیں، وہ درست نہیں۔ تبرکات محض برکت کیلئے ہوتے ہیں، امور کا انجام دینا، دستِ باری میں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سواری کے جانور بھی جسے ملے اس نے بطورِ تبرک رکھے۔ ہتھیار، لباس، نعلین مبارک، موئے مبارک جو کچھ جس کو نصیب ہوا وہ بطور تبرک رہا اور ابھی تک حضور ﷺ کی استعمال شدہ بعض چیزیں یا آپ ﷺ کے خطوط مبارک محفوظ ہیں۔ اس طرح شیخ کی کوئی چیز اگر بطورِ تبرک رکھی جائے تو اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ برکت ہوتی ہے، اس میں حاجت روائی کی کوئی طاقت نہیں آجاتی۔

اصل میں ہمارے ہاں اعتدال نہیں رہا۔ ہم یا تو اس کا بالکل انکار کر دیتے ہیں یا اسی کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ دونوں طرف ہم انتہاء پہ چلے جاتے ہیں حالانکہ معاملہ بین بین ہے۔ اسلام درمیانی راستہ ہے، اعتدال کا راستہ ہے۔ تبرکات کی پوجا درست نہیں، برکت کیلئے رکھنے میں کوئی حرج نہیں اور اللہ کریم اس میں برکت دیتے بھی ہیں۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ پورے عرب شریف میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یادگاریں چپے چپے پہ ثبت تھیں اور ترکوں نے محفوظ رکھی تھیں۔ بہت سے آثار تھے حضورِ اکرم ﷺ کے جو مٹا دیئے گئے۔ اس میں انتہا پسندی کا ہی دخل ہے۔ ایک انتہا پسند تو وہ تھے جنہوں نے وہاں سجدے دینے شروع کر دیئے اور پوجا کا طریقہ بنا لیا اور دوسرے وہ

تھے جنہوں نے انہیں محفوظ کرنے کی بجائے مٹا ہی دیا کہ یہ شرک ہو گیا، کفر ہو گیا۔ بھئی! شرک ہو گیا تو شرک کرنے والے کے شرک کو روکو، آثار کو مٹا دینا تو کوئی اچھی بات نہیں۔

تبرکات کا رکھنا اچھی بات ہے، تبرکات کے حوالے سے دعا کرنا درست ہے لیکن دعا اللہ سے کی جائے گی۔ یہ کہنا کہ اس کی وساطت سے میری دعا قبول فرمالے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کا اثر بھی ہے، برکت بھی ہوتی ہے۔

علمِ غیب کی حقیقت

علمِ غیب کی تعریف یہ ہے کہ جس کے جاننے کے لئے درمیان میں کوئی واسطہ نہ ہو۔ نہ نظر، نہ عقل، نہ خبر۔ کوئی ذریعہ، واسطہ درمیان میں نہ ہو، بغیر کسی واسطے کے جانا جائے، وہ علم، علمِ غیب ہوتا ہے اور وہ خاصہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ یعنی وہ بغیر کسی ذریعے، بغیر کسی واسطے، بغیر کسی سبب کے ہر چیز کو، ہر وقت، ہر آن جانتا ہے، وہ عالم الغیب ہے۔

انبیاءؑ کو جو غیب کا علم ہوتا ہے وہ غیب نہیں ہوتا اس لئے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے بتانے سے پتہ چلتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں وہ اطلاع عن الغیب، یعنی غیب پر مطلع فرما دینا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء (آلِ عمران:179) جب قاصد حضرت یوسفؑ کی قمیض لے کر مصر سے نکلا تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا جو قرآن میں مذکور ہے اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ (یوسف: 94) مجھے آج یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔ یہاں پہنچ کر ایک سوال اٹھتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے قریب ہی کنعان میں حضرت یوسفؑ (کنویں میں) پڑے رہے اور حضرت یعقوبؑ کو خوشبو نہ پہنچی اور اتنی دور مصر سے کرتہ چلا اور حضرت یعقوبؑ کو خوشبو آ گئی۔ اس بات کو بڑے خوبصورت انداز میں کہا گیا ہے۔

زمصرش بوئے پیراھن شمیدی　　چرا در چاہ کنعانش ندیدی

کسے پرسید آں گم کردہ فرزندہ　　کہ اے روشن گہر پیر خردمند

کسی نے اللہ کے اس نبیؑ سے جس کا بیٹا گم ہو گیا تھا پوچھا کہ آپؑ تو اللہ کے نبی ہیں، ہیرے کی طرح روشن دل رکھتے ہیں، دانا اور بزرگ ہیں، مصر سے پیراھن نکلا اور آپؑ نے کنعان میں خوشبو پالی، کنعان ہی کے کنوئیں میں یوسفؑ پڑے رہے تو آپؑ کو خوشبو نہیں آئی، آپؑ نے فرمایا

بگفت حال ما برق جہاں است

دمِ پیدا دمِ دیگر نہاں است

یعنی وہ کہنے لگے کہ اللہ کی طرف سے ہمارا حال یہ ہے کہ جیسے بجلی چمکتی ہے تو ساری کائنات کو روشن کر دیتی ہے۔ اگر اللہ منکشف کر دے تو ساری کائنات کھول کر رکھ دے جیسے بجلی چمکتی ہے تو آسمان و زمین روشن ہو جاتے ہیں، آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اتنی روشنی ہوتی ہے کہ قریب و دور ہر چیز نظر آتی ہے اور دوسرے ہی لمحے کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ ایک لمحہ آتا ہے کہ عرشِ علیٰ تک دیکھتے ہیں اور دوسرے لمحے میں اپنے پاؤں کی پشت بھی نظر نہیں آتی۔ یعنی اللہ جو چاہے دکھائے وہ دیکھ لیتے ہیں اور جو وہ نہیں دکھاتا ہم سے گم رہتا ہے کہ قدرتِ کاملہ تو اسی کے پاس ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ کے واقعے میں قرآنِ حکیم میں ملتا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (الانعام:75) ہم نے ابراہیمؑ کو زمین اور آسمانوں کی بادشاہت کھول کر دکھا دی۔ دوسرے لمحے یہ چھوٹی سی بات نہیں بتائی کہ آپؑ کی بند آنکھوں کے نیچے آپؑ کے ہاتھوں کون ذبح ہو رہا ہے۔ اپنے اس محبوب، اس خلیل کو غم نہیں ہونے دیا۔ یہ اس کے اپنے

علوم ہیں جتنا چاہے عطا کر دے، جو چیز نہ بتانا چاہے نہ بتائے۔ یہ اس کی ذات ہے جو ہمہ جہت ہے، ہر بات، ہر وقت، ہر شے جانتی ہے۔ جبکہ اللہ کے بندے بحساب جانتے ہیں۔ اتنا جانتے ہیں جتنا اللہ انہیں بتاتا ہے۔

اللہ کریم انبیاء علیہم السلام کو ضرورت کے مطابق مطلع فرماتے ہیں۔ انبیاؑ کو جب من جانب اللہ اطلاع دی جاتی ہے تو اسے اطلاع عن الغیب کہتے ہیں وہ علم غیب نہیں ہوتا۔ غیب وہ ہوتا ہے جو کسی بھی ذریعے سے پتہ نہ چلے، خود ذاتی طور پر پتہ ہو اور یہ جاننا صرف اللہ کی خصوصیت ہے۔ اللہ کو کسی کی احتیاج نہیں کہ کسی کے بتانے سے جانے گا۔ وہ عالم الغیب ہے، وہ ذاتی طور پر جانتا ہے، جو ہو چکا وہ بھی جانتا ہے، جو ہو رہا ہے، وہ بھی جانتا ہے اور جو آئندہ ہوگا وہ بھی جانتا ہے۔ اللہ کے علوم میں ماضی، حال اور مستقبل نہیں ہے۔ اللہ کا علم حضوری ہے، غیب بھی اس کے سامنے حاضر ہے۔ جس قدر علوم ذاتِ باری سے مخلوق میں تقسیم فرمائے گئے وہ سارے بھی جمع کر لیے جائیں تو وہ تمام علوم اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں بنتے جو علوم نبی کریم ﷺ کو عطا ہوئے۔ آپ ﷺ کے علوم سے انبیاء و رسلؑ نے بھی استفادہ کیا اور پوری کائنات نے بھی۔

اگر اللہ کریم وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے بتانے کی ضرورت تھی کہ اللہ کے بتائے بغیر انبیاءؑ کو بھی پتہ نہیں چل سکتا۔ نبی کریم ﷺ وہ اولین و آخرین ہستی ہیں کہ جنہیں سب سے زیادہ علوم عطا ہوئے اور جب انہیں بھی اللہ کریم کے بتانے سے خبر ہوئی تو پھر شیخ اور پیر کی کیا حیثیت ہے؟ شیخ اور پیر تو بارگاہِ نبوت ﷺ کا ادنیٰ سا خادم ہوتا ہے وہ کیسے اللہ اور اللہ کے بندوں کے تعلق کو جان سکتا ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ شیخ اور پیر بارگاہِ نبوت ﷺ کے امانت دار بن کر، بارگاہِ نبوت ﷺ کے خادم بن کر اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے بندوں کو یقین و ایمان کی وہ کیفیات عطا کرتے ہیں جو

سینہ اطہر رسول اللہ ﷺ سے سینہ بہ سینہ پھیلتی ہیں اور بندوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ اصلاح احوال کیلئے بندوں کے بارے اللہ کریم خود جب چاہے اور جتنا چاہے اپنے نبی ﷺ پر منکشف کردے یا کسی ولی کو اس کے حال سے جب چاہے اور جتنا چاہے باخبر کردے۔

اولیاء اللہ کو جو اطلاع عن الغیب نصیب ہوتی ہے وہ باتباع نبوت، کمالاتِ نبوت میں سے ہوتی ہے۔ اتباع نبوت سے ان کا پَرتَو اس کی اپنی استعداد اور اس کی حیثیت کے مطابق ولی میں آتا ہے۔ تو جس طرح حقیقی، صحیح، درست اور مفصل علم نبیؑ کا ہوتا ہے، ولی کا علم اس درجہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر ولی کی بات نبیؑ کی بات کے مطابق ہے تو اس نے صحیح سمجھا، کہیں ٹکراتی ہے تو نبیؑ کی بات درست ہے اور ولی کو بات سمجھنے میں غلطی لگی۔ یہ علمِ غیب نہیں، یہ اطلاع عن الغیب ہے۔

لہذا علمِ غیب یعنی بغیر کسی کے بتائے جاننا یہ خاصۂ الٰہی ہے۔ انبیاء، صحابہؓ، صلحاء، اولیاء، اللہ کے بتانے سے جانتے ہیں تو جو بتانے سے جانا جائے وہ غیب نہیں ہوتا کیونکہ اس میں جاننے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تو انبیاؑ کے علوم اللہ کے عطا کردہ ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ علوم محمد رسول اللہ ﷺ کے ہیں جن کی کوئی حد، کوئی شمار نہیں اور جن پہ بحث کرنا گستاخی ہے اور ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ اللہ واحد ہے لاشریک ہے اور اللہ کے بعد کائنات میں بے مثل و بے مثال ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

انبیاؑ کو بہت امورِ غیبیہ عطا کئے گئے اور جتنے کائنات میں تقسیم ہوئے ان میں سب سے زیادہ نبی کریم ﷺ کو عطا ہوئے چونکہ نبی کریم ﷺ نبیوں کے بھی نبی اور امام ہیں۔ دنیا میں جو کچھ تقسیم ہوا، وہ کم ہے اور حضور اکرم ﷺ کے خزانے ان سے زیادہ ہیں۔ اللہ کی ذات سب سے بڑا غیب ہے۔ حضور ﷺ نے کائنات کو اللہ سے آشنا کردیا۔ فرشتے

غیب ہیں، حضور اکرم ﷺ نے فرشتوں کے متعلق سب کچھ بتادیا۔ جنت و دوزخ غائب ہے، لیکن حضورِ اکرم ﷺ نے ہر کلمہ گو کو اس کے بارے میں بتادیا۔ بے شمار امورِ غیبیہ ہیں جن پر عام آدمی کو بھی اطلاع دے دی گئی۔

علوم ظاہریہ کو جاننے کیلئے کچھ ذرائع لوگوں نے بنائے اس کے دو حصے ہیں۔

1۔ ایک حصہ تو یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو شیطان سے مصاحبت ہو جاتی ہے اور شیطان کچھ نہ کچھ باتیں ان کے دلوں میں ڈالتا رہتا ہے۔ قرآنِ کریم میں آتا ہے وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِھِمْ (الانعام:121) شیطان اپنے دوستوں سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے اس بندے کا کردار بھی شیطانی ہوگا، اس کا کھانا بھی حلال نہیں ہوگا، وہ بدکار بھی ہوگا۔ غلیظ بھی ہوگا۔

2۔ دوسرا حصہ ہے انسانوں کے ایجاد کردہ علوم: علمِ جفر، علمِ رمل، دست شناسی، چہرہ شناسی یہ سب اندازے ہیں، ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے علمِ طب یا میڈیکل سائنس۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ان علوم پر اگر کوئی یقین کرلے تو اس کا اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اگر بطور ایک فن کے جانتا ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ علمِ غیب نہیں ہے، یہ انسانی اندازے ہیں۔ یہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں، غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سے زندگی کی راہیں متعین نہیں کی جاسکتیں۔ یہ رواج ہندوؤں میں بہت تھا، سب حکمرانوں نے اپنے جوتشی رکھے ہوئے تھے۔ اللہ ہمیں معاف کرے، کافروں کی طرح مسلمان حکمران بھی ان ریلیوں، نجومیوں، جوتشیوں کے مشورے پر کام کرتے رہتے ہیں۔

جادو اور اس کا اثر

جادو، علمِ نجوم، دست شناسی، چہرہ شناسی، قیافہ شناسی وغیرہ یہ سارے فن اس

طرح سے ہیں جس طرح آپ کی میڈیکل سائنس۔ ایک طبیب نبض پر ہاتھ رکھ کر، اس کی رفتار سے بدن کی وہ ساری کیفیت بھانپ لیتے ہیں، اندازہ کر لیتے ہیں کہ خرابی کیا ہے، تکلیف کیا ہے، اس کی اصل کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟

جس طرح یہ اندازے ہیں، ٹھیک بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، اسی طرح ہاتھ دیکھنے والے کا اندازہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اس طرح نجومی جو ستاروں سے حساب کرتا ہے، اس کا اندازہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔

جادو ان شعبوں سے الگ ایک شعبہ ہے جس میں شیطانی دخل اور کفر شامل ہے۔ دست شناسی میں آدمی بدکاری یا برائی نہ بھی کرے تو اسے ایک فن کی حیثیت سے سیکھ سکتا ہے، علمِ نجوم کو بھی ایک فن کی حیثیت سے سیکھ سکتا ہے لیکن جادو متذکرہ علوم سے الگ ایک شعبہ ہے جس میں شیطان کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ اور جو شیطانی کلمات اِن کو سکھائے جاتے ہیں، اس سے بعض عجیب چیزیں ظہور میں آتی ہیں۔ جادو کے کلمات کفریہ کلمات ہوتے ہیں۔ یہ شیطان اپنے چیلے چانٹوں کو القاء کرتا ہے وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ (الانعام:121) وہ جب یہ کلمات دہراتے ہیں تو ممکن حد تک شیطان ان کی مدد کرتا ہے، خصوصاً کتے، خنزیر، سانپ پر اس کا اثر بہت چلتا ہے بلکہ اکثر جن اور شیاطین ان شکلوں میں متشکل ہو کر رہتے ہیں تو پھر وہ چیزیں اُن کی بات ماننا شروع کر دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام آدمی ایسے لوگوں سے متاثر ہوتا ہے اور ان کی بات مان کر گمراہ ہوتا ہے۔

نبی رحمت ﷺ پر بھی یہود کے جادو کا اثر ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک یہودی اور اس کی بیٹی نے حضور اکرم ﷺ پر جادو کر دیا، جس کے اثر سے آپ ﷺ کو شدید سر درد کی شکایت پیدا ہو گئی۔ اب یہ کہنا کہ جادو سے آپ ﷺ کو تکلیف کیوں ہوئی؟ یہ سمجھنا اسی طرح

سے آسان ہے کہ جس طرح اُحد میں زخم لگنے سے دندانِ مبارک شہید ہوئے، زخم لگنے سے رخسارِ مبارک زخمی ہوا، اسی طرح جادو کے اثر سے بھی ایذا پہنچی۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ انسانی دنیا میں، انسانی معاشرے میں جو چیزیں تمام انسانوں کو متاثر کرتی ہیں، انبیاءؑ کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ نبیؑ غیر نبی کی طرح متاثر ہو کر، غیر نبی کی طرح ان کی وجہ سے اپنے منصب سے یا اپنی راہ سے ہٹ نہیں جاتا بلکہ وہ چیزیں اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ جہاں تک اثر کا، ردِ عمل کا تعلق ہوتا ہے وہ نبی علیہ السلام کا اپنی شان کے مطابق ہوتا ہے، عام آدمی کا اپنی حیثیت کے مطابق، صحابیؓ کا اپنی شان کے مطابق، ایک ولی اللہ کا اپنی شان کے مطابق ہوتا ہے۔ جہاں تک کسی عمل کے مؤثر ہونے کا تعلق ہے تو انبیاءؑ شہید کیے گئے، زخمی کیے گئے، محبوس کیے گئے، جلاوطن کیے گئے تو انسانی زندگی کے پراسیس (process) سے نبیؑ بھی گزرتے ہیں۔ نبی رحمت ﷺ پر یہود کے جادو کا جو اثر ہوا، آپ ﷺ کو جو ایذا پہنچی، آپ ﷺ کی وہ تکلیف جو آپ ﷺ نے برداشت کی، اس کا حاصل ساری امت کو نصیب ہوا اور اللہ کریم نے معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) نازل فرما دیں جن کو پڑھنے سے جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت موسیٰؑ کے واقعے میں جادو کا ذکر ملتا ہے کہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن گئیں۔ وہ اصل میں سانپ نہیں بنی تھیں بلکہ لوگوں کو وہ سانپ دکھائی دینے لگیں۔ سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْھَبُوْھُمْ (الاعراف:116)۔ جادو میں شیطان اپنے پجاریوں کو بعض کفریہ کلمات سکھاتا ہے، کفریہ اعمال کرنے کیلئے اُن کی معاونت کرتا ہے تاکہ وہ کفریہ اعمال میں لگے رہیں لیکن جادو کے ذریعے قلبِ ماہیت نہیں ہو سکتی۔ قلبِ ماہیت سے مراد ہے کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی تخلیقات کو تبدیل کر کے کچھ اور بنا دینا۔

حضرت موسیٰؑ کے مقابل آنے والے جادوگروں کا طریقہ کار یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو مرعوب کیا، ڈرایا، ان کے دلوں میں اپنا رعب ڈالا۔ یعنی جو بندہ ڈر جاتا ہے، وہ ڈرانے والے کی ہر بات کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ لوگوں کی قوتِ بصارت پر جادو کر دیا۔ قلبِ ماہیت تو نہ ہوئی، رسیاں اصل میں سانپ نہیں بنیں بلکہ سانپ دکھائی دینے لگیں يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ:66) ان کی قوتِ متخیلہ کے ذریعے ان کی آنکھوں کو سانپ دکھائی دیئے۔ آج بھی جادو کا اثر اسی طرح ہوتا ہے اور انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو جادو سے ڈرتے ہیں اور جادو سے وہی ڈرتا ہے جس کے دِل سے اللہ کا ڈر نکل جاتا ہے۔

ذاتِ باری پر بھروسہ ہو تو کسی مخلوق کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ سامنے ٹھہر سکے۔ یہ ہماری اپنی کمزوری ہوتی ہے خواہ کسی فطری، طبعی کمزوری کے باعث کوئی بیماری لاحق ہو اور کوئی کہہ دے کہ یہ تو کسی نے جادو کر دیا ہے اور بندہ اس بات سے ڈر جائے تو اس پر جادو نہ بھی ہو تو وہ نفسیاتی طور پر جادو کا مریض ہو جاتا ہے۔ اگر جادو ہو بھی تو جتنا جادو کو قبول کیا جائے، اتنا ہی زیادہ وہ مؤثر ہوتا ہے وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ وہ اس جادو سے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، نہ شیطان کسی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ:102) ہاں یہ ہوتا ہے کہ جس شخص سے، جس جگہ سے، جس کام سے حفاظتِ الٰہیہ اٹھ جائے وہاں وہ اثر کرتا ہے۔ بعض خطائیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ ہو جائیں تو کسی نہ کسی جگہ سے حفاظتِ الٰہیہ اٹھ جاتی ہے۔ کاروبار سے اٹھ گئی، صحت سے اٹھ گئی، خانگی امور سے اٹھ گئی، جہاں سے اللہ کی حفاظت اٹھ جائے وہاں شیطان بھی اثر کرتا ہے اور شیطانی کلمات بھی اثر کرتے ہیں۔

جادو برحق ہے۔ غلط العام اصطلاح

کہا جاتا ہے کہ جادو برحق ہے، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جادو کا جو علاج نازل ہوا، وہ برحق ہے۔ جادو تو باطل ہے، کفر ہے، نجاست ہے، ظلم ہے، زیادتی ہے، شیطانی عمل ہے، برحق کیسے ہو گیا؟ برحق تو یہ ہے کہ کوئی جادوگر کسی کو پریشان کرتا ہے تو علاج کے لیے معوذتین موجود ہیں۔ علاج ہے، اللہ کریم نے نازل فرما دیا، حضور نبی اکرم ﷺ نے استعمال فرمایا۔ اور ہر مسلمان کو حق ہے کہ اگر کسی کو شبہ ہو گیا ہے کہ اس پر جادو ہو گیا تو اول و آخر درود شریف پڑھے اور معوذتین پڑھ کر پھونک مار دے، ان شاء اللہ جادو ختم ہو جائے گا۔

بندش

اگلے روز کسی کا خط تھا کہ جی میری روزی کسی نے بند کر دی ہے، میری اولاد نہیں ہوتی کسی نے بند کر دی ہے، میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ میں نے دو جملے اسے جواب میں لکھے کہ بھئی عقیدے کا فرق ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ روزی بھی اللہ دیتا ہے، اولاد بھی وہ دیتا ہے، صحت بھی وہ دیتا ہے۔ اگر وہ نہیں دیتا تو کوئی دے نہیں سکتا، وہ دیتا ہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ لوگ روک بھی دیتے ہیں، لوگ دلوا بھی دیتے ہیں، اس لئے میرا اور آپ کا بڑا فاصلہ ہے، میرے پاس آپ کا علاج نہیں ہے۔ کتنا فاصلہ ہے بنیادی عقیدہِ ایمان سے اس خیال کا۔ مجھے بتاؤ! کیا اسلام میں اس کی گنجائش ہے؟ میں نے یہی جواب لکھ دیا کہ ”میرے بھائی! تم کسی اپنے ہم خیال سے اس کا علاج دریافت کرو۔ میں چونکہ دوسرے طبقے کا آدمی ہوں، مجھے کیا پتہ، میرا تو سب کچھ اللہ کرتا ہے“۔ پتہ نہیں کیا سوچتے ہیں یہ لوگ۔

ایصالِ ثواب

کسی بھی نفلی عبادت جیسے صدقہ، نفلی حج، نفلی نماز، تلاوت، تسبیحات وغیرہ کا ثواب

کسی کو بھی، وہ زندہ ہے یا زندہ نہیں ہے، دیا جا سکتا ہے۔ ایصالِ ثواب کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نفل پڑھیں یا کوئی اور نفلی عبادت کریں، وہ آپ کا بیلنس ہے۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ یا اللہ! میرا یہ بیلنس میرے زندہ یا مُردہ عزیز کو منتقل کر دے۔ اللہ کریم اپنے فضل سے آپ کی عبادت قبول کر کے اس کا اجر و ثواب آپ کی طرف سے تحفۃً آپ کے عزیز کو پہنچا دیں گے۔

میرے بھائی! ایصالِ ثواب کا یہ سادہ سا طریقہ ہے، نہ کسی پیر صاحب کے پاس جانے کی ضرورت ہے اور نہ مولوی صاحب کے پاس۔ آپ کا اکاؤنٹ اللہ کے پاس ہے، آپ فرض ادا کرتے ہیں تو وہ آپ کی ذمہ داری ہے، فرض کسی کو تحفۃً نہیں دے سکتے۔ نفلی صدقات، نفلی روزے، نفلی حج، نفلی تسبیحات، تمام نفلی عبادتوں کا جو ثواب آپ کو ہو، وہ آپ کسی زندہ کو دینا چاہیں یا مُردہ کو تو آپ اللہ سے دعا کریں کہ یا اللہ! میرے اکاؤنٹ میں سے فلاں نیکی کا ثواب فلاں کو پہنچا دیں۔ وہ کر دے گا اور بات ختم۔

لیکن جن کے اکاؤنٹ ہوتے ہیں انہیں وہ بڑے عزیز ہوتے ہیں اور ہمارے پاس تو کچھ ہوتا نہیں، ہم ویسے ہی بخشتے رہتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ مرنے والوں کی نسبت ہم پر زندہ لوگوں کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ ماں باپ کی ذمہ داری ہے، بیوی کی ذمہ داری ہے، بچوں کی ذمہ داری ہے۔ ایصالِ ثواب درست ہے اور دنیا سے گزرنے والوں کیلئے دعا کرنا اور ایصالِ ثواب کرنا اچھی بات ہے لیکن ہماری نفسیات ایسی بن گئی ہے کہ بندے کے دنیا سے اٹھتے ہی اس کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اس کیلئے یہ کریں اور ایسے کریں اور وہی شخص جب زندہ ہوتا ہے تب کسی کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس کے افکار و کردار کا انجام کیا ہوگا؟ ہمارے ساتھ ہماری اولاد ہوتی ہے، ہمارے ماں باپ ہوتے ہیں، ہمارے ازواج ہوتے ہیں، رشتہ دار عزیز ہوتے ہیں اور زندگی بھر ہمیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ بیوی کیا کر رہی ہے، بیٹا کیا کر رہا ہے، اس کا انجام کیا ہوگا۔ والدین کیا کر رہے ہیں، ان کی عمر کیا ہے اور وہ کیا کر رہے ہیں؟ اسی اسی سال کے لوگ ہیں اور نماز روزہ نہیں کرتے، ان کی اولاد میں کوئی بھی انہیں پیار و محبت سے اس طرف نہیں لاتا۔ اگر کوئی کہتا بھی ہے تو جھڑک کر کہتا ہے "بابا نماز کیوں نہیں پڑھدا؟" وہ محبت جو مرنے کے بعد کی جاتی ہے وہ زندگی میں نہیں ہوتی۔ الٹا والدین کو جھڑکنے پر گناہگار ہوتے ہیں اور جب وہ بزرگ فوت ہو جاتے ہیں تو پھر انہیں بخشوانے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اس وقت حلوے مانڈے کھانے والے سامنے آ جاتے ہیں، جو کہتے ہیں اتنی رقم دو، اتنے بکرے ذبح کرو، یہ پکاؤ ہم ختم پڑھیں گے، ہمیں ہی سب کچھ دے دو تمہارا مردہ بخشا گیا۔ تو زندہ انسانوں پر محنت کریں اور بخشوانے کیلئے دنیا میں احکامِ الٰہی کی پابندی کروانے میں مدد کریں، انہیں سمجھائیں، انہیں ترغیب دلائیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا، آپ میری تمام عمر کی نیکیاں لے لیں اور غارِ ثور کی ایک رات کا اجر مجھے دے دیں۔ انہوں نے فرمایا یہ سودا میں نہیں کر سکتا۔ یہ جو دس دس لاکھ کلمہ شریف بخشتے ہیں ان سے اگر کہا جائے کہ دس روپے اس کیلئے خیرات کر دو تو وہ نہیں دیں گے۔ دس روپے دینے کیلئے تیار نہیں کلمہ دس لاکھ بخش دیں گے۔ پتہ ہوتا ہے کہ کبھی آدھا، کبھی پورا، کچھ پڑھا کچھ نہ پڑھا، تو مفت کا سودا ہے وہ دے دیا ہے۔ جسے پتہ ہو اس کی قیمت کیا ہے، ابوبکر صدیقؓ جیسا بھی کوئی غنی ہوگا انہوں نے تو ایک رات بھی فاروق اعظمؓ کو دینے سے انکار کر دیا کیوں کہ انہیں اس کی قیمت کا اندازہ تھا۔ دنیا کا تو سارا مال اٹھا کر دے دیا اور خالی رہ گئے، لباس میں بھی ایک کمبل تھا، کاٹ کر گلا بنایا اور کانٹے لگا کر بند کیا لیکن جب غارِ ثور کی ایک رات کی بات آئی تو تین راتوں میں سے ایک رات نہیں دی۔ ہمارے پاس اس طرح کی عبادات ہوتی ہیں دینے کے لیے کہ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ اگلا بھی عیش ہی کرے گا۔

میرے بھائی! اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی فکر زیادہ کریں تو ایصالِ ثواب میں تو کوئی شبہہ نہیں، اس میں کسی کو اختلاف بھی نہیں ہے۔ آپ جس طرح دولت کماتے ہیں اسی طرح ثواب بھی آپ کی دولت ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ کافر کو ایصالِ ثواب نہیں کر سکتے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی مغفرت کی دعا نہیں کر سکتے۔ زندگی میں کافر کے لیے بھی ہدایت کی دعا کی جاسکتی ہے جیسا کہ گناہگار مسلمان کیلئے توبہ کی دعا کی جاسکتی ہے۔

ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے اور اچھی بات ہے مرنے والوں کو کوئی تحفہ دیا جائے بلکہ اس موضوع پر، برزخ پر، آخرت پر شاہ ولی اللہؒ اور خاندان دہلوی کی کتابیں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مرنے والے تو منتظر رہتے ہیں۔ ایصالِ ثواب کرنا خود اپنے لیے بھی بڑا باعثِ برکت ہے کہ وہ ثواب جو اپنے بزرگوں کو یا جاننے والوں کو یا اہل اللہ کو یا اساتذہ کو یا عامۃ المسلمین کو بخشتا ہے تو یہ عمل اس کے اپنے لیے بھی بہت فائدہ مند ہے اور اللہ کریم قادر ہیں کہ پڑھنے کا شاید اسے اتنا ثواب نہ مل رہا ہو جتنا بخشنے کا مل جائے لیکن ان سب باتوں کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے یا نہیں۔ جو زندگی میں اپنے ذمے ہے وہ نہ کرے تو پھر دوسروں کیلئے بھی نہیں کر پائے گا، اگر کرے گا تو رسمی طور پر کرے گا۔ ہر چیز کی قیمت اس کے خلوص سے لگتی ہے۔ اسی طرح ثواب کے درجات بھی خلوص کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں کہ کتنے خلوص سے، کتنے درد سے اس نے کون سا عمل کیا ہے؟ ایصالِ ثواب درست ہے لیکن ایصالِ ثواب کرنے سے پہلے اپنے زندہ وجود کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اولاد اگر نیکی کرے تو از خود والدین کو ثواب پہنچتا رہتا ہے اور برائی کرے تو ان سے باز پرس بھی ہوتی ہے کہ کیا تم نے تربیت ٹھیک کی تھی؟

قبر میں عذاب وثواب اور دنیوی جھگڑے

میں ایک زمانے میں ڈھلوال سکول میں پڑھاتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ اس کے صحن میں دو قبریں تھیں۔ اس جگہ آبادی کم تھی اس لئے نمازی بھی کم ہوتے تھے لیکن ان میں بھی دیوبندی، بریلوی کا جھگڑا چلتا رہتا تھا۔ بریلوی رات کو ان قبروں پر دیئے جلاتے تھے اور دیوبندی انہیں منع کرتے رہتے تھے۔ اس جھگڑے سے تنگ آ کر ایک دن مجھ سے فیصلہ کروانے آ گئے۔ میں نے پوچھا، پہلے تو یہ بتاؤ کہ ان قبروں میں جو بزرگ ہیں وہ جنتی ہیں یا خدانخواستہ دوزخی ہیں۔ کہنے لگے، بندے، تو نیک ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ اگر قبر میں بندہ خدانخواستہ دوزخی ہو تو اس کی قبر تو ویسے ہی آگ سے بھری ہوگی، اس کے اوپر آگ جلانے کی کیا ضرورت ہے اور اگر بندہ جنتی ہے تو جس کی قبر میں جنت کا نور اور روشنی ہے تو اس پر دیئے جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس تیل کی ایک تو بدبو ہے دوسرا یہ دھواں دیتا ہے، تو اس کے پاس تو جنت کی خوشبو اور روشنی ہے۔ تم اگر دیا جلانا ہی چاہتے ہو تو مسجد کے اندر رکھ دو یا اتنا تیل کسی طالب علم کو دے دو یا کسی غریب کو دے دو، اس کے گھر روشنی ہو جائے گی تو صاحبِ قبر کو دونوں صورتوں میں دینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر وہ دونوں مطمئن ہو گئے۔

اجتہاد

اجتہاد بھی جہاد کی طرح جدوجہد سے مشتق ہے یعنی کسی بھی معاملے میں کوشش اور محنت۔ جس مسئلے کا حل یا جواب قرآن مجید میں براہ راست موجود نہ ہو، سنت میں موجود نہ ہو، پہلے فقہاء کی آراء میں موجود نہ ہو تو پھر اس فریم ورک (frame work) کو جو قرآن اور سنت کا ہے، اسے سامنے رکھ کر، اس کی حدود کے اندر رہ کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔

اجتہاد کا معنی یہ نہیں ہے کہ کوئی نیا فرقہ پیدا کیا جائے بلکہ اجتہاد اتفاق کا راستہ ہے کہ متقدمین کی آراء میں سے، ان کے فیصلوں میں سے، موجودہ عہد کے سوال کا کوئی حل تلاش کیا جائے جو موجودہ عہد میں قابلِ عمل ہو۔ لیکن قرآن وسنت اور سلف صالحین کے فریم ورک سے باہر نہ جائے۔

اجتہاد کون کرے؟ اجتہاد کا دروازہ کسی نے بند نہیں کیا ہے۔ لیکن اجتہاد مجتہد کرتا ہے اور مجتہد وہ ہوتا ہے جس کو عربی زبان پر بھی عبور ہو، عربی گرائمر، صرف ونحو پر بھی عبور ہو، احادیثِ مبارکہ پر عبور ہو، قرآنِ حکیم، اس کی تفسیر اور اس کے نزول اور اس کے احکام پر عبور ہو اور اس سارے عبور کے ساتھ اس میں یہ استعداد ہو کہ مسائل کا استنباط کر سکے، استخراج کر سکے یعنی کوئی مثال ڈھونڈ کر اس کو منطبق کر کے حکم حاصل کر سکے۔ اگر سارے علوم بھی آتے ہوں اور قوت استنباط نہ ہو تو وہ شخص اجتہاد نہیں کر سکتا۔

کیا موجودہ دور میں اجتہاد کی ضرورت ہے؟ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آج بھی اجتہاد ہو تو مولوی کیلئے بھی میدانِ عمل میں تھوڑی سی جگہ بنائیے۔ پہلے جب اجتہاد ہوتے تھے تو سارے مجتہدین میں سے آپ کوئی ایک دکھادیں جو میدانِ عمل میں نہیں تھا، سارے عملی زندگی میں موجود ہوتے تھے۔ اور ان علماء میں ایسے بھی تھے جن کی بین الاقوامی تجارتی کمپنیاں تھیں، ایسے بھی تھے جو مقامی طور پر تجارت کرتے تھے تو از خود اجتہاد ہوتا رہتا تھا۔ اب بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ جن بچوں کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ بین الاقوامی فورم پر بات کرتے ہیں آپ انہیں دین بھی پڑھائیں۔ پھر جب وہ میدانِ عمل میں آئیں گے تو از خود اجتہاد کی راہیں کھل جائیں گی۔ ان کے پاس صرف مسائل نہیں ہوں گے، انہیں پھر مسائل پر سوچنا بھی پڑے گا۔ ان کے پاس دُنیوی علم بھی ہوگا، ان کے سامنے قرآن و حدیث بھی ہوگی، سلف صالحین کی آراء بھی ہوں گی، فقہ بھی ہوگا تو وہ از خود اس میں سے

راستہ تلاش کریں گے۔

ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ یہاں اس طرح کی محنت نہیں کی جا رہی جو کی جانی چاہیے تھی اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہمارا دینی طبقہ موجودہ عہد کے سوالات کو جاننا چاہتا ہی نہیں۔ ابھی تک نہ کسی نے جاننے کی کوشش کی ہے اور نہ کوئی جاننا چاہتا ہے۔ وہ موجودہ عہد کے مسائل کو Face ہی نہیں کرتے۔ وہ اپنے خاص دائرہ کار سے باہر آتے ہی نہیں۔ جن لوگوں کے پاس دینی علم ہے۔ وہ میدانِ عمل میں آتے ہی نہیں اور جو عمل میں ہیں، ان میں کوئی مولوی نہیں ہے، ان میں میری طرح کے لوگ ہیں تو پھر اجتہاد کیسے ہو؟

آپ کسی بڑے سے بڑے عالم کا نام لیں، بتائیں کون سی تجارتی کمپنی ہے اس کی، کون سی ہوائی کمپنی میں اس نے حصے لے رکھے ہیں، کون سا اس نے کسی بس میں، کسی کمپنی میں حصہ ڈال رکھا ہے، اس کا کسی طرح کا کوئی بزنس ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی طرح ان کے بھی بحری جہاز لد لد کر باہر جائیں پھر انہیں پتہ چلے کہ اس ملک میں خرید وفروخت کا اصول کیا ہے، عہدِ نبوی ﷺ میں کیا تھا، صحابہؓ کے عہد میں کیا تھا، سلف صالحین کے عہد میں کیا تھا؟ اب اس میں کیا کیا پیچیدگیاں آ گئی ہیں اور اس کا جواب کس طرح تلاش کیا جائے تو از خود اجتہاد ہوتا رہے۔ جب وہ اس میدان میں آتے ہی نہیں، اس کی ضروریات سے بھی واقف نہیں ہوتے تو جب بھی ان سے کسی مسئلہ کا حل پوچھا جائے تو انہوں نے وہی چھ سات سو سال پہلے والا جواب ہی بتانا ہے۔ متقدمین کی آراء، ان کے فیصلوں کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ عہد کے سوال کا کوئی نیا حل بتائیں گے جو موجودہ عہد میں قابلِ عمل ہو تو وہی تو اجتہاد کہلائے گا۔

مسئلہ یہ ہے کہ آپ اِدھر بیٹھے ہیں، علماء اُدھر بیٹھے ہیں۔ آپ انہیں معاشرے

میں گھسنے نہیں دیتے۔ آپ بھی خوش ہیں کہ کام ہم کریں گے، پیسہ ہمارے پاس ہی رہے، حکومت ہماری ہی رہے، موج ہم کریں، یہ جنازے پڑھاتے رہیں۔ تو ہمارے طرزِ عمل نے اجتہاد کا راستہ روک رکھا ہے ورنہ کسی نے منع نہیں کیا۔

نئے مسائل کے حل کیلئے کیا کریں؟ آج بھی اگر کچھ ایسے معاملات پیش آتے ہیں جو طے شدہ نہیں ہیں۔ کوئی نئی صورتحال پیش آتی ہے تو علماء فیصلہ کرتے ہیں لیکن علماء ہمیشہ قرآن و حدیث کو، متقدمین کے طرزِ عمل کو، متقدمین کی آراء کو، ائمہ فقہ کی آراء کو، سب کو سامنے رکھ کر اس کا کوئی حل تلاش کرتے ہیں۔

تقلید

ایمانیات میں تقلید نہیں ہوتی۔ تقلیدی ایمان، ایمان نہیں ہوتا کہ فلاں مانتا ہے اس لیے میں بھی مانتا ہوں۔ بلکہ ایمان اس شے کا نام ہے کہ میں اس لیے مانتا ہوں کہ یہ بات حق ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ، صفاتِ باری تعالیٰ، ضروریاتِ دین، حضور ﷺ کی نبوت و رسالت، قرآن کا کتاب اللہ ہونا، جنت، دوزخ، آخرت، فرشتے اور تقدیر، یہ سب ایمانیات میں سے ہیں۔ یہ عقائد ہیں اور عقائد میں تو تقلید سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ تقلید فرع میں، احکامات کی تشریح میں، فقہی احکام میں اور مسائل میں ہوتی ہے۔ ہر بندہ مسائل نہیں سمجھتا تو اسے کسی نہ کسی سے سیکھنا پڑتے ہیں، پوچھنا پڑتے ہیں۔

فقہی احکام ائمہ اربعہؒ کی ذاتی رائے نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے عہد کے علماء کو جمع کر کے، ادارے بنا کر، ایک ایک مسئلے پر تحقیق کر کے، قرآن و حدیث اور متقدمین کی آراء کو سامنے رکھ کر، مسائل کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لے کر، اس کے بارے طے کیا۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ کا چالیس علماء کا بورڈ ہوتا تھا وہ بڑی بحث و تمحیص کے بعد، تحقیق کر کے کسی پیش آمدہ مسئلے پر رائے دیتے تھے اور اس فراخدلی سے کہ ائمہؒ اور ان کے شاگردوں کے

درمیان اگر اختلاف ہوتا تو اپنا اختلاف لکھتے کہ امام صاحب کی اس مسئلے میں یہ رائے ہے، ہماری یہ رائے ہے اور فلاں شاگرد کی یہ ہے۔

عجیب بات ہے کہ ان حضرات نے اتنی تحقیق کی کہ ان کے بعد صدیاں بیت گئیں کسی کو وہ تکلف نہ کرنا پڑا۔ یہ نہیں کہ امت میں ان کے بعد علماء نہیں آئے۔ بڑے بڑے فاضل علماء آئے اور بہت پائے کے لوگ آئے۔ ان میں صاحبِ حال اور صاحبِ کشف بھی آئے، علمی اعتبار سے بھی بہت بلند پایہ لوگ آئے۔ برصغیر ہی کو دیکھ لو، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسے لوگ مقلد ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ اپنے زمانے کے مانے ہوئے، چوٹی کے عالم تھے۔ عربی زبان پر بھی عبور تھا، قرآن حکیم کے اسرار و رموز بھی اللہ نے عطا فرمائے تھے، حدیثِ پاک کے اسرار و رموز بھی اللہ نے بخشے تھے، صرف و نحو، زبان دانی اور علمِ زبان و علمِ کلام پہ بھی عبور تھا۔ خود 'جذب القلوب' میں کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا میں نے بارگاہِ نبوی ﷺ میں گذارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! اللہ نے مجھے بڑے علوم عطا فرمائے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اجتہاد کر سکتا ہوں تو میں اپنے لیے اجتہاد کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے جواب میں ارشاد فرمایا گیا کہ غور کر کے دیکھ لو کہ ائمہ اربعہؒ نے کہیں کوئی کسر چھوڑی نہیں ہے۔ تمہیں کوئی ایسا مسئلہ نظر آتا ہو جس میں انہوں نے رہنمائی نہیں کی تو پھر تم اجتہاد کر لینا، ورنہ چاروں میں سے جو پسند آئے اس راستے کو اپنا لو۔

آج اسمبلی کے اراکین اور اس میں ہماری بہو بیٹیاں جو بیٹھی ہیں، ان کے علوم پتہ نہیں کتنے وسیع ہیں کہ وہ سب مجتہد بن بیٹھے ہیں۔ حالانکہ آج کوئی ہم جیسا نادان اٹھ کر معانی تراشنے لگے تو وہ درست نہیں ہوگا۔ جب ایک آیہ کریمہ نازل ہوتی اور بڑے بڑے اہلِ زبان خدمتِ عالی ﷺ میں شرفِ باریابی رکھے ہوئے ہوتے اور حضور ﷺ فرماتے کہ اس کا مفہوم جانتے ہو، معانی جانتے ہو؟ کوئی عربی دان اور بڑے سے بڑا ادیب یا فاضل یہ

نہیں کہتا تھا کہ مجھے یہ سمجھائی۔ سارے سر جھک جاتے اور عرض کرتے **اللہ و رسولہ اعلم** اس کے معانی انہ جانتا ہے، اللہ کا رسول ﷺ جانتے ہیں۔ آج دین پہ دیدہ دلیری کا جو عالم ہے وہ دراصل اللہ کی عظمت سے نا آشنائی ہے، مقامِ نبوت سے نا آشنائی ہے، منصبِ نبوت کی عظمت سے نا آشنائی ہے۔ لیکن اگر کوئی تقلید نہ کرنا چاہے تو کوئی جرم نہیں ہے، نہ کرے لیکن دینی امور پہ بحث کرتے وقت اس طرح کی تحقیق تو اس کے پاس ہو جس طرح کی ائمہؒ نے کی۔ ان کا علم و فضل تو ہو جتنا ان کا تھا۔ تو بہر حال ائمہ اربعہؒ بہت افضل ہیں اس لیے ان کی رائے پر تامل کرنا چاہیے۔

دین توارث سے آیا ہے، وراثتاً آیا ہے۔ اس میں کوئی نئی چیز نہ داخل کی جا سکتی ہے نہ نکالی جا سکتی ہے لہٰذا دین کے معاملے میں قرآن فہمی کے لئے، حدیثِ پاک کا مفہوم سمجھنے کیلئے، سلف صالحین کو دیکھنا پڑتا ہے، متقدمین کو دیکھنا پڑتا ہے، علماءِ حق کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر ان کو نہ دیکھا جائے تو علم آئے گا کہاں سے؟

یہ یاد رکھیے کہ ہم تقلید کو نہ فرض سمجھتے ہیں نہ ضروری سمجھتے ہیں لیکن ہماری رائے میں دین سمجھنے کیلئے ان لوگوں کی آراء کو ماننا، آج کے کسی بندے کی رائے کو ماننے سے بہر حال بہتر ہے۔ ان کا علمی پایہ، اس بات کا مستحق ہے، ان کا ورع تقویٰ اس بات کا مستحق ہے، ان کی پوری زندگی کی کاوشیں اور ایک دنیا کا ان کی رائے پر اعتبار اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ ان کی بات کو زیادہ وزن دیا جائے، بات مان لی جائے یا پھر اپنے اندر کوئی اتنا علم پیدا کرے کہ وہ خود اجتہاد کر سکے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

فرقہ بندی

پاکستان میں اکثریت اہلِ سنت والجماعت کی ہے۔ فرقے یہاں دو ہی ہیں ایک اہلِ سنت والجماعت اور دوسرے شیعہ حضرات۔ شیعت میں الوہیت سے، نبوت سے لے

کر کتاب تک، آخرت تک، نماز، کلمہ، روزہ اور سارے فقہی مسائل نکاح، طلاق، جنازہ، وضو ہر چیز اپنی بنالی گئی ہے۔ باقی یہ دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث یہ سارے اہلِ سنت ہیں اور ان میں لفظوں کی جنگ ہے، عمل کی نہیں۔ سب ایک سا ہی عمل کرتے ہیں۔ سب ایک ہی قرآن پڑھتے ہیں۔ فقہ کی کتابیں سارے مدارس میں ایک ہی ہیں اور جو لوگ اہلحدیث یا غیر مقلد کہلاتے ہیں جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ بھی وہیں سے مسئلہ لیتے ہیں۔ اور جہاں سے وہ (اہلحدیث) لیتے ہیں وہ انہی کے مقلد بن جاتے ہیں۔ کوئی دیوبندی کہلائے، بریلوی کہلائے یا اہلحدیث، قرآن و سنت سے تو نہیں بھاگ سکتے۔

آج ہم اپنی حالت پر غور کریں۔ عجیب بات ہے کہ ہماری تقسیم شیعہ، سنی سے شروع ہوئی پھر دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، مقلد، غیر مقلد وغیرہ۔ اب ہم اس بات پہ پہنچ گئے ہیں کہ ہر مسجد دوسری مسجد کے خلاف ہے یعنی ہم آتے آتے اس سطح پر آ گئے ہیں کہ جو اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتا ہم اسے مسلمان ماننے کو ہی تیار نہیں خواہ اگلی مسجد میں پڑھتا ہو۔ نتیجتاً ہم غلام ہو گئے اور کافر ہم پر مسلط ہو گئے۔

اگلے دن مجھ سے کوئی پوچھ رہا تھا کہ جی اختلاف تو شروع سے آ رہے ہیں، آخر ائمہ اربعہؒ میں بھی تو اختلاف ہے؟ میں نے کہا بھئی! آپ بھول رہے ہیں۔ ائمہ اربعہؒ میں کسی میں کوئی اختلاف نہیں، چاروں ایک ہیں۔ پوچھنے لگا پھر آپ ایک کو کیوں مانتے ہیں؟ میں نے کہا۔ میرے بھائی! دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک ہوتا ہے اصول اور ایک ہوتی ہے اس کی تشریح اور فرع۔ چاروں ائمہؒ کا فروعات کا اختلاف ہے، اصول کا کہیں بھی نہیں ملے گا اور اس اختلاف کو نبی کریم ﷺ نے باعثِ برکت قرار دیا ہے کہ یہ جو فروعات کا اختلاف ہے، یہ اللہ کی رحمت کا سبب ہے اس لیے کہ ایک حکم کے جتنے پہلو بنتے ہیں سب پر عمل ہو جاتا ہے۔ اختلاف تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سیدھا کافر کہہ دیتے ہیں۔ کوئی امام

دوسرے کی تکذیب نہیں کرتا، اسے غلط نہیں کہتا۔ ہمارا فرق ترجیح کا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دوسرے سے بہتر ہے اور بس۔

جب اصول کے اختلاف پر آئیں تو چند گنے چنے فرقے رہ جاتے ہیں اور فروعات کو اہمیت دیں تو پھر ہر گھر ایک نیا فرقہ بن جاتا ہے تو یہ کیوں روز ایک نیا فرقہ بن جاتا ہے؟ اس لیے کہ لوگ اپنی پسند پہ عمل کرتے ہیں اور مرکز سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بارگاہِ الوہیت میں آؤ، بارگاہِ رسالت ﷺ میں آؤ، اپنی پسند چھوڑ دو، حضور ﷺ کی پسند اپنالو، اختلاف ختم ہو جائے گا۔

اصل میں تو دال روٹی اپنی اپنی ہے۔ سب نے اپنے اپنے طبقے بانٹ رکھے ہیں کہ گڈمڈ ہو گئے تو چندے بند ہو جائیں گے۔ جھگڑے زیادہ اس پر ہوتے ہیں۔ دراصل مذہب کو ہم نے پیشہ بنا لیا ہے تو پیشے میں تو جھگڑے ہوتے ہیں۔ پیشے میں تو Competition ہوتا ہے۔ ہمارا قومی اور اجتماعی مسئلہ ہے کہ ہم نے مولوی کے لئے کوئی پروفیشن نہیں چھوڑا۔ ہمارا مولوی اور ہمارا پیر دو قابلِ احترام ہستیاں ہیں جن کا سوائے مسجد کے کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ اگر ہم انہیں روزگار مہیا کر سکیں تو مساجد میں جھگڑا ختم ہو جائے۔ یہ جو فقہ میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے، یہ اختلاف نہیں ہے اس میں بات وہی ہے کہ کسی نے کوئی ادا اپنائی ہے، کسی نے کوئی دوسری ادا اپنائی ہے، سب نے نبی کریم ﷺ کی ادائیں اپنائی ہیں۔

ہم فقہ حنفی کو کیوں سب سے اچھا سمجھ کر اپناتے ہیں؟ اس لیے کہ فقہِ حنفی میں کوشش کی گئی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی سب سے آخری جو ادا تھی وہ اپنائی جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی رفع یدین فرمایا۔ اگر اہل حدیث رفع یدین کرتے ہیں یا شافعی کرتے ہیں تو یہ بات نہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رفع یدین نہیں کیا، حضور ﷺ

سے رفع یدین ثابت ہے لیکن احناف کہتے ہیں کہ آخر میں حضور ﷺ صرف تکبیرِ اولیٰ پر رفع یدین کرتے تھے باقی تکبیروں پر نہیں کرتے تھے لہٰذا ہم اس کا اتباع کرتے ہیں کہ یہ زیادہ افضل ہے۔ صرف ترجیح کا اختلاف ہے وہ بھی صحیح ہے وہ غلط نہیں ہے۔ لہٰذا منہاجِ محمدی ﷺ کیلئے بھی آپ وہ آخری راستہ تلاش کریں جو صحابہؓ نے اختیار فرمایا۔

اختلافِ رائے اور دلوں میں رنجش

وہ خصوصیات جو اولادِ آدمؑ ہونے کی وجہ سے پوری انسانیت میں فطری طور پر اللہ نے پیدا فرما دیں وہ ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ انہی میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اختلافِ رائے ہو سکتا ہے اور نہایت پائے کے لوگوں میں جو متقی ہوں ان میں بھی ہو سکتا ہے۔ یہ رائے کا اختلاف دلوں میں رنجش بھی پیدا کر دیتا ہے اور بعض اوقات ایک دوسرے کے خلاف غم و غصے کے جذبات دل میں پیدا کر دیتا ہے اور یہ جذبات برزخ میں، میدانِ حشر میں، میزانِ عدل میں اور پل صراط تک بدستور جائیں گے۔ جب دخولِ جنت کا وقت آئے گا تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میں ان کے دلوں سے یہ رنجشیں، یہ کدورتیں مٹا دوں گا وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (الحجر:47) ان کے دل میں اگر کسی قسم کی کوئی رنجش بھی ہو گی تو دخولِ جنت سے پہلے صاف کر دی جائے گی اور سارے اہلِ جنت بھائی بھائی ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کے سامنے گاؤ تکیے کے سہارے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔

تو معمولی سی بات پر کسی سے اختلافِ رائے ہو اور فوراً اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے، یہ درست نہیں ہے۔ ہاں متقین میں جو اختلافِ رائے ہوتا ہے اس میں بددیانتی شامل نہیں ہوتی بلکہ نہایت دیانتداری سے اور خلوص کے ساتھ جس رائے کو وہ اقرب الی الثواب سمجھتے ہیں، زیادہ صحیح سمجھتے ہیں، ان میں کسی قسم کی رونمائی یا لڑائی یا اپنی

بات منوانے کا جذبہ یا کوئی بددیانتی وغیرہ نہیں ہوتی کیونکہ یہ ساری باتیں خلافِ تقویٰ ہیں۔ لیکن انسان ہوتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ نہایت خلوص کے ساتھ ایک انسان ایک بات کو ایک نگاہ سے دیکھے اور دوسرا اسی بات کو دوسری نگاہ سے دیکھے۔ لیکن کسی کو اختلافِ رائے کی بناء پر مسلمان ہی نہ سمجھنا یا اس کے خلاف توہین آمیز رویہ اختیار کرنا یا بزرگوں میں اگر اختلافِ رائے ہو جائے تو ان دو میں سے کسی ایک کو بھلا بُرا کہنا، تقاضائے انسانیت کے خلاف ہے۔

کوئی ایسی قوم جو اپنے اساتذہ کو، اپنے بنانے والوں کو، اپنے سمجھانے والوں کو قتل کرنے پر آجائے تو کیا اس کے پاس سکون و اطمینان کی طرح کی کوئی چیز باقی رہتی ہے؟ ہم ذلت کی اس حد کو پہنچ گئے ہیں کہ مساجد جو اللہ کا گھر تھیں، ان میں بھی اللہ کی مسجد کوئی خال خال ہی رہ گئی ہے۔ مساجد بھی لوگوں کی، فرقوں کی، جماعتوں کی، اشخاص کی ملکیت بن گئی ہیں کہ یہ فلاں کی ہے، یہ فلاں کی ہے۔ اور دوسرا فرقہ یا دوسرے فرقے کا کوئی بندہ جو اس سے متفق نہیں ہے وہ اس میں نہیں گھس سکتا اور بندوق بردار، پہرے دار نہ ہوں تو مسجد میں عبادت کرنا بھی ناممکن اور محال ہو گیا ہے۔ ہمارے پاس علاج کی گنجائش موجود ہے لیکن ہم معالجین کو ہی قتل کرنے کے درپے ہیں۔ ایک عالم کو ایک لمحے میں قتل تو کیا جا سکتا ہے لیکن شاید اس جیسا کوئی عالم صدیوں میں پیدا نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ جس قوم کا عالم یہ ہو کہ وہ جسمانی طبیبوں کو بھی گولی مارتی ہے اور روحانی طبیبوں کو بھی، اس کے پاس سکون نام کی چیز کہاں سے آئے گی۔

لفظ امام کی تشریح

آپ ہر اس شخص کو امام کہہ سکتے ہیں جو اپنے قریبی یا اپنے اردگرد کے لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کے آگے چل رہا ہے۔ اگر نیکی کی طرف رہنمائی کر رہا ہو تو نیکوں کا

امام ہے اور اگر برائی کی طرف رہنمائی کر رہا ہے تو بُروں کا امام ہے۔

امام کوئی شرعی اصطلاح نہیں ہے۔ جو اصطلاحات شریعت کی ہیں ان کا اپنا اپنا مزاج ہے۔ نبوت، شریعت کی اصطلاح ہے اور اس پر ایمان کا دارومدار ہے کہ نبیؐ کو نبیؐ نہ سمجھنے والا کافر ہے اور غیر نبی کو نبی ماننے والا کافر ہے لیکن امامت فی نفسہٖ کوئی منصب نہیں ہے جس طرح نبوت شرعی منصب ہے۔ اللہ نے فرعون اور اس کے ماننے والوں کو امام تو کہا ہے، نبی نہیں کہا کیونکہ نبی اصطلاحِ شریعت میں ایک ایسے رتبہ کا لفظ ہے کہ اللہ کے رسولوں پر بولا جاتا ہے۔

اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ میں نے فرعون کو بھی اور اس کے ماننے والوں کو بھی امام بنادیا وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً ۔(القصص: 41) امام بارالٰہا؟ یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۔(القصص: 41) دوزخ کی طرف دعوت دینے والا۔ ایسا بنادیا کہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر لوگ دوزخ میں گرتے ہیں، یہ لوگ ان کے پیشوا بن گئے۔ یعنی شریعت کی اصطلاح میں فرعون اور اس کے لشکری بھی امام ہیں اور وہ دوزخ کی طرف جانے والوں کے پیشرو ہیں۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں ایک جگہ آتا ہے فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ (التوبہ: 12) اور کفر کے اماموں سے جہاد کرو یعنی کافروں کے سرداروں سے، کافروں کے لیڈروں سے، کافروں کی قیادت سے حق کیلئے جہاد کرو۔

یہاں ایک بات بڑی صاف ہو گئی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہاں ملتا ہے، غالباً ان کی کتاب جذب القلوب میں کہ میں نے مدینہ منورہ میں مراقبہ کی حالت میں حضور اکرم ﷺ کے روضہ اطہر کے سامنے یہ بات پیش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ جو فرقہ ہے مسلمانوں میں شیعہ حضرات کا، کیا یہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہے، اہل حق ہیں یا اہلِ باطل؟ تو بارگاہِ نبوی ﷺ سے ارشاد ہوا کہ ان کا عقیدہ باطل ہے اور اس کے بطلان کی دلیل ان کا

عقیدۂ امامت ہے۔ یہاں اس باطل فرقہ کے ہاں امامت ہی مذہب کی بنیاد ہے۔ امام ان کے نزدیک ایک ایسا شخص ہے جو معصوم عن الخطا بھی ہو، صاحب وحی بھی ہو، صاحبِ شریعت بھی ہو اور اس کا حلال کردہ حلال قرار دیا جائے اور جس کو وہ حرام قرار دے، وہ حرام قرار دیا جائے تو گویا امامت کو انہوں نے نبوت سے افضل بتایا۔

اللہ نے انبیاءؑ کو بھی امام کہا ہے اور نیک لوگوں کو بھی امام کہا ہے۔ ہم شروع ہوتے ہیں امام الانبیا ﷺ سے، صحابہ کرامؓ کو بھی امام کہتے ہیں، پھر مفسرین میں سے جو زیادہ وسیع العلم ہیں ان کو مفسرین کا امام کہتے ہیں، محدثین میں جو سب زیادہ وسیع العلم ہے ان کو محدثین کا امام کہتے ہیں، فقہاء میں سے جو زیادہ فقیہہ ہے اسے فقہ کا امام کہتے ہیں حتیٰ کہ جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو جو شخص نماز پڑھانے کیلئے سامنے کھڑا ہوتا ہے اسے امام کہتے ہیں۔

یاد رکھیں! امام کیلئے شرط یہ ہے کہ صرف اپنے ساتھ والوں کا لیڈر ہو اور ان کے آگے ہو، مندر میں جو پروہت رہ رہا ہے، وہ بھی مندر والوں کا امام ہوتا ہے۔ امامت کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت اللہ نے مخصوص نہیں فرمائی۔

اللہ کیلئے لفظ 'خدا'

مجھے تو نہیں پتہ کہ یہ خدا کس زبان کا لفظ ہے۔ غالباً یہ کوئی پرانے پارسیوں کا، آتش پرستوں کا کوئی لفظ ہے۔ چونکہ خدا کے تصور کے ساتھ اس کی بیویوں کا تصور ہے۔ انگریزی میں خدا کو God کہتے ہیں، اس کی بیوی کو Godess کہتے ہیں۔ ہندی میں دیوتا، مہادیو کہتے ہیں اور اس کی بیوی کو دیوی کہتے ہیں۔ میں نے اس لفظ کی کبھی تحقیق کی ہے نہ اس سے کبھی سروکار رکھا ہے۔ میں اپنے بولنے، لکھنے، پڑھنے میں لفظ خدا سے اجتناب کرتا ہوں کہ لفظ خدا 'اللہ' کا تصور نہیں دیتا۔ اللہ کا اور کوئی معنی نہیں ہے، اللہ کا معنی

بھی اللہ ہے۔ یہ جو خدا ہم نے اللہ کا متبادل بنا لیا ہے، یہ غلط ہے۔ اللہ واحد ہے، لاشریک ہے۔ انگریزی میں ہم نے جو تفسیر لکھی ہے اس میں بھی ہم نے لفظ God نہیں لکھا، اللہ ہی لکھا ہے۔ اللہ کا کوئی ترجمہ نہیں، کوئی اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا بلکہ میں تو کوشش کرتا ہوں کسی کو خدا حافظ بھی نہ کہا جائے، اللہ حافظ کہا جائے۔

لفظ اللہ ایک ایسا انفرادی لفظ ہے کہ نہ اس کا کوئی تثنیہ ہے، نہ جمع ہے، نہ اس کا کوئی ترجمہ ہے۔ اللہ، اللہ ہی ہے، نہ اس کی کوئی مثل ہے نہ کوئی مثال ہے، اور لفظ خدا غلط العام ہو گیا ہے، لوگوں نے اس لفظ کو 'اللہ' کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے لیکن یہ عظمتِ الٰہی کا مظہر نہیں ہے۔ اس سے اللہ کی ذات و صفات کا اظہار نہیں ہوتا۔

جنگ اور جہاد میں فرق

بعثتِ محمد رسول اللہ ﷺ نے جنگ کا لفظ ہی ختم کر دیا، جنگ کا تصور ہی بدل دیا۔ جنگ ہوتی تھی مخالف کو تباہ کرنے کیلئے، اس کے وسائل تباہ کرنے کیلئے، اس کی عزت خاک میں ملانے کیلئے، اسے اتنا کمزور کرنے کیلئے کہ پھر سر نہ اٹھا سکے، کشتوں کے پشتے لگ جائیں، شہروں کے شہر جلا دو، کھیتیاں جلا دو، باغات تباہ کر دو، خزانے لوٹ لو، مال و دولت لوٹ لو، عزت و آبرو لوٹ لو اور انہیں رسوا کر کے چھوڑ دو۔

آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، میری بعثت کے بعد جنگ نہیں ہوگی، ظلم کو روکنے کیلئے جہاد ہوگا۔ جہاد اور جنگ آپس میں اتنے الگ تھلگ ہیں کہ جنگ اگلے کو تباہ کرنے کیلئے ہوتی ہے اور جہاد اگلے کو بھی ظلم سے بچانے کیلئے ہوتا ہے کہ ظالم کو بھی ظلم سے روک دیا جائے کہ وہ مزید ظلم نہ کرے۔ اگر ظالم بھی ظلم سے باز آ جائے تو اس پر تلوار نہیں چلائی جائے گی، آبادیاں تباہ نہیں کی جائیں گی، درخت نہیں جلائے جائیں گے، فصلیں نہیں اجاڑی جائیں گی، پانی پینے کے وسائل تباہ نہیں کئے جائیں گے، معبد تباہ نہیں کئے جائیں گے خواہ

ان میں کوئی بت پوجتا ہے، خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا اور مقابلہ صرف اس سے ہوگا جو میدان میں اترے گا۔ تو کتنا فاصلہ ہے جنگ اور جہاد میں۔

ہر غلطی تقدیر کے ذمے

شیطان سے جب غلطی ہوئی تو اس نے کہا کہ اے اللہ! تو نے مجھے گمراہ کیا، اگر تو چاہتا تو میں ضرور سجدہ کرتا۔ تیرا ہی منصوبہ یہ تھا کہ میں سجدہ نہ کروں۔ اس نے اپنی غلطی کو ذاتِ باری کے ذمہ لگایا اور آج بھی اکثر وہ لوگ جن کے دل میں عظمتِ الٰہی نہیں ہے، جو دردِ دل سے آشنا نہیں ہیں، ہر غلطی پر یہی کہتے ہیں کہ تقدیر میں یہی ہوگا، اللہ کو یہی منظور تھا۔ یہ وہ بات ہے جو شیطان نے پہلے دن کہی تھی۔ آج بھی اگر معاشرے میں دیکھیں تو جب کوئی کام درست ہو جائے تو آدمی اس کا ایوارڈ لیتا ہے کہ میں نے اس پر محنت کی، میں نے اس کو مشورہ دیا، میں نے اس میں مدد کی، یہ میری تجویز تھی اس لیے یہ کام درست ہوا۔ کام غلط ہو جائے تو کہتے ہیں اللہ کو یہی منظور تھا۔ کوئی ڈاکہ ڈالے، چوری کرے، قتل کر دے تو کہتے ہیں کہ اللہ کو یہی منظور تھا حالانکہ اللہ نے تو اس سے منع کیا تھا کہ ایسا مت کرنا۔ یہی کام شیطان نے کیا تھا جو قصور اس سے ہوا، اس نے کہا تو ہر چیز پہ قادر ہے، اگر تو چاہتا تو میں سجدہ کیسے نہ کرتا۔ تیری ہی مرضی تھی کہ یہ سجدہ نہ کرے۔

عقیدت میں غلو

انسانی مزاج میں کچھ کمزوریاں ہیں۔ بندہ کھرا ہونے کیلئے محنت کرے تو بعض اوقات سوچ کا زاویہ غلط ہونے سے مزاج الٹ بھی جاتے ہیں اور لوگ اسے ہی عبادت سمجھتے ہیں کہ فلاں وظیفہ پڑھیں، فلاں بزرگ کے پاس جائیں، فلاں سے دعا کروائیں، فلاں کی بات کو حتمی اور یقینی مانیں تو اٹکے ہوئے کام آسان ہو جائیں گے، مشکلات حل ہو جائیں گی، مصائب و پریشانیاں چھٹ جائیں گی۔ اس طرح لوگوں سے امیدیں وابستہ کر

لیتے ہیں پھر اس راستے پر چل نکلتے ہیں اور غیر اللہ کی پوجا تک چلے جاتے ہیں۔ دنیا میں جن کے بت بنائے گئے وہ بھی کبھی اللہ کے نیک اور مقبول بندے تھے، لوگوں کی پہلے ان سے عقیدت وارادت تھی، پھر وہ رفتہ رفتہ عبادت کے درجے تک پہنچ گئی، پھر انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا اور انہی بزرگوں کو بت بنالیا۔ عرب میں رائج مشہور بت یعوث، یعوق، نصر، یہ کبھی اللہ کے نیک بندوں کے نام تھے۔ نیک بندوں کو معبود کا درجہ دینے کی وجہ قرآن حکیم میں یوں آئی ہے وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر:3) اپنے اس عمل کیلئے یہ بڑا خوبصورت بہانہ بناتے ہیں کہ ہم ان بزرگوں کو اس مقام پر اس لئے رکھتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب پہنچا دیں گے۔ جب خلوص نہیں رہتا تو خواہشات رہ جاتی ہیں اور خواہشات کی تکمیل کیلئے چور دروازے ڈھونڈے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ سے اس لیے عقیدت ہے کہ یہ اللہ کے قریب پہنچا دے گا لیکن درحقیقت فلاں بزرگ سے اس لئے عقیدت ہوتی ہے کہ اس سے اغراض و مفادات کے پورا ہونے کی امید ہوتی ہے۔

یاد رکھیں! عالم اور پیر، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بات بتا سکتے ہیں اپنی منوا نہیں سکتے۔ جو شخص اپنی بات منوائے گا وہ پیر یا عالم نہیں، ڈاکو ہے، انسانوں کا ایمان ضائع کر دے گا۔

خالق کی شکایت مخلوق سے

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ تجھے اگر بیماری ہوگئی، ڈاکٹر سے بات کی تو درست، علاج کیلئے یہ ضروری ہے لیکن ہر آنے جانے والے سے تو کہے کہ میں مر گیا، مجھے بخار ہو گیا تو اس کا مطلب ہے کہ تو خالق کی شکایت مخلوق سے کر رہا ہے۔ تیری عمر اگر پچاس ساٹھ برس ہے اور تو نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میری صحت ٹھیک ہے، ساٹھ برس صحت سے

لطف اندوز ہوتا رہا کسی کو نہیں بتایا، بخار ہو گیا تو ہر بندے کو بتا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے تو خالق کی شکایت مخلوق سے کر رہا ہے۔ اور کیا ایسا ہوتا نہیں؟ کتنی نعمتیں ہوتی ہیں جن کا ہم شکر ادا نہیں کرتے لیکن ذرا سی تکلیف آتی ہے تو اللہ سے شکایت ہی نہیں، غیر اللہ سے امیدیں بھی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ فلاں کے پاؤں چوم لو، یہ ہو جائے گا۔ اللہ کا خوف کرو، کچھ نہیں ہو گا، سب مخلوق ہے۔ مخلوق، مخلوق کو کیا دے گی، گداگر، گداگر کو کیا دے گا؟ گداگروں کا بھی یہ طے شدہ اصول ہے کہ غریب سے غریب آدمی سے مانگ لیں گے لیکن گداگر کے سامنے کوئی دوسرا گداگر ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔ جو مانگنا ہے مانگو لیکن مالک سے مانگو، جو خود مانگنے نہیں جاتا اس سے مانگو۔ جو خود مانگ کے کھاتا ہے وہ کسی کو کیا دے گا؟ بھائی! اللہ اللہ کرنے کا مقصد ہی توحیدِ باری کو جاننا ہے، اپنے خالق کو پہچاننا ہے۔

اسلام اور مسلمان

اسلام۔ دینِ ھدیٰ

ھدیٰ کا معنی ہے کام کرنے کا صحیح ترین طریقہ، جیسے دو نقطوں کو آپس میں ملانا ہو تو بے شمار لکیریں لگائی جا سکتی ہیں لیکن ان بے شمار لکیروں میں سے ایک لکیر سب سے سیدھی ہو گی۔ یہ خطِ مستقیم ہو گا جو تمام لکیروں سے مختصر، سیدھا اور ایک ہو گا، باقی سب خطوط لمبے ہوں گے ٹیڑھے ہوں گے، مشکل ہوں گے اور بے شمار ہوں گے۔ اسی طرح صراطِ مستقیم کو ھدیٰ کہا گیا ہے۔ دینِ اسلام صراطِ مستقیم ہے جو زندگی گزارنے کا سیدھا، مختصر ترین، آسان ترین اور خوبصورت ترین طریقہ ہے۔ کسی کام کو کرنے کا جو بھی صحیح طریقہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔

ھوکہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

یعنی جو کچھ دانشور کرتا ہے، کرتا بیوقوف بھی وہی ہے لیکن بیوقوف بڑی خرابی کے بعد کرتا ہے۔ وہ بہت سی چیزیں ضائع کرنے کے بعد وہ کام کرتا ہے جو دانا شروع میں ہی کر لیتا ہے۔ دینِ اسلام یا طریقِ حیات جو رسول اللہ ﷺ نے دیا، یہ دانش ہے، دانائی ہے اس لیے قرآن نے اسے حکمت کہا ہے وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (آل عمران:164) کتاب تو قرآن کریم ہے، اس کی جو تشریحات حدیث شریف میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمائیں وہ حکمت ہے اور زندگی کا آسان ترین راستہ ہے۔

دینِ اسلام اور ادیانِ باطلہ کا تقابل

دینِ اسلام اور ادیانِ باطلہ کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ ہر دین، ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ یہ وظیفہ کرو تمہیں یہ فائدہ ہو گا، یہ رسم ادا کرو تمہیں یہ ملے گا، فلاں بت پہ یہ چیز چڑھاؤ

تمہیں یہ انعام ملے گا، فلاں کی یہ خدمت کرو تمہیں یہ نفع ہو جائے گا، فلاں جگہ ایسا کرو تمہیں یہ حاصل ہو جائے گا، اس دیوی کی پوجا کرو دولت ملے گی، اس دیوتا کو خوش کرو اولاد ملے گی اس کو راضی رکھو صحت ٹھیک رہے گی، اس تہوار پر یہ رسومات ادا کرو تو یہ کام ہو جاتا ہے۔ سارے کا سارا کام دنیا کیلئے ہوگا۔ یہ سب رسومات ہیں جنہیں دین کہا جا رہا ہے لیکن ان سب کا اور تمام ادیانِ باطلہ کا حاصل یہ ہے کہ کچھ کر کے اس سے زیادہ وصول کرو۔ ادیانِ باطلہ میں یہ ہے کہ کچھ رسومات مذہب کے نام پر ایجاد کر لی جاتی ہیں اور ان رسومات کے بجا لانے پر دنیوی انعامات یا مصیبتوں کے دور کرنے یا صحت وغیرہ کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ وہ ایک طبقہ جو مذہبی پیشوائی اختیار کرتا ہے وہ بہت سے دوسرے لوگوں پر اپنا تقدس جتا کر انہیں اپنی خدمت پہ لگا لیتا ہے لیکن وہ مذاہب باطلہ معاشرے کے افکار پر، سیاسیات پر، اندازِ حکمرانی پر، حکمرانوں پر کوئی گرفت نہیں کرتے بلکہ ان کا تعاون چاہتے ہیں اور خود اپنا تعاون انہیں پیش کرتے ہیں اور یوں دو طبقے وجود میں آ جاتے ہیں۔ ایک بادشاہ، حکومت، ریاست کا اور ایک مذہبی پیشوائی کا۔ عیسائیت میں بھی کلیسا الگ ہو گیا اور حکومت الگ ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کے معاون بن گئے اسی طرح یہودیت میں بھی ان کے مذہبی، پیشوا الگ ہو گئے، انہوں نے اپنی ریاست کے اندر ایک ریاست بنا لی لیکن ریاستی امور کے ساتھ کبھی ان کا ٹکراؤ نہیں ہوا بلکہ وہ اسے جواز مہیا کرتے رہتے ہیں۔

اسلام انسان کو دنیا و مافیہا سے بلند کر کے اللہ سے ملا دیتا ہے، اس لئے کہ اللہ، اللہ ہے اور اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ باقی سارے وجود نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لئے کہ اپنے زور پر، اپنی طاقت پر، اپنی قوت پر اللہ کے سوا کوئی دوسرا وجود قائم نہیں ہے۔ صرف وہ وجود آپ کو نظر آتے ہیں جن کو اللہ قائم رکھے ہوئے ہے اور جب وہ انہیں ہٹا لیتا ہے وہ مٹ جاتے ہیں۔

اسلام کی بنیاد اس پر ہے کہ تمہیں جو کچھ ملنا تھا وہ مل گیا۔ اللہ، اللہ کے نبی ﷺ پر ایمان لانے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ایمان مل گیا، اسلام مل گیا، اس کے بعد کوئی ایسی چیز نہیں جو رہ گئی ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے پاس کیا ہے اور تم کیا نچھاور کرتے ہو؟ تمہارے پاس تمہاری انا ہے، تو کیا تم اسے رکوع اور سجود میں نچھاور کرتے ہو؟ تمہارے پاس طاقت ہے، تو تم اسے اللہ کی راہ میں لگاتے ہو یا نہیں؟ اللہ نے تمہیں علم دیا ہے، تم اللہ کی راہ میں اسے خرچ کرتے ہو یا نہیں؟ تمہیں اللہ نے دُنیوی اقتدار دیا ہے، اس قوت کو تم اللہ کی راہ میں لگاتے ہو یا نہیں؟ ادیانِ باطلہ میں سوداگری ہے، اس کے مقابلے میں اسلام میں جو ملنا تھا وہ مل گیا اب دینے کی باری ہے اور یہی دینِ اسلام اور ادیانِ باطلہ کا بنیادی فرق ہے۔

دورِ حاضر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ انسانوں نے مختلف رسومات کو عبادت کا درجہ دے کر ان سے ضروریات کی تکمیل کو جوڑ دیا ہے۔ یہاں برصغیر میں ہندوؤں کے میل جول کے ساتھ بہت سی ہندوانہ رسمیں در آئیں اور اسلام کا روشن چہرہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور حصولِ دنیا، حصولِ زر، معاملاتِ دنیا کا حل دین کے نام پر شروع ہوتا چلا گیا۔

دینِ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے

دینِ اسلام کا جب ظہور ہوا تو اس میں دو بنیادی باتیں آ گئیں۔

1۔ ایک تو یہ کہ بیک وقت ساری انسانیت کیلئے ایک ہی دین قرار پایا، ایک ہی نبی ﷺ قرار پایا، ایک ہی رسول قرار پایا اور یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا۔ سوائے رب العالمین کے کوئی دوسرا اس طرح سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

2۔ دوسرا یہ کہ اسلام کے ظہور سے پہلے، نہ ہی اسلام کے ظہور کے بعد، دنیا کا کوئی

دانشور، کوئی ایسا قانون، کوئی ایسا ضابطہ دے سکتا ہے جو روئے زمین پر قابلِ عمل ہو۔ یہ بڑی عجیب بات ہے آج بھی اگر کوئی بندہ چاہے کہ ایسا ضابطہ دے جو ساری دنیا پر قابلِ عمل ہو تو وہ نہیں دے سکتا۔ آپ دیکھ لیجئے اب جمہوریت کا شور وغوغا ہے۔ ہر ملک کی جمہوریت الگ قسم کی ہے۔ کہیں بادشاہ ہے، کہیں ملکہ ہے، کہیں صدارتی نظام ہے، کہیں پارلیمانی نظام، کبھی وہ ایک طرح کا نہیں ہوا۔ سوشلزم، کمیونزم کا بڑا شور وغوغا رہا۔ جبکہ اسلام نے واقعی ایسے ضابطے دیئے جو چودہ صدیوں سے روئے زمین کے ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقے میں قابلِ عمل ہیں۔

اسلام کی عالمگیریت آپ ﷺ کا معجزہ ہے کہ آج سے سوا چودہ سو برس پہلے جو مکمل دستورِ حیات حضور اکرم ﷺ نے دیا وہ اپنی قوم کیلئے نہیں تھا، اہلِ عرب کیلئے نہیں تھا، کسی ایک نسل کیلئے نہیں تھا، کسی ایک خطے کیلئے نہیں تھا بلکہ روئے زمین پر بسنے والی تمام اولادِ آدم کیلئے تھا۔ سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ اہلِ مغرب کے بنائے ہوئے قوانین اہلِ مشرق کو راس نہیں آتے اور شمال کے لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین پر جنوب کے لوگوں کیلئے عمل ممکن نہیں۔ ایک ایسا دستورِ حیات ممکن نہیں جو موسموں کی تبدیلی، خوراک، افراد کی تبدیلی، ان کی سوچوں کی تبدیلی، ان کی رسومات کی تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر ہر جگہ، ہر قوم اور ہر ملک کیلئے یکساں قابلِ عمل ہو۔ یہاں گرمی ہے تو جنوب میں سردی ہے، یہاں شدید گرمی ہوگی تو وہاں برف باری شروع ہو جائے گی، لوگوں کے رنگ مختلف ہیں، نسلیں مختلف ہیں، غذائیں مختلف ہیں، سوچ کے انداز مختلف ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے جو دستور دیا وہ ایک ہے اور پوری زندگی کا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں جہاں، دنیا کے جس ملک نے دینِ اسلام قبول کیا، اس کے لئے اس پر عمل کرنا آسان تھا اور کوئی کمیٹی نہیں بنی جو اس میں تبدیلی کرے۔ صحابہ کرامؓ نے اس کی تشریح کی تو ائمہ کرامؒ نے بھی

انہی ارشاداتِ عالیہ کی تشریح اور وضاحت کی۔ دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل کیلئے ضرورت کے مطابق جواب اُنہی فرامین میں سے تلاش کیا جو محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائے تھے۔ کہیں باہر سے کوئی چیز نہ اس میں آسکتی ہے نہ اس سے کوئی چیز گھٹائی جاسکتی ہے۔

اسلام صرف توحیدِ باری، رسالتِ نبی کریم ﷺ، عبادات اور اخلاقِ حسنہ تک اگر بات ختم کر دیتا تو اہلِ مکہ کو بھی اس سے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ کیا وہ حضور ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کے گرویدہ نہ تھے؟ وہ آپ ﷺ کو صادق اور امین مانتے تھے۔ جب حضور ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اعلان فرمایا تھا کہ میری بات سنو اور قبائلِ مکہ جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے تو اس وقت بھی انہوں نے کہا تھا کہ ہم آپ ﷺ کو صادق بھی مانتے ہیں اور امین بھی مانتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ حضور ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کے قدر دان تھے۔ جن اخلاقِ حسنہ کی وہ قدر کرتے تھے اگر صرف ان اخلاقِ حسنہ کو حضور ﷺ عام کرتے تو انہیں کیا اعتراض تھا۔ مکہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو بتوں کو نہیں مانتے تھے اور مکہ میں دنیا کے بے شمار مذاہب کا چربہ موجود تھا۔ اگر ان میں مسلمانوں کا ایک طبقہ اور پیدا ہو جاتا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔

لیکن اسلام نے توحیدِ باری پر بس نہ کی، رسالتِ محمدی ﷺ پر بس نہ کی، اسلام نے عبادات پر بس نہیں کی، اسلام نے اخلاقِ حسنہ پر بس نہیں کی، اسلام نے انسان کے بنیادی حقوق کی بات کی اور اسلام نے ہر انسان کو انسان سمجھا اور بنی آدم کو ایک نظر سے دیکھا۔ ان کے مدارج، ان کے حقوق، ان کی اہلیت اور استعداد کے مطابق مقرر فرمائے۔ اسلام نے اپنا نظامِ عدل دیا، اسلام نے اپنا نظامِ معیشت دیا، اسلام نے اپنا نظامِ سیاست دیا۔ اس کی جب بات ہوتی تو ان کے سیاسی نظام، ان کے عدالتی نظام، ان کے معاشی نظام

سے ٹکراؤ آجاتا اور یہ بات انہیں گوارا نہ تھی۔ یہود و نصاریٰ بلکہ سب مذاہب کیلئے یہ ناقابل قبول تھا۔

دین زندگی کے سارے امور اور تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ جب سارے پہلو اللہ کی رضا کے تابع آجائیں تو ایسے شخص کو دیندار اور متقی کہا جاتا ہے۔ دین یہ نہیں کہ عبادت کے وقت عبادت کر لی اور مسجد سے نکل کر ذاتی زندگی، معاشرتی زندگی اور اجتماعی زندگی بے مہار گزار دی۔ عبادات دین کا بہت اہم حصہ ہیں لیکن صرف عبادات ہی دین نہیں۔ تقسیم کار کے اعتبار سے بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے مثلاً پانچ نمازوں پر کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ بہت زیادہ وقت بھی لگے تو چوبیس گھنٹوں میں سے شاید دو گھنٹے لگ جاتے ہوں گے۔ باقی بائیس گھنٹے اگر دین کا حصہ نہ سمجھے جائیں تو کیا بائیس گھنٹے دین کے بغیر گزریں گے؟ اس سے ظاہر ہوا کہ دین کا بیشتر حصہ عبادات کے علاوہ ہے البتہ عبادات کا باقی زندگی پر اثر مرتب ہوتا ہے۔

دین قیامت تک کیلئے اسلام ہی ہے

ختم نبوت اس بات کی دلیل ہے کہ تہذیب ہو یا معاشرت، معیشت ہو یا صلح و جنگ، لین دین ہو یا سیاست، یہ ساری چیزیں مکمل ہو چکیں، ان کے اصول، قواعد و ضوابط بن چکے، اب ان شرعی حدود کے اندر ان میں کوئی تبدیلی کرنی ہے تو درست۔ اور یاد رکھیں! تبدیلی ہمیشہ ذرائع میں، وسائل میں آتی ہے۔ کیا چودہ سو سال پہلے انسان کو بھوک لگتی تھی اب نہیں لگتی، چودہ سال پہلے اسے لباس چاہیے تھا آج نہیں چاہیے، چودہ سو سال پہلے وہ سفر کرتا تھا آج نہیں کرتا، چودہ سو سال پہلے اسے گھر چاہیے تھا آج نہیں چاہیے، چودہ سو سال پہلے اسے نیند کی ضرورت تھی آج نہیں ہے، چودہ سو سال پہلے بیمار ہوتا تھا، علاج کرتا تھا کیا آج وہ بیمار نہیں ہوتا اور علاج نہیں کرتا؟ کون سی چیز بدل گئی ہے؟ چودہ سو سال پہلے

لوگ مٹی کے، کچے گھر بنا لیتے تھے آج آپ بنگلہ اور کوٹھی بنا لیتے ہیں۔ پہلے گھوڑے پر، اونٹ پر سفر کرتے تھے آج گاڑیوں اور جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔

اسلام نے وسائل سے نہیں روکا اگر چودہ سو سال پہلے بھی قدغن لگائی ہے تو اس بات پر کہ دوسرے کا پتھر چوری یا زبردستی لے کر اپنا گھر نہ بناؤ، آج بھی اسی پہ قدغن ہے کہ دوسرے کے وسائل یا ذرائع چوری یا ناجائز طریقے سے حاصل نہ کرو۔ جائز وسائل سے اور حلال طریقے سے وسائل جمع کرو۔ اچھا کھاؤ، اچھا پہنو، اچھا گھر بناؤ، اچھی گاڑی رکھو، اس میں کوئی برائی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ وہ دین ہے جو ساری انسانیت کیلئے اور سارے زمانوں کیلئے ہے۔ آج بھی روئے زمین پر اس پر عمل ہو رہا ہے الحمدللہ! اگرچہ لوگوں کے رنگ مختلف ہیں، نسلیں مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، عادات مختلف ہیں، دن رات مختلف ہیں، موسم مختلف ہیں، فضائیں مختلف ہیں، بیماریاں مختلف ہیں، تکلیفیں مختلف ہیں، دکھ الگ الگ ہیں، خوشیاں الگ الگ ہیں، رویئے الگ الگ ہیں، لیکن ہر جگہ، ہر ملک میں آج بھی سب سے بہتر طرزِ زندگی وہ ہے جو اسلام نے دیا ہے۔ سب سے آسان بھی اور سب سے خوبصورت بھی۔ اور یہ ہمیشہ رہے گا نہ پرانا ہے نہ پرانا ہوگا۔ چودہ سو سال کی تو بات ہی نہیں یہ تو ساری انسانی تاریخ کی بات ہے۔

ہماری ایک نامور ادیبہ فرما رہی تھیں "جو دین سے وابستہ افراد ہیں کیا وہ آج سے چودہ سو سال پہلے کے معاشرے کے بارے سوچ رہے ہیں"۔ حالانکہ وہ خود نہ صرف دین سے وابستہ ہیں، مسلمان ہیں بلکہ ایک اعلیٰ مسلمان خاندان کی نورِ نظر ہیں۔ کل جب ان کا جنازہ اٹھے گا تو وہی چودہ سو سال پرانی نماز پڑھائی جائے گی۔

انسانی ضروریات ازل سے ایک تھیں اور جب تک دنیا قائم ہے ایک رہیں گی۔ ہاں! ہر دور کے ضروریات کو پورا کرنے کے وسائل ضرور مختلف تھے، ہیں اور رہیں گے

مگر اسلام نے وسائل (Means) پر کوئی قدغن نہیں لگائی، تکمیلِ ضرورت کے ناجائز اور ناروا طریقوں پر پابندی ضرور لگائی ہے کہ ہر انسانی ضرورت پوری کی جائے مگر دوسروں کا حق چھین کر نہیں بلکہ جائز طریقے سے، درست وسائل کے ذریعے پوری کی جائے۔ تو بھلا اس میں کون سی بات پرانی ہے۔

قرآنِ حکیم اپنے نزول سے لے کر قیامِ قیامت تک کیلئے قابلِ عمل ہے۔ اب جتنے طرزِ حیات اس زمانے کے تھے ترک ہو گئے ہیں، جتنا اسلحہ اس زمانہ کا تھا ناقابلِ استعمال ہو گیا، جتنے ملبوسات اس زمانے میں ہوتے تھے آج نہیں ہوتے، جو جوتے اس زمانے میں پہنے جاتے تھے آج کوئی نہیں پہنتا، آج وہ سواریاں نہیں رہیں جو اس زمانے میں تھیں لیکن کیا بدلا؟ وسائل بدلے ہیں، Means بدلے ہیں، انسانی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

دین کے تمام شعبے ضروری اور اہم ہیں

ہماری کمزوری ہے کہ ہم دین کو شعبوں میں بانٹ لیتے ہیں اور ایک ہی شعبے کو دین سمجھ لیتے ہیں کہ یہی دین ہے، بس یہی فریضہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک آدمی میں استعداد ہی اتنی ہوتی ہے کہ وہ ایک شعبے میں کام کر سکتا ہے لیکن دوسرے شعبوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ضرور کہنا چاہیے کہ یہ کام بھی کرنا ہے۔ اب جو درس و تدریس میں ہے وہ کہے کہ یہ تبلیغ تو محض آوارہ گردی ہے اور جو تبلیغ کرتا ہے وہ کہے کہ جی مدرسے میں بیٹھنا تو وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ جو ذکر کرتا ہے وہ یہ سوچے کہ جو نہیں کرتا وہ تو بڑا فضول آدمی ہے۔ جو نہیں کرتا وہ یہ سوچے کہ یہ پاگل ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر کسی کو اللہ نے کسی ایک شعبے میں زیادہ کام کرنے کی توفیق دی ہے تو دوسرے شعبوں کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ عموماً اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جو صرف ایک شعبے میں کام کر سکتے ہیں۔ بہت کم

ایسے لوگ ہوتے ہیں جو متعدد شعبوں میں کام کرتے ہیں، تو جس شعبے میں بھی دین کی خدمت کی سعادت نصیب ہو، دوسرے شعبوں کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑا عجیب رویہ ہے جو ہم دنیا کی زندگی میں تو اختیار نہیں کرتے مثلاً ایک بہت پڑھا لکھا آدمی ہے، پی ایچ ڈی ہے، ڈاکٹر ہے لیکن اس نے ڈرائیونگ نہیں سیکھی تو وہ گاڑی چلانے کی کوشش نہیں کرتا اور اسے کوئی باک نہیں ہوتا وہ ڈرائیور رکھ لیتا ہے اور اسے اس میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ دنیا کی زندگی میں جسے جو کام نہیں آتا وہ نہیں کرتا۔ دین کی جب بات آتی ہے تو جس نے دین کا کوئی ایک شعبہ بھی پڑھ لیا، وہ سمجھتا ہے کہ اب وہی دین ہے جو میں کہتا ہوں۔

دین کے بھی بے شمار شعبے ہیں۔ تفسیر، حدیث اور فقہ، جن کے ماہرین بالترتیب مفسر، محدث اور فقیہہ ہیں۔ اسی طرح ایک شعبہ تزکیے کا بھی ہے جس کے ماہر صوفیاء کرام ہیں۔ یہ شعبہ صفائے باطن سے متعلق ہے، کیفیتِ قلبی سے متعلق ہے اور یہ کیفیت حاصل کرنا پڑتی ہے، وارد کرنا پڑتی ہے دل پر۔ اب جس نے اس کیفیت کو حاصل ہی نہیں کیا وہ بھی اپنی ایک رائے رکھتا ہے اور ایک فتویٰ لیے پھرتا ہے۔ بالخصوص ہمارے وہ دانشور جو مغرب سے اسلامیات میں Ph.D کر کے آئے ہیں، وہ زیادہ بھڑکتے ہیں، کچھ مقامی حضرات بھی ہیں۔ اب ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں یہ تزکیہ ہمیں تو نہیں آتا، ہم تو اس کو نہیں جانتے۔ بھئی! جو چیز آپ کو نہیں آتی، کیا اس کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے یا جو آپ جانتے ہیں صرف وہی دنیا میں ہے؟ اب کتنی چیزیں ہیں جو ہم نہیں جانتے اور وہ دنیا میں موجود ہیں ہمارا جاننا تو شرط نہیں اگر ہم نہیں جانتے تو یہ کمی ہم میں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان چیزوں کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے۔

مذہب کے معنی وہ راستہ ہوتا ہے جس پر ہم چلنا چاہتے ہیں، وہ صحیح ہے یا غلط۔ وہ روش جو معاشرہ اپنا لیتا ہے، وہ تہذیب جس کا رنگ معاشرے پہ غالب آجاتا ہے، آج کل کی زبان میں جسے کلچر کہتے ہیں، وہی مذہب ہوتا ہے۔ مذہب ایک روش کا نام ہے۔ مذہب کا معنی ہے چلنے والا راستہ۔ جس پر کوئی چل رہا ہے وہی اس کا مذہب ہے۔

دین نام ہے سلامتی، عدل اور راست بازی کا۔ دین انسانی روش کا نام نہیں ہے۔ دین سے مراد وہ نظریہ ہے جو بطورِ نظریہ بھی عین صحیح ہو اور وہ نظریہ جو انسان کی پوری عملی زندگی کو زیرِ بحث لا کر اس کی رہنمائی کرتا ہو، اس کے دُنیوی و اُخروی ثمرات پہ بات کرتا ہو اور نہ صرف اِس عالم میں بلکہ اُس عالم میں بھی کامیابی کی ضمانت ہو۔ ایسا نظام جو زندگی میں راحت دے سکے، جو موت کو پرسکون بنا دے یا مابعد الموت اسے کوئی فائدہ پہنچا سکے، وہ دین ہے۔

اسلام مذہب نہیں، اسلام دین ہے۔ اس کا مادہ ''س ل م'' سے مشتق ہے جو ہر طرح کی سلامتی کا ضامن ہے۔ خواہ وہ نظریات میں ہو، فکر اور سوچ میں ہو، عمل اور اس کی تعبیر میں ہو۔ اسلام کا ایسا تصور ممکن ہی نہیں کہ نظریات کچھ ہوں اور کردار کچھ اور ہو، اگر ایسا ہو تو وہ اسلام نہیں ہے۔

دین نظریے اور کردار کو محیط ہوتا ہے۔

1۔ اب اگر نظریہ اور کردار آپس میں مطابقت نہیں رکھتے، نظریہ غلط ہو اور کردار صحیح بھی ہو تو آدمی کافر ہے۔

2۔ بعض اوقات نظریہ زبانی حد تک درست ہوتا ہے کیونکہ ہم کسی کا دل چیر کر تو نہیں دیکھ سکتے، نہ آپ اور نہ میں، دلوں کا مالک تو اللہ ہے، لیکن کردار اس کا کافرانہ

ہوتا ہے۔ اس کیلئے جو اصطلاح قرآنِ کریم نے استعمال کی ہے وہ ہے 'منافق' کہ اس کا نظریہ کچھ اور ہے اور عمل کچھ اور۔ نظریہ سلامتی کا اور کردار تباہی کا ہے۔ مسجد جاتا ہے تو سجدہ کرتا ہے باہر آتا ہے تو ملاوٹ کرتا ہے، ملاوٹ شدہ چیزیں بیچتا ہے، دفتر میں بیٹھ کر لوگوں سے رشوت لیتا ہے، بے گناہ لوگوں کو قتل کرتا ہے۔

3۔ ایک گوشہ اور بھی ہے کہ عقیدہ واقعی درست ہے، دل سے مانتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا تو اسے فاسق یا فاجر کہا جاتا ہے۔ فسق و فجور ہوتا ہے عدمِ اطاعت یعنی اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کی عدمِ اطاعت، اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی۔

مذہب کے بارے میں Misconception

آج کل مصیبت یہ ہے کہ ہم مذہب کو بھی دنیوی نفع و نقصان کے حوالے سے پہچاننا چاہتے ہیں۔ آج کا انسان یہ چاہتا ہے کہ ایسا مذہب اختیار کرے جس میں اسے دنیوی مفاد حاصل ہو یا شکوہ یہ ہوتا ہے کہ نماز بھی پڑھتا ہوں، تلاوت بھی کرتا ہوں، زکوٰۃ بھی دیتا ہوں لیکن کاروبار میں نقصان ہو گیا ہے، بیٹا بیمار ہے، فلاں کام نہیں ہوتا۔ امورِ دنیا ایک راستہ ہے جس پر مومن و کافر سب بحیثیتِ مخلوق سفر کر رہے ہیں۔ اس کے اپنے طریقے، اپنے قاعدے، اپنے زاویے ہیں۔ اب ایک شخص تجارت شروع کرتا ہے اسے تجارت کا ڈھنگ نہیں آتا، وہ نمازیں پڑھتا رہے تو اس سے تجارت نافع تو نہیں ہو جائے گی۔ تجارت اپنے طریقے سے کام کرنے سے بہتر ہوگی۔ ایک آدمی کاشتکاری کرتا ہے اور اس سے ہل نہیں چلایا جاتا، وہ کھیت کی حفاظت نہیں کر سکتا، اسے اپنے وقت پر پانی نہیں دے سکتا اور وہ کہتا ہے کہ میں دن رات ذکر اذکار کرتا ہوں، وظیفے پڑھتا ہوں تو وظیفے

پڑھنے کا اس سے کیا تعلق؟ کھیت مومن بھی بو سکتا ہے کافر بھی بو سکتا ہے، حصولِ رزق کے ذرائع مومن کیلئے بھی ہیں اور کافر کیلئے بھی ہیں۔ جو محنت و مشقت کرے گا اور جس کی محنت صحیح ہوگی، قاعدے کے مطابق ہوگی، وہی زیادہ پھل پائے گا۔

یاد رکھیے! سوا لاکھ سے کم یا زیادہ، جتنے بھی انبیاءؑ مبعوث ہوئے ہیں ان میں کوئی نبیؑ اس لیے مبعوث نہیں ہوا کہ لوگوں کے کاروبار سیدھے کرے یا بیماریوں کو دور کرنے میں مدد کرے۔ اگر کسی سے یہ چیزیں بطور معجزہ ظاہر بھی کی گئی ہیں تو غرض یہ تھی کہ نبیؑ کی نبوت کا لوگوں کو ادراک ہو جائے۔ انبیاءؑ کا اور انبیاءؑ کی نبوت کا موضوع یہ تھا کہ بندے اور رب کے مابین تعلق اور واسطہ قائم ہو جائے۔ یہ سوچ کہ عبادت کے ساتھ روزی کا تعلق ہے، صحت و بیماری کا تعلق ہے، یہ مذاہب باطلہ کی دی ہوئی سوچ ہے اور جتنے مذاہبِ باطلہ ہیں، ان کی ہر عبادت کے ساتھ اجر کے طور پر کسی نہ کسی دنیوی مقصد یا فائدے کا لالچ بھی آ جاتا ہے۔

مسلمان جب عملی زندگی میں شیر تھے، روئے زمین پر حکمران مسلمان ہی تھے۔ جب ان کی دنیوی، عملی زندگی تعطل کا شکار ہوگئی تو کسی بھی مسجد کے گوشے میں بیٹھنے والا، کوئی بھی چلہ کشی کرنے والا، کوئی بھی تقریر کرنے والا، تسبیحات پڑھنے والا، اس قوم کی نجات کا سبب نہیں بنا۔ سب سے پہلے جنہوں نے اسلام قبول کیا، جنہیں قرآنِ حکیم **سابقون الاولون** کہتا ہے، ساری دنیا پر سبقت لے گئے۔ انہوں نے جب مکہ مکرمہ میں اسلام قبول کیا تو ان کو کیا دنیوی فائدہ ہوا؟ جو کچھ پاس تھا وہ بھی گیا، گھر بھی چھٹے، مال جائیداد بھی گئی، مار بھی پڑی اور تیرہ برس کا جو تکلیف دہ وقت گزارنا پڑا وہ انہی کا حوصلہ تھا تو کیا وہ یہ کہتے تھے کہ معاذ اللہ جب ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے تو ہم تو بہت چین سے تھے، ہمیں اسلام سے کیا ملا، ہم نے کلمہ پڑھا مصیبت میں پھنس گئے۔ اللہ کریم نے ہر انسان

کیلئے انہیں معیار بنا دیا کہ دیکھو، انہوں نے دنیا کیلئے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کیلئے دنیوی دولت، دنیوی آرام اور اپنا خون نچھاور کر دیا اگرچہ بعد میں ان کی خاطر میں نے پورا جہان ان کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیا۔

یہ جو اہل اللہ کے قدموں میں دنیوی فوائد حاصل ہوتے ہیں، یہ جھونگے میں ملتے ہیں، انہیں شمار ہی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو مفت میں بٹتے رہتے ہیں انہیں گننے کی کیا ضرورت ہے۔ شمار اس چیز کو کرنا چاہیے جو اصل ہے یعنی ایمان کھرا ہو جائے، توحید خالص ہو جائے، رسالت پر اعتماد آ جائے اور عمل میں پختگی آ جائے اور اس کے ساتھ ساتھ خلوص اور خشوع و خضوع میں زیادتی ہوتی رہے۔

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (البقرہ:208)

ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ پورے کے پورے اسلام کے اندر آ جاؤ۔ تمہارا کوئی دامن، کوئی پہلو، کوئی پلہ، کوئی کونہ، باہر نہیں رہنا چاہیے۔ سارے کے سارے اسلام کے اندر آ جاؤ۔ اب یہ کون سا اسلام ہے کہ ایک ٹانگ آپ نے اندر رکھی ہوئی ہے ایک باہر رکھی ہوئی ہے، نماز پڑھ لیتے ہیں سود بھی کھا لیتے ہیں، روزہ رکھ لیتے ہیں جھوٹ بھی بول لیتے ہیں، عبادت بھی کر لیتے ہیں ڈاکہ بھی ڈال لیتے ہیں، یہ تو اسلام نہیں ہے۔ اسلام تو یہ ہے کہ زندگی تمہاری نہ رہے محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں چلی جائے۔ تمہارے فیصلے تم نہ کرو، تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بارگاہ سے فیصلے کیے ہوئے ملیں اور وہ تم اپنے آپ پہ نافذ کرو۔

ہوتا کیا ہے؟ ہم میں سے کوئی نماز پڑھ لیتا ہے روزہ نہیں رکھتا، روزہ رکھ لیتا ہے دوسرے کا مال کھا جاتا ہے، جھوٹ بول لیتا ہے۔ ہم زندگی کو پوری طرح اسلام کی تحویل میں نہیں دے پائے حالانکہ حکم یہ ہے کہ جب ایمان لے آئے ہو تو پھر پورے کے پورے

اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

دینِ اسلام ایک متحرک زندگی کا نام ہے

اسلام ایک متحرک زندگی کا نام ہے۔ جو لمحے اللہ نے دیئے ہیں ان لمحات کو اس کی رضا کیلئے استعمال کیا جائے۔ اپنے آپ کو جسمانی طور پر فٹ رکھیں گے تو عبادات میں بھی لطف آئے گا، اگر چولیں ڈھیلی ہوتی ہیں تو عبادات میں بھی مزا نہیں آتا کہ رکوع میں جاؤ تو ادھر سے درد نکل رہا ہے اور سجدے میں جاؤ تو ادھر سے درد نکل رہا ہے۔ جسمانی لحاظ سے آدمی فٹ نہ ہو تو بہت سی عبادات رہ جاتی ہیں، آدمی معذور ہو جاتا ہے۔ ایک تو عمر کا تقاضا ہے، ایک حد پر جا کر اعضاء و جوارح میں وہ ہمت نہیں رہتی کہ وہ اپنے آپ کو صحیح رکھ سکیں یا ورزش کر سکیں لیکن جوان بچوں کیلئے، جوان آدمیوں کیلئے ایک ایکٹو (active) اور متحرک زندگی چاہیے۔

اسلام، عین انسانی مزاج کے مطابق ہے

اسلام اور شریعتِ اسلامیہ کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جسے صالح مزاج قبول نہ کرے، عقلِ سلیم قبول نہ کرے بلکہ جہاں سے عقل قبول کرنے سے انکار کرتی ہے، وہاں عقل میں فتور ہے۔ احکامِ شریعت عین انسانی مزاج کے مطابق ہیں اس لیے کہ انسان کا خالق وہی ہے، اس کے مزاج کا خالق وہی ہے اور اس نظام کو بنانے والا بھی وہی قادرِ مطلق ہے اور اس نے عین انسانی مزاج کے مطابق اسے ترتیب دیا ہے۔ اگر کوئی انسان، انسانیت سے گر جائے تو وہ الگ بات ہے ورنہ احکامِ شرعی، انسانی عقلِ سلیم بھی قبول کرتی ہے۔

اسلام وفاؤں کا نام ہے

جو سارے کا سارا اِسلام ہے اسے کہتے ہیں وفا۔ اسلام صرف وفاؤں کا نام ہے۔ مجاہد جہاد کرتا ہے وہ اپنی جان ہار جاتا ہے۔ کیوں؟ اسے شہید کیوں کہا اللہ نے؟ وہ

اپنی وفاداری کی گواہی جان ہار کر دیتا ہے۔ شہید کا مطلب ہے، گواہ۔ اس نے تو گواہی دینے کا حق ادا کر دیا کہ میں اسی بات پر قائم ہوں، گردن کٹتی ہے تو کٹ جائے، سر کٹتا ہے تو کٹ جائے، سینہ پھٹتا ہے تو پھٹ جائے، جان جاتی ہے تو چلی جائے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ اس نے میرے نبی ﷺ کے ساتھ وفا کرنے پر اپنی جان دے کر گواہی دے دی ہے۔ یہ شہید ہے۔

تو سارا حاصل، اسلام کا کیا ہے؟ وفا۔ وہ ہستی جس کے قیام کیلئے اس زمین میں استعداد نہیں تھی، اللہ نے جنت سے ٹکڑا بھیجا۔ ہم اس ہستی سے کتنی وفا نبھاتے ہیں۔ ایک فارسی کا شاعر کہتا ہے۔

پائے سگ بوسید مجنوں خلق گفتندایں چہ بود

کتا گذر رہا تھا اور مجنوں نے اسے پکڑا اور اس کے پاؤں چومنے لگا۔ لوگوں نے دیکھا تو کہا کہ پاگل تو اور بھی ہوتے ہیں لیکن یہ تو پاگل پن کی بھی انتہا ہے اور کتے کے پاؤں چومنے کی کیا تک بنتی ہے۔

گفت ایں سگ گاہے گاہے کوئے لیلیٰ رفتہ بود

اس نے کہا میں نے کبھی کبھار اس کتے کو لیلیٰ کی گلی سے گذرتے دیکھا ہے۔

تو وفا ایک عملِ استمرار ہے، ایک تسلسل ہے، ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے تو جس کسی نے بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وفا کی، ہم اسی سے وفا کرتے ہیں۔ جو اس گلی سے گذرا، اس کے نقشِ کفِ پا کو بھی چومتے ہیں۔ جو آپ ﷺ کی بات کرے، اس کی باتوں پر نچھاور ہو جائیں۔ جو آپ ﷺ کا کام کرے، ہم اس کے دست و بازو بن جائیں۔

اسلام سب کا ہے

اسلام واحد مذہب ہے جو ہر آنے والے کو اللہ کے روبرو کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ کسی

پیر کا مذہب نہیں ہے، کسی مولوی کی ذاتی جاگیر نہیں ہے، کسی بادشاہ کا مذہب نہیں ہے، کسی بڑے زمیندار کا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ سب مسلمانوں کا اپنا اسلام ہے۔ ہر مسلمان کا اللہ رب العزت کے ساتھ، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ ہم میں جتنی گروہ بندی در آئی ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ اپنا نام بھی شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کہتے ہیں، اللہ کی مانو، رسول اللہ ﷺ کی مانو، ساتھ میری بات بھی مانو، اس طریقے سے مانو جس طریقے سے میں کہتا ہوں۔ علماء ہم تک اللہ کے احکام، رسول اللہ ﷺ کی بات پہنچائیں۔ وہ بات جو اللہ کی ہو، وہ بات جو رسول اللہ ﷺ کی ہو، ہم تک پہنچائیں یہ ان کا احسان ہے۔ لیکن اگر اس میں لپیٹ کر وہ اپنی بات کہنا چاہیں تو پھر ہم ان سے دین نہیں سیکھیں گے، کسی ایسے دروازے پہ جائیں گے جہاں کھرا اور خالص دین ملے گا۔

یہی حال پیروں کا، مشائخ کا ہے کہ وہ برکاتِ نبوت ﷺ کے امین ہوتے ہیں۔ اگر واقعی ان کے پاس وہ دولت ہے تو پھر ہمیں بھی ان کے پہلو میں بیٹھ کر کچھ گرمی، کچھ حدت، کچھ حرارت، کچھ محبت کی چنگاریاں پھوٹتی نظر آنی چاہییں۔ اگر ان کے پاس بیٹھ کر بھی ہمیں نفرتیں ملیں تو پھر ہم محبتیں لینے کہاں جائیں؟ کیونکہ اسلام تو محبتوں کا مذہب ہے، اسلام تو ایسا مذہب ہے جو کافر سے بھی شفقت کا درس دیتا ہے۔

ہماری مصیبت یہ ہے کہ اسلام کو ہم نے مولانا اور پیر صاحب کا بریف کیس بنا دیا ہے اور اسے ہم اٹھائے پھرتے ہیں۔ پیر صاحب نے قرآن کا ادب سکھایا، مولانا نے ادب سکھایا لیکن کیا یہ ہمیں پیر صاحب اور مولوی صاحب بتائیں گے کہ اس میں ہے کیا۔ ہمیں یہ اسلام مطلوب نہیں۔ قرآنِ کریم میں کیا ہے، یہ جاننا ہر مسلمان کا ذاتی مسئلہ ہے، اسلام اس کا اپنا ہے۔ مولانا، پیر صاحب کی ضرورت، ان کا احسان یہ ہے کہ وہ ہمیں بتائیں کہ قرآن

میں کیا لکھا ہے اور اس پر عمل کی صورت کیا ہے؟ اور اگر عمل صرف پیر صاحب یا مولوی صاحب نے کرنا ہے اور ہم نے ان کی زیارت کر کے چلا جانا ہے تو یہ مسلمانی نہیں ہے۔

الگ الگ اسلام

اگر جذبہ بھی صادق نہ ہو، عمل اور کردار بھی صحیح نہ ہو، عقائد بھی رسومات کی زد میں ہوں تو باقی بچتا کیا ہے؟ پھر زیادتی یہ ہے کہ ہم ساری عمر اس پر مطمئن رہتے ہیں کہ جو کچھ میرے پاس ہے یہی اسلام ہے۔ یعنی جس طرح کسی کی اپنی پسند ہے، اسی طرح کی سوچ اور اسی طرح کے عمل کو اسلام بنا لیا گیا ہے اور یہ قطعاً صحیح نہیں ہے اور نہ ہی مفید۔ اسلام وہی ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے تعلیم فرمایا، وہی اعمال صالح ہیں جن کی سند بارگاہِ نبوی ﷺ سے ملتی ہے۔ عمل محبت پہ استوار ہوتا ہے یا عمل سے محبت پیدا ہو جاتی ہے لیکن عمل بھی خالص ہو، عقیدہ بھی کھرا ہو۔

آج ہم مسلمان ہیں الحمد للہ! نمازیں ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج کرتے ہیں، ارکانِ اسلام پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم سے ہمارا ایک گھر نہیں سنبھالا جا رہا۔ باپ سے بیٹے کی سوچ الگ ہے، بیٹیاں الگ سوچتی ہیں، بیوی الگ سوچتی ہے اور میاں کی سوچ الگ ہے۔ ایک خاندان میں، ایک گھر میں چار پانچ افراد ہیں اور یہ چار پانچ افراد ایک سوچ پہ متفق نہیں ہوتے۔ صحابہ کرامؓ نے کیا جادو کر دیا کہ روئے زمین کے انسانوں کو ایک سوچ پہ متفق کر دیا۔ کیا وہ ہم سے کوئی زائد نماز پڑھتے تھے۔ کیا ان کے پاس کوئی الگ قرآن تھا یا ان کے پاس کوئی الگ وظیفہ تھا یا ان کا کوئی معمول الگ تھا یا کوئی ایسی بات ہے جو ان میں تھی اور ہم میں نہیں؟ یہ یقینی بات ہے، یہ طے ہے کہ کوئی ایسی بات ہے جو ان میں تھی اور ہم میں نہیں، کوئی Missing Link ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے علمی گھروں میں، اگر چار بندے ہیں تو ہر ایک کا
لگ الگ مذہب ومسلک ہے۔ اتنی گمراہی آ گئی کہ ایک گھر میں ایک مذہب کا گزارہ نہیں۔
ہی حال حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے تھا، ایک گھر کے دس کافر کسی ایک بت پہ متفق نہیں
وتے تھے۔ اکثر تو دس بت الگ الگ ہوتے تھے نہیں تو پانچ سات ضرور ہوتے تھے۔
مارے ایک پہ متفق نہیں ہوتے تھے۔ ہر ایک نے اپنی جیب میں اپنا الگ بت ڈالا ہوتا تھا۔

سیرت کی کتابوں میں ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کا سبب اسی طرح کا
یک واقعہ بنا۔ شہر سے کہیں باہر تھا۔ سفر پر تھا یا مویشی چرا رہا تھا کہ اسے پیشاب کی حاجت
ہوئی تو اس نے بت نکال کر رکھ دیا کہ میں رفع حاجت کر کے اٹھالوں گا۔ اس نے بت کی
بے ادبی سمجھی کہ اب میں پیشاب کرنے بیٹھوں اور بت جیب میں ہو تو یہ تقدس کے خلاف
ات ہوگی۔ تو اس کے ساتھ کتا بھی تھا۔ وہ شخص کہیں جھاڑی کی اوٹ میں پیشاب کرنے
یٹھ گیا۔ کتے کی عادت ہوتی ہے، اس نے وہ پتھر سا دیکھا، اس کے گرد گھوما اسے سونگھا اور
س پر پیشاب کر دیا۔ اس شخص نے دیکھا تو کہا میں نے تو تجھ سے اتنی شرم کی لیکن کتا تجھ پر
پیشاب کر رہا ہے، اگر تو خدا ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتا۔ تو اسے منع نہیں کر سکتا، میں تیرا بوجھ کیوں
ٹھائے پھروں۔ جب تو اپنے لئے اتنا نہیں کر سکتا کہ اس کتے کو روک دے کہ تجھ پر پیشاب
نہ کرے، تو تو میرے کیا کام آئے گا؟ میں جاتا ہوں محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس، میں نے
دیکھ لی تیری خدائی اور اس نے یہ سارا واقعہ آ کر بارگاہِ رسالت ﷺ میں عرض کر دیا۔
حضور ﷺ مسکرائے، تبسم فرمایا کہ تم نے صحیح دلیل پکڑی ہے۔

آج ہم اپنے دعویٰ اسلام اور متضاد اعمال کے سبب اس سزا کی زد میں ہیں۔ اگر
اللہ ہمیں سمجھ دے، شعور دے، فکر دے تو آج ہم اپنے گھروں میں، اپنے خاندان میں، اپنے
شہر، گاؤں، محلے میں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک گھر میں پانچ بندے ہیں تو پانچ ہی مذہب ہیں۔

ہر آدمی نے اپنا الگ الگ بت بنا رکھا ہے۔

اسلام سے پیپر میرج

ہم من حیث القوم برائی کی طرف کیوں دوڑ رہے ہیں؟ دراصل ہمارے اپنے
اندر بے ایمانی کے جراثیم موجود ہیں۔ ہمارے اپنے صاف نہیں ہیں، ہماری روحیں زندہ
نہیں ہیں، ہمارا اپنا تعلق محمد رسول اللہ ﷺ سے بن نہیں سکا۔ بنتا تو اس میں لذت آتی اور
ہم اس کے دیوانے ہوتے۔ اس نام سے رشتے کی ہم نے ایک رسم ادا کر دی ہے۔ رسم اور
رشتے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ہمارے لوگ جب امریکہ یا یورپ جاتے ہیں تو وہاں رہائش حاصل کرنے کیلئے
ایک طریقہ کار اختیار کرتے ہیں اسے Paper Marriage کہتے ہیں یعنی کاغذوں
میں شادی۔ ہم نے بھی اسلام کو قبول نہیں کیا، اسلام کے ساتھ Paper Marriage
کی ہوئی ہے۔ Paper Marriage میں تعلق اور رشتے کا پاس نہیں ہوتا، وہ میاں
بیوی بن کر نہیں رہتے، ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، نہ کوئی تعلق نہ ذمہ داری۔ ہماری
اکثریت نے بھی اسلام کے ساتھ پیپر میرج کر رکھی ہے، نہ دل سے کلمہ پڑھا نہ تعلق بنا۔ اگر
کوئی دل سے کلمہ پڑھ لے تو اس کلمے میں اتنی قوت ہے کہ عمر بھر کے کفر و شرک سے پاک کر
کے خالص اللہ کیلئے مخلص کر دیتا ہے۔ ہمیں اسی ای برس ہو گئے کلمہ پڑھتے ہوئے، ہماری
اصلاح ہوتی ہی نہیں۔ ادھر حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر کوئی کافر ستر اسی برس کفر میں گزار
کر ایک مرتبہ سچے دل سے کلمہ پڑھ لے تو وہ اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے اس نے آج
تک کوئی گناہ کیا ہی نہیں، ہمیں تو پون صدی بیت گئی کلمہ پڑھتے ہوئے، ہمیں نہ اللہ کے
موجود ہونے کا احساس ہے، نہ اللہ کے نبی ﷺ کی ناراضگی کا ڈر ہے۔ ہم نے کیسا کلمہ پڑھا
ہے کہ ہمارا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے رشتہ ہی استوار نہیں ہوا۔ دراصل ہماری اسلام

سے پیپر میرج ہی ہوئی ہے جس میں ہم خود کو مسلمان ہونے کا دھوکہ دیتے ہیں۔

ہم نے اسلام کو Mystery بنا دیا ہے

ہم نے دین کو ایک جادوگری بنا دیا ہے یعنی سارے کام خود بخود ہو جاتے ہیں اور بعض احباب نے ذکر الٰہی کو بھی اسی انداز میں لیا ہے۔ میرے پاس خط آتے ہیں کہ میں ذکر بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں، پھر بھی میرے کاروبار میں نقصان ہو گیا، میں بیمار ہو گیا وغیرہ۔ تو ہم نے دین کو جادوگری کا تماشہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نماز پڑھیں گے تو یہ کام اس طرح ہو جائے گا، ہم ذکر کریں گے، ایسا ہو جائے گا۔

یاد رکھیں! عملی دنیا میں ذکر اتنی ہی مدد کرے گا کہ تم خلوص سے اللہ کی اطاعت کرنے لگ جاؤ گے۔ نتائج اس کے دستِ قدرت میں ہیں، کوئی زہر کھالے اللہ اسے شفا دے دے، اسے کون روک سکتا ہے اور کوئی امرت پئے، وہ اسے موت دے دے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ ہم مسلمانوں نے دین کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی اور پھر خصوصاً جنہوں نے تصوف کا لبادہ اوڑھ لیا اور ایک گدڑی لے کر گوشے میں بیٹھ گئے کہ خدایا! تو جانے تیرا جہان جانے، ہم تو یہ بیٹھے ہیں۔

ہم نے اللہ کو Own نہیں کیا

اللہ سے اپنا تعلق ایسا رکھیے جیسے ہر بندے کو، ہر مومن کو یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اللہ میرا ہے۔ ہم نے اللہ کو اور اللہ کے حبیب ﷺ کو Own نہیں کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ مولوی صاحب کا ہے، پیر صاحب کا ہے، وہ اسے منالیں گے۔ دین مولوی صاحب کا حصہ ہے، یہ کرتے رہیں گے۔ نہیں، اللہ بھی ہمارا اپنا، نبی کریم ﷺ بھی ہمارے اپنے ہیں، دین ہمارا اپنا ہے اسے Own کیجئے۔ Own کریں گے تو آپ یقیناً اس کی باریکیوں کو جاننا چاہیں گے، سمجھنا چاہیں گے، عمل کرنا چاہیں گے۔ آپ اگر بنظرِ غور ملاحظہ فرمائیں گے تو دین پر عمل

آسان اور دین کے خلاف ہر عمل آپ کو پریکٹیکلی (practically) مشکل نظر آئے گا۔ کوئی بھی بندہ علیحدہ بیٹھ کر سوچے کہ یہ جو کام میں کرنے ہوں، اس کا شرعی اور غیر شرعی طریقہ کیا ہے؟ تو یقیناً شرعی طریقہ آرام دہ اور آسان ہوگا، باعزت ہوگا۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمیں جب دنیا بتائی جاتی ہے تو دین نہیں بتایا جاتا اور جہاں دین بتایا جاتا ہے وہاں دنیا نہیں بتائی جاتی۔ بہت کم خوش نصیب ہیں جو سارا زور دین پر عمل کرنے میں لگاتے ہیں اور دنیا میں گزارا کرتے ہیں۔ اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو دین کے معاملے میں بس گزارا کرتے ہیں اور سارا خلوص طلبِ دنیا میں خرچ کرتے ہیں۔

بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (الشعرآء:74)

دنیا کے معاملے میں ہر شخص اپنی راہ تلاش کرتا ہے۔ باپ بڑھئی ہے تو ضروری نہیں کہ بیٹا بڑھئی ہو۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ باپ سے کوئی اچھا پیشہ اپنا لے یا اس سے زیادہ دولت کمائے، پڑھ لکھ کر کوئی آفیسر بن جائے یا کاروبار کرے۔ باپ کسان ہے تو ضروری نہیں کہ بیٹا ہل چلاتا پھرے وہ کوئی CSP افسر بھی بن سکتا ہے۔ کسانوں کے بیٹے جرنیل بھی ہیں۔ لیکن دین کے معاملے میں لوگ اس قدر تساہل پسند واقع ہوئے ہیں کہ بس وہ "بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ" (الشعرآء:74) ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا وہ اسی طرح کرتے تھے اس لئے ہم اس طرح کر رہے ہیں۔ بھئی دنیا کے معاملات میں آپ نے ماں باپ کی پیروی کیوں چھوڑ دی؟ دنیا میں اگر آپ کا باپ لوہار تھا تو آپ لوہار بنتے، آپ کیوں پڑھ لکھ کر دوسرے شعبوں میں چلے گئے؟ لیکن دین کے معاملے میں اکثر ایسا رویہ ہی ہے۔

دین پر عمل محال نہیں

اسلام مشکل دین نہیں ہے، دین پر عمل محال نہیں ہے اس لئے کہ اللہ کی رحمت

ساتھ ہو جاتی ہے اور وہ معاون بن جاتی ہے۔ اللہ کریم توفیقِ عمل ارزاں کر دیتا ہے۔ لیکن کوئی چاہنے والا بھی تو ہو، کسی کے دل میں درد جاگے بھی تو سہی، کسی کے لب پہ دعا آئے تو سہی، کوئی مانگے تو سہی، کوئی یہ فیصلہ تو کرے کہ اسے نبی ﷺ کا ساتھ دینا ہے۔

زندگی قیمتی ہے جب یہ ختم ہو گی تو تم ساری دنیا کی دولت دے کر چاہو کہ کوئی ایک لمحہ تمہیں کہیں سے خرید دے تو نہیں مل سکے گا۔ یہ گزارنے کیلئے نہیں ہے یہ سنوارنے کیلئے ہے۔ اب اگر ایک شخص اطاعتِ نبوی ﷺ کے لئے اپنی بھرپور کوشش کرتا ہے لیکن بتقاضائے بشریت اس سے خطائیں ہو جاتی ہیں تو یہ قابلِ معافی ہے۔ ایک شخص پرواہی نہیں کرتا، جانتا، پوچھتا ہی نہیں محمد رسول اللہ ﷺ کون ہیں، قرآن کیا ہے اور سمجھتا ہے کہ زندگی میری ہے میں جیسے چاہوں گا بسر کروں گا تو کیا یہ قابلِ معافی ہے؟ پھر ایک شخص اس سے آگے بڑھتا ہے، وہ دین کی مخالفت شروع کر دیتا ہے، احکامِ شریعت کا مذاق اڑاتا ہے، تو یہ باتیں تو قابلِ معافی نہ رہیں۔

اسلام کیا ہے

اسلام یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمان ہر طرح سے سرنڈر (Surrender) کر دیتا ہے۔ اپنے اختیارات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدموں میں ڈال دیتا ہے، اپنی رائے سے دستبردار ہو جاتا ہے اور صرف اور صرف اتباعِ نبوی ﷺ کیلئے اپنی پوری کوشش صرف کر دیتا ہے، یہ اسلام ہے۔ اسلام ہے زندگی کے مکمل مصرف کا نام، اسلام ہے اللہ سے تقویٰ کا نام۔ اسلام یہ ہے کہ برکاتِ نبوت ﷺ سے سینے معمور ہو جائیں، پھر زبان پہ بات جاری ہو تو اپنی نہ ہو، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہو۔ نگاہ دیکھے تو حضور ﷺ کے حوالے سے، دل سوچے تو حضور ﷺ کے حوالے سے، دماغ میں خیال آئے تو محمد رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے پھر دیکھیں امن قائم ہوتا ہے کہ نہیں۔ اگر آپ یہ راستہ

نہیں اپنائیں گے تو دنیا بھر کی ساری کاوشیں کر کے دیکھ لیں، بداحی بڑھتی چلی جائے گی۔ یہ تباہی اور ظلمت جو پھیل رہی ہے اس کے ذمہ دار میں اور آپ ہیں۔ ہم جو اپنے علامہ ہونے کے مدعی ہیں، ہم جو بڑا اچھا مقرر ہونے کے مدعی ہیں، ہم جو صاحب ہونے کے مدعی ہیں، ہم جو اہلِ علم ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، ہم نے کتنے دلوں کو روشن کر دیا؟ کیا ہم نے اپنے سینے میں وہ روشنی بہم پہنچائی جو محمد رسول اللہ ﷺ کے سینۂ اقدس سے تقسیم ہوئی اور کیا ہم نے اتنی بہم پہنچائی کہ آگے دلوں کو روشنی دے سکے؟ اگر نہیں تو مجرم ہیں اور جرم معمولی نہیں ہے کہ اللہ کی مخلوق کو تباہی میں دھکیل دیا جائے۔

مسلمانی اپنے امور کو ماہرِ حیات ﷺ کے سپرد کر دینا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کوئی انسان زندگی کی گتھیاں سلجھانے کی فرصت ہی نہیں رکھتا اہلیت تو دور کی بات ہے۔ اگر کسی کو اہلیت مل بھی جائے تو اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ وہ ہر بات کے تمام اثرات کا احاطہ کر سکے۔ وہ باتیں کرے گا، کام کرے گا یا ان کے اثرات کا احاطہ کرے گا۔

ہماری مسلمانی یہ ہے

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

کہ تم نے اپنا حلیہ، شکل و شباہت، لباس، بول چال، رنگ ڈھنگ عیسائیوں جیسا بنا لیا ہے اور معاملاتِ زندگی، طور اطوار، اٹھنا بیٹھنا، شادی بیاہ، سوگ ہمیں دین کی رسومات ہندوؤں سے لے لی ہیں اور کردار اتنا گھناؤنا ہو گیا ہے کہ دنیا کی خبیث ترین قوم یہودی بھی تمہارے کردار سے گھبراتے ہیں، تم تو ان سے بھی گئے گذرے ہو۔ اسلام رسوا نہیں ہے، ہم مسلمان رسوا ہیں اس لئے کہ ہم اسلام کو چھوڑ چکے ہیں۔ ہماری رسوائی کا سبب یہ ہے کہ ہم

میں سے ہر ایک، کردار میں، افکار میں، شکل میں، لباس میں، جس سمت سے دیکھو غیر مسلم بننے پر فخر کرتا ہے، کافروں جیسا دکھائی دینے پر فخر کرتا ہے، کافروں جیسا کھانے، پینے، سوچنے پر فخر کرتا ہے۔ وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود، شکل عیسائیوں جیسی بنالی اور رسومات ہندوؤں سے لے لیں۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر صحابہؓ میں سے کسی کو دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تو ہمیں دیکھ کر وہ پریشان ہو جائے گا کہ یہ پاگل ہیں کہ خود کو مسلمان کہتے ہیں! اور ہم انہیں دیکھ کر یہ سوچیں گے کہ حیرت ہے! مسلمان ایسے ہوتے ہیں؟ ہم میں اور اسلام میں اتنا فاصلہ ہے۔

یہ اسلام نہیں ہے

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو نماز روزے میں مقید کر دیا۔ ہم نے سمجھا کہ محض نماز پڑھنے، روزے رکھنے، تسبیحات پڑھنے سے اسلام مکمل ہو گیا۔ لوگ سُود لیتے ہیں، نمازیں باقاعدہ پڑھتے ہیں۔ تسبیحات پڑھتے ہیں، اعتکاف بیٹھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور سُود کھاتے ہیں یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کا کام نماز روزے سے مکمل ہو گیا، عملی زندگی میں سُود کھا رہے ہیں۔ ڈاکوؤں کو ہم نے نمازیں پڑھتے دیکھا ہے، پیشہ ور قاتل نمازیں پڑھتے ہیں جنہیں پیسے دو تو وہ بندہ قتل کر دیں گے۔ ہم نے نماز روزہ کر کے اسلام کو ایک طرف راضی کر لیا، باقی زندگی جو جی چاہے کرتے رہیں۔ یہ اسلام نہیں ہے۔

دعویٰ اسلام اور ہمارا عمل

دعویٰ کرنا مسلمان ہونے کا، دعویٰ کرنا عشق و محبت کا، دعویٰ کرنا اتباعِ رسول ﷺ کا، ہم اس کے قائل نہیں ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ ہمارے مسلمان ہونے کی بدولت زمانہ انگڑائی لے اور پتہ چلے کہ یہ عاشقانِ رسول ﷺ کا عہد ہے۔

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہماری زبانوں پر یہ شکوہ رہتا ہے کہ حالات بڑے خراب ہیں۔ حالات خراب ہوتے ہیں تو سُدھارے جاتے ہیں۔ حالات بگڑتے ہیں تو ظلم ہوتا ہے، ناانصافی ہوتی ہے، جبر ہوتا ہے تو پھر ہی عاشقانِ رسول ﷺ کی پہچان ہوتی ہے۔ ہم صرف دعوے کرتے رہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ شمع ہی کیا جو کہے جی یہاں اندھیرا بہت زیادہ ہے، میں تو یہاں جل نہیں سکتی۔

اللہ کے نزدیک دنیا میں سب سے زیادہ گری ہوئی قوم، سب سے زیادہ معتوب قوم یہود ہے لیکن مسلمان کا کردار اس عہد میں اس سے بھی گر چکا ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو وعدہ کر کے پورا کرتے ہیں، کتنے ہیں جو سچ بولتے ہیں، کتنے ہیں جو اللہ کی عبادت بجالاتے ہیں، کتنے ہیں جو احکام شرعی کا احترام کرتے ہیں؟ اگر کچھ باقی بھی ہے تو اس کی بھی ایک رسم رہ گئی ہے، ایک رواج رہ گیا ہے۔ رواج میں اور عمل میں بڑا فاصلہ ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو محبتِ الٰہی سے بے قرار ہو کر سربسجود ہوتے ہیں؟ اکثریت جو نماز ادا ہی نہیں کرتی اسے تو چھوڑ دیجیے لیکن ہم جو نماز ادا کرتے ہیں تو وہ بھی ہم پر ایک بوجھ ہے۔ ہم اسے بوجھ سمجھ کر، دیکھا دیکھی، اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں۔ کیا ربِ کریم کو ہمارا اٹھنا بیٹھنا منظور ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اسے تو وہ دردِ دل چاہیے جو اس کے جمال کا طالب ہو، اسے تو وہ تڑپ چاہیے جو اس کے قرب کی متلاشی ہو، اسے تو وہ آرزو چاہیے جو اس کی ذات سے اس کو مانگے، اسے تو وہ جان چاہیے جو اس کے حبیب ﷺ پر نچھاور ہو سکے، اسے تو وہ جذبہ چاہیے جو اس کے ارشادات، اس کے نبی ﷺ کے احکامات، اس کے حبیب ﷺ کی اطاعت پر قربان ہو سکے۔ اگر اس معیار سے دیکھا جائے تو ہم میں سے کتنے لوگ مسلمان نکلیں گے؟

ہمارے دانشوروں کا اسلام

ہمارے دانشوروں کے حلق سے اسلام نہیں اترتا۔ یہ ساری زندگی نظریہ اسلام پر طنز کرتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا دانش کیلئے علم و عمل کو کسوٹی بنایا جاتا تھا اور دانشور انہیں کہا جاتا تھا جو اہلِ علم ہوتے تھے، زندگی کے تجربات سے آشنا ہوتے تھے، صاحبِ عمل ہوتے تھے، صاحبِ کردار ہوتے تھے۔ وہ کسی معاملے میں رائے دیتے تو لوگ کہتے کہ یہ اہلِ دانش کی رائے ہے یا فلاں دانشور نے یہ کہا۔ اب دانشوری کیلئے کوئی عہدہ چاہئے اور وہ ہر معاملے پر بات کئے جائے خواہ اس سے کوئی بات بنتی ہو یا نہیں، ہر معاملے پر محض بولتا چلا جائے تو وہ دانشور کہلاتا ہے۔

غضبِ علیٰ غضب یہ ہے کہ ہمارے عہد کا دینی سربراہ بھی بڑا سستا ہو گیا ہے۔ میں نے ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اندرا گاندھی کی لاش جل رہی تھی، ٹی وی پہ دکھایا جا رہا تھا اور دو مولوی پاس بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے۔

ہم اسلامی ریاست جیسی نعمت کے قابل نہیں

افغانستان میں ایک اسلامی ریاست بنی جس کی بنیاد شرعی حدود پر رکھی گئی۔ ہماری سوچ یہ ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ نے اسے ختم کر دیا۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے ہم سے وہ نعمت چھین لی کہ تم لوگ اس قابل نہیں کہ تمہیں ایسی منصف عدالتیں اور اس طرح کا اسلامی نظام دیا جائے۔ تم اس قابل ہو کہ تم پر ظالم اور جابر حاکم مسلط کیے جائیں جو صبح شام تمہاری ٹھکائی کریں، تمہیں بھوکا رکھیں اور خود عیش کریں۔ جو تمہیں نیلام کریں، بیچیں اور کھائیں۔ ہم اگر اپنا ہی حساب کریں تو ہم میں سے ہر پیدا ہونے والا بچہ بھی مقروض ہے۔ وہ دنیا میں بعد میں آتا ہے اور اسے رہن رکھ کر اس پر پیسہ پہلے کھا لیا جاتا ہے۔

اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ کون؟

یہ جن سے ہم نفاذِ اسلام کی امید رکھتے ہیں، یہ Publically مسلمان ہیں، ذاتی طور پر یہ اسلام سے ڈرتے ہیں۔ مسلمان سیاستدان، مسلمان علماء، مسلمان پیر اور مسلمان بادشاہ، یہ چار طبقے اسلام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہر وہ مولوی جس کا پیشہ اسلام ہے، ہر وہ پیر جس کا پیشہ پیری ہے، ہر وہ سیاستدان جس کا پیشہ سیاست ہے، ہر وہ بادشاہ جسے خاندانی حکومت کی لت پڑ گئی ہے، یہ چار طبقے نفاذِ اسلام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ عوام کو نفاذِ اسلام سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہمیں اسلام کچھ دے گا، ہم سے چھینے گا نہیں۔ یہ اسلام کے خلاف اس لئے لڑ رہے ہیں کہ یہ سب اپنے اپنے میدان کے فرعون ہیں، ان فرعونوں کے قدموں کے نیچے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ اسلام ہوگا تو ان سے کچھ چھنے گا۔ ان سیاستدانوں سے، ان حکمرانوں سے، ان بہروپیوں سے، پیشہ ملّی سے بہت کچھ چھن جائے گا۔ انہیں بھی ہمارے ساتھ مزدوری کرنا پڑ جائے گی، جب غریب کے گھر کی بتی بجھے گی تو صدارتی محل تک لوڈ شیڈنگ کا اثر جائے گا۔

مسلمان مسکین نہیں ہوتا

مسلمان مسکین نہیں ہوتا کہ جو کوئی اُسے دیکھے، اسے اس پر ترس آنے لگے۔ مسلمان اللہ کا شیر ہوتا ہے کہ جو بھی اُسے دیکھے، ایک دفعہ ٹھٹھک جائے کہ کس سے پالا پڑا ہے۔ یہ جو مسلمانوں پر مسکنت چھا گئی ہے یہی ہمارے زوال کا سبب ہے کہ ہر کوئی دیکھو کاسۂ گدائی لیے پھرتے ہیں۔ جسے دیکھو یوں لگتا ہے ابھی رو پڑے گا۔ یہ اسلامی زندگی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ اللہ کا بندہ جلالتِ الٰہی کا مظہر ہو اور کافر اور منافق اسے دیکھ کر لرز جائے، اسے خوابوں میں بھی نظر آتا رہے کہ پتہ نہیں کیا ہو جائے گا؟ ہیبت ہونی چاہیے مسلمان کی۔

ہم نے عملی زندگی میں کفار کی پیروی اختیار کر لی ہے تو جوتے تو پڑیں گے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ ہمارا سارا نظام ہائے زندگی کافروں کی غلامی میں ہو، کافروں کے طریقے پر ہو، شریعت کے خلاف ہو اور ہم اپنے اسلام سمیت کافروں میں گھل مل جانا چاہتے ہوں اور چاہتے ہیں کہ پھر ہم پر پھول برسیں۔ پھول تو نہیں برسیں گے۔ یہ تو بھڑوں کا چھتہ ہے جو اس میں سر دے گا اسے بھڑیں ہی کاٹیں گی۔

کس حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حکم عدولی؟

ہمیں پتہ ہے کہ ہم حکومت کے ایک معمولی اہلکار کی حکم عدولی نہیں کر سکتے اور کرنے پہ آتے ہیں تو اللہ رب العزت کی حکم عدولی کرتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی کرتے ہیں۔ یہ تو اس کا کرم ہے، اس کی عطا ہے کہ پھر بھی وہ برداشت کیے جاتا ہے، ہمیں روزی دیئے جاتا ہے، ہمیں مہلت دیئے جاتا ہے۔ دن میں پانچ دفعہ اپنی طرف بلاتا ہے کہ بھئی بس کرو، چھوڑو، آ جاؤ۔ آج وقت ہے، آج وہ بلاتا ہے ہم نہیں جاتے، کل وقت ہوگا، ہم جانا چاہیں گے، وہ آنے نہیں دے گا۔

اور یہ جو بے شمار لوگ نماز ادا نہیں کرتے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بڑے دلیر ہیں اس لیے ادا نہیں کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سجدہ کرنے کی توفیق ہی نہیں دیتا، راندۂ درگاہ کر دیتا ہے اور اگر بات بڑھتی جائے تو پھر ایمان تک سلب ہو جاتا ہے اور لوگ ایک نیا فرقہ ایجاد کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر گھر میں اب پانچ فرد ہیں تو پانچ افراد کا الگ الگ فرقہ ہے۔ یہ اتنی فرقہ بندی کہاں سے آ گئی، یہ کٹی ہوئی پتنگیں ہیں۔

ہم میں قوتِ برداشت نہیں

کتنی عجیب بات ہے کہ تیرہ سالہ مکی زندگی میں صحابہ کرامؓ جس طرف نکلتے، مصیبت پاتے۔ جدھر نکلتے مار کھاتے، جدھر نکلتے تکلیفیں اٹھاتے، جدھر نکلتے مذاق اڑایا

جاتا، غرض ہر پریشانی ان کیلئے تھی لیکن ان کی زندگی کیسی تھی۔ پوری سیرت میں، پوری تاریخ میں نہیں ملتا کہ کسی ایک صحابیؓ نے کبھی عرض کیا ہو کہ یارسول اللہ ﷺ ان کے لیے بددعا فرما دیجیے کہ اللہ انہیں تباہ کر دے، ہمیں انہوں نے بہت تنگ کیا ہے۔ جبکہ ہماری زندگی پر ذرا سا دباؤ پڑے، جس طرف سے دباؤ پڑے، کہتے ہیں اللہ اسے غارت کرے، اللہ اسے تباہ کرے، ہماری کیوں چیخ نکل جاتی ہے؟ اور وہ جن کی زندگی کو کفار نے اذیت ناک بنا دیا، گرم لوہے سے داغے گئے، گرم ریت پر لٹا کر اوپر منوں وزنی چٹانیں رکھی گئیں، مارا پیٹا گیا، گلیوں میں گھسیٹا گیا تو کیسے عجیب لوگ تھے کہ وہ یہ بھی نہیں کہتے تھے کہ یارسول اللہ ﷺ! ان کیلئے بددعا کر دیجیے۔ بظاہر وہ تکلیف تھی لیکن بباطن ان کیلئے ایسی لذت آفرین تھی کہ اسی لمحے انہیں مزید قربِ الٰہی نصیب ہو جاتا۔

تو بظاہر دنیوی تکالیف جو آتی ہیں اگر رابطہ رب العالمین سے ہو، دل میں اللہ بستا ہو، دھڑکنوں میں اس کا نام ہو، سانسوں میں اس کی خوشبو رچی بسی ہو تو بظاہر جو دکھ آتے ہیں، بباطن قربِ الٰہی کا سبب بن جاتے ہیں، وہ بھی اپنی لذتیں چھوڑتے ہیں۔ اور اگر زندگی میں سے قربِ الٰہی کی لذت ختم ہو جائے تو وہ محض ایک تماشہ ہے۔

ہم پنشن یافتہ مسلمان ہیں

ہم اسلام کے ساتھ وابستہ بھی ہیں، اس کے مفادات بھی لے رہے ہیں لیکن ہم effective نہیں رہے۔ ہمارے دستخطوں سے اب کچھ نہیں ہوتا، ہماری دعاؤں میں، ہمارے کردار میں کوئی جان نہیں رہی، ہماری سوچ ہی شکست خوردہ ہے۔ ہماری حالت ایک پنشنر کی طرح ہے کہ بڑے بڑے آرمی آفیسرز، جرنیل تک ریٹائر ہو جاتے ہیں، کیا ان کے کسی حکم پر کوئی فوجی سپاہی عمل کرتا ہے؟ جرنیلی تو باقی رہتی ہے، سہولتیں باقی رہتی ہیں، پنشن ملتی رہتی ہے لیکن وہ بات نہیں رہتی۔

تو ہماری جو پشن یافتہ مسلمانی ہے اس میں ہمارے حوصلے بھی اتنے پست ہو گئے ہیں کہ ہمیں پتہ ہے کہ ہمارے کہنے سے کیا ہوگا؟ آپ کسی سے پوچھ لیں، اس کا جملہ یہی ہو گا کہ میرے کرنے سے کیا ہوگا؟ جب کہ جو حاضر سروس ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں جہاں تک میرا بس چلتا ہے وہاں تک ہوگا۔

ہم بہت گہری نیند میں چلے گئے ہیں

کسی سوئے ہوئے پر پانی کا چھینٹا دیا جائے تو اس کی آنکھ کھل جاتی ہے لیکن ہماری قوم اتنی گہری نیند میں چلی گئی ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کا خون بھی ابھی تک اس کی آنکھ کھولنے سے قاصر ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑ رہے ہیں، مظلوموں کی چیخیں ہمارے کانوں سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں، تباہ شدہ لاشوں کے ٹکڑے ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ مرنا تو انہی کو تھا، ہمیں شاید نہیں مرنا۔

ہم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں

میری آدھی سے زیادہ ڈاک لوگوں کے خوابوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مجھے یہ خواب آیا تھا، میں نے خواب میں اس طرح دیکھا، میرے خواب میں یہ گزرا، میرے خواب میں وہ گزرا اور باقی آدھی حصولِ معاش کیلئے، روزگار کیلئے کہ کوئی وظیفہ پوچھنے والوں کی ہوتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میدانِ جنگ میں کسی کو اتنی نیند آتی ہے کہ وہ لمبے لمبے خواب دیکھا کرے۔ شاید ہم لوگوں نے خود کو اسلام سے یا مسلمان قوم سے الگ ایک فرد سمجھ لیا ہے۔ ہم ایک تماشائی بن گئے ہیں اور ہم نے اپنے وجود کو، اپنی ذات کو، اسلام سے بھی اور مسلمان قوم سے بھی الگ کر لیا ہوا ہے۔ ہم فارغ ہیں، ہم بیٹھے خواب دیکھا کرتے ہیں، ہمارے پاس فرصت ہے، ہم خود کو امیر ترین بندہ بنانا چاہتے ہیں، ہم دولت جمع کرنا چاہتے ہیں۔

حیرت ہے جن لوگوں کی وفائیں محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہونی چاہیں، وہ دال روٹی کے پیچھے بھاگتے رہیں اور زندگی بھر روٹی کا ایک لقمہ حاصل کرنے کیلئے اسی اسی نوے نوے برس عمر ضائع کر کے چلے جائیں۔ ان کی کوئی رات اس فکر میں نہ گزرے کہ دین کو غالب کیسے کیا جائے اور کوئی دن اس فکر میں نہ گزرے، دل بے قرار نہ ہو کہ کفر کے غلبے سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟

ہم نے سمجھوتے کر لیے ہیں

بارگاہِ رسالت ﷺ میں جو آیا، وہ پڑھا لکھا تھا یا ان پڑھ، نورِ نبوت نے اسے صحابیؓ بنا دیا۔ اس میں وہ درد انڈیل دیا کہ وہ بندہ اسلام کی دعوت کو اول تا آخر سمجھ کر جم گیا۔ ہم نے سمجھوتے کر لیے ہیں۔ مسجد کے اندر ہم مسلمان ہیں، مسجد کے باہر ہم مسلمان نہیں ہوتے۔ عدالتوں میں ہم مسلمان نظر نہیں آتے، بازار میں ہم مسلمان نہیں بنتے، حکومت و اقتدار میں ہم مسلمان نہیں رہتے، مسجد میں آتے ہیں تو مسلمان بن جاتے ہیں۔ ہم مسلمان تو ہیں الحمدللہ، نام بھی مسلمانوں جیسے ہیں، دعویٰ بھی اسلام کا ہے لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے تعلق والی بات کمزور پڑ گئی ہے۔ چار پیسے حرام کے مل رہے ہوں تو اپنی مسلمانی کے باوجود ہم نہیں چوکتے، دوسروں کا حق کھانے سے ہم باز نہیں آتے، عبادت کیلئے ہمارے پاس فرصت نہیں، قرآنِ کریم کھولنے کا وقت نہیں ملتا، دنیا بھر کے ناول، افسانے پڑھ لیتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو پڑھنے کی فرصت نہیں۔ دنیا بھر کے چینلز سے جھوٹے ڈرامے اور فلمیں دیکھتے ہیں جہاں ٹی وی سیٹ سے لے کر کیبل تک اخراجات اٹھتے ہیں، تو پھر یہ کیسی مسلمانی ہے؟

آج مسلمان نے شکل نصاریٰ کی بنا لی، تہذیب یہودیوں کی لے لی، رسومات ہندوؤں سے لے لیں، مسلمانی کہاں رہی؟ سر تا پا، قول تا فعل، سوچ تا فکر ہر چیز ایک رنگ

میں رنگ جائے تب جا کر بندہ مسلمان ہوتا ہے۔

اب دین کی حفاظت کیلئے ابابیل نہیں آئیں گے

ایک دفعہ پیر کرم شاہ صاحبؒ تقریر فرما رہے تھے تو ان کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ فرمانے لگے اگر اب مسلمانوں کا یہ خیال ہو کہ بیت اللہ پر حملہ ہوا تو اللہ کریم ابابیل بھیج دیں گے تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ جب بیت اللہ کی حفاظت کیلئے اللہ نے ابابیل بھیجے تھے تب مسلمان دنیا میں نہیں تھے اور جب اس امت کو اللہ نے اعزاز بخشا، نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو اس کے بعد بیت اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری اس امت پر ہے، اب اس کے لیے ابابیل نہیں آئیں گے۔

مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہم، جن کے کندھوں پر دین کی عمارت استوار ہے، ہم کسی آنے والے کے انتظار میں ہیں۔ ہر بندہ کہتا ہے، کوئی آئے گا۔ کون آئے گا؟ کوئی نہیں آئے گا۔ نہ تو کوئی آسمان سے ٹپکے گا، نہ کوئی زمین سے آئے گا، یہ میری اور آپ کی، یہ ہم سب کی، ہر اس بندے کی ذمہ داری ہے جو کہتا ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ۔ ایک وقت آئے گا جب اللہ کے حضور ہم سب کو جواب دینا ہوگا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اصحابِ فیل کے واقعہ کے بعد کعبہ پہ کئی دفعہ طوفان آیا، لوگوں نے حجرِ اسود اکھیڑ لیا، بیس برس تک کعبہ حجرِ اسود سے محروم رہا، کوئی ابابیل نہیں آیا۔ عین مطاف میں حاجی قتل کیے گئے، کوئی ابابیل نہیں آیا۔ ابن زبیرؓ جیسے لوگوں کو سولی پر لٹکا دیا گیا، کوئی ابابیل نہیں آیا۔ پھر کیا ابابیل کے لشکر ختم ہو گئے یا اللہ کی ملکیت ختم ہو گئی؟ بات کیا ہوئی؟ بعثتِ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اللہ نے فرمایا، اب کعبے کی رکھوالی، اے محمد ﷺ! اے میرے نبی ﷺ! میرے ذمے نہیں، اب ابابیل نہیں آئیں گے۔ اب اگر اسے سلامت رہنا ہے تو تیرے جاں نثاروں کے خون پر سلامت رہے گا۔ اگر یہ اس کی حفاظت کا

حق ادا نہ کر سکیں تو اسے گر جانے دے۔ مجھے حیا آتی ہے کہ میں اب بھی ابابیل بھیجوں۔ تب سے اب تک کوئی ابابیل نہیں آیا اور کبھی نہیں آئے گا۔ نبی کریم ﷺ کی پیش گوئیوں میں موجود ہے، کعبہ گرا دیا جائے گا، طواف ختم ہو جائے گا، حج و عمرہ ختم ہو جائے گا، قیامت آجائے گی، ابابیل نہیں آئیں گے۔ دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی، دنیا تباہ کر دی جائے گی، لیکن کعبے کو بچانے کیلئے ابابیل نہیں آئیں گے۔ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے۔

مسلمانوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ دین ہم سے قائم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم دین سے قائم ہیں کیونکہ اللہ دین کو باقی رکھے گا، یہ اس کا وعدہ ہے۔ اسلام کو چھوڑ دینے سے ہم مٹ جائیں گے، اسلام نہیں مٹے گا۔ اسلام کی بقاء ہماری محتاج نہیں ہے، ہماری بقاء اسلام کی محتاج ہے۔ ہماری عزت اسلام سے ہے، ہماری بقاء اسلام سے ہے، ہمارا سارا وقار اسلام کا محتاج ہے۔

مسلمان کیوں مغلوب ہو رہا ہے؟

ہم ایسے عہد میں ہیں جہاں چودہ صدیوں کی نسبت تاریکیاں بہت بڑھ گئی ہیں، ایسے زمانے میں ہیں کہ میں سوچا کرتا ہوں کہ جو گناہ آج کل ہوتے ہیں، یہ شاید شیطان نے بھی نہیں سوچے ہوں گے۔ وہ بھی پریشان ہوگا کہ میں تو انہیں آدمی سمجھ کر ان سے گناہ کراتا تھا، یہ تو کتوں سے بھی بدتر ہیں۔ جس گناہ کی حالت میں مغرب ڈوبا ہوا ہے، جس میں فار ایسٹ ڈوبا ہوا ہے، جس طرح کی غلاظت آج بکھیری جا رہی ہے، میں کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ اتنا تو بُرا شیطان نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔ لوگ جانوروں سے بدتر ہو گئے ہیں اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ (الاعراف:179) جوں جوں انسان ہوشیار ہوتے گئے، نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی گئیں، تو نئے نئے گناہ بھی ایجاد ہوتے گئے۔ جو گناہ آج کل ہوتے ہیں آج سے پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنی غلاظت مزاجوں میں بھر چکی ہے، اس قدر غلیظ

مٹی ہوگئی ہے انسانی وجودوں کی اور اس قدر ان کی بیماریاں اور تاریکیاں بڑھ گئی ہیں کہ آبِ حیات سے بھی مرے ہی، زندہ نہیں ہو سکے۔ اب اگر کفر غالب آرہا ہے اور مسلمان مغلوب ہو رہا ہے (اسلام نہیں) تو کیوں؟ اس لئے کہ وہ اسلام سے ہٹتا جا رہا ہے اور کافر کی تقلید میں جا رہا ہے۔ مسلمان، اسلامی حدود سے نکل کر کافر کی مشابہت اختیار کرتا ہے، کافر کی طرح کھاتا پیتا، کافر کی طرح شراب پیتا، کافر کی طرح برائی کرتا، کافر کی طرح جھوٹ بولتا، کافر کی طرح سود کھاتا اور پھر کافر جیسا نظر آنے پر فخر کرتا ہے۔ کوئی بات نہ ہوتی اگر ہم کافروں کی مشابہت اختیار کرتے مگر اس پہ شرمندہ ہوتے تو کبھی اس سے خلاصی کی امید ہو سکتی تھی۔ اب ہم اسلام پر شرمندہ ہیں جو کام ہم شریعت کے مطابق کرتے ہیں اس پہ ہمیں شرمندگی، معذرت سی ہوتی ہے۔

یہ سوچنے کا لمحہ ہے کہ ہر بندہ اپنے آپ سے پوچھے کہ اس کے ایمان کی حالت کیا ہے؟ میں اپنے آپ سے پوچھوں، آپ اپنے آپ سے پوچھیں اور دوسروں کے ممتحن نہ بنیں، اپنی فکر کریں۔ جواب تو سب کو اپنا دینا ہے، نہ میں نے کسی کا جواب دینا ہے نہ آپ نے دینا ہے۔ لہٰذا اپنے دل کے کھرے پن کو تلاش کریں۔

ہم کیا کریں؟

سب سے پہلے تو ہم وہ آرزو زندہ کریں کہ میں جانور نہیں ہوں کہ بس روزی کما لی، گھر بنا لیا، بچے ہو گئے تو میں سمجھوں میں نے بڑا کام کر لیا۔ یہ میرا کام نہیں ہے یہ تو بڑا معمولی سا کام ہے جو ایک چڑیا بھی کر رہی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ کر کے بھی کچھ اور کرنا ہے۔ وہ کچھ اور کیا ہے؟ وہ وصالِ حق ہے، وہ طلبِ بارگاہِ الٰہی ہے، وہ طلبِ قربِ محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔ اب اس کے وسائل کیا ہوں گے؟ اس کے لیے میں اپنے نہاں خانۂ دل کو سجاؤں، اسے صاف کروں، اس میں جو جھاڑ جھنکار ہے، جو خواہشات کے

اژدھے ہیں، جو غلط چیزیں ہیں، میں انہیں صاف کروں، وہاں اللہ کے نام کی روشنی کروں۔ پھر وہ میرے کردار میں آئے اور میرا کردار مجھے قربِ الٰہی کے قابل بنا دے، تو ایک بندہ انقلاب آفرین ہو سکتا ہے۔ ایک ایک بندہ ظلم کے خلاف ناقابلِ شکست ہو سکتا ہے۔

آج اس طلب و جستجو اور اس آرزو سے بیگانہ ہو کر، اس دردِ دل اور اس نورِ باطنی سے بیگانہ ہو کر بظاہر ہم زندہ ہیں لیکن مُردوں کی صف میں ہیں۔ بظاہر ہم انسان ہیں لیکن حیوانوں کا گلہ ہیں کہ بھیڑیے نے چاہا تو ایک بکری گرا لی اور باقی سو بکریاں بھاگ بھاگ کر جان بچانے کی فکر میں ہیں۔

ظلم کے بڑھنے کا سبب مسلمانوں کا کردار

آج جو میں اور آپ سوچتے ہیں کہ اسلام مظلوم ہے تو اسلام پر ظلم کافر نہیں، وہ مسلمان کر رہا ہے جو اسلام کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ آج اسلام پر ظلم وہ مسلمان کر رہا ہے جو اسلام کے نام پر چوری کرتا ہے، وہ مسلمان کر رہا ہے جو اسلام کے نام پر دھوکہ دیتا ہے، وہ مسلمان کر رہا ہے جو اسلام کے نام پر منافقت کرتا ہے اور دنیوی مفاد کے لیے چند ٹکوں کے عوض بک جاتا ہے، تھوڑی سی عزت کیلئے بک جاتا ہے، تھوڑی سی شہرت کیلئے بک جاتا ہے، حکومت میں شریک ہونے کیلئے بک جاتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے، کیسے کیسے لوگ اس طرح بکتے ہیں جیسے قربانی کے جانور بیچے جاتے ہیں۔ آج کے مسلمان کا یہ کردار ظلم کے بڑھنے اور کفر کی آندھیوں کو بڑھانے کا سبب بن رہا ہے۔

مجھے کفر کے اتحاد سے خوشی ہوئی ہے اس لئے نہیں کہ مسلمان مر رہے ہیں اور ظلم ہو رہا ہے بلکہ اس لئے کہ کفر کا اتحاد ایک آخری حربہ ہے کہ شاید ہماری غیرتِ ملی کو بیدار کر دے۔ اگر خطبات سے، شعروں سے، تقریروں سے، واقعات اور حوالہ جات بتانے سے یہ

قوم زندہ ہوتی تو کب کی زندہ ہو چکی ہوتی۔ یہ سارے عہد گذر گئے۔ کوئی کتنا بڑا نغمہ لکھ لے، علامہ اقبالؒ جیسی بات تو نہیں کہے گا جنہوں نے جو شعر کہا، یا قرآن کا ترجمہ ہے یا سنتِ رسول اللہ ﷺ کا ترجمان۔ لیکن ہم اسے بھی طبلے کی تھاپ پر گا کر واہ واہ کر دیتے ہیں، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

مسلمان اپنی ظاہری شناخت ہی کھو چکا

اگر دورِ حاضر میں ہم مسلمانانِ عالم کے کردار کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ہم اپنی ظاہری شناخت بھی کھو چکے ہیں۔ آپ نے یقیناً ٹی وی پر بھی، اخباروں میں بھی مسلمانوں کے قتل ہونے کی خبریں پڑھی ہوں گی، تصاویر دیکھی ہوں گی۔ کیا کوئی لاش آپ کی نظر سے ایسی گزری جسے کافروں کی لاشوں میں رکھ دیا جائے تو حلیے سے، لباس سے، اپنی شناخت سے الگ کیا جا سکے کہ یہ مسلمان ہے۔ تو جن لوگوں کے وجود اور لباس تک کی شناخت محمد رسول اللہ ﷺ سے نہیں ملتی، ان کے دل کب ملتے ہوں گے، ان کا کردار کب ملتا ہوگا۔ اور جب دل کا رشتہ نہیں ہے، کردار کا رشتہ نہیں ہے تو پھر ہم کس لئے یہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہمیں حضور ﷺ کی رحمت العالمینی سے، اللہ کی رحمت سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔

ہر مسلمان حکمران کی شناخت شیروانی اور پگڑی ہوا کرتی تھی لیکن انگریز نے چوبداروں، چوکیداروں اور بیروں کو شیروانی اور پگڑی پہنوادی۔ انگریزی لباس تو حاکموں کا ہو گیا اور جو مسلمان امراء اور سلاطین کا لباس تھا وہ انگریز نے انتقاماً کھانا Serve کرنے والے بیروں کو، چوکیداروں کو، دروازے پر پہرہ دینے والے گارڈ کو پہنا دیا۔ آج بھی اپنے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ چلے جائیں تو وہی طرّہ دار پگڑی اور شیروانی پہرہ دے رہی ہے اور وہی ٹائی اور سوٹ اندر کرسی پر براجمان ہے۔

دینی شعائر میں بھی غیر مسلموں کی پیروی

غور کیجیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ سُود ہم کھاتے ہیں، بددیانتی ہم کرتے ہیں، جھوٹ ہم بولتے ہیں، کاروبار میں دھوکہ ہم دیتے ہیں، جہاں سے تنخواہ لیتے ہیں وہاں ذمہ داری ہم پوری نہیں کرتے، کون سی معاشرتی برائی ہے جو معاشرے کے دھارے میں بہہ کر ہم نے اپنا نہیں رکھی۔ جب ہم معاشرے کا اتباع کرتے ہیں، تو اس پر پھل بھی وہی لگے گا جو معاشرے کو مل رہا ہے۔ حتیٰ کہ ہم اگر حضورِ اکرم ﷺ سے اپنے رشتے پر اظہارِ مسرت کرنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ کی دنیا پر تشریف آوری کی خوشی منانا چاہتے ہیں، تو اس کے اظہار کا بھی ہمارا طریقہ وہی ہوتا ہے جو مغربی اقوام کے الیکشن لڑنے کا ہے۔ اسے ہم نے مکہ مکرمہ سے، صحابہ کرامؓ سے، مدینہ منورہ سے، مہاجرین و انصار سے نہیں لیا، اسے بھی ہم نے اقوامِ مغرب کے سیاسی جلسوں سے لیا ہے کہ اپنی پارٹی، اپنی جماعت، اپنے ہم خیال لوگوں کا اتنا انبوہ ہو کہ مخالف کو پتہ چلے کہ یہ بھی ہیں۔ اس میں کچھ ڈھول تماشے ہوں، کوئی اونٹ گھوڑے ہوں، کوئی موٹر گاڑیاں ہوں، ہندوؤں کے گتکے سے لے کر جھنڈوں، نعروں اور آتش بازی تک ہر ہر رسم کو ہم نے جشنِ میلاد کا نام دے دیا۔

ہم سے انسانی اقدار چھوٹ گئیں

آپ جس مغرب سے مرعوب بیٹھے ہیں اس مغرب نے انسان اور انسانیت کو کیا دیا؟ جہاں بیٹی باپ کو نہیں پوچھتی، بھائی بہن کو نہیں پوچھتا، جہاں شرم نام کی کوئی چیز نہیں ملتی، حیا نام کی کوئی شے نہیں ملتی اور یہ بے ہودگی، اسلامی ممالک بھی ان سے درآمد کر رہے ہیں۔ ایجادات انسانوں کی سہولت کیلئے ہوتی ہیں اور اگر انسان کے پاس انسانی اقدار ہی نہ رہیں تو سہولت کو کیا کرے گا؟ کیا سہولتیں اس لیے ہوتی ہیں کہ انسان کو جانور بنا دیا جائے، اس میں سے انسانی حس ہی ختم کر دی جائے۔ اس میں نہ غیرت ہو، نہ شرم و حیا ہو، نہ

چھوٹے پہ شفقت، نہ بڑے کی عزت ہو۔ یعنی جو انسانی خصوصیات ہیں وہ نکال دی جائیں اور اسے کتے بلے کی طرح بنا کر چھوڑ دیا جائے تو ایسی ایجادات اس کے کس کام کی؟

ایک وجود کو آپ بہت اچھا کھانا کھلائیں، بہت اچھے کپڑے پہنائیں لیکن اس کی انسانی عظمت چھین لیں تو باقی کیا بچے گا؟ آپ کنجروں سے کیوں نفرت کرتے ہیں، آپ کے پاس پیشہ ور خواتین سے نفرت کا کیا جواز ہے، کیا وہ انسان نہیں ہیں، کیا وہ اولادِ آدم سے نہیں ہیں، ان کا وجود ہماری طرح نہیں ہے، انہیں صحت بیماری ہماری طرح نہیں ہوتی؟ ان کے پاس پیسے بھی ہم سے زیادہ ہیں، وہ کھاتی پیتی ہم سے اچھا ہیں، لباس، زیور بھی بہت ہے تو پھر آپ ان کی عزت کیوں نہیں کرتے، انہیں گالی کیوں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سے انسانی اقدار چھوٹ گئیں۔ صرف یہی وجہ ہے ناں! تو یہاں تو چند آپ کو بازار میں ملتی ہیں، مغرب سارے کا سارا اُن سے بھر گیا، مشرق بعید سارے کا سارا اُن سے بھر گیا۔ آپ اپنے کنجروں سے نفرت کرتے ہیں اور غیر ملکی کنجروں جیسا بننا چاہتے ہیں، یہ فلسفہ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ کیا عجیب سوچ ہے؟

تو ان ایجادات نے انسانیت کو کیا دیا؟ ان ایجادات نے یہ دیا کہ قیامِ امن کیلئے اپنے سے کمزور ملکوں کو تباہ کر دو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں سے درگزر نہ کرو، آبادیوں کی آبادیاں تہس نہس کر دو۔ یہی دیا ہے ناں مغرب نے! اگر سائنس کو قرآن کے تابع رکھ کر قرآن کو ماننے والے اس میں ترقی کرتے، تو یہی سائنس انسانیت کی خدمت کر رہی ہوتی۔ اب یہ لاٹھی اندھوں کے ہاتھوں میں آئی ہے تو ہر ایک کا سر پھوڑ رہی ہے۔

آج بھیک بھانگنا قابلِ فخر کیوں ہو گیا؟

کیسی عجیب بات ہے خود کو مسلمان کہلانے والے، نبی کریم ﷺ کے امتی ہونے کے دعویدار، آج کافروں کے پاؤں کی ٹھوکر پہ ہیں۔ ہمارے نام سے تو کفر کو لرزہ براندام

ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹ گیا ہے۔ وہ ہمیں ہمارے ملک میں آ کر مارتے ہیں اور پھر ہم ان سے معافی بھی مانگتے ہیں۔ کیسا عجیب زمانہ آ گیا ہے کہ ایک عرصے سے ہماری حکومتوں کا بڑا کارنامہ یہ شمار کیا جاتا ہے کہ اس حکومت نے کافروں سے اتنا قرض لے لیا۔ یہ کیسی عجیب قوم ہے اور کیا عجیب سوچ ہے؟ جو چیزیں قابلِ مذمت تھیں، وہ قابلِ فخر قرار پائیں۔ الفاظ کے معانی بدل گئے، اقدار بدل گئیں۔ مانگ کر کھانا تو کسی دور میں قابلِ فخر نہیں تھا آج مومن کا کافر سے خیرات مانگنا قابلِ فخر کیوں ہو گیا؟ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ کہنے کو ہم مسلمان ہیں لیکن عقیدے کے اعتبار سے، فکری اور عملی اعتبار سے ہم نے دامانِ رحمتِ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ دیا ہے اور خواہشاتِ نفس کے اسیر ہو گئے ہیں۔

پھر بھی مسلمانوں کو شکوہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ پر تو رحمت نازل ہوئی ہم پر کیوں نہیں ہوئی؟ کیا صحابہ کرامؓ اسی طرح قیصر و کسریٰ کے سامنے دامن پھیلانے گئے کیا صحابہ کرامؓ نے کسریٰ کے خزانوں کی خیرات مانگی تھی یا وہ شمشیر بکف گئے تھے؟ ہم تو باطل کے سامنے گدائی کرنے جاتے ہیں۔ ہم سے چھوٹ گیا تو صرف اللہ کا در، ورنہ بھیک مانگنے کے لیے دنیا کا کوئی دروازہ ہم نے چھوڑا ہی نہیں۔ یہ تو پھر اس کا کرم ہے کہ ہمیں اُس نے کلمہ پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہے ورنہ اس جرم کی سزا یہ ہے کہ ہم سے کلمے کی توفیق بھی سلب ہو جانی چاہیے تھی۔

ہم بھی عجیب لوگ ہیں جس نے شاباشا کی، اس کے پیچھے پانچ دس کھڑے ہو گئے۔ کوئی کپڑے اتار کر سڑک پہ کھڑا ہو جائے، کہہ دے میں خدا ہوں، اسے بھی ماننے والے مل جاتے ہیں۔ جو پاگل، مالیخولیا کا مریض کہہ دیتا ہے، میں نبی ہوں، اسے بھی ماننے والے مل جاتے ہیں تو ولایت کا دعویٰ تو بڑی چھوٹی سی بات ہے جس کا جو جی چاہے کرے۔ جو بھنگ گھوٹ رہا ہے، چرس پی رہا ہے، افیون کھا رہا ہے، اس کے گرد اگرد بھی لوگ کھڑے

ہو جاتے ہیں کہ جی بڑا ولی اللہ ہے۔ اپنی ہوش نہیں، برہنہ پڑا ہے اور لوگ سجدے کر رہے ہیں۔ یہ جہالت کی حد ہے۔

شہدا کی قربانیاں رنگ لائیں گی

آج اگر دنیا میں مسلمانوں کا خون ارزاں ہے تو لاکھوں شہداء کی قربانیاں ان شاء اللہ غلبہ اسلام کا سبب بنیں گی اس سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں سوچنا چاہیے کہ شاید کفر غالب آ گیا اور اسلام مٹ جائے گا، ایسا کبھی نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔ بیشک شیطان کافروں کے ساتھ رہے، طاغوتی طاقتیں ان کے ساتھ رہیں، سمجھوتوں کی زندگی گزارنے والے ان کے ساتھ رہیں، دنیا کے سارے اسباب بھی یکجا ہو جائیں، مسبب الاسباب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

یہ لاکھوں مسلمان جو جامِ شہادت نوش کر رہے ہیں ان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا، غلبہ اسلام کا سورج طلوع کرنے کا سبب بن جائے گا۔ یہ وہ ستارے ہیں جو سحر کی تلاش میں ڈوب رہے ہیں۔ ہر شہید وہ ستارہ ہے جو تلاشِ سحر میں گم ہو جاتا ہے اور اس کا گم ہونا ہی سحر کی آمد کا استعارہ بن جاتا ہے۔ جب ستارے ڈوبنے لگتے ہیں تو ہر ذی شعور یہ سمجھ جاتا ہے کہ سورج کے طلوع کا منظر آنے والا ہے کہ ستارے نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں سو سو منزلہ عمارتیں نظر آتی ہیں لیکن جو مضبوط چٹانیں سو سو منزلہ عمارت کی بنیاد اٹھا کر کھڑی ہوتی ہیں وہ ہمیشہ زیرِ زمین ہوتی ہیں، وہ ہماری ظاہری نظر میں نہیں آتیں۔ یہ ان شہدا کا خون اور ان مجاہدین کی قربانیاں ہیں جو پیوندِ زمین ہو گئے۔ ان کے خون، ان کی ہڈیاں، ان کے گوشت پوست پر آپ کی ریاست کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔

عجیب بات ہے کہ قتل کا نام ہی دردناک اور ڈراؤنا ہے کہ اس سے بدن کے پرخچے اڑ جاتے ہیں لیکن جب اللہ کے ساتھ تعلق نصیب ہو، معیتِ باری نصیب ہو تو وہ ایسا

قادر ہے کہ کسی کیلئے تو نرم اور راحت آفریں بستر میں لذت نہیں چھوڑتا اور کسی کیلئے میدانِ کارزار میں لذت رکھ دیتا ہے۔

یاد رہے کہ کانٹا لگ جائے اور خون کا قطرہ بہہ نکلے تو وضو فاسد ہو جاتا ہے، کپڑے پہ لگ جائے تو کپڑا ناپاک ہو جاتا ہے۔ جب شہید کا لہو بہتا ہے تو ہر چیز پاک ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خون آلود لباس مت اتارنا، ایسا لباس دوسرا نہیں ملے گا۔ اسے غسل مت دینا، اس کے خون نے جو اسے غسل دیا ہے وہ کافی ہے، اتنا مبارک پانی تمہارے پاس نہیں ہے کہ جس سے اس کا خون دھویا جائے۔ یار! حلال جانور کا ذبح کے وقت جو خون نکلتا ہے وہ بھی حرام ہے لیکن شہید کے خون میں وہ تقدس آ گیا کہ ہر چیز کو پاک کرتا چلا گیا۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ شہید کے خون کا ایک قطرہ جو زمین پر گرتا ہے، دنیا و مافیھا سے، دنیا میں جو کچھ ہے اس سے زیادہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور مقبول ہے۔

اسلام پھر سے زندہ ہوگا۔ غزوۃ الہند

حالات ہمیں اس مقام کی طرف لئے جا رہے ہیں جس کی خبر اصدق الصادقین ﷺ نے چودہ سو سال پہلے دے دی کہ برصغیر میں غزوۃ الہند برپا ہوگا۔ اللہ کے بندے ایک طرف ہوں گے اور دنیا کا کفر دوسری طرف جمع ہو جائے گا۔ طویل جنگ ہوگی، اسلام غالب ہوگا، مسلمان فاتح ہوں گے، پورا برصغیر اسلامی ریاست بنے گا اور حضور ﷺ نے اس سے بڑھ کر بہت بڑی خوشخبری عطا فرمائی کہ آخر امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ آخری زمانے میں دو جماعتیں ایسی ہوں گی جن کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا اور جو سیدھے جنت جائیں گے۔ ان میں سے ایک گروہ الہند میں جہاد کرے گا اور دوسرا حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ہوگا۔ امام نسائیؒ نے نسائی شریف کی جلد دوئم، صفحہ ۶۳، 'کتاب الجہاد' میں غزوۃ الہند پر ایک پورا باب باندھا ہے۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا مجھے الہند سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ آپ ﷺ نے الہند سے دین کی سلامتی کی ٹھنڈک محسوس فرمائی ہے۔ آپ ﷺ کی ہر بات حق ہے۔

برصغیر میں اس کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں، میں نے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں بتانا شروع کیا تھا۔ اس وقت لوگ حیران ہوتے تھے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے اور اس بارے بات کرنا عجیب سمجھتے تھے لیکن اب شاید صورتحال روز بروز واضح ہوتی جارہی ہے اور عام آدمی کو بھی سمجھ آنے لگی ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ ٹکراؤ ہوگا۔ اس کا وقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن اس کا ہونا یقینی ہے کہ یہ قدرت کا فیصلہ ہے جس کی خبر نبی کریم ﷺ نے دی ہے۔ آپ ﷺ اصدق الصادقین ہیں اور آپ ﷺ پر اعتبار کا نام ہی ایمان ہے۔

اسے غزوہ کیوں کہا گیا؟

اسے غزوہ، محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو مجاہد شریک ہوں گے، ان کو رفاقتِ پیغمبر ﷺ اسی طرح نصیب ہوگی جس طرح بدر و احد و دیگر غزوات میں شامل مجاہدین کو نصیب ہوئی۔ غزوۃ الہند کے مجاہدین کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وہ شفقت، وہ رحمت، وہ تائید اور وہ برکت نصیب ہوگی گویا آپ ﷺ خود وہاں بنفسِ نفیس موجود ہوں۔ حضور ﷺ نے غزوہ فرمایا تو یہ ہوگا ہی غزوہ۔

لاہور میں علماء کی محفل میں کسی نے سوال کیا کہ حضور ﷺ نے الہند کے جہاد کو غزوہ فرمایا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک محقق نے جواب دیا کہ جنگ کو عربی میں عرفِ عام میں غزوہ کہہ دیا جاتا ہے، یہ اس وقت رواج تھا، آپ ﷺ نے رواجاً اسے غزوہ کہہ دیا۔ میں نے عرض کی کہ رواج اس وقت تک رواج رہتا ہے جب تک اسے عام لوگ استعمال کرتے ہیں، اگر وہی رواج نبی ؐ اختیار کرلیں تو وہ دین بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا الہند کے جہاد کو غزوہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جہاد میں شامل ہونے والوں کو حضور ﷺ

کی خاص توجہ نصیب ہوگی۔

نہ اسلام خطرے میں ہے اور نہ پاکستان

اسلام بھی اِن شاء اللہ ہمیشہ رہے گا اور پاکستان بھی رہنے کیلئے بنا ہے، ان شاء اللہ یہ بھی رہے گا۔ جو اس کے مٹنے کی باتیں کررہے ہیں یہ خود مٹ جائیں گے۔ کفر اور اسلام کی جنگ اسی سرزمین ہند پر ہوگی، اس میں پاکستان بھی ہے، ہندوستان بھی ہے، افغانستان بھی ہے۔ دنیا بھر کا کفر ایک طرف ہوجائے گا، ایمان والے متحد ہوجائیں گے، گھمسان کا رن پڑے گا۔ مسلمان شہید ہوں گے، کافر بھی واصلِ جہنم ہوں گے۔ اس میں فتح اسلام کو ہوگی اور پورا ہندوستان پاکستان بن جائے گا ان شاء اللہ۔ یہ اتنی بڑی ریاست ہوگی کہ پوری دنیا میں اسلام کو پھیلانے کا سبب بنے گی۔ ان شاء اللہ یہ سب کچھ ہو گا، مجھے تو اس میں رائی برابر شبہ نہیں اور میں ایک عرصے سے یہ بات دُہرا رہا ہوں۔ اب تو چیزیں صاف نظر آنے لگ گئی ہیں، اب تو چیزیں نکھر رہی ہیں، سامنے آرہی ہیں۔

غزوۃ الہند امام مہدی کی تشریف آوری سے پہلے ہوگا

اخبارات میں کالم نگار لکھتے ہیں کہ امام مہدی آئیں گے تو حالات درست ہوں گے لیکن ابھی یہ وقت نہیں آئے گا۔ امام مہدی کی آمد سے پہلے غزوۃ الہند ہوگا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ غزوۃ الہند سے پہلے امریکہ تقسیم ہوجائے گا ان شاء اللہ۔ باطل کی عمر لمبی نہیں ہوگی۔ میری آرزو ہے، میری محنت، میری کوشش، میری تربیت یہ ہے، میں یہ چاہتا ہوں، میری تو دعا ہے، اللہ کرے مجھے خود اس میں شرکت کا موقع میسر آئے لیکن اگر گزر بھی جائیں تو کچھ لوگ پیدا کر جائیں جو ہماری طرف سے اس غزوہ میں، اس جہاد میں شریک ہوں۔

عظمت الٰہی

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق

عظمتِ الٰہی کو یاد رکھنا، یہی ایک خصوصیت ہے جو بندے میں برائی اور فرعونیت پیدا ہونے نہیں دیتی ورنہ ہر انسان سمجھتا ہے کہ نظامِ کائنات اسی کی وجہ سے چل رہا ہے۔ وہ ہے تو کام چل رہے ہیں، وہ نہ ہو تو کام کا حرج ہو جائے گا۔ حکمران سے لے کر خاکروب تک سب ہی اس غلط فہمی کا شکار ہیں اور یہی وہ بنیادی مرض ہے جو انسان کو اپنی بڑائی میں مصروف کر کے عظمتِ الٰہی سے غافل کر دیتا ہے۔ اس کا علاج بھی عظمتِ الٰہی کو دل میں بٹھانا ہے۔

حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ کریم فرماتے ہیں **کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق** میری ذات ایک چھپا ہوا خزانہ تھی، مخلوق میں سے کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ میری ذات سے آشنا ہونا چاہے، میں نے چاہا کہ کوئی ایسی مخلوق پیدا کروں جو مجھے جانے، پہنچانے، میری ذات کی طالب ہو، میری عبادت کرے، میرے لئے راتوں کو جاگے، مجھ سے باتیں کرے، میرے لئے تڑپے، میرے لئے بے قرار ہو، میرے جمال کی منتظر ہو، میرے قرب کی متقاضی ہو، جو مجھے دیکھنا چاہے، جو مجھ سے بات کرنا چاہے، میرے وصال کیلئے بے قرار ہو اور جو کچھ میں اسے عطا کروں وہ میری چاہت میں مجھ پر نچھاور کر دے **فخلقت الخلق** تو میں نے انسان کو پیدا کر دیا۔

قدرتِ باری کا عجیب اظہار

خالق کسی چیز کا محتاج نہیں اور مخلوق بغیر احتیاج کے رہ نہیں سکتی، یہ بہت بڑا اور واضح فرق ہے۔ وہ ایسا قادر ہے کہ کتنے پانی کو وہ سمندروں سے اٹھا کر بلندیوں پہ لے جاتا

ہے، یہ ہلکی پھلکی چلنے والی ہوا، یہ کتنا پانی اٹھائے پھرتی ہے کہ جب وہ برستا ہے تو زمین سے برداشت نہیں ہوتا۔ جب آسمان سے یا بلندیوں سے پانی کو اتارتا ہے تو زمین سنبھالنے سے عاجز آ جاتی ہے، طوفان آ جاتے ہیں، طغیانیاں آ جاتی ہیں، لوگ غرق ہونے لگتے ہیں، مکان بہہ جاتے ہیں، سڑکیں بہہ جاتی ہیں، تو یہ پانی زمین پر آنے سے پہلے کہاں تھا؟ یہی بادل جو آپ کو محض دھند نظر آتے ہیں ان ہی میں یہ بے پناہ پانی سمویا ہوا تھا اور وہ قادر ہے اس نے ہوا کو اسے اٹھانے کی قوت دے دی اور بادل کو اسے برداشت کرنے کی قوت دے دی لیکن جب وہ برستا ہے تو زمین جس نے اتنی مخلوق کا بوجھ اٹھا رکھا ہے، اس پانی کو سنبھالنے سے عاجز آ جاتی ہے۔

اس کا نظام ایسا عجیب ہے کہ پیپل اور برگد جیسے بڑے بڑے درختوں کا بیج خشخاش سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ برگد کا درخت دو سو سال میں جا کر جوان ہوتا ہے۔ پھر اللہ کی قدرت دیکھیں، پرندے کا معدہ بڑا سخت ہاضم ہوتا ہے۔ ایسے پرندے بھی ہیں جن کی غذا اللہ نے کنکر مقرر کر دی ہے جو اس کے معدے میں ہضم ہو جاتے ہیں سخت سے سخت بیج کھاتا ہے، اس کے معدے میں ہضم ہو جاتا ہے لیکن پیپل اور برگد کا بیج جو پرندے کے معدے سے نکل کر، اس کے فضلے میں جا کر زمین پر گرتا ہے صرف وہی اگتا ہے ورنہ جتنے بیج گرتے ہیں یہ سارے اگر پیدا ہوتے تو شاید کسی اور چیز کے زمین پر پیدا ہونے کی جگہ ہی نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایسا سخت نظام بنا دیا ہے کہ پرندے کے معدے میں جا کر دانہ گل کر اتنا نرم ہو جاتا ہے کہ اُگنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

رازق اللہ کی ذات ہے

ہم اپنی زمینوں پہ کنواں کھود رہے تھے کہ کوئی پندرہ یا اٹھارہ فٹ کے بعد سخت (solid) چٹانیں آ گئیں۔ ہم نے 234 فٹ تک وہ چٹانیں کاٹ کر کنواں بنایا۔ ہم نوے

فٹ کے قریب تھے تو ایک چٹان مزدوروں نے بارود لگا کر توڑی تو اس میں سے پتھر کی ایک گیند نکلی جتنی یہ کرکٹ کی گیند ہوتی ہے۔ جب انہوں نے اسے توڑا تو اس میں اتنی سی جگہ جتنا پرانا چاندی کا روپیہ ہوتا تھا، خالی تھی اور اس کے اندر پروں والی تتلی پھر رہی تھی۔ وہ وہاں پیدا ہوئی، اللہ نے اسے وہاں گھر بنا دیا۔ اسے ہوا بھی چاہیے تھی، آکسیجن بھی چاہیے تھی، غذا بھی چاہیے تھی، رطوبت، پانی بھی چاہیے تھا اور ایک ہی تھی، کوئی جوڑا بھی نہیں تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ وہ پتھر بھی دیکھا اور وہ تتلی بھی۔ تو میں نے کہا، ایک محاورہ سنا تھا کہ اللہ پتھر میں بھی کیڑے کو روزی دیتا ہے۔ تو وہ قادر ہے، ہر متنفس کو جہاں وہ ہے، اسے روزی پہنچا رہا ہے۔ ہماری روزی بھی اس کے ذمے ہے اور وہ پہنچاتا ہے، پہنچا رہا ہے اور پہنچاتا رہے گا۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ روزی وہ دے رہا ہے اور ہم سمجھتے یہ ہیں کہ ہم نے اپنی ہمت سے کمائی ہے، بس یہاں غلطی لگ جاتی ہے۔

اللہ سے محبت کیسے کریں

بظاہر یہ بڑا مشکل سوال ہے کہ جی اللہ سے محبت کیسے کریں؟ لیکن بڑا آسان کام ہے اور اس میں ساری مشکل یہ ہے کہ صرف اپنی انا کو چھوڑنا پڑتا ہے، بس، اپنا لکھ (کچھ) نہیں رہتا۔ میں یہ ہوں، میں وہ ہوں، میں علامہ ہوں، میں پیر ہوں، میں نیک ہوں، میں پارسا ہوں، یہ سارا کچھ چلا جاتا ہے بندہ کچھ نہیں رہتا۔ میری یہ پسند ہے مجھے یہ ناپسند ہے یہ سب بھی ختم ہو جاتا ہے، کچھ نہیں رہتا۔ ایک ہی پسند رہ گئی، جو حضور ﷺ کی ادا ہے وہ اپنانی ہے، بات ختم ہو گئی اور اس میں اللہ یہ فیضانِ صحبت بھی عطا کر دے تو نور علیٰ نور ہے۔

اللہ کی ذات ہے ہی عبادت کے لائق

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (الزمر:3) جب کوئی ماننے والا کسی کی عبادت کرے اور خود کو عبادت کرنے والا اور معبود کو معبود برحق مان کر اپنا اور معبود کا رشتہ استوار

کرے تو اس کی سزاوار صرف اللہ کی ذات ہے۔ یہ بات صرف اللہ کے ساتھ رکھنی ممکن ہے۔ اسی لئے معبودانِ باطلہ کی عبادت کوئی بھی خلوص سے نہیں کرتا۔ دنیا کے مذاہب باطلہ کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے۔ کوئی بتوں کو پوجتا ہے، کوئی سورج کو، کوئی چاند کو تو کوئی آگ کو، لیکن تمام پوجنے والے اپنے معبود کو اس لیے نہیں پوجتے کہ وہ لائقِ عبادت ہے۔ اُن کی عبادت میں اخلاص نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معبود کے ساتھ صرف اغراض کا رشتہ رکھتے ہیں کہ فلاں کی پوجا سے یہ خواہش پوری ہو جائے گی اور فلاں سے یہ ضرورت پوری ہو گی۔ یہ کمال صرف ذاتِ باری میں ہے کہ جو اپنا رشتہ اللہ سے بنانا چاہے اور خود کو اتباعِ نبوی ﷺ میں لے آئے، اس کا قلب و باطن مان لیتا ہے کہ اللہ کی ذات ہے ہی عبادت کے لائق۔

آج ہم جس دور میں ہیں اس میں ہماری عبادت بھی، ہمارا اسلام بھی، ہمارا اللہ کو ماننا بھی اغراض سے وابستہ ہے۔ ہمارا رشتہ بھی خلوص سے عاری ہے اس لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں تو ہمیں دنیوی تکالیف سے بچایا جائے۔ ہم عبادات کرتے ہیں تو ہمارے گھروں، خاندانوں میں کوئی مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔ ایسی عبادت مذاہبِ باطلہ میں ہے دینِ اسلام میں نہیں۔ دین تو خلوص کے رشتے کا نام ہے اور یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ بندے کا اللہ سے تعلق ہو تو پھر کھرا ہو، اللہ سے کھوٹا تعلق ہونا ممکن نہیں۔ اللہ کی ذات ہی ایسی ہے کہ جو اس سے رشتہ رکھتا ہے وہ کھرا ہی رکھتا ہے، اللہ سے تعلق کے علاوہ تمام تعلقات اغراض و مفادات پر مبنی ہوتے ہیں۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (البقرہ:22)

اللہ وہ ہستی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنا دیا۔ کیسا عجیب فرش ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اسے وہ سمو لیتا ہے۔ ہم بستیوں کی بستیاں جلا دیتے ہیں، زمین اسے ڈھانپ لیتی ہے۔ ہم بے شمار غلاظتیں پھیلاتے ہیں، زمین اس سب کو سمو لیتی ہے پھر

اس کے بدلے ہمیں بہترین اور خوبصورت رزق عطا کرتی ہے۔ مرنے والے لوگوں کو دیکھو کہ اگر زمین اپنا سینہ فراخ کر کے انہیں نہ سموتی تو کسی کے لیے سانس تک لینا ممکن نہ ہوتا۔

زمین اتنی نرم ہے کہ آپ اسے سوئی سے کھودنا شروع کر دیں تو کھودتے چلے جائیں گے اور اتنی مضبوط ہے کہ سینکڑوں منزلہ عمارت اس کے سینے پر کھڑی کر دو تو اٹھا کر کھڑی ہے۔ کوئی مر جائے تو اسے قبول کرتی ہے، جو زندہ ہے اسے رزق دیتی ہے اور کتنی مخلوق ہے کہ زمین کا سینہ پھاڑ پھاڑ کر طرح طرح کی نعمتیں حاصل کر رہی ہے۔ کب سے کھیتیاں اگ رہی ہیں، کب سے یہ پھل پک رہے ہیں، کب سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور دیئے جا رہی ہے، دیئے جا رہی ہے کوئی سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (الزمر:20)

اللہ نے جنت تیار کی ہے اس میں باغات تیار کیے ہیں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (الزمر:20) دنیا کے باغ نہروں کے تابع ہیں، پانی کے تابع ہیں۔ جہاں پانی پہنچ سکتا ہو وہاں باغ لگایا جاتا ہے، جہاں پانی نہیں پہنچ سکتا وہاں باغ نہیں لگایا جاتا۔ لیکن فرمایا! اللہ کے وہ باغ ایسے ہیں کہ پانی ان کے تابع ہے۔ جہاں وہ باغ اگا دیتا ہے وہاں پانی کو پہنچنا پڑتا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی ایسی قدرتِ الٰہیہ ہے، جنت ایسی جگہ ہے کہ جہاں باغ لگا دیا جاتا ہے، پانی کو وہاں پہنچنا پڑتا ہے۔ دنیا کے باغ نہروں کے تابع ہیں اور جنت کی نہریں باغوں کے تابع ہیں۔ ایسی خوبصورت جگہ ہے جس کا انسان تصور نہیں کر سکتا۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ہمارے اردو والے تو ترجمہ لکھ دیتے ہیں کہ باغوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ باغوں کے نیچے نہیں، یہاں 'تحت' کا مفہوم ہے کہ ان کے تابع ہوں گی۔ آپ بھی اس کو جو کسی کے تابع ہو ماتحت کہتے ہیں۔ یعنی نہریں باغوں کے ماتحت

ہوں گی، ان کے تابع ہوں گی۔

عظمتِ الٰہی، عقلِ انسانی اور ضرورتِ انبیاءؑ

اللہ خالق و مالک ہے۔ مخلوق کو اللہ نے صلاحیتوں سے نوازا ہے لیکن وہ محدود ہیں۔ مخلوق کی بصارت کی ایک حد ہے اور بصیرت کی بھی، علم و فکر کی بھی ایک حد ہے اور شعور و ادراک کی بھی۔ اسی طرح تمام محسوساتِ انسانی محدود ہیں۔ اللہ کی ذات و صفات حدود سے بالاتر ہے۔

لامحدود کو محدود میں سمونا ممکن نہیں لہٰذا انسان اپنی عقل سے اس ذات کو نہیں پا سکتا۔ عقلِ انسانی انتہائے کمال پر پہنچ کر اس حقیقت سے آشنا ہوتی ہے کہ کوئی ہے جو اس نظام کو چلا رہا ہے۔ خالق کی تخلیقات سے اسے اتنا پتہ ملتا ہے کہ کوئی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، جو اس نظام کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے، جس نے کائنات کی قوتوں کو باہم مربوط کر رکھا ہے اور ہر چیز اپنے وقت پر ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ کوئی ہے جو بارشیں روک لیتا ہے اور زمین پر گرداڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی ہے جو ان بارشوں کو برساتا اور زمین کو سبزہ زار بنا دیتا ہے۔ کوئی ہے جو مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور انہیں موت سے ہم کنار کر دیتا ہے لیکن وہ کون ہے، کیسا ہے؟ اس کا جواب عقل نہیں دے سکتی۔

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

اگر دانا، عقلاء اور فلاسفہ اس گتھی کو سلجھا لیتے تو انبیاءؑ کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ انبیاءؑ اسی لیے مبعوث فرمائے جاتے ہیں اور نبوت ایک ایسا کمال ہے جو بندے کو اللہ کے روبرو کر دیتا ہے، نبی اللہ کی ذات کو جانتا ہے، سمجھتا ہے اور سمجھا سکتا ہے۔ انبیاءؑ اللہ کریم سے آشنائی حاصل کرنے کا وہ ذریعہ ہیں کہ اگر یہ ذریعہ درمیان سے نکال دیا جائے

تو بندہ اپنی ذاتی استعداد، علم وفکر سے کبھی اس مقام تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ لہٰذا نبیؑ کی ضرورت شاید زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔

ساری محنت، سارے مجاہدے کا حاصل یہ ہے کہ یہ سمجھ آجائے کہ اللہ کی عظمت ہمارے ادراک میں نہیں آسکتی لیکن ہمیں اپنی حیثیت کے مطابق کم از کم اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ بہت عظیم ہے، اس کی کوئی مثال نہیں۔ انسان جب اپنی فطرتِ سلیمہ کو غفلت کے پردوں میں دبا دیتا ہے تو اپنی ذمہ داری سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔

رب کی تلاش

اگلے روز شام کے وقت دو نوجوان آگئے، میں باہر بیٹھا تھا۔ کہنے لگے ہم گجرات سے آئے ہیں، وکیل ہیں، بڑی جگہوں پر گئے، بڑی خانقاہیں، بڑے دربار پھرے لیکن جہاں جاتے ہیں وہی دنیاداری ہی ہے، کوئی اللہ کا پتہ، رب کا پتہ نہیں بتاتا۔ میں نے ان سے کہا کہ اللہ کریم تو گم نہیں ہوتے، ہم خود گم ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں۔ خود کو تلاش کرو من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے اللہ تو گم نہیں ہوتا ہم خود گم ہو جاتے ہیں اور خود کو کھو دیتے ہیں۔ تو اپنے آپ کو تلاش کرو کہ تم کون ہو، کیسے ہو، کہاں ہو، تو تمہیں اللہ کریم تو اپنے اندر بھی نظر آئے گا، باہر بھی نظر آئے گا، ساتھ بھی نظر آئے گا، ہر وقت، ہر جگہ موجود ہوگا۔

قربِ الٰہی

قربِ الٰہی کی کوئی ایسی انتہا نہیں جہاں پہنچ کر بندہ سمجھے کہ آگے اللہ کریم سامنے آ گئے ہیں اور اس سے دریٰ الوریٰ کوئی منزل نہیں۔ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے لیکن بندہ خود اتنا دُور ہو جاتا ہے کہ خود کو تلاش کرنا محال ہو جاتا ہے۔ اللہ کو تلاش کرنا مشکل نہیں وہ تو قریب ہی ہے۔ بندہ خود ہی دُور چلا جاتا ہے اور واپسی کیلئے عرصہ نہیں صرف لمحہ چاہیے۔

ایک احساسِ ندامت، چند آنسو، دردِ دل
اے خدا! تجھ کو منانا کس قدر آسان ہے

تو اللہ کریم کے قرب کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اللہ سے جب تعلق بنتا ہے تو زندگی کا ایک ایک سانس گروی ہو جاتا ہے، اپنا نہیں رہتا۔ ایک ایک لمحہ اللہ کا ہو جاتا ہے، ایک ایک عمل کے وقت حضورِ حق کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ میں کیا کہنے لگا ہوں۔ میں کیا کرنے لگا ہوں اور میرا رب تو میری جان سے زیادہ میرے قریب ہے، میرے پاس ہے، میں اللہ کے روبرو کیا کر رہا ہوں۔

قربِ الٰہی کا معیار

قربِ الٰہی کا معیار یہ ہے کہ جتنا جتنا عبادات میں، نیکی میں بندے کا دل لگتا جائے، اتنی ہی برائی اور نافرمانی سے نفرت ہوتی جائے۔ اگر کسی کو کوئی مراقبات نصیب ہو بھی گئے مگر نیکی کی محبت اس میں نہ آسکی تو ہو سکتا ہے مشائخِ سلسلہ کی کرامت کی وجہ سے یا ان کے پاس بیٹھنے کی وجہ سے وقتی طور پر کوئی انوارات کا پرتو آ گیا ہو لیکن وہ دوسرے ہی لمحے سلب ہو جاتا ہے۔ جب تک عمل میں تبدیلی نہ آئے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ چونکہ محاسبہ اعمال کا ہوگا۔ پھر جو عمل ہم کرتے ہیں اس میں کتنا خلوص ہے اور کس قدر اس میں خشوع وخضوع ہے۔ یہ خلوص اور خشوع وخضوع ایسی کیفیات ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہے یعنی آپ کوئی حد مقرر نہیں کر سکتے کہ یہاں پہنچ کر بندے کا خلوص کامل ہو گیا یا اس کا خشوع و خضوع کامل ہو گیا چونکہ یہ تعلق باللہ کی، قربِ الٰہی کی کیفیات ہیں اور قربِ الٰہی کی کیفیات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور نہ کبھی ہوگی۔

اسی طرح جنت میں ہر جنتی کی اپنی حیثیت کے مطابق ترقی ہوتی رہے گی اور ابدالآباد ہوتی رہے گی اور کوئی انتہا نہیں آئے گی اس لئے کہ یہ قربِ الٰہی ہے اور اس میں کسی

جگہ پہنچ کر کوئی انتہا نہیں آئے گی کہ جی ربِ کریم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے آگے کوئی جگہ نہیں ہے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ احادیثِ مبارکہ میں موجود ہے کہ اہلِ جنت کے حالات ہر لمحہ ترقی پذیر ہوں گے بلکہ کھانے تک میں یہ فرق ہوگا کہ ایک لقمہ کھانے کے بعد جب اسی کھانے سے دوسرا لقمہ کھائیں گے تو اس میں پہلے سے زیادہ لذت ہوگی، ہر چیز میں ترقی ہوتی رہے گی۔

چونکہ بنی آدم کا مزاج اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ ایک حال پر رہ جائیں تو اکتا جاتے ہیں خواہ جنت میں ہی ہوں یعنی جنت کی زندگی بھی اگر روٹین ورک بن جائے تو اللہ کے بندے چوتھے دن دعائیں کرنے لگیں گے کہ اے اللہ! آپ نے ہمیں کہاں پھنسا دیا۔ تو وہ خالق ہے، مالک ہے، اس نے خود مزاج بنایا ہے، اس نے اپنے بندوں کیلئے ہر لمحہ میں پہلے سے زیادہ لذت، زیادہ سکون، زیادہ آرام، زیادہ برکات کا اہتمام کر دیا۔ اب وہ جگہ کبھی نہ ختم ہونے والی میعاد کی ہے، کبھی نہ ختم ہونے والی عمر کی ہے تو اس کا مطلب ہے وہ ترقی بھی کبھی ختم نہ ہوگی۔

قربِ الٰہی کی عجیب خصوصیت

معرفتِ الٰہی یا قربِ الٰہی کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جتنا اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے اتنا اس کی عظمت دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور اپنے کچھ نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اپنی حیثیت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں، میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک ایک ذرہ کارآمد ہے لیکن اربوں ذرات جو میرے وجود میں مرتسم ہو گئے ہیں میں نے تو یہ بھی گناہوں سے آلودہ کر دیئے۔ وہ ذرۂ خاک جو گرد میں اڑتا ہے، جو راہوں میں پڑا ہے، اس نے کم از کم کوئی گناہ تو نہیں کیا اور یہ کھربوں ذرات جو میرے جسم میں مرتسم ہو گئے ہیں، میں نے تو یہ ذرات بھی نافرمانیوں سے آلودہ کر دیئے۔

قربِ الٰہی کے راستے کی مشکلات

علماءِ حق فرماتے ہیں کہ قربِ الٰہی کے راستے میں مصیبتیں ہیں، مشکلات ہیں، تکلیفیں ہیں۔ شیطان انسان کا دشمن ہے اور شیطان کے سارے چیلے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس میں جان کا خطرہ ہے، جسمانی ایذا، بدنامیوں کی گھاٹی، بیماریوں کے حملے ہیں لیکن سب سے مشکل منزل وہ ہے جب لوگ ان کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور تہمتیں لگاتے ہیں، الزام لگاتے ہیں لیکن اللہ کے بندے جنہیں جمالِ الٰہی سامنے نظر آ رہا ہوتا ہے وہ بھلا ان چیزوں کی کب پرواہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے دل درد آشنا ہوں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ مراقبات میں آدمی ایسی جگہ چلا جاتا ہے جہاں تکالیف اور مصیبت کا آنا اس کا ضروری حصہ ہوتا ہے۔ جیسے شہید کے لیے قتل ہونا ضروری ہے۔ شہادت ایک مقام ہے اس کو پانے کے لیے قتل ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اہل اللہ کے بعض مراقبات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ یہ چیزیں وابستہ ہوتی ہیں، وہاں سے گزرنا ہوتا ہے۔ کسی میں صحت خراب ہوگی، کسی میں بیماری آئے گی، کسی میں دنیوی تکلیف آئے گی۔

اب بھلا جنہیں بارگاہِ نبوی ﷺ کی حضوری نصیب ہو، ان پر کوئی طعن کرے، انہیں بدنام کرے، ان پر الزام لگائے تو کیا وہ باز آ جائیں گے، انہیں کوئی روک لے گا۔ لیکن یہ اس راستے کی شرط ہے۔ مگر مسافر کو راستے کی کٹھنائیوں سے یا خار دار جھاڑیوں سے مطلب نہیں ہوتا، وہ اپنا دامن بچاتا ہوا، پھٹ جائے تو دامن پھاڑتا ہوا، کٹ جائے تو گلا کٹواتا ہوا محبوب کی بارگاہ پہ نظر رکھتا ہے کہ میری منزل وہاں ہے۔

بارگاہِ الٰہی

اللہ کے کرم کو کوئی کہاں تک گنتا رہے، کہاں تک شمار کرتا رہے۔ یہ ایک ہی بارگاہ ہے جس میں تنگیٔ داماں کا علاج بھی ہے کہ اگر تمہارا دامن پھٹا ہوا ہے تو وہ سی دیں گے، تنگ ہے تو وسیع کر دیں گے۔ جتنے درد سے مانگو گے اتنا تمہارا دامن بھی بڑھا دیں گے، اپنی عطا بھی بڑھا دیں گے جو تمہارے علوم، تمہاری سمجھ، تمہارے فہم، تمہارے شعور و ادراک کی حدوں سے بالاتر ہے۔ اپنی تنگ دامنی کو دیکھتے ہو تو حسرت ہوتی ہے لیکن یہ بارگاہ ایسی ہے کہ یہاں دامن تنگ بھی لے جاؤ تو وہ وسعتِ دامن بھی عطا کر دیتے ہیں۔ جتنا کوئی مانگتا جائے، اتنا عطا کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بندہ اپنی حیثیت کے مطابق مانگتا ہے اور اللہ اپنی شان کے مطابق عطا فرماتا ہے۔

عشقِ الٰہی

دردِ عشق کو پالینا کچھ بات ہی الگ ہے۔ اس کی محبت میں گھل گھل کے مرنا ایک اور ہی بات ہے۔ اس کیلئے راتوں کو تڑپ کر اٹھ جانا کوئی اور معنی رکھتا ہے۔ اس کی آرزو میں مسجد میں آنا کچھ اور مفہوم رکھتا ہے۔ رکعتیں پوری کرتے ہیں، فاتحہ، تسبیحات، تکبیرات، سجدے اور رکوع کرتے ہیں، الحمدللہ! نماز ادا ہو جاتی ہے، لیکن ایک ایک لفظ اللہ کے روبرو کہنا کچھ اور بات ہوتی ہے۔ ایک ایک سجدہ اس کے سامنے ادا کرنا کچھ اور کیفیت رکھتا ہے۔ اپنے دل کی بات اس سے کہنا، اپنے دکھ اس سے بیان کرنا، اپنی طلب، اپنی آرزو بیان کرنا ایک اور کیفیت ہے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کیفیت ہر مسلمان میں ہو۔ اب اول و آخر اس آرزو کو جگانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے برکاتِ محمد رسول اللہ ﷺ کا حصول۔ تعلیماتِ نبوت نے بتا دیا اللہ کیسا ہے، اس کی ذات کیسی ہے، اس کی صفات کیسی ہیں۔ برکاتِ نبوت نے دل میں اس کی آرزو پیدا کر دی اور عشق کی چنگاری روشن کر دی۔

برکاتِ نبوت نے آرزوئے وصل کو ہوا دی اور مشتِ غبار نے عشقِ الٰہی کا دیا روشن کر لیا۔

کہاں ایک عاجز محتاج بندہ، کہاں اس کی ذاتِ بے ہمتا۔ لیکن ایک درجے میں یہ آرزوئے وصل لئے پھرتا ہے، یہ اس کیلئے بے قرار ہوتا ہے، اس کے لئے گوشوں میں بیٹھ کر روتا ہے اس سے ملنا چاہتا ہے، روبرو ہونا چاہتا ہے اور یہی ایمان کی صفت ہے۔

عشقِ الٰہی کا معاملہ مختلف ہے

ہمارے ادب میں، ہماری شاعری میں اور تمام اصنافِ سخن میں ہمیں یہی تصور دیا گیا ہے کہ محبوب ہمیشہ پہلو تہی کرتا ہے، بات نہیں سنتا، بے رخی کرتا ہے۔ عشقِ الٰہی میں معاملہ الٹ ہے۔ یہاں عشاق کی گنتی نہیں ہے جبکہ محبوب ایک ہے۔

عشقِ الٰہی میں پہلی عجیب بات یہ ہے کہ محبوب خود عاشق کو، دیوانے کو خطاب کرتا ہے اور اپنے پانے کا راستہ بتاتا ہے۔ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ سارے عاشق ایک دوسرے سے بھی اتنا پیار کرتے ہیں جتنا اللہ سے عشق کرتے ہیں یعنی اس محبت میں رقابت نہیں بلکہ محبت ہی محبت ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ساری مخلوق جنونِ عشقِ الٰہی میں مبتلا ہو جائے تو ان کی آپس میں بھی محبتیں بڑھ جاتی ہیں۔

اللہ سے تعلق کا تقاضا

اللہ محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ نے انسان کو شعور اس لئے دیا کہ وہ اس کی ذات کو سمجھے، اس کی صفات کو سمجھے، اسے اس قابل سمجھے کہ اس پر جان قربان کرنی چاہیے۔ واقعی یہ ذات ایسی ہے کہ اس پر جان نچھاور کرنی چاہیے۔

اللہ کو تو وہ خلوص چاہیے، وہ درد چاہیے جو دل سے اٹھے اور سوائے وصالِ الٰہی کے اُس کی کوئی دوا نہ ہو۔ وہ taste (ذوق) چاہیے جس سے صرف اللہ کے نام پہ سکون بھی ملے اور اُس کی آتشِ شوق اور بھی بھڑکے۔ ایسا دل چاہیے جو جوں جوں اللہ کے قریب

ہواس کا درد اور بڑھے، آتشِ شوق مٹنے کی بجائے اور بھڑکے۔ اس لئے کہ صرف وہ ذات اس قابل ہے جس پہ جان لٹائی جائے، وہ ہے جس کو چاہا جائے، وہ ہے جس سے محبت کی جائے، وہ ہے جس پہ سب کچھ لٹایا جائے۔ اور جب اس سے تعلق بنتا ہے تو پھر رد اں رد اں اس کا ہو جاتا ہے، پھر سوچیں اس کی ہو جاتی ہیں، سانسیں اس کی ہو جاتی ہیں۔ کردار اور عمل اپنا نہیں رہتا، حکم کا منتظر رہتا ہے۔ جو کرنے کا حکم ملتا ہے وہ کرتا ہے، جہاں سے روک دیا جاتا ہے وہاں رک جاتا ہے۔ جہاں مارنے کا حکم ملتا ہے وہاں مارتا ہے، جہاں مرنے کا حکم ملتا ہے وہاں مر جاتا ہے۔ اگر یہ بات نہیں تو پھر اس سارے ہاؤ ہو کا کیا فائدہ؟ پھر ہم سے تو سیاستدان بھلے جو لاکھوں لوگ جمع کر لیتے ہیں، ان کو کچھ کھلاتے پلاتے ہیں، ان سے کچھ چندے وصول کرتے ہیں۔ پھر ہم سے دنیا دار ہی بھلے، ہاؤ ہو کر کے، جلسے جلوس نکال کر، جھنڈے اشتہار لگا کر کچھ قبروں پر، کچھ مقبروں پر، کچھ دیواروں پر، کچھ درختوں پر، لوگوں سے نذرانے بھی وصول کر لیتے ہیں، جمِ غفیر بھی جمع کر لیتے ہیں۔

فلاسفہ کا اصول

فلاسفہ کا ایک اصول ہے کہ آپ اللہ کے احسانات کو دیکھنا چاہیں تو یہ بھول جائیں کہ کائنات میں اور لوگ بھی ہیں۔ آپ یہ تصور کریں کہ اس دنیا میں صرف میں ہوں تو پھر آپ کو سمجھ آئے گی کہ ساری کائنات ایک بندے کی خدمت پر مامور ہے۔ سورج اس کیلئے گرمی پہنچاتا ہے، اس کیلئے بادل بنتے ہیں، صرف اسی ایک بندے کیلئے بارش برستی ہے۔ اسی طرح کائنات کا ہر ذرہ اس نے ایک ایک بندے کی خدمت پر مامور کر دیا ہے اور اس کی کیسی عجیب شان ہے کہ اسی نے انسان کو بنایا، وہی جانوروں کا خالق ہے، وہی انسان اور جانور کو روزی بھی دیتا ہے۔ انسان کو اتنی عظمت دی کہ وہ جانور کو کاٹ کر کھا لیتا ہے اور مزے کی بات ہے کہ وہی ذبح بھی کرے اور الٹا وہی ثواب لے۔ اللہ کی مخلوق ہے کسی پر

آپ نے بوجھ لادا ہوا ہے، کسی کی کھال کے جوتے پہنے ہوئے ہیں، کسی کا گوشت آپ کی خوراک ہے، کسی کا دودھ آپ کی خوراک ہے اور ایسا پیچیدہ ایک نظام بنا دیا کہ اب تو یہ بات واضح ہے کہ انسانی جسم میں بے شمار ذرات (Atoms) ہوتے ہیں، بے شمار ذرے (cells) اس میں سے گرتے بھی رہتے ہیں، نئے بھی شامل ہوتے رہتے ہیں، یہ سارے کہاں سے آتے ہیں؟ وہ ذراتِ خاکی کو مختلف قالبوں میں ڈھالتا ہے۔ کہیں فصل میں، کہیں گھاس میں، کسی جانور نے اُسے چرا، تو جس قالب میں وہ جانی تھی جس وجود میں وہ ذرات جانے تھے، اس جانور کا دودھ یا گوشت بن کر اس انسان تک پہنچا۔ انسان سوچے کہ اس کی خاطر کہیں گندم بنی، چاول بنے، پھل بنے، یہ مٹی کے سارے روپ ہیں۔ کسی ایک بندے کے حصے کا ایک دانہ کوئی دوسرا بندہ نہیں کھا سکتا۔ کس قدر جامع نظام صرف تمہارے لیے بنا دیا۔

وہ آپ کا، میرا محتاج نہیں ہے۔ محتاج ہم ہیں، ناز برداریاں وہ فرما رہا ہے اور اتنی ساری کائنات کو ایک ایک فرد کی خدمت پر لگا دیا۔ ہر وجود میں ایک جہان ہے، بے شمار قسم کی مخلوق اس میں موجود ہے۔ اس کی رگوں میں، اس کے خون میں، اس کے دماغ میں کیا کیا ہو رہا ہے؟ دماغ میں ایسا عجیب کمپیوٹر ہے کہ ایک آدمی ملتا ہے، وہ فوراً اپنی فائلیں کھولتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ اس بندے کو تو میں نے بیس سال پہلے دیکھا تھا، فوراً اس کی تصویر آ جاتی ہے کہ اسے میں بیس سال پہلے فلاں جگہ ملا تھا۔ اس نے انسان کے دماغ میں یہ کیا کیا بنا دیا۔ اتنی یادداشتیں، اتنی تصویریں یہ کس طرح سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اگر دیکھیں کہ اس کمپیوٹر میں کیا ہے تو ٹیڑھی ٹیڑھی سی رگیں ہیں اور ان میں ایک گاڑھی رطوبت سی بھری ہوئی ہے، اور کچھ بھی نہیں۔ اور جس خالق نے یہ سب بنایا ہے اگر اس سے تعلق بگاڑو گے تو فرمایا، وہ تمہیں نابود کر دے گا، کوئی اور قوم پیدا کر دے گا جو اس سے محبت کرے گی اور جس سے وہ

محبت کرتا ہوگا۔

ایک ہی آرزو

ہر نبیؑ جو کمالات اور شفقتیں بانٹتا تھا، وہ کام ختم ہو گیا۔ اب ایک ہی دکان رہ گئی جو کبھی بند نہیں ہوگی اور وہ در ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا۔ یہ شرط نہیں کہ مدینہ پہنچو، یہ شرط نہیں کہ عرب میں آؤ، یہ شرط نہیں کہ حرم میں بیٹھو، یہ شرط نہیں ہے کہ بڑے خوبصورت ہو، بڑے قد آور ہو، یہ شرط نہیں ہے کہ دولتمند ہو، حکمران ہو، ایک ہی شرط ہے کہ زمین و آسمان کے کسی گوشے میں، کائنات کے کسی جنگل میں، کسی غیر آباد جزیرے میں، جہاں کہیں ہو تمہارے سینے میں دل تو ہے، دل میں خواہشات بھی ہیں، آرزوئیں بھی ہیں، کیا ان میں یہ آرزو بھی ہے کہ میں اللہ کا ہو جاؤں یا اللہ کو اپنا کر لوں؟ اگر ہے تو تم نے مقصدِ حیات پا لیا اور اگر نہیں ہے تو زندگی جھک مارتے گزار دی۔

اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے

ویسے سوچنے کی بات ہے کہ اس کی رحمت ہم سے کس قدر مایوس ہوتی ہوگی کہ وہ کتنی وسیع ہے اور ہمارا دامن کتنا تنگ ہے۔ وہ ہمیں کتنا زیادہ نوازنا چاہتا ہے اور ہم کتنے تھوڑے پہ راضی برضا ہیں، ہمیں زیادہ کی تمنا ہی نہیں ہے۔ اس پر اصل کمال تو یہ ہے کہ اس کی ذات بے نیاز ہے اور ہم ہر دم محتاج۔ بے نیاز ہوتے ہوئے بھی اس کی رحمتیں ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور برکتیں اور عنایتیں ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ ہر لمحہ لٹانے پہ آمادہ ہے، کوئی لوٹنے والا چاہئے۔ ہم ہر سانس، ہر قدم، ہر حال میں اس کے محتاج ہوتے ہوئے بھی بے اعتنائیاں برتتے ہیں۔

نبوت و رسالت / عظمتِ پیغمبر ﷺ

شمسِ نبوت طلوع ہوا۔۔۔۔۔۔۔

یہ جزیرہ نمائے عرب اپنی مثال آپ تھا۔ اللہ کریم نے اسے دنیا کا مرکز بنایا ہے اور نقشے کے اعتبار سے بھی یہ عین دنیا کے مرکز میں ہے۔ یہاں کے باسی ہر ملک جاتے تھے، تجارت پیشہ لوگ تھے جہاں جاتے تھے وہاں کی برائی بھی لے کر آتے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب میں روئے زمین کی ساری برائیاں بیک وقت جمع ہو گئی تھیں۔ قاتل بھی تھے، چور بھی تھے، ڈاکو بھی تھے، مشرک بھی تھے، کافر بھی تھے، جادوگر بھی تھے، آگ کے پجاری بھی تھے، ستاروں کی پوجا کرنے والے بھی تھے۔ جتنی برائیاں زمین پر متفرق تھیں وہ آکر جزیرہ نمائے عرب میں جمع ہو گئیں۔ پھر شمسِ نبوت طلوع ہوا۔ عجیب بات ہے، کھال نہیں بدلی، چہرہ نہیں بدلا، قد نہیں بدلا، ہر چیز وہی تھی لیکن بندہ بدل گیا۔

کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

مُردہ زندہ کرنا بھی بہت بڑا معجزہ تھا لیکن آپ ﷺ نے تو مُردوں کو، مُردے زندہ کرنے والا بنا دیا۔

معرفتِ پیغمبر ﷺ

سارے نبیؑ ازل سے نبی ہیں، دنیا میں پیدا کیثیتِ نبیؑ ہوتے ہیں، برزخ میں نبیؑ رہتے ہیں، میدانِ حشر میں نبیؑ ہوں گے، جنت میں بھی تختِ نبوت پہ جلوہ افروز ہوں گے، نبیؑ نبیؑ ہی ہوں گے۔ نبوت وہبی صفت ہے، اللہ سے عطا ہوتی ہے اور ہمیشہ کیلئے عطا ہوتی ہے۔ نبیؑ محنت سے، مجاہدے سے اور پڑھنے پڑھانے سے نہیں بنتے، نبیؑ بنے بنائے آتے ہیں اور ہمیشہ نبیؑ ہی رہتے ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کا اتباع اللہ کی اتنی بڑی نعمت تھی کہ اللہ نے اپنے پیاروں کو، اپنے نبیوںؑ کو، اپنے رسولوںؑ کو شبِ معراج یہ موقع عطا فرمادیا۔ شبِ معراج اللہ تعالیٰ آدمؑ سے عیسیٰؑ تک تمام انبیاء و رسلؑ کی مقدس جماعت کو نبی کریم ﷺ کی صحبتِ عالی سے فیض یاب کرنے کیلئے برزخ سے بیت المقدس لے آئے۔ ان سب ہستیوں کو جو اپنے اپنے وقت میں اللہ کے بندوں کو واصل باللہ کرنے کیلئے اللہ کی معرفت بانٹنے اور مخلوق کو ہدایت پہنچانے کا کام کرتی رہیں۔ کوئی شہید ہو کر اپنی منزل کو پہنچا اور کسی کو اور طرح سے دارِ بقاء کو سدھارنا ہوا، ان سب کو برزخ سے واپس لوٹایا گیا کہ دو رکعت ہی سہی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں صلوٰۃ ادا کریں۔ حضورِ اکرم ﷺ کے اتباع میں سجدہ وہ نعمت ہے جو ہمیں قیامت تک کیلئے نصیب ہے لیکن ہم سے وہ سجدہ نہیں ہوتا، ہم اس کی پروا نہیں کرتے، یہ سجدہ ہمارے لیے بوجھ بن گیا ہے۔

جس ہستی کا ایک ایک عمل، طرزِ عبادت، طرزِ حیات، رکوع و سجود اتنا عظیم ہو کہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والتسلیم مقبولانِ بارگاہِ الٰہی، وہ اولوالعزم رسولؑ جو اللہ سے ہمکلام ہوتے تھے، وہ رسولؑ جن کیلئے تجلیاتِ باری نازل ہوتی تھیں، وہ رسولؑ جن کی ایک بددعا سے اللہ نے پوری قوم غرق کردی، وہ رسولؑ جن کی مدد کو فرشتے نازل ہوئے، وہ نبیؑ جو اللہ کے مقرب تھے وہ جو جہان میں اللہ کا نور بانٹتے تھے انہیں بھی یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ دو رکعت ہی سہی، حضورِ اکرم ﷺ کی اقتداء میں صلوٰۃ ادا کرنا نصیب ہو جائے۔ یہ ان کی زندگی کا وہ حسین تمغہ ہے جو اللہ نے انہیں عطا فرمایا کہ میدانِ حشر میں ان کے پاس بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں ادائیگیِ صلوٰۃ کا تمغہ ہونا چاہیے۔

ہماری ساری زندگی کیلئے اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ کا راستہ کھلا پڑا ہے لیکن یہ ہم پر بوجھ بن گیا ہے۔ جس شخص کو ہیروں کی پہچان ہو نہ قدر ہو، اسے ہیرے لدوا دیں تو ہیرے

ہی اس کیلئے بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس کے لیے تو برابر ہے کہ اس پر ایک من ہیرے لدے ہوں یا ایک من پتھر۔ وہ انہیں بوجھ سمجھ کر ہی ڈھو رہا ہوتا ہے اور جو جانتا ہے کہ ہیرا کیا ہے، اسے آپ ہیرے کا چھوٹا سا ٹکڑا ہی دے دیں تو اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ بات جاننے کی ہے۔ جو جانتے ہیں وہ آپ ﷺ کی ایک ایک حرکت و سکوت پر نچھاور ہوتے ہیں، اس راستے میں جان دینی پڑے تو بھی وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سودا سستا ہے۔

حضرتؒ ایک واقعہ بیان فرماتے تھے کہ کوئی صاحب منطق میں بہت فاضل تھے اور صرف و نحو اور منطق میں بہت مانے ہوئے تھے۔ مختلف چیزوں پہ دلائل جمع کرنے والے کو منطقی کہا جاتا ہے۔ تو حضرتؒ نے یہ واقعہ سنایا کہ وہ صاحب سید عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں نے ساری عمر منطق اور صرف و نحو میں بسر کردی، مجھے حلقۂ ارادت میں لے لیں اور مجھے اللہ اللہ سکھائیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ تم یہ منطق کا چکر چھوڑ دو تو میں تمہیں اللہ اللہ سکھاتا ہوں، یہ تو بلا دلیل سیکھنے کے کام ہیں اس پر دلیلیں دینے بیٹھو گے تو اصل کام رہ جائے گا اور دلیلوں پہ بحثیں ہوتی رہیں گی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس شخص کی عمر پوری ہوگئی۔ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کو پتہ چلا کہ زیادہ بیمار ہے تو آپؒ اس کے پاس تشریف لے گئے۔ جب آپ گئے تو وہ مرض الموت میں گرفتار تھا، زندگی ختم ہو رہی تھی تو آپؒ نے پوچھا کیا حال ہے؟ تو اس نے کہا کوئی حال نہیں، شیطان میرے سامنے ہے اور کہتا ہے کہ توحید باری پہ دلیل دو کہ کس طرح اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس بات کی کیا دلیل ہے تمہارے پاس؟ تو میں سو کے قریب دلیلیں دے چکا ہوں اور وہ رد کر دیتا ہے، آگے سے ایسی دلیل دیتا ہے کہ میری دلیل بے وزن ہو جاتی ہے۔ میرا خاتمہ قریب ہے اور یہ مجھے اسلام پہ تو مرنے نہیں دے گا تو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا کہ تم کیوں دوسری دلیلیں دیتے ہو۔ تم کہو مجھے محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس پر صرف یہ ایک

ہی دلیل ہے تو فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ کہا تو شیطان غائب ہو گیا۔

معرفتِ پیغمبر ﷺ کے بغیر کلام اللہ کو سمجھنا مشکل ہے

جب تک عظمتِ پیغمبر ﷺ کی سمجھ نہ آئے، معرفتِ نبوی ﷺ نصیب نہ ہو تو نہ ہی کلام اللہ کی سمجھ آتی ہے اور نہ ہی خود ذاتِ باری کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نہ اپنی سمجھ آتی ہے، نہ اپنے کردار کی سمجھ آتی ہے اور نہ زندگی کے بعد کے واقعات کی سمجھ آتی ہے۔ آدمی قصے کہانیوں کی طرح سن لیتا ہے لیکن وہ اس کے قلب پر، اس کے دل پر، اس کے باطن، ضمیر پر ایسا اثر نہیں چھوڑتیں کہ اس کی اصلاح ہو سکے۔ اس ساری اصلاح کیلئے معرفتِ نبوی ﷺ کی ضرورت ہے۔

اللہ کی ذات سے آشنائی کا ذریعہ، صرف محمد رسول اللہ ﷺ

یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ افراد اور اشیاء منصۂ شہود پر آتی ہیں، اپنا اپنا کام کرتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ کہاں جاتی ہیں؟ یہ بڑا عجیب سوال ہے جس پر کم ہی غور کیا جاتا ہے۔ لگتا ہے فنا پذیر کائنات ایک آبشار کی طرح کسی گہری کھائی میں، کسی تاریک غار میں گر رہی ہے، جو گرنے کے بعد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، نگاہ سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ آخر یہ کہاں جا رہی ہے؟ اتنے اہم سوال کا جواب، آج تک نہ کوئی فلسفی دے سکا، نہ سائنسدان، نہ دانشور، نہ نکتہ دان۔ اس کا جواب صرف انبیاء کرامؑ نے دیا اور صرف یہی نہیں بتایا کہ مخلوق کہاں جا رہی ہے بلکہ یہ بھی بتایا کہ مخلوق کہاں سے آ رہی ہے؟

سائنس بہت طاقتور علم ہے لیکن سائنس کی تحقیق کی انتہا اسی موضوع پر رہتی ہے کہ نطفے سے بچہ کیسے بنتا ہے، اس کی حیات اور اس کے متعلقات پر بحث ہوتی ہے لیکن بچے میں روح کہاں سے آتی ہے اور پھر مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے یا روح ہے کیا؟ اس کے بارے سائنس کا علم لاچار ہے۔ انسانی تحقیقات کا دائرہ، انسان کے ظاہری وجود اور

اشیائے ظاہری کے وجود پر محیط ہے کہ کس شے میں کون کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ اس کی ماہیت اور افعالِ ظاہری کے بارے میں معلومات پر بات ہوتی ہے لیکن اشیا کو، انسان کو، کس نے بنایا؟ وہ کیوں مٹ گیا؟ مٹ کر کہاں چلا گیا؟ وہ کچھ بھی نہیں تھا، عدم سے آیا تھا تو کیا وہ معدوم ہو گیا؟ معدوم ہو کر کہاں چلا گیا؟ اسے کون عدم سے لایا؟ کیوں لایا؟ اس کے آنے کا سبب کیا تھا؟ اگر وہ یہاں آیا تھا تو اس کو یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کا یہاں فریضہ کیا تھا؟ اور چلا گیا تو کیوں چلا گیا؟ ان سوالات کا جواب حضرت آدمؑ سے لے کر حضور نبی کریم ﷺ تک اپنے اپنے وقت میں ہر نبیؑ اور ہر رسولؑ نے دیا۔

جس بندے کے اندر یہ سوچ بیدار ہی نہیں ہوتی کہ وہ کون ہے، کس نے اسے پیدا کیا، وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟ اس کا مطلب ہے ایسا شخص انسانی درجے کو پہنچا ہی نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح غذا، آرام، توالد و تناسل اور بیماری و موت کے مراحل تک ہی رہا۔ انسانی نسل میں ہونے کے باوجود، انسانی ذمہ داریوں کا مکلف ہونے کے باوجود اس نے انسانیت میں قدم رکھا ہی نہیں کہ جس کا قدم دائرۂ انسانیت میں آئے گا اس کا پہلا سوال یہ ہو گا کہ اس کا بنانے والا کون ہے، کہاں ہے؟ جن انسانوں کے اندر یہ سوال اٹھا، ان کیلئے اللہ نے جواب عطا فرما دیا کہ میں ہی وہ ذات ہوں اور تمہارے سارے سوالوں کا جواب ایک ہے، محمد رسول اللہ ﷺ۔ جو پوچھنا چاہتے ہو اُن ﷺ سے پوچھ لو۔ اللہ کی ذات سے آشنائی صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

انسانی عقل آپ ﷺ کی عظمت کا ادراک نہیں کر سکتی

انبیاءؑ اس پائے کے انسان تھے کہ جو تخلیقی طور پر جمالِ باری سے آشنا تھے اور ہمیشہ ان کا اللہ سے براہ راست تعلق قائم تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب دنیا پہ آقائے نامدار ﷺ مبعوث ہوئے تو گویا نبوت کا کمال بھی ظاہر ہو گیا اور انتہا اللہ کریم نے

ظاہر کردی۔ یعنی وہ نبیؐ مبعوث ہوا، انسان کی سوچ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے کہ اللہ کریم نے ایک ہستی ایسی پیدا فرمادی جو اپنی بعثت سے لے کر ہمیشہ تک آنے والوں کی رہنمائی کا حق ادا کرتی رہے گی۔

ہم جب یہ چاہتے ہیں کہ یہ کمرہ روشن کریں تو ہمیں متعدد لائٹیں لگوانی پڑتی ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ کوئی ایک لائٹ ایسی ہو جو اس سارے کمرے کو روشن کردے تو اس کیلئے بہت بڑی طاقت کا بلب لینا پڑے گا اور اگر ہم چاہیں کہ اس پورے علاقے کو ایک لائٹ سے روشن کردیں تو اس کے لئے کتنی زیادہ طاقت کا بلب چاہیے ہوگا؟ بالکل یہی حال یہاں ہے۔ جب اللہ کریم نے چاہا کہ ساری انسانیت تک جمالِ باری کے انوارات اور روشنی پہنچے تو کتنی عظمت بخشی ہوگی حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اور کتنی طاقت بخشی ہوگی قلبِ اطہر ﷺ کو کہ قیامت تک جہاں بھی اللہ کی یاد میں کوئی دل دھڑکے، وہاں تک انوارات جمالِ باری بطفیلِ حضرت محمد ﷺ پہنچ جائیں۔ انسانی عقل آپ ﷺ کی عظمت کا ادراک نہیں کرسکتی۔ ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ ذاتِ باری کے بعد منتہائے کمال کا نام ہے محمد رسول اللہ ﷺ، کہ جہاں تمام کمالات کی انتہا ہوجاتی ہے۔

نبی علیہ السلام کی ذات

نبیؐ ازل سے اللہ کا منتخب شدہ، چنا ہوا بندہ ہوتا ہے تو اس کی پاکیزگی، اس کی عصمت، اس کی روح کی لطافت اسے اللہ رب العزت سے ایسا پیوست کرتی ہے کہ اس میں شبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔

نبیؐ کا یقین اس درجے کا ہوتا ہے جس میں لغزش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خود نبیؐ پہ ایمان میں، کہ نبیؐ کو نبیؐ ماننے میں بندے کا یقین کتنا پختہ ہے، جتنی پختگی اس یقین میں ہوگی، اتنی پختگی ان باتوں اور ان عقائد میں آئے گی جو تعلیماتِ نبوی ﷺ میں ہوں

گی۔ اگر خود نبی ﷺ کی ذات پہ اسے یقینِ کامل نہیں ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کریم کے بارے بتانے میں بھی اسے یقین حاصل نہیں ہوگا۔ خود نبیؐ کی ذات پہ اگر اسے یقین حاصل نہیں ہے تو نبیؐ کی بتائی ہوئی آخرت کی باتوں پہ بھی اسے یقینِ کامل حاصل نہیں ہو گا۔

اسی طرح نبیؐ کی توجہ میں بھی ایک اثر ہوتا ہے۔ نبیؐ کے وجود میں برکات ہوتی ہیں، کیفیات ہوتی ہیں جو ماننے والے کو نبیؐ کے ساتھ اس طرح پیوست کردیتی ہیں کہ اس میں شکوک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ نبیؐ کی بات کو ماننے کیلئے دلائل کا محتاج نہیں رہتا۔ اس کے پاس سب سے بڑی، سب سے پہلی اور سب سے آخری دلیل یہ ہوتی ہے کہ نبیؐ نے یہ فرمایا۔

نبی علیہ السلام کا کمال

نبی علیہ السلام کے ارشاد میں جو کیفیات ہوتی ہیں وہ بندوں کے قلوب میں اتر کر بندے کا حال بن جاتی ہیں۔ انبیاءؑ جو کچھ فرماتے ہیں وہ دوسرے لیڈروں کی طرح سستی جذباتیت نہیں ہوتی، حقائق ہوتے ہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے لیڈر ہوئے ہیں جنہوں نے قوموں کی روش بدل دی، ملکوں کے نقشے تبدیل کردیئے۔ ان سب کے پاس کیا تھا؟ انسانی جذبات کو ابھارنے کا فن تھا۔ وہ بڑی پرجوش، لچھے دار تقریریں کرتے اور لوگ ان پر فریفتہ ہوکر ان کے ہمنوا ہوجاتے اور وہ کر گزرتے جو وہ کہتے۔ ہٹلر نے عالمی جنگ چھیڑ دی، ماؤزرے تنگ نے چین میں انقلاب برپا کردیا۔ مسولینی، نپولین، سکندرِ اعظم، کسی کو بھی دیکھ لیں انہوں نے کیا کارنامہ کیا؟ انہیں انسانی جذبات کو استعمال کرنے کا فن آتا تھا، وہ ان جذبات کو بڑھا کر اپنے مقاصد پورے کر گئے۔ جب جذبے سرد ہوگئے تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ آج جرمنی میں ہٹلر کا نام سننا کوئی پسند نہیں کرتا، چین میں ماؤ کو برا بھلا

کہا جاتا ہے اس لیے کہ جب لوگوں کو ہوش آیا تو پتہ چلا کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔

نبیؑ لوگوں کے جذبات کو استعمال نہیں کرتے بلکہ نبیؑ جو فرماتے ہیں وہ نہ صرف الفاظ ہوتے ہیں بلکہ ان الفاظ کے ساتھ کیفیات ہوتی ہیں۔ الفاظ کانوں سے ذہن میں جاتے ہیں جبکہ کیفیات دل میں اتر جاتی ہیں۔ نبیؑ جو فرماتا ہے، بندہ وہ محسوس کرنے لگتا ہے اور پھر اس میں تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے۔

آقائے نامدار ﷺ کا کمال

آپ ﷺ کا کمال یہ تھا کہ جس کو بھی نورِ ایمان نصیب ہوا، آپ ﷺ نے اسے اللہ کے حضور کھڑا کر دیا۔ کسی کو اس بات پہ نہیں رکھا کہ تم مجھے سجدہ کرو، میں اللہ کو سجدہ کرتا ہوں۔ کسی سے یہ نہیں فرمایا کہ تم مجھ سے مانگا کرو، میں اللہ سے مانگوں گا بلکہ جسے نورِ ایمان نصیب ہوا آپ ﷺ نے اسے اللہ کے روبرو کھڑا کر دیا اور فرمایا میں بھی اللہ کی عبادت کرتا ہوں تم بھی اللہ کی عبادت کرو، میں بھی اللہ سے لیتا ہوں تم بھی اللہ سے لو۔ اللہ سے بات کرنے کا، اللہ کے حضور پہنچنے کا سلیقہ سکھا دیا۔ جس بندے کے دل میں تجلیاتِ باری آئیں، اس کی نظریں اتنی روشن اور اتنی کھل گئیں کہ اسے دنیا کا اور اپنی برائی کا انجام نظر آنے لگا اور عظمتِ الٰہی سے واقف ہو کر وہ اپنی خدائی منوانے کی بجائے، اللہ کی عظمت منوانے کیلئے اس راستے پہ چل نکلا اور عذابِ الٰہی بننے کی بجائے لوگوں کیلئے رحمتِ الٰہی بنا۔ یہ آقائے نامدار ﷺ کی ذاتِ کریمہ تھی جس نے اتنی محبتیں بانٹیں کہ جو پہلے ڈاکو، چور، لٹیرے تھے، اب اپنا مال لٹا کر خوش ہوتے تھے اور اپنی گرہ سے دوسروں کو دے کر اور اللہ کی راہ میں خرچ کر کے خوش ہوتے تھے، دوسروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مظلوموں کو ظلم سے بچانے کیلئے اپنی جانیں نثار کرتے تھے۔

کیا کیا تھا محمد رسول اللہ ﷺ نے، کیا کوئی بندے درآمد کیے تھے؟۔ عرب میں تو

سارے وحشی، ظالم، مشرک اور بدکار لوگ تھے۔ ڈاکو، چور، شرابی تھے۔ ہر طرح کی برائی میں ملوث لوگ تھے۔ پھر دیکھو! ان صحراؤں سے کیسے کیسے لوگ نکلے۔ ابوبکرؓ کو صدیقؓ کس نے بنا دیا؟ عمرِ فاروقؓ، عثمانِ غنیؓ، علی المرتضیٰؓ، خالد سیف اللہؓ، ابوعبیدہ ابن الجراح، کس کس کو گنواؤ گے؟

ہر گلِ را رنگ و بوئے دیگر است

دامانِ رسالت ﷺ سے وابستہ ہوئے تو لوٹ کر کھانے والے لٹانے والے بن گئے۔ دنیا میں ظلم کرنے والوں نے روئے زمین کو عدل سے بھر دیا۔ جنہیں لوگ جاہل سمجھتے تھے، روئے زمین پر پوری دنیا کے علم کے استاد بن گئے، جو خانہ بدوش کہلاتے تھے وہ اس دنیا کے بڑے سلطان بن گئے۔

نبوت کے دو پہلو

عظمتِ انسانی کے جس قدر مدارج ہیں، بنی آدم میں سب سے اعلیٰ رتبہ نبوت کا ہے۔ نبوت وہ مقام ہے کہ جسے کوئی محنت مجاہدے سے حاصل نہیں کر سکتا۔ نبیؑ کو اللہ کریم پیدا ہی نبیؑ فرماتا ہے۔ نبیؑ تخلیقی طور پر ہی نبیؑ ہوتے ہیں۔ نبوت اللہ کریم وہبی طور پر عطا فرماتے ہیں۔ نبوت نبیؑ کی ذات کا حصہ اور خاصہ بن جاتی ہے۔ نبیؑ دنیا میں نبیؑ ہوتا ہے، برزخ میں نبیؑ ہوتا ہے، آخرت میں نبیؑ ہوتا ہے، جنت میں بھی نبیؑ کی عظمت اپنی ہوگی، نبیؑ کو اللہ کی ذاتی معیت نصیب ہوتی ہے۔

نبوت کا ایک پہلو ہمہ وقت بارگاہِ الوہیت سے پیوستہ ہوتا ہے۔ نبیؑ پر غفلت نہیں آتی۔ اللہ کا نبیؑ جب سو جاتا ہے تو نیند سے اس کا وضو فاسد نہیں ہوتا، اس لیے کہ نیند اس کے قلب و نظر کو غافل نہیں کر سکتی، اس کا دل یا زندگی کا وہ پہلو جو بارگاہِ الوہیت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے وہ ہوش و حواس قائم رکھتا ہے۔

نبوت کا دوسرا پہلو نوعِ انسانی سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی جس کی کوئی حیثیت نہیں، اس تک نبیؐ کی توجہ جاتی ہے۔ وہ عام آدمی بھی نبیؐ کی بات سمجھتا ہے۔ عالم کی بات سمجھنے کیلئے علم چاہیے، شاعر کو سمجھنے کیلئے فنِ شعر سے کوئی نسبت ہونی چاہیے، کسی ادیب کی عبارت کا جائزہ لینے کیلئے ادب سے تعلق چاہیے۔ آپ کتنا قیمتی شعر پڑھ دیں مگر ہر آدمی تو اسے نہیں سمجھ سکے گا۔ لوگوں کو تو سمجھانے سے بھی سمجھ نہیں آتی لیکن جب نبیؐ ارشاد فرماتا ہے تو عالم اپنی حیثیت سے مفہوم پاتا ہے، مفسر، محدث اپنی شان کے مطابق پاتا ہے، عام پڑھا لکھا، ان پڑھ، جاہل ہر کوئی اپنا اپنا مقصد پالیتا ہے، کوئی خالی نہیں رہتا۔ یہ کمال ہوتا ہے نبیؐ کے ارشاد میں کہ اس کے ارشاد کو سمجھنے سے کوئی اللہ کا بندہ خالی نہیں رہتا۔ اس کی توجہ نچلی سطح پر انسانی قلوب کے ساتھ رہتی ہے اور نبیؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کو حضورِ الٰہی نصیب ہو جائے۔

جب نبیؐ کی عطا کردہ کیفیات دلوں میں آتی ہیں تو بندے اور طرح کے ہو جاتے ہیں۔ ان کیلئے یہ دنیا اور یہ زندگی ایک مشکل وقت بن جاتا ہے کہ کب یہ بدن کا چولا اترے اور روح لطیف ہو کر سامنے آئے اور مجھے اللہ کے حضور پیش ہونا پڑے تو میں اللہ کو روبرو دیکھوں، اسی لیے انہیں اہل اللہ کہتے ہیں۔ جب دل اس احساس سے مستفید ہوتا ہے تو آدمی اپنے شب و روز زمین پر گزارتا ہے لیکن بستا آخرت میں ہے۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ شبِ معراج، میں نے جنت کی سیر فرمائی تو میں نے بلالؓ کے جوتوں کی آواز جنت کے کوچے میں سنی۔ حضرت بلالؓ معراج شریف میں حضور ﷺ کے ساتھ تو نہیں تھے، زمین پہ چل پھر رہے تھے لیکن جو قدم زمین پر پڑ رہا تھا، اس کی چاپ جنت الفردوس میں سنائی دے رہی تھی یعنی نبیؐ کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اپنے دامن سے وابستگان کو اسی عالم آب و گل میں بستے ہوئے، جنت میں بسا دیتا ہے۔

لیکن ہمارے ساتھ کچھ معاملہ بدل گیا ہے، ہم اس زمین پر رہتے ہیں لیکن فکری طور پر اللہ ہمیں معاف فرمائے، ہم جہنم میں ہیں۔ روز عزتیں لٹتی ہیں، روز خون ہوتے ہیں، روز گھر جلتے ہیں۔ ہر کوچے، ہر گلی میں ظلم ہوتا ہے، ڈاکو لوٹ کے لے جاتے ہیں، پولیس کے پاس جاؤ تو جو بچا ہو، اُسے وہ لوٹ لیتی ہے۔ حکمرانوں کے پاس جاؤ، وہ ظلم کرتے ہیں، عدالت میں جاؤ وہ ظلم کرتی ہے، ڈاکٹر کے پاس جاؤ وہ ظلم کرتا ہے۔ کمال ہے، ایسے ایسے پیشے جن میں تقدس تھا اور جن میں اللہ کی طرف سے ایک رحمت، شفقت اور محبت تھی، ہمارے لیے وہ بھی عذاب کا سبب بن گئے۔ وہ لوگ زمین پر چلتے تھے تو چاپ جنت میں سنائی دیتی تھی لیکن ہم گرتے گرتے کم از کم زمین پر تو رہ جاتے، اس سے بھی نیچے چلے گئے۔ کیوں؟ شاید ہم نے کلمے کے الفاظ کو تو اپنا لیا ہے لیکن ان کیفیات و برکات کو چھوڑ دیا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلبِ اطہر سے آتی تھیں جن کے بغیر بات نہیں بنتی۔

عصمتِ انبیاء

عصمت خاصہ نبوت ہے۔ جس ہستی کو نبوت عطا ہوتی ہے اسے عصمت بھی عطا ہوتی ہے۔ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوتا اس لیے کہ انبیاء کرامؑ اللہ کی طرف سے معیارِ اطاعت بنائے جاتے ہیں۔ انبیاءؑ کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہوتا۔ صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد اہل اللہ محفوظ عن الخطاء ہوتے ہیں۔ اللہ ان کی گناہ سے حفاظت فرماتا ہے۔

عالمِ انسانیت میں رسولؐ کا یہ مرتبہ ہوتا ہے کہ وہ انسان بھی ہوتا ہے، کھاتا پیتا بھی ہے، اس میں تمام قویٰ انسانی بدرجہ اولیٰ موجود ہیں۔ سننے کی، بیان کرنے کی، توالد کی، اولاد کی، سونے جاگنے کی، تمام ضروریات اس میں موجود ہوتی ہیں اور وہ بات کو سن کر پھر آگے پہنچا بھی سکتا ہے۔ ان تمام طاقتوں کے ہوتے ہوئے بھی اس سے گناہ ممکن نہیں ہوتا یعنی ایک تو یہ ہے کہ ایک شخص ہے اس میں قوت ہے ہی نہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ غلط کام

کرنے سے معذور ہے۔ یہ بات نہ ہو بلکہ اس میں کام کرنے کی قوت استعداد ہو لیکن اس کام کو غلط طور پر کرنے کی استعداد نہ ہو۔ ممکن ہی نہ ہو کہ وہ کسی قوت کا کسی وقت میں غلط استعمال کرے، اسے کہتے ہیں معصوم عن الخطاء ۔یعنی خصوصیات ،انسانی ہوں اور حالات ،ملکوتی ہوں، وجود انسانی ہو، طاقتیں انسانی ہوں، عادات انسانی ہوں، خصوصیات انسانی ہوں اور عمل ملکوتی ہو جیسے فرشتے کا ہوتا ہے کہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا نام عصمت ہے، اور یہی شرطِ نبوت ہے۔ معصوم عن الخطاء ہونا نبیؑ کا وصف ہے۔ نبیؑ سے کبھی خطا سرزد نہیں ہوتی، ہو سکتی ہی نہیں اس لیے کہ نبیؑ مطاع ہوتا ہے اور امت کے تمام لوگ نبیؑ کے پیچھے چلنے کے مکلف ہوتے ہیں۔ اگر اللہ کا نبیؑ خطا کرے گا تو پوری امت اس خطا کو عبادت سمجھ کر اس پر عمل کرتی رہے گی اس لیے اللہ کریم نے انبیاءؑ کو خطا سے پاک اور بالاتر بنا دیا۔ اسی لیے نبیؑ کو معصوم مانا جاتا ہے۔ کسی دوسرے شخص کے بارے اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ معصوم عن الخطاء ہے تو یہ اس کو نبیؑ ماننے کے برابر ہے۔

معصوم اور محفوظ میں یہ فرق ہے کہ معصوم سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی اور جو محفوظ ہوتا ہے اس میں غلطی کرنے کا امکان موجود ہوتا ہے لیکن اللہ کریم اس کی حفاظت فرماتے ہیں، اسے غلطی سے بچاتے ہیں۔ اگر کچھ خطا ہو جائے تو وہ رجوع الی اللہ کرتا ہے، توبہ نصیب ہو جاتی ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں کچھ لوگ بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! جب ہم آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو کیفیات بالکل مختلف ہوتی ہیں اور جب ہم باہر نکلتے ہیں اور عملی زندگی میں جاتے ہیں تو کہیں نہ کہیں بھول چوک ہو جاتی ہے، وہ کیفیت نہیں رہتی جیسی حضوری میں ہوتی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سے کوئی خطا نہ ہو اور تم اس خطا کے لئے اللہ سے بخشش نہ مانگو اور گڑگڑاؤ نہیں تو اللہ کریم

تمہیں اٹھا لے گا اور تمہاری جگہ ایسے انسان پیدا کر دے گا، جو اس کی ذات پر یقین رکھتے ہوں گے، اس سے محبت بھی کرتے ہوں گے اور اُن سے بتقضائے بشریت غلطیاں بھی سرزد ہو جائیں گی پھر وہ اس کی مغفرت کے طالب ہوں گے۔

نورِ نبوت

انبیاءؑ جس زمین پر سے گزرتے ہیں، ان کی برکت سے ذرات ذاکر ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ کریم کسی کو نگاہ عطا کر دے تو وہ اس صحرا کو، ان گلیوں کو، ان مناظر کو دیکھے جہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے قدوم مبارک لگے ہیں۔ ہر ذرہ آج بھی نورِ الٰہی سے پُر ہے، روشن ہے، ذاکر ہے۔ زمین پر جہاں حضور ﷺ کے قدوم مبارک لگے، وہ قطعۂ زمین اس طرح روشن ہے جس طرح چاند آج بھی آسمان پر چمکتا نظر آتا ہے۔

مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان فضا کو دیکھا تو انوارات الٰہی سے پُر تھی۔ قدومِ مبارک کی تو سمجھ آ گئی مگر فضا میں کیا ہے؟ حضرتؓ سے عرض کیا تو انہوں نے فرمایا، جہاں جہاں حضور ﷺ کی نگاہِ مبارک گئی، وہ فضا منور ہو گئی اور قیامت تک منور رہے گی۔ نبیؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ جس شے کو وہ استعمال کریں، لباس ہو یا جوتے، ہر شے منور ہو جاتی ہے، جس زمین پر قدم رکھیں وہ زمین ذاکر ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ آقائے نامدار ﷺ سے حبیبہ حبیب کبریا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کائناتؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! بڑی بارش ہوئی ہے آج۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے کہاں دیکھی؟ عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میں جنت البقیع کی طرف جا رہی تھی، وہاں موسلا دھار بارش تھی۔ فرمایا تو نے جنت البقیع کی طرف جاتے کیا دیکھا، کس چیز سے پرکھا، تیرے اوپر کیا تھا؟ عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کی چادر پڑی تھی وہ میں نے اوڑھی ہوئی تھی، فرمایا! تبھی تو تمہیں بارش نظر آ رہی تھی، وہ تو انوارات تھے، انوارات برس

زہے تھے یعنی صرف اس چادر کو سر پر رکھنے سے نہ صرف ذات کو نور نصیب ہو گیا بلکہ جہاں جہاں نور تھا اس کا ادراک بھی نصیب ہو گیا۔

لوگ بجلی کے اثر کو مانتے ہیں کہ جسم اس سے ذرا ٹچ (touch) ہو جائے تو ساری بجلی جسم میں گھس جاتی ہے۔ لوگ دھوپ کے اثر کو مانتے ہیں کہ ایک لمحے کیلئے بندے کو باہر بھیجو پوری دھوپ اس میں آجاتی ہے۔ بارش کے اثر کو مانتے ہیں کہ بارش شروع ہو، ایک لمحہ باہر بھیجو، سارا بھیگ جائے گا تو نورِ نبوت کی برسات کو ماننے میں کیا مانع ہے جبکہ اس کے اثرات تاریخ کے صفحات پر سورج سے زیادہ روشن ہیں اور ایک ایک واقعہ بتاتا ہے کہ قلب کی حیات، قلب کی زندگی اور نورِ نبوت سے، قلب کی بیداری سے کیا انقلاب آتا ہے اور بندہ کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ قلب کو حیات نصیب ہوتی ہے نورِ نبوت سے، نبی کریم ﷺ سے رابطہ ہونے سے۔ جب حضور ﷺ اس عالمِ آب و گل میں جلوہ افروز تھے تو جس پر آپ ﷺ کی نگاہِ مبارک پڑ گئی یا جس کو آپ ﷺ پر ایمان کے ساتھ نگاہ ڈالنا نصیب ہو گیا تو وہ ایک نگاہ اس کیلئے کافی ہو گئی۔ اس ایک نگاہ سے سارے کمالات اس میں آ گئے۔

معیتِ رسالت کیا ہے؟

حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو کمالِ رسالت کیا ہے اور نوعِ انسانی کو آپ ﷺ کے اللہ کے رسول ﷺ ہونے سے کیا ملا، کیا فائدہ ہوا؟ فرمایا وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ۔ وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہیں۔ یہ جملہ بڑا قابلِ غور ہے، اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے رسول ﷺ جن کے ساتھ ہیں بلکہ فرمایا جو لوگ آپ ﷺ کے ساتھ ہیں یعنی ساتھ ہونا لوگوں کی طرف سے ہے، ہماری طرف سے ہے، ہم نے ساتھ ہونا ہے۔ کاش یہ جملہ یوں ہوتا کہ آپ ﷺ جن کے ساتھ ہیں تو ہر کوئی باغ باغ ہوتا۔ وہ تو لجپال بھی ہیں، کریم بھی ہیں، رؤف و رحیم بھی ہیں۔ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عقیدہ وہی ہو جو

محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، عمل وہی ہو جو محمد رسول اللہ ﷺ نے کرنے کا حکم دیا، عمل اسی طرح کرے جس طرح حضور ﷺ نے بتلایا۔ اگر طریقہ بدل گیا، سنت چھوٹ گئی اور رواج، رسم، بدعت آ گئی تو ساتھ چھوٹ گیا یعنی دامن تھامنا ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ ﷺ کی معیت ہی وہ نعمت ہے جو بنی آدم کو انسان بناتی ہے۔ یوں تو انسان میں بے شمار جذبات ہیں لیکن دو جذبے سب سے قوی اور مضبوط ہیں جو تمام جذبات پر غالب آجاتے ہیں یعنی قوتِ غضبیہ اور قوتِ شہوانیہ۔

قوتِ غضبیہ یعنی غصہ اور ناراض ہونا۔ یہ ایسا جذبہ ہے کہ جب آدمی پر وارد ہوتا ہے تو اسے نہ رشتے دکھائی دیتے ہیں نہ بات، نہ چھوٹا بڑا دکھائی دیتا ہے، نہ کوئی دوست دشمن۔ غیض و غضب میں وہ بہت کچھ کر گزرتا ہے۔ **دوسری قوتِ شہوانیہ** ہے کہ لالچ سے چیزوں کو حاصل کرنا، چیزوں کو پانا، یعنی عہدے، اقتدار، دولت کے لالچ میں آ کر سب کچھ کر گزرنا۔

ذہن و جسم کے تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی یہ دو قوتیں باقی سارے جذبات پر غالب آجاتی ہیں۔ فرمایا، محبتِ رسالت کا کمال یہ ہے وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:29) قوتِ غضبیہ بھی ان کے تابع ہو جاتی ہے اور قوتِ شہوانیہ بھی یعنی وہ غصے اور جذبات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ جذبات ان کے تابع ہو جاتے ہیں کہ کفر سامنے آ گیا تو پورے کا پورا غضب سامنے آ گیا اور سامنے مسلمان آیا تو پورا جذبہ رحم اور جذبہ ہمدردی سامنے آ گیا۔ ایک وقت میں برق تپاں بھی ہیں اور عین اسی وقت بادِ رواں بھی ہیں۔ اسی وقت مجسمِ محبت بھی ہیں اور اسی وقت مجسمِ قہر بھی ہیں۔ یہ میرے نبی ﷺ کا کمال ہے۔

اتباعِ سنت ﷺ میں سکون

یاد رکھو! جو اپنے آپ کو اتباعِ سنت میں ڈھال لیتا ہے دنیا پہ آگ بھی برس رہی

ہو تو وہ پر سکون رہتا ہے۔ اس کیلئے اللہ کریم ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں جیسا ابراہیم خلیل اللہؑ کے لیے وقت پیدا فرمایا جب اُن کو آگ میں پھینکا گیا تو اللہ نے آگ کو حکم دیا قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیاء:69) اے آگ! ابراہیمؑ کیلئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا۔ اکثر حضرات نے لکھا ہے کہ آگ بجھ گئی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آگ کو بجھنے کا حکم تو نہیں دیا گیا، آگ کو حکم دیا گیا کہ ابراہیمؑ کیلئے پُر فضا، مزیدار ہو جا۔ جلتی رہ مگر تیرا اثر جلانے والا نہ ہو، لوریاں دینے والا ہو۔ تجھ میں دھوئیں کی بدبو نہ ہو، تجھ سے خوشبوئیں اٹھیں اور تو مانند بادِ سحر میرے نبیؑ کو لوریاں دے، تُو اسے جلا نہیں سکتی۔

اے آگ! براہ راست آگ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ٹھنڈی بھی ہو جا اور ابراہیمؑ کیلئے تو ہی سلامتی کا سبب بن جا۔ تو وہ قادر ہے اس نے آگ کو لوریاں دینے پر لگا دیا اور ٹھنڈا کر دیا اور اس میں نسیمِ سحر کی طرح کا اثر پیدا کر دیا۔ آگ کے بھانبھڑ جلتے رہے، انہیں لوریاں دیتے رہے، انہیں ٹھنڈ محسوس ہوتی رہی، انہیں مزیدار موسم محسوس ہوتا رہا۔

مقامِ محمود

مقامِ محمود کی تفصیل میں علماء کے مختلف ارشادات ہیں اور مختلف اقوال نقل کیے ہیں، جن میں زیادہ زور اس پر ہے کہ میدان حشر میں مرتبہ شفاعت کا آپ ﷺ کو نصیب ہو گا کہ سب نبیؑ بھی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوں گے اور شفاعتِ خاص کے طالب ہوں گے یہی مقامِ محمود ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ جنت میں بلند اور سب سے اعلیٰ گھر ہے جو صرف آپ ﷺ کیلئے ہے اور آپ ﷺ کی شان کے مطابق تمام جنت سے اعلیٰ ترین ہے۔

کشفاً اولیاء اللہ کی ارواح کی حاضری ہوتی ہے، صرف یہ ایک مقام ایسا ہے کہ جہاں سوائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کوئی ہمرکاب نہیں ہوتا۔ جب بھی حاضری ہو، صرف

وہ ایک ہستی حاضرِ بارگاہ تشریف فرما ہوتی ہے۔ غالباً اس لیے کہ ان کی معیت بھی تو منفرد ہے کہ معیت ذاتِ باری میں بمطابق "ان اللہ معنا" شریک ہے۔

کوئی اس جیسا ہو تو۔۔۔۔۔

اللہ ایسا قادر ہے، اتنا کریم ہے، اتنا وسیع القدرت ہے، ایسا خالقِ بے مثال ہے کہ اس نے محمد رسول اللہ ﷺ جیسا رسول بھیج دیا۔ علم کے مقابلے میں، عقل و شعور کے مقابلے میں، دانش و خرد کے مقابلے میں، جمال و کمالِ باطنی کے مقابلے میں نسلِ انسانی میں کوئی اس جیسی تصویر دکھاؤ۔ ارے! جس کی مخلوق کی مثال تم پیش نہیں کر سکتے، اس خالق کو کیسے چیلنج کر سکتے ہو؟ تم میں بھی تو بڑے بڑے دلیر ہیں، بڑے بڑے شہ زور ہیں، بڑے بڑے پہلوان ہیں، ماہرینِ جنگ ہیں، ماہرینِ اقتصادیات ہیں، مختلف علوم و فنون کے ماہرین ہیں، ارے! کسی سے کہو، روئے زمین کے انسانوں کو چیلنج ہے کہ اس ہستی کی خاکِ پا کی مثال تو پیش کر سکیں۔ کسی میدان میں، علم و فن کے میدان میں، عمل کے میدان میں، اخلاق کے میدان میں، کردار کے میدان میں، حسنِ صورت و حسنِ سیرت کے میدان میں، کہیں کسی شعبے میں کوئی آپ ﷺ کی نظیر تو لاؤ، لیکن آدمؑ سے لے کر آج کی انسانیت تک تم کوئی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ کوئی فرشتہ مقابلہ نہیں کر سکتا، کوئی نوری مخلوق مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔

ایسا وجود، جو وجود تو آدمی کا ہے، ایسا وجود جس کا خمیر اسی خاک سے ہے جس سے سارے انسان بنے ہیں لیکن اس میں اتنی طاقت آ گئی کہ وہ وجودِ اطہر ﷺ، فرشتوں کو سدرۃ المنتہیٰ پہ چھوڑ کر عرشِ علیٰ سے آگے تشریف لے گئے۔ لاؤ کوئی مثال، کوئی ایسا انسان لاؤ جو اولادِ آدم سے ہو، جس کی رگوں میں خون دوڑتا ہو، گوشت پوست کا انسان ہو اور پھر اس میں اس قدر لطافت ہو کہ وہ فرشتوں سے بھی زیادہ لطیف تر وجود رکھتا ہو۔ لاؤ کوئی

انسان جس کی ایک نگاہ کسی بھی انسان کو اٹھا کر علم و عمل کی انتہا پہ پہنچا دے، جسے پڑھانے کیلئے الفاظ نہ بتانے پڑیں، جسے سکھانے کیلئے کورس نہ کرانا پڑیں۔ چرواہا اونٹوں کا ریوڑ چھوڑ کر آئے، ایمان قبول کرے اور صبح اسے جرنیل بنا کر مہم پہ بھیج دے اور وہ تاریخ کا کامیاب ترین جرنیل ثابت ہو۔ لاؤ کوئی ایسا بندہ۔ تاریخ سے کہو کسی ایک جرنیل کو بھلا دے جسے محمد رسول اللہ ﷺ نے بنایا تھا، مورخ سے کہو، کسی کا نام اپنے قرطاس سے محو کرنے کی جرأت کرے۔ نہیں کر سکتا۔ ایسی خوبی دکھاؤ کسی میں، کسی کا شاگرد نہ ہو، کسی مدرسے نہ گیا ہو، کسی سے پڑھا نہ ہو، کہیں سے سیکھا نہ ہو اور ہر سوال کا جواب اُس کے پاس موجود ہو اور وہ جواب حتمی بھی ہو، یقینی بھی ہو، درست بھی ہو اور آسان ترین بھی ہو۔

ولادت و بعثتِ رحمتِ دو عالم ﷺ

حضور ﷺ کی ولادت باسعادت ربیع الاول میں ہوئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء:107) عالمین میں اللہ کی ذات کے علاوہ ساری مخلوق ہے۔ عرش بھی مخلوق ہے، آسمان بھی مخلوق ہے، جو کچھ زمین میں ہے، ستاروں میں ہے، سیاروں میں ہے، آسمانوں پر ہے، عرش میں ہے، نوری ہے یا مادی، کسی بھی طرح کی کوئی مخلوق ہے، سب تخلیقاتِ باری ہیں۔ ساری مخلوقات کو دُنیوی برکات، دُنیوی زندگی، عدم سے وجود، وجود میں مختلف خصوصیات، مختلف نعمتیں، یہ سب کچھ جو اللہ کی طرف سے عطا ہو رہا ہے، اس میں واسطہ ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

جب عمرِ مبارک چالیس برس ہو گئی، تو جبرائیلِ امینؑ نے آپ ﷺ کو یہ خوشخبری دی کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آلِ عمران:164) اللہ نے مومنوں پر، ایمان والوں پر، مسلمانوں پر بہت بڑا احسان فرمایا کہ انہیں میں سے اپنے ایک بندے کو رسول

مبعوث فرمایا۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ولادت باسعادت سے تو کائنات کے ہر ذرے کا رشتہ ہے اور یہ عمومی تعلق ہے۔ بندۂ مومن کا اپنے نبی ﷺ سے بعثت کا رشتہ ہے اور یہ خصوصی تعلق ہے تو ہم اپنا خاص منصب چھوڑ کر، اپنا خاص مقام چھوڑ کر اس عموم پر کیوں رہیں؟ بندہ مومن کا رشتہ احکامِ الٰہی کی فرمانبرداری سے جڑتا ہے اور احکامِ الٰہی ولادتِ شریفہ کے ساتھ نہیں آئے، بعثتِ عالی ﷺ کے ساتھ آئے۔

بندۂ مومن کو تو بات بعثتِ عالی ﷺ کی کرنی چاہئے، جہاں سے کلمۂ طیبہ عطا ہوا، جہاں سے نورِ ایمان عطا ہوا، جہاں سے اسلام کی ابتداء ہوئی، جہاں سے بندے کا اللہ سے تعلق قائم ہوا، جہاں سے صحابیت تقسیم ہوئی، تابعیت تقسیم ہوئی، تبع تابعیت تقسیم ہوئی، ولایت تقسیم ہوئی، جو تا قیامت بٹتی رہے گی، تقسیم ہوتی رہے گی۔ لیکن آپ نے بعثتِ عالی ﷺ کا کہیں تذکرہ سنا؟ بعثتِ عالی ﷺ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کس لئے مبعوث ہوئے ہیں، آپ ﷺ کا پیغام کیا ہے؟ ہم ان برکات کا ذکر کرتے ہیں جس میں مسلم و غیر مسلم سب شریک ہیں لیکن جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے، اُس طرف رخ نہیں کرتے۔

ذرا سوچئے! ولادت باسعادت سے لے کر بعثتِ عالی تک، چالیس برسوں میں حضور ﷺ کے ساتھ رہنے والوں، ملنے جلنے والوں میں سے کوئی صحابیؓ بنا، کسی کو ذاتِ باری سے آشنائی ہوئی، قرآن کی خبر ہوئی، کسی کو آخرت کے حساب کتاب کا پتہ چلا، کسی کو اللہ کی پسند، ناپسند کی اطلاع ہوئی، گناہ ثواب کا پتہ چلا؟ یہ سب تو تب پتہ چلا جب حضور ﷺ مبعوث ہوئے اور جب مبعوث ہوئے تو ایک نگاہِ پاک پانے والا صحابیؓ بن گیا اور قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ ان کے وجود اور قلوب تک ہر ذرہ ذاکر ہو گیا۔ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ

وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ . (الزمر:۲۳)

آج مسلمان جب بھی بات کرتے ہیں ولادتِ مبارکہ کی بات کرتے ہیں اس لیے کہ ولادتِ باسعادت کے ساتھ حکم نہیں ہے کہ ایسا کرو، ویسا نہ کرو لیکن جب بعثتِ محمد رسول اللہ ﷺ کی بات کریں تو زندگی ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اپنی نہیں رہتی۔ اپنا آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اپنی کوئی پسند نہیں رہتی اور اتباعِ نبی ﷺ کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ آپ سال کی بات کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ جس لمحے اللہ کے نبی ﷺ کے اتباع کا احساس بھول گیا، وہ لمحہ جب اتباعِ نبوی ﷺ سے ہٹے گا تو کفر کے اتباع میں گزرے گا، اللہ محفوظ رکھے۔ اللہ سب کو ہدایت دے۔ (آمین)

جب ہم چھوٹے تھے تو جلسہ میلادِ نبوی ﷺ دیکھا کرتے تھے۔ مساجد کو آراستہ کیا جاتا تھا، خوبصورت سٹیج بنتے تھے ان پر ریشمی چادریں بچھائی جاتی تھیں، علماء و مشائخ تشریف لاتے تھے، لوگ مؤدب ہو کر، باوضو ہو کر بیٹھتے تھے اور نبی کریم ﷺ کی برکات کا، آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کا تذکرہ ہوتا تھا۔ زمانے نے کروٹ لی، پھر جو ان گناہگار آنکھوں نے دیکھا۔ وہ کیا تھا؟ جی مسجد جانے کیلئے یا مسجد پہنچنے کیلئے پہلے کسی حویلی میں، کسی دارے پر، کسی بیٹھک پر جمع ہوا جائے پھر وہاں سے جلوس کی صورت جائیں گے۔ جائیں گے مسجد ہی لیکن جلوس جائے گا۔ پھر ہماری تسلی نہ ہوئی کہ مسجد میں تو پابندیاں ہیں۔ اب وہ جلوس بیٹھک، ڈیوڑھی سے نکل کر بازار تک پہنچا۔ مسجد جانے کی بجائے چوک تک رک گیا۔ پھر جلوس میں بھی کچھ حدود و قیود تھیں، ہم نے اسے جشنِ میلاد النبی بنا دیا۔ جشن ایک وسیع تر لفظ ہے، اس سے مراد ہوتا ہے کہ جس طرح کوئی چاہے اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ کوئی نعت پڑھ کر کرتا ہے، کوئی گا کر کرتا ہے، کوئی شمع جلا کر کرتا ہے، کوئی اچھلتا کودتا ہے۔ آپ نے دیکھا جشنِ میلاد میں کوئی ٹریکٹر پہ مائیک لگائے ہوئے ہے، کوئی ریڑھے پر، کوئی اونٹ پر،

کوئی گھوڑے پر، کسی نے کوئی عجیب سا لباس پہن رکھا ہے، کوئی نعت پڑھ رہا ہے، کوئی پیسے دے رہا ہے، کوئی پیسے لے رہا ہے۔ ایک عالم ہاؤ ہو ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

نہ جانے ہماری غفلت اس کے بعد ہمیں کہاں لے جائے گی؟ حق کا دامن ہم سے چھوٹتا جا رہا ہے اور ہم محض ڈھول بجا کر، باجے گاجے بجا کر، نعرے لگا کر، دیگیں پکا کر اپنی طرف سے اسلام کی خدمت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ یہ درست نہیں۔

ادبِ رسول اللہ ﷺ

ہمارے کہنے سے تو شائد کسی کو اچھا نہ لگے کہ تم کون ہو ہمیں روکنے والے؟ میں روک نہیں رہا، میں تو کہتا ہوں کہ آپ ﷺ کا ذکرِ خیر ہر حال میں کریں لیکن ذکرِ رسول ﷺ کا تقاضا، ادبِ رسول ﷺ ضرور ہے۔ اس بارگاہ کا احترام لازمی ہے، اس کا ادب ضروری ہے۔ اگر ادب ہاتھ سے چھوٹ گیا تو سب کچھ گیا۔ بے باک محبتیں ہوتی ہوں گی، بے باک عشق ہوتا ہو گا لیکن یہ بارگاہ اتنی عالی ہے کہ یہاں عشق و محبت بھی آداب کے پابند ہیں۔ عشق بھی اپنی عرض کرے گا لیکن سر کو جھکا کر، آنکھوں میں آنسو لا کر دائرۂ ادب میں رہ کر۔ آپ ﷺ کی بارگاہ کا معاملہ اتنا حساس ہے کہ دمِ رخصت آپ ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی گود مبارک میں سر ٹکائے ہوئے لیٹے ہیں اور آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ پاس تشریف فرما ہیں کہ دروازے پر کسی نے نہایت ادب سے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اجازت ہے، میں اندر آ سکتا ہوں؟ حضرت فاطمہؓ نے جھڑک دیا، ''کون ہے، دیکھ نہیں رہے ہو، اللہ کے رسول ﷺ تکلیف میں ہیں، آپ ﷺ کی طبیعت ناساز ہے۔ تُو کون ہے اجازت لینے والا''؟ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ بیٹا! یہ تیرے باپ کا دروازہ ہے ورنہ یہ آنے والا کسی سے پوچھ کر نہیں آتا۔ پوچھنے والا ملک الموت ہے اور یہ تیرے بابا کا دروازہ ہے، جہاں سے اجازت لے رہا ہے۔ یہ وہ بارگاہ ہے جہاں

کے آداب بھی اللہ نے خود متعین فرما دیئے۔

معراجِ مصطفےٰ ﷺ ۔۔۔ جسم اطہر ﷺ کی لطافت

آقائے نامدار ﷺ کی عظمت، آپ ﷺ کا مقامِ رفیع اتنا بلند ہے کہ لوگ مر کر بھی ان عظمتوں کو نہیں دیکھ سکے جن کو حضورِ اکرم ﷺ اس عالم میں تشریف فرما ہوتے ہوئے ملاحظہ فرما گئے اور یہ حضورِ اکرم ﷺ کے جسمِ اطہر اور جسمِ مبارک کی لطافت ہے۔

حضور ﷺ کا جسمِ اطہر اس قدر لطیف، اس قدر نظیف، اس قدر مقدس، اس قدر طاہر اور اس قدر پاکیزہ ہے کہ جن عظمتوں کو انبیاءؑ کے علاوہ اہل اللہ کی ارواح بھی نہیں پا سکتیں، ان عظمتوں پر حضور ﷺ کا جسمِ اطہر بھی تشریف لے گیا اور روحِ اطہر ﷺ کا اندازہ آپ اس سے کر لیں کہ جو جسمِ مقدس ﷺ اس قدر لطیف تر ہے تو روحِ اطہر ﷺ، روحِ مبارک ﷺ کی عظمت کیا ہوگی؟۔

اگر معراج روحانی ہوتا تو خواب کی مثل ہوتا کیونکہ روحانی واردات اور خواب میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ خواب انسان غیر اختیاری طور پر دیکھتا ہے جبکہ روح کے سفر کو اختیاری طور پر اور بیداری میں دیکھتا ہے۔ اگر اس طرح کا واقعہ ہوتا کہ مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر اس حیثیت سے (خواب میں) بیت المقدس کو دیکھ لینا یا اس حیثیت سے آسمانوں کو دیکھ لینا ہوتا تو اس پر مشرکینِ مکہ بھی اعتراض نہ کرتے۔ یہ ایسی عجیب بات نہ تھی کہ اس پر اتنا طوفان بپا ہوتا اور اہل مکہ چیختے اور چلاتے۔

اگر خواب ہوتا تو کفر کو خواب کی تردید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ میں آسمانوں پر گیا۔ اب یہاں اگر کوئی کہہ دے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں آسمانوں پر گیا تو لوگ کیا اسے پاگل کہنے لگیں گے؟ خواب تو وہ دیکھ سکتا ہے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ میں بیداری میں گیا اور اس محسوس جسم کے ساتھ

آسمانوں پر گیا، عرش پر بھی گیا، جنت بھی دیکھی، دوزخ بھی دیکھی، پھر واپس بھی آ گیا۔ یہ کوئی کہے گا تو ہزار بار سوچنا پڑے گا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟

آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے، وہ ٹھیک تھا کہ جو ہوا ٹھیک ہوا، بہترین ہوا۔ عجیب بات تب ہوئی جب اللہ نے یہ حکم دیا کہ آپ ﷺ یہ بات صبح سب کو بتائیں۔ آپ اندازہ کیجیے اس ماحول اور معاشرے کا، اس کی شدید ترین مخالفت اور بہتانوں کا اور اس میں پھر یہ حوصلہ اللہ کے نبی ﷺ کا ہی ہوتا ہے کہ جس بات کا اللہ حکم دے دے، اسے سرِ بازار، سرِ میدان، پکار پکار کر، اعلان کر کے بیان کر دیتا ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتا، کسی سے نہیں ہچکچاتا، کبھی نتائج کی پرواہ نہیں کرتا۔ حضور اکرم ﷺ نے جہاں ایک ایک تفصیل بتائی، وہاں راستے میں اہلِ مکہ کے جو قافلے چل رہے تھے ان کی تفصیل ارشاد فرمائی، ان کے اونٹوں کا رنگ ارشاد فرمایا، بعض جو منزل کے قریب تر تھے، ان کے پہنچنے کا وقت ارشاد فرما دیا کہ وہ اتنے راستے پر ہیں اور پہنچنے والے ہیں۔

تو یہ سارے شواہد مل کر اس بات کو پختہ تر کر دیتے ہیں کہ واقعۂ معراج، حضورِ اکرم ﷺ کا جسدِ اطہر کے ساتھ بالائے آسمان جہاں تک رب اللعالمین نے چاہا، تشریف لے جانے کا واقعہ ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک جو لوگ چودہ صدیوں سے اپنے مسلمان ہونے کے مدعی ہیں ان کا ایک بہت بڑا طبقہ کہتا ہے یہ حقیقت نہیں، خواب تھا۔

معجزۂ معراج کے حقیقی وارث

معجزۂ معراج کی عظمتیں کس کو منتقل ہوئی ہیں؟ وہ صادقین جنہیں واقعی سلوک نصیب ہوا ہو، اس معجزے کے حقیقی وارث ہوتے ہیں۔ اب کسی کا جسم تو اس تقدس کو پانے سے رہا جو حضرت محمد ﷺ کے جسدِ اطہر کا تھا۔ ساری نیکیوں، ساری عبادات، سارے اذکار

کرنے کے بعد اس روح کو بھی اگر نقوشِ کفِ پا پر رسائی حاصل ہو جائے تو یہ کسی بھی آدمی کیلئے کمال کی انتہا ہے۔ روح کے پہنچنے کا راستہ جو ہے وہ نقشِ کف پائے محمد رسول اللہ ﷺ کا مرہونِ منت ہے۔ معجزاتِ پیغمبر ﷺ امت میں سے ان لوگوں کو بطورِ کرامت منتقل ہوتے ہیں جنہیں کمالِ اطاعت نصیب ہو۔

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی (الضحیٰ: 7)

اس سوال میں علماء پھنس جاتے ہیں کہ بعثت کا اعلان تو ہوا نہیں تھا جبکہ آپ ﷺ تیس تیس، چالیس چالیس دن کیلئے ستو اور پانی لے جاتے، روزے سے بھی رہتے، اس کی کیا ضرورت تھی۔ جب آپ ﷺ پہ وحی نازل نہیں ہوئی تھی تو کس نے حکم دیا؟ بعض نام نہاد علماء جنہیں عظمتِ رسالت ﷺ کا ادراک نہیں ہو سکا وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس دور کے عمل کی تو کوئی سند ہی نہیں ہے۔

مولانا آزادؒ نے یہاں اس کی یہ بہت خصوصی توجیہہ پیش کی ہے کہ جب کلی پھول بننے پہ آتی ہے تو اس میں ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ اس کا منہ بالکل بند ہوتا ہے، بالکل سیل ہوتی ہے لیکن اس کے اندر فطری طور پر ایک اضطراب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اضطراب اسے پھاڑ کر غنچہ بنا دیتا ہے اور غنچہ کھل کر پھول بن جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبیؐ کے اندر وہ جذبہ تو پیدائشی طور پر، تخلیقی طور پر موجود ہوتا ہے۔ جوں جوں بعثت قریب آتی ہے، وہ اضطراب اسے مخلوق سے الگ کر کے خالق کی یاد میں محو کیے رکھتا ہے۔ وہ لوگوں سے کٹ جاتا ہے اور یہ اس اضطراب کا کمال ہے کہ جس پر کلی غنچہ بنتی ہے۔

عرصۂ شعور سے لے کر بعثت تک ایک بیقراری جو غنچے کو چٹکنے کیلئے اور کلی کو پھول بننے کیلئے ہوتی ہے وہ قلبِ اطہر رسول اللہ ﷺ میں تھی جسے قرآن کریم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی ہم نے آپ ﷺ کو بیقرار پایا تو ہم نے آپ ﷺ

کیلئے راہیں کھول دیں، آپ ﷺ کو نبوت عطا کر دی۔ اس آیت کریمہ کا ترجمہ تو بڑا صاف اور واضح ہے، بات عام فہم ہے کہ قربِ الٰہی کی طلب اور تڑپ کا جذبہ آپ ﷺ کو بیقرار کیے ہوئے تھا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ قربِ الٰہی کی تڑپ کا ایک ذرہ کسی کو نصیب ہو جائے تو بات آگے چلے۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا

"لذت ایں مے بخدا ناشناسی تا نہ چشی"

اس مشروب کی لذت نہ پا سکو گے جب تک اسے چکھو گے نہیں۔ ہمیں اس تڑپ کا اندازہ نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو اس کا ایک ذرہ نصیب ہو جائے تو اس کی ساری توجہ اس درد کو بڑھانے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسے سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے یہی دھیان رہتا ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ سکتا ہے اس بات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کوئی اس سے راضی ہو یا خفا، اسے کسی بات کی پرواہ نہیں رہتی وہ اسی بات پر متوجہ رہتا ہے کہ قربِ الٰہی کی طلب کی کیفیت میں فرق نہ آنے پائے۔

تو اگر ایک ولی کہ جسے ایک ذرہ، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جوتوں کی خیرات میں مل جاتا ہے اور وہ اس کو مزید قرب کیلئے بیقرار رکھتا ہے تو وہ نبی ﷺ جو ساری کائنات کیلئے ہے، سارے جہانوں کیلئے رحمت ہے، جو نبیوںؑ کے بھی نبی ہیں، جو امام الانبیا ﷺ ہیں، ان کے قلبِ اطہر میں کیا تجلیات اور کیا کیفیات ہوتی ہوں گی جس نے قیامت تک کے سارے جہانوں کو روشن کر دیا۔ تو ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کیفیات کیا ہوں گی اور جتنی کیفیات ہوں گی اسی درجہ کی بیقراری بھی ہوگی، جس طرح کی طلب ہوگی اسی طرح کا اضطراب بھی ہوگا۔ تو قرآنِ کریم کا یہ جملہ ہی بڑا محبت بھرا ہے، معانی اور کیفیات سے بھرپور ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کوئی سمجھ نہ سکے۔ یہ بہت خوبصورت آیۂ کریمہ ہے، پیار بھری بات ہے جیسے محبوب خود کسی چاہنے والے سے کہے کہ میں تیری بیقراری سے

واقف ہوں۔ دنیائے محبت میں اس سے بڑا کوئی مقام نہیں جب محبوب اپنے طالب سے کہے کہ میں تیرے حال سے واقف ہوں۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ محبوب کی طرف سے محبت کا جواب آ رہا ہے، طالب کیلئے اظہارِ محبت ہو رہا ہے ورنہ آدمی خود تو محبت کر سکتا ہے کسی دوسرے کو محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ پھر جب طالب ہوں محمد رسول اللہ ﷺ اور مطلوب ذاتِ باری ہو اور ذاتِ باری خود فرمائے کہ ہم آپ ﷺ کی بے قراری سے واقف ہیں، آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی منزل عطا کر دی گئی تو یہ کتنا خوبصورت جملہ ہے۔ محبت کے لطیف جذبات کا یہ کتنا بڑا خزانہ ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ: 128)

فرمایا! میرا نبی ﷺ ساری کائنات سے بے نیاز ہے لیکن اے اولادِ آدم! تمہارے معاملے میں لالچ کی حد تک چلا جاتا ہے، کبھی سیر نہیں ہوتا۔ فرمایا! اے نبی ﷺ! اگر تو چاہے تو ان پہاڑوں کو سونے کا بنا دوں۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں اے خدایا! مجھے مسکین ہی زندہ رہنے دے، اے اللہ! مجھے مسکینوں میں موت دینا اور مسکینوں کے ساتھ اٹھانا۔ لیکن جب تمہاری بات ہوتی ہے تو وہ اس بات پر راضی نہیں ہوتا بلکہ تمہارے لیے لالچ کی حد تک مانگتا چلا جاتا ہے۔ مومنوں کے ساتھ اس کا معاملہ رحمت کا ہے۔ وہ بخشش جس کی حد نہیں، ایسی رحمت جس کی انتہا نہیں۔ مومن کیلئے میرے نبی ﷺ کے پاس راحت اور رحمت ہی ہے۔ راحت ہوتا ہے خطاؤں سے درگزر کرنا اور رحمت ہوتی ہے کام تھوڑا ہو اور اس کی مزدوری زیادہ ہو۔ فرمایا! میرا نبی ﷺ ایسا کریم ہے کہ تم گناہ کرتے ہو وہ چھپا لیتا ہے۔ تم تھوڑی عبادت کرتے ہو وہ تمہارے لیے زیادہ مانگتا ہے یعنی تم مزدوری کم کرتے ہو وہ تمہیں زیادہ دینا چاہتا ہے۔ تم گناہ کرتے ہو وہ تمہاری بخشش کیلئے ہر آن دستِ بدعا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا مزاجِ عالی یہ ہے کہ فرمایا عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ کہ پوری

انسانیت میں ٹھوکر کسی انسان کو لگتی ہے اس کا درد اللہ کے نبی ﷺ محسوس کرتے ہیں۔ وہ تمام انسانوں کیلئے اتنے شفیق ہیں کہ جہاں کوئی بھی اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے، حضور ﷺ اس کا دکھ محسوس کرتے ہیں۔ انسانوں کی غلطیاں اور نافرمانیاں آپ ﷺ پر بہت بھاری، مشکل اور تکلیف دہ ہیں حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ. وہ ہستی جو دو عالم سے بے نیاز ہے اور صرف اللہ کی طالب ہے، وہ انسانوں کے معاملے میں حرص اور لالچ کی حد تک ان کی ہمدرد اور خیر خواہ ہے اور چاہتی ہے کہ ہر فرد عذابِ الٰہی سے بچ جائے۔ یہ عمومی کرم تو نبی کریم ﷺ کا ساری انسانیت پر ہے لیکن جنہیں ایمان نصیب ہوا ان کے ساتھ خصوصی رحمت ہوتی ہے وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ: 128) مومنین کے حق میں ہمہ وقت رحم کے طالب رہتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: 107)

ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تمام جہانوں کی تفصیل سمجھنے کیلئے یہ بات کافی ہے کہ ذاتِ باری کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ سب تمام جہانوں، تمام عالمین میں شامل ہے۔ یعنی تمام اولین و آخرین، افرادِ انسانیت، جن، فرشتے، حیوان، چرند پرند، زمین و فضا، ستارے و سیارے، آسمان، زمین، آسمانی مخلوقات اور عرشِ عظیم۔ تمام کی تمام تخلیقاتِ باری کیلئے حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔

ساری اچھائیوں کا مجموعہ ہے ذاتِ محمد رسول اللہ ﷺ، کمالات کا مجموعہ ہے ذاتِ آقائے نامدار ﷺ۔ اللہ کی ساری رحمتیں مجسم ہو کر بن گئے محمد رسول اللہ ﷺ۔ رحمۃ للعالمین صرف انسانوں کیلئے نہیں، اللہ کی ساری مخلوق کیلئے حضور ﷺ کی ذات ستودہ صفات رحمت ہے۔

اللہ، اللہ ہے۔ خالق و مالک ہے اور باقی سب اس کی مخلوق ہے۔ اللہ کے بعد، اللہ کا رسول ﷺ مخلوق میں بلند ترین ہستی ہیں۔ سادہ سی بات ہے اور آسان بات ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، بے مثل و بے مثال ہے اور مخلوق میں محمد رسول اللہ ﷺ افضل ترین ذات ہیں۔ آپ ﷺ جیسا کوئی اور دوسرا نہیں۔

حضور ﷺ کی ذاتِ عالی پر بحث کرنا (اختلاف کا موضوع بنانا) جہالت ہے اور اس جہالت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ لوگوں نے اس پر کتابیں لکھیں، مناظرے کیے اور ابھی تک کر رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے نبی کریم ﷺ میں یہ کمال تھا، دوسرا کہتا ہے یہ نہیں تھا (معاذ اللہ) اور کوئی یہ نہیں سوچتا کہ

"اپنے سے کم کو تولا جاتا ہے اپنے سے زیادہ کو نہیں"

پانچ سیر کا باٹ بیس سیر کے وزن کو نہیں تول سکتا۔ اپنے سے نیچے پر بحث کی جاتی ہے، اپنے سے اوپر پر بحث کرنا ہی جہالت ہے۔ کسی پیمانے پر نبی کریم ﷺ کی ذاتِ والا صفات کو موضوعِ بحث بنانا بجائے خود ایک گستاخی ہے۔ سادہ سا ایمان ہے اس بات پر یقین رکھا جائے کہ ہر وہ کام حق ہے جو حضور ﷺ کے ارشاد و سنت کے مطابق ہے اور ہر وہ کام باطل ہے جو حضور ﷺ کو پسند نہیں۔

فروعات میں، تشریحات میں اختلافِ رائے ہوتا ہے، یہ مستحسن ہے۔ جب تک یہ اختلاف شریعت کی حدود کے اندر رہ کر ہو، درست ہے۔ کسی نے آپ ﷺ کے ارشادِ پاک کے ایک حصے کو افضل مان لیا، کسی نے دوسرے کو افضل مان لیا۔ فضیلت میں رائے مختلف ہوتی ہے۔ اختلافات جھگڑے کیلئے نہیں ہوتے، شریعت کے ہر پہلو پر عمل کیلئے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے انہیں باہمی نزاع کا سبب بنا لیا ہے۔

شیخ سعدیؒ کی نعت کا ایک شعر ہے۔

نہ حسنش غایب دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیر و تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

وہ کہتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ کے حسن کی کوئی حد ہے نہ سعدی کے پاس کلام کی اتنی وسعت کہ نعت کہہ کر اسے سمو سکے۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ استسقاء کا مریض پانی پیتے پیتے بھی پھر پیاسا ہی مر جاتا ہے حالانکہ دریا کناروں تک بھرا ہوا بہہ رہا ہوتا ہے۔ استسقاء کے مریض کو اگر دریا کے کنارے ڈال دیں، وہ بھر بھر کر پیتا رہے، مر جائے گا لیکن پیاس ختم نہ ہوگی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعریف کرنے والا تعریف کرتے کرتے تھک جائے گا اور اس کی زندگی ختم ہو جائے گی لیکن آپ ﷺ کے حسن کا احاطہ نہ کر سکے گا۔

آپ ﷺ کا ہر پہلو بے مثال ہے۔ حسنِ ظاہر ہو، قد و قامت ہو، آواز ہو، نگاہِ عالی ہو، ہاتھ مبارک ہوں، پائے اقدس ہوں، بال مبارک ہوں یا آپ ﷺ کی قوت گویائی یا سماعت ہو، ہر ہر پہلو اتنا حسین ہے کہ کائنات میں ایسا کوئی دوسرا نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کا دماغ بھی اتنا عالی ہے کہ ایسا دماغ کسی دوسرے بشر میں نہیں لیکن قرآن دماغ پر نہیں قرآن دل پر نازل ہوا۔ یہ ہے اہمیت قلب کی۔

حسنِ ظاہر سے تیرے روشن جہانِ رنگ و بو
پر جمالِ باطنی کی ضو فشانی اور ہے

محبت و عشق

محبت کیا ہوتی ہے؟ محبت ایک رشتہ ہوتا ہے، محبت ایک طلب ہوتی ہے جو محبوب کا قرب چاہتی ہے، محبوب کو دیکھنا چاہتی ہے، محبوب سے بات کرنا چاہتی ہے، محبوب کے

پاس رہنا چاہتی ہے۔اور جب یہ رشتہ بڑھ کر جنون کی حد تک چلا جائے کہ محبوب کے علاوہ کچھ سجھائی نہ دے تو اسے عشق کہتے ہیں۔یعنی عشق کیا ہے، کمال محبت ہے۔جب محبت اپنی انتہاء کو، اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو عشق کہلاتی ہے۔عشق یہ ہے کہ جو اطاعت ہم ظاہراً کرتے ہیں اس میں صرف ہمارا وجود ہی شامل نہ ہو بلکہ ہمارا دل بھی شامل ہو جائے۔جب ہم رکوع کر رہے ہوں تو صرف کمر ہی دوہری نہ ہو بلکہ دل بھی بارگاہِ الوہیت میں جھک رہا ہو اور وصل کی لذتوں سے سیراب ہو رہا ہو۔جب ہم سجدہ کر رہے ہوں تو صرف پیشانی ہی زمین پر نہ رکھی ہو بلکہ دل ڈوبا ہوا ہو اور وہ کیفیاتِ وصل کی لذتیں محسوس کر رہا ہو۔

جس طرح بادام کے اوپر ایک مضبوط سا خول ہوتا ہے وہ مضبوط خول شریعتِ مطہرہ ہے۔اس کے اندر بادام کی نازک سی گری محفوظ ہے۔اگر وہ خول توڑ دیں تو اسے کوئی پرندہ بھی اُچک سکتا ہے، اسے چیونٹیاں بھی کھا سکتی ہیں، وہ باقی نہیں رہتی۔اسی طرح ہمارے سینے میں وہ دردِ دل ہو کہ جب ہم شریعت پر عمل کریں اعضاء و جوارح ہی عمل نہ کریں بلکہ دل بھی اس کا ساتھ دے رہا ہو اور دل میں درد اور تڑپ بھی ہو۔ایک شاعر نے اسے Describe کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے

محبت کیا ہے تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں　　تیرا مجبور کر دینا، میرا مجبور ہو جانا

یعنی محبت ایک ایسا جذبہ ہے کہ محبوب کے لیے بندے کے سارے اختیارات سلب ہو جاتے ہیں۔وہ خود کو کھو بیٹھتا ہے، اس کی اپنی کوئی پسند ناپسند نہیں رہتی، اس کی پسند محبوب کی پسند ہے، اس کی آرزو محبوب کی آرزو ہے، اس کا جینا مرنا محبوب کے لیے، اس کی خوشی کے لیے ہوتا ہے۔عجیب بات ہے بندے کا اپنا کچھ نہیں رہتا۔ایک عرب شاعر کہتا ہے فان المحب لمن یحب مطیع محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے اس کا غلام ہو کے رہ جاتا ہے اور یہ غلامی غیر مشروط ہوتی ہے۔کچھ ملے یا نہ ملے۔محبوب

خوش ہو تو پیار کرتا ہے، وہ ناراض ہو تو بھی وہ اس سے پیار کرتا ہے۔یہ عجیب بیماری ہے۔

عشق کو کیا ضرورت ہے آسانیاں تلاش کرنے کی۔عشق کا ہدف معشوق کی بارگاہ ہوتی ہے۔اس میں کوئی شرائط نہیں کہ راستہ آسان ہو گا تو آجاؤں گا، راستہ مشکل ہو گا تو شاید میں نہ آسکوں، اس کو عشق نہیں کہتے، اس کو محبت نہیں کہتے۔عشق اپنے مقصد پہ نگاہ رکھتا ہے، راستے کی ہر گھاٹی اسے عزم کی پختگی عطا کرتی ہے، ہر رکاوٹ اسے اور تیز گام کرتی ہے، ہر پہاڑ اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے۔

عشق ایک طاقت ہے جو کمزوروں کو طاقتور بنا دیتی ہے، زیردستوں کو بالادست بنا دیتی ہے۔عشق ایسا جواں عزم عطا کرتا ہے کہ راستے کی کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں رہتی۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے　　دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اجالا کر دے

عشقِ نبوی ﷺ ایک عجیب کیف آفریں شعلہ ہے کہ کوئی اکیلا نہیں جلتا، جلنے والا بے شمار لوگوں کو ساتھ جلاتا چلا جاتا ہے۔ساری محبت کا نام ہے محمد رسول اللہ ﷺ۔اس نامِ نامی سے باہر محبت کا تصور نہیں ہے۔"م ح م د" کو درمیان سے نکال دیں تو نفرت ہی نفرت ہے، محبت کا تصور نہیں ہے، نہ پہلے تھا نہ اب ہے اور نہ کبھی ہو گا۔احب الصالحین ولست منهم لعلی الله یرزقنی صلاحا. مجھے نیکوں سے محبت تو ہے اگرچہ میں نیک نہیں ہوں لیکن اس سے کیا بعید ہے کہ وہ مجھے بھی یہ صلاحیت عطا کر دے۔محبت جب اللہ سے ہوتی ہے، محبت جب اللہ کے حبیب ﷺ سے ہوتی ہے تو ہر فرد اور اللہ کی تمام مخلوق سے محبت ہو جاتی ہے۔جب کسی دل میں محبت کے جذبات آتے ہیں تو اللہ کی ساری کائنات اُسے محبوب لگتی ہے۔پھر ہر ایک کا دکھ، اس کا دکھ ہوتا ہے۔گناہ دوسرے سے سرزد ہوتا ہے، آنسو اُس کی آنکھ سے نکلتا ہے کہ کاش اس شخص نے ایسا نہ کیا ہوتا۔اور اگر یہ محبت نصیب نہ ہو تو آدمی صرف دوسروں پر طنز کرتا رہتا ہے، نفرتیں بکھیرتا رہتا ہے، چڑتا رہتا ہے۔اس

کے اندر اتنی نفرتیں جمع ہو جاتی ہیں کہ وہ خود کو ہلاک کر لیتا ہے۔

محبت اور نفرت ایک دوسرے کی ضد ہیں جس طرح روشنی اور تاریکی۔ جہاں محبتیں آئیں گی، وہاں سے نفرتیں مٹ جائیں گی اور جہاں نفرتیں آئیں گے، دل محبتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ ان نفرتوں کا علاج ہے دردِ دل جو بارگاہِ محمد رسول اللہ ﷺ سے تقسیم ہوتا ہے۔

محبتِ رسول اللہ ﷺ

محبت بندے کو نہ ہونے کے برابر کر دیتی ہے، مٹا کر رکھ دیتی ہے اور بندہ محبوب کے اشاروں پر ناچتا رہتا ہے۔ ایسا قیدی ہوتا ہے جسے آزاد بھی کر دیا جائے تو بھی وہ غلام ہی رہتا ہے۔ لوگ غلامی سے جان چھڑاتے ہیں، آزادی کے طالب ہوتے ہیں لیکن محبت کرنے والے غلام ہی رہتے ہیں، خواہ انہیں آزاد کر دیا جائے۔ جب محبت ہوتی ہے تو محبت بندے کا اختیار سلب کر لیتی ہے، اپنی تجویزیں ختم ہو جاتی ہیں، اپنے فیصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے، محبوب کی خوشنودی اور رضامندی۔ محبوب بھی ایسا جس کی رحم دلی، شفقت و محبت کے دعوے خود اللہ کریم کر رہے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے آپ ﷺ بہت ہی نرم مزاج، نرم دل اور بے حد محبت کرنے والی ہستی ہیں۔ کوئی ذرا سا آپ ﷺ کی طرف جھکے تو آپ ﷺ اس پر رحمتیں نچھاور کر دیتے ہیں۔

مرزا مظہر جان جاناںؒ نے کیا خوب فرمایا تھا، کیسے عجیب آدمی تھے، فرماتے ہیں

محمد از تو می خواہم خدارا خدایا از تو عشقِ مصطفےٰ را

اگر نبی پاک ﷺ کی خدمت میں گزارش کرنی ہو تو کہو اے محمد ﷺ! مجھے اللہ عطا کر دیں اور اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھانے ہوں تو نبی ﷺ کا عشق مانگو۔ نبی پاک ﷺ سے اللہ کی ذات مانگو اور اللہ سے نبی کریم ﷺ کا عشق مانگو۔

دگر لب وا مکن مظہر فضولیست سخن از حاجت افزوں تر فضولیست

ضرورت سے زیادہ بات کرنا فضول ہوتا ہے۔ اس میں سب کچھ آ جاتا ہے دونوں جہان آ جاتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں اللہ کو مانگو اور اللہ کی بارگاہ میں حضور ﷺ کو مانگو۔ بس بات ختم ہو گئی۔

یہ فطری بات ہے کہ کوئی ایک شخص کسی سے محبت کرتا ہو پھر دوسرا کرنے لگے، دس بیس کرنے لگیں تو سارے آپس میں رقیب بن جاتے ہیں، ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ یہ عجیب بارگاہ ہے، یہاں عجیب معاملہ ہے کہ جتنے جتنے اللہ کے عاشق، اللہ کے نبی ﷺ کے عاشق بنتے جائیں، وہ ایک دوسرے سے بھی محبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ ساری دنیا کا قاعدہ الگ ہے، اس بارگاہ کا ضابطہ الگ ہے چونکہ وہ محبتیں اور ہیں۔ محبتیں اپنے اندر تلخی بھی رکھتی ہیں مگر یہ محبت سراسر مٹھاس ہی مٹھاس ہے، اس میں تلخی نہیں ہے اور یہ کمال محبوب ﷺ کا ہے۔

دنیوی دوستی بھی کاروبار کی ہی ایک قسم ہے جسے ہم محبت کا نام دے دیتے ہیں۔ ہماری دوستی اور محبت وہیں تک ہوتی ہے جہاں تک ہمیں کچھ ملنے کی امید ہوتی ہے۔ کسی سے کچھ حاصل ہونے کی امید نہ رہے تو دوستی رہتی ہے نہ محبت۔ سگا بیٹا بھی اگر کما کر نہ دے تو والدین کو جو پیار اولاد سے ہوتا ہے وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کو دیا اور جو کچھ آپ ﷺ نے مومنین کو دیا۔ جو کچھ آپ ﷺ دیتے رہے ہیں اور جو کچھ آپ ﷺ قیامت تک آنے والے ہر بندۂ مومن کو عطا کرتے رہیں گے، وہ دائمی، ابدی اور حقیقی انعام ہے، وہ ختم ہونے والا نہیں۔ لہٰذا حقیقی محبت بھی وہی ہے جو دائمی چیزوں سے ہو۔ وقتی چیزوں، لمحاتی اور فانی چیزوں سے محبت نہیں ہوتی وہ ہماری ضرورتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم محبتوں کا نام دے دیتے ہیں۔ دنیوی رشتے، مادی اور وقتی مفاد کیلئے ہوتے

ہیں۔

جب ہم محبت کرتے ہیں تو جس چیز سے، جس فرد سے محبت کرتے ہیں اس میں کوئی خوبی ہوتی ہے، اس خوبی کے ہم عاشق ہو جاتے ہیں حالانکہ اس میں بے شمار خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ والدین اور اولاد کو لے لو۔ ہم ان کی محبت میں پاگل ہوتے ہیں لیکن والدین میں بھی بعض اوقات ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو ہمیں پسند نہیں ہوتیں اور اولاد تو اکثر اوقات نافرمان نکلتی ہے۔ اس کے باوجود اولاد، اولاد ہی ہوتی ہے۔ اس لئے ماں باپ بھی ان سے محبت کرتے ہیں، ان کے بچاؤ کے اسباب، ان کیلئے کچھ نہ ہو سکے تو دعا تو کرتے ہی رہتے ہیں۔ اسی طرح ہم دولت سے محبت کرتے ہیں، ضروری نہیں کہ سارا مال حلال ہی ملے، اس میں حرام بھی ہوتا ہے، ناجائز بھی ہوتا ہے، سود بھی ہوتا ہے، ظلم کا کمایا ہوا بھی ہوتا ہے، یہ ساری خامیاں نظر انداز کر کے ہم محنت کئے جا رہے ہوتے ہیں۔

اللہ کا حبیب ﷺ ایسی ہستی ہے جن کا کمال تو یہ ہے کہ خامی نام کی کسی چیز کا وہاں گزر ہی نہیں، خوبی ہی خوبی ہے، حسن ہی حسن ہے، لطافت ہی لطافت ہے۔ ایسا وجودِ عالی، ایسی ہستی ہمارے سامنے ہو اور ہم اس سے محبت نہ کریں، کیسے ممکن ہے؟ ہم محبت نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو جانا نہیں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص ایمان والا نہ ہوگا جب تک اس کے دل میں میری محبت اپنے والد اور اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو جائے (صحیح بخاری)۔

محبتِ رسول اللہ ﷺ کے پہلو

محبتِ رسول اللہ ﷺ کے بھی کھربوں پہلو ہیں۔ ہیرا ایک پتھر ہے اس کی قیمت تراش خراش سے بنتی ہے اور جتنے اس کے پہلو بنتے جائیں گے اتنی اس کی قیمت بڑھتی چلی جائے گی۔ اللہ کریم کی اپنی تراش خراش ہے، اس نے ایک ایسا ہیرا تراشا کہ کہا، اب اس

جیسا دوسرا تراشا نہیں جائے گا۔ یہ ایک ہی بے مثل ہے، بے مثال ہے، کوئی اس کا ثانی بناؤں گا ہی نہیں۔ آپ اندازہ کریں اللہ کے رسول ﷺ کی ذاتِ اقدس کا کہ کب سے کائنات ان سے عشق کرنے لگی اور کب تک کرتی چلی جائے گی، گویا افرادِ کائنات کم پڑ جائیں گے اور آپ ﷺ کے جمال کے پہلو کم نہیں پڑیں گے۔

اب ایک ان پڑھ کی محبت ہے، ایک عالم کی محبت ہے اور ایک گناہگار کی بھی ہے۔ میں نے گناہگاروں میں بھی محبت دیکھی ہے۔ جنہیں لوگ بدمعاش، بدکردار کہتے ہیں، وہ نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، لیکن ذرا سی عظمتِ نبی ﷺ پر بات آ جائے، جان دے دیتے ہیں، سینہ شق کرا لیتے ہیں، مرنے مارنے پہ تیار ہو جاتے ہیں۔ کہیں کوئی درد ہے تو ایسا کرتے ہیں، کہیں کچھ ہے تو جان دیتے ہیں، کسی گوشے پہ کہیں تو کوئی چوٹ پڑی ہے، اس رشتے کے احساس پہ گرد پڑی ہوئی تھی کوئی صاف کرنے والا نہ ملا، کوئی ایسا نہ ملا جو اسے دھو دیتا لیکن جب عظمتِ رسالت ﷺ پہ حرف آیا تو چوٹ تو پڑی۔ جہاں اس کا کوئی رشتہ جو دل کی گہرائی میں تھا وہاں چوٹ پڑی تو بندہ بھڑک اٹھا اور جان دینے پہ آمادہ ہو گیا۔

اب ایک ایسی ہستی جس کی محبت عین ایمان ہے اور آدمؑ سے لے کر قیامت تک آنے والے لوگ اس سے محبت کریں گے تو کتنی مخلوق محبت کرے گی۔ ہر بندے کا مزاج بھی الگ ہے، فکر الگ ہے، قلب الگ ہے، علم الگ ہے، استعداد الگ ہے اس لیے اس ہیرے میں بھی اتنے ہی پہلو ہوں گے جتنے لوگ اس سے محبت کریں گے کوئی گن سکتا ہے کہ محبت کے کتنے پہلو ہیں آقائے تاجدار ﷺ کے۔ کم از کم میرے مطالعے میں دنیا میں کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو ہر بندے کو پسند ہو۔ امیر کو بھی غریب کو بھی، بادشاہ کو بھی فقیر کو بھی، مرد کو بھی عورت کو بھی، بچے کو بھی بوڑھے کو بھی، روئے زمین پر ایسی ایک ہی ہستی ہے اور وہ ہے

محمد رسول اللہ ﷺ۔ یہ ایک ایسی ہستی ہے جس پر ہر مسلمان جان نچھاور کرتا ہے۔ جس کا دل چیر کر دیکھو وہی کہتا ہے میرے آقا، میرے محمد رسول اللہ ﷺ۔ ہم جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں ہماری محبت ایک طرح کی تو نہیں ہے۔ ہر بندے کے اپنے جذبات ہیں، ہر بندہ اپنے انداز سے محبت کرتا ہے۔ روزِ اول سے قیامِ قیامت تک لوگوں کا جمِ غفیر دیکھو اور درمیان میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔ اب جتنے طالب ہیں، ہر ایک الگ الگ پہلو کا طالب ہے۔ اس کا مطلب ہے اتنے ہی پہلو محبتِ رسول اللہ ﷺ کے ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہیں اس لیے کہ لوگ ابدالآباد تک محبت کرتے جائیں گے، محبت بڑھتی جائے گی۔ جنت کے مکینوں کی بھی بڑی دولت عشقِ رسول ﷺ ہی ہوگی اور روز افزوں ہوگی، نئے نئے پہلو سامنے آتے جائیں گے لہٰذا یہ اللہ ہی جانے اور اللہ کا رسول ﷺ جانے۔ یہ ماؤشما کے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است

عظمتِ رسالت ﷺ کو صرف اللہ جانتا ہے۔ ہم مانتے ہیں لیکن ہم احاطہ نہیں کر سکتے۔ ہم تو اپنی حیثیت کے مطابق ہی جانتے ہیں۔ حضرت شیبہؓ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ ان کا باپ اور بھائی بدر میں مارے گئے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میرے دل میں اس بات کا بڑا قلق تھا۔ غزوۂ حنین میں، میں اس ارادے سے نکلا کہ آج جب گھمسان کا رن پڑے گا، میں اپنے باپ اور بھائی کے دکھ کا مداوا کروں گا اور معاذ اللہ نبی کریم ﷺ پر وار کر کے اپنے دل کی آگ بجھالوں گا۔ میں موقع تاکتے ہوئے حضور ﷺ کی طرف بڑھا۔ دائیں طرف سے گیا تو حضرت عباسؓ موجود تھے۔ بائیں طرف سے گیا تو کوئی ایک اور جان نثار موجود تھے۔ میں پیچھے پہنچ گیا تو اچانک حضور ﷺ نے میرا نام لے کر پکارا اور فرمایا شیبہ! سامنے آؤ۔ میں دھک سے رہ گیا کہ میں تو پیچھے تھا لیکن حضور ﷺ نے مجھے ملاحظہ فرمالیا۔

میں شرمندہ شرمندہ حضور ﷺ کے سامنے آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا! قریب آؤ۔ جب میں اور قریب گیا تو آپ ﷺ نے میرے قلب پر اپنی انگلی مبارک رکھی اور دعا فرمائی۔ ''اے اللہ! اس کے دل کو بدل دے''۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ دنیا و مافیہا کو اُن کے قدموں پہ نچھاور کیا جاسکتا ہے۔ اب میرے نزدیک محمد رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب کوئی نہ رہا''۔ یہاں سے اندازہ کرلیں کہ کوئی دشمنی لے کر جاتا ہے اور محبت لے کر آتا ہے، عشق لے کر پلٹتا ہے تو جو محبت لے کر جائے گا وہ کیا پائے گا!

تو میرے بھائی! محبت کرو۔ محبت مانگنے کا نام نہیں، محبت نچھاور کرنے کا نام ہے۔ عاشقانِ رسالتمآب ﷺ کے واقعات ہم گننے لگیں تو بڑے طویل ہیں، بے حساب ہیں۔ عشاقِ نبی ﷺ کی زندگیاں اسی میں بسر ہوئیں۔ عجیب عجیب انداز سے لوگوں نے محبت کی، ایک رائی برابر بھی، چھوٹے سے چھوٹا درجہ بھی اس محبت کا نصیب ہو جائے تو ایمان کی دلیل بن جاتا ہے، عمل کی بنیاد بن جاتا ہے، نجات کا سبب بن جاتا ہے، رضائے الٰہی کا سبب بن جاتا ہے۔

محبت کیلئے جاننا شرط ہے

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو جاننے کے دو طریقے ہیں اور میری ذاتی رائے میں دونوں اپنانا چاہئیں۔

1۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جتنا ممکن ہو سکے حضور ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے۔ چھوٹی سی کتاب ملے، بڑی کتاب ملے، مستند کتابیں ہوں۔ حضور ﷺ کی سیرت جوں جوں کوئی پڑھتا ہے، اتنی اتنی محبت دل میں اترتی ہے۔

2۔ اس سے بھی آسان راستہ یہ ہے کہ ہر وقت زبان درود شریف سے تر رہے۔ جتنا جتنا درود شریف پڑھتے چلے جائیں گے اتنے اتنے اسرار مطالعہ کے بغیر بھی

کھلتے جائیں گے۔

لذائذِ دنیا اور محبتِ محمد رسول اللہ ﷺ

اللہ نے روئے زمین پر اپنی تخلیقات میں مختلف انداز کے حسن اور مختلف لذتیں بکھیر دیں اور دوسری طرف اپنے جمالِ جہاں تاب کی لذت کو رکھا۔ انسان کو درمیان میں چھوڑ کر اسے آزاد کر دیا کہ اب اس کی پسند ہے اُس طرف جاتا ہے یا اِدھر آتا ہے۔

اور دیکھو لذائذِ دنیا کی طرف دعوت دینے کیلئے ابلیس کو راندۂ درگاہ قرار دیا اور اپنی طرف دعوت دینے کیلئے مخلوق کا سارا حسن سمیٹ کر محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا کر دیا۔ اب کتنی عجیب بات ہے کہ انسان جو حسن کا شیدائی ہے وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بات کو چھوڑ دے اور شیطان کی دعوت کو قبول کر لے۔ کتنی عجیب بات ہے، کتنا بگاڑ آ گیا اس کے مزاج میں اور کتنا شدید بیمار ہے وہ کہ جسے مرچ کڑوی نہیں لگتی اور وہ جو آم کھانا پسند نہیں کرتا تو آپ اس کے بارے کیا اندازہ کریں گے؟ میرے خیال میں ہم تو سمجھیں گے کہ اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ آپ نے کبھی کسی سانپ کے ڈسے ہوئے انسان کو دیکھا ہے؟ اسے مرچیں کھلاؤ، کڑوی نہیں لگتیں اور میٹھی چیز اس کی زبان پر رکھو تو وہ مرنے لگتا ہے اور سانپ کا کاٹا اتنا شدید مرض ہے کہ تمام بیماریوں میں سب سے خطرناک بیماری ہے۔ اسی طرح جو شخص محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں شیرینی نہیں پاتا اور شیطان کی بات پر ریجھ جاتا ہے، اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ بہت قابلِ رحم حالت ہے اس کی اور وہ انتہائی فوری علاج کا متقاضی ہے ورنہ وہ مر جائے گا اور انسان کی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ اسلام سے کفر میں چلا جائے۔ روح کا بدن سے جدا ہونا موت نہیں ہے، یہ تو ایک منزل ہے۔

دعویٰ محبت کا پیمانہ

یہاں محبت بھی حدود و قیود کی پابند ہے۔ ہر مسلمان کا دعویٰ ہے کہ وہ حضور ﷺ

سے محبت کرتا ہے اور واقعی مسلمانوں نے حضور ﷺ سے بے پناہ محبت کی ہے، بے پناہ محبت کریں گے اور کرتے رہیں گے۔ لیکن اس دعویٰ محبت کا پیمانہ اور معیار وہی ہے، اتباعِ نبوی ﷺ۔ جو آپ ﷺ کا اتباع نہیں کرتا وہ آپ سے محبت نہیں کرتا، وہ اپنے دعویٰ میں سچا نہیں ہے۔ اس لیے کہ کچھ کرنا تو درکنار جس سے محبت ہو اس کی مرضی کے خلاف کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ محبت تو یہ سوچنے بھی نہیں دیتی کہ محبوب کی پسند کے برخلاف ہو جائے اور کبھی بتقضائے بشریت غلطی سے خطا ہو جائے تو راتیں بیت جاتی ہیں روتے ہوئے کہ خطا ہو گئی۔ بندے کو احساسِ ندامت گھیر لیتا ہے اور وہی ندامت باعثِ مغفرت بن جاتی ہے۔

تقاضائے محبت

تقاضائے محبتِ رسول ﷺ یہ ہے کہ زندگی قرآن کے سانچے میں ڈھل جائے۔ اس محبت کا تقاضا ہے کہ زندگی کا ہر کام اس طرح کرو جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے کر کے دکھایا۔ تو یہ عشق موت نہیں، حیات ہے اور یہ بندے کو اس بلندی پہ لے جاتا ہے دنیا میں کہ اسے کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، اس کے دن کا ٹائم ٹیبل بھی بارگاہِ الوہیت میں بنتا ہے۔ کتنی عظمت ہے ایک بندے کیلئے کہ اس کے سونے جاگنے کے اوقات من جانب اللہ مقرر ہوں۔ ایک بندے کیلئے کتنے اعزاز کی بات ہے کہ سوتا ہے تو اللہ کے اذن اور اجازت سے اور جاگتا ہے تو اس کے حکم کے مطابق۔

تقاضائے محبت تو یہ ہے کہ محبوب کی خاطر میں نے کیا کیا اور اگر ایک ہستی سے ہمارا رشتہ ہی یہ ہو کہ تم مجھے یہ دے دو، تم مجھے وہ دے دو، تو یہ کون سی محبت ہے۔ اسے محبت کہنا تو اپنے آپ کے ساتھ دھوکہ ہے۔ محبت تو یہ ہے کہ موت بھی آئے تو میں زندگی ہار جاؤں گا لیکن حضور ﷺ کی محبت سے دست کش نہیں ہوں گا۔ بیٹے قربان ہو جائیں، کر دوں گا۔ گھر

لٹ جائے، لٹا دوں گا۔ چھوڑنا پڑے، چھوڑ دوں گا۔ جب مہاجرینِ مکہ نے ہجرت فرمائی تو جائیدادیں، بھرے ہوئے گھر سب کچھ مکہ مکرمہ میں رہ گیا اور جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تب بھی وہ سب واپس نہ لیا۔ فاتح تھے، چاہتے تو سارے شہر پہ قبضہ کر لیتے کہ یہ ہمارا ہے، تم نے کبھی ہمیں نکالا تھا اب ہم تمہیں شہر بدر کرتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا؟ لیکن انہوں نے اپنا بھی کچھ واپس نہ لیا۔ انہوں نے کہا وہ اب ہمارا نہیں جو ہم نے آپ ﷺ کے نام پر، اللہ کے حکم پر چھوڑ دیا۔ تو محبت کا انداز یہ ہے کہ محبوب کی خدمت میں، میں نے کیا پیش کیا۔

محبت میں فنا ہو جانا

قرآن پڑھو۔ قرآن سنو، قرآن سمجھو۔ جتنی سمجھ آتی جائے گی اتنی عظمتِ پیغمبر ﷺ آپ پر واضح ہوتی جائے گی ور جتنی واضح ہوتی جائے گی، اتنے ہی آپ عشق اور محبت میں مبتلا ہوتے جائیں گے۔

ہر ایک کی اپنی حیثیت ہے۔ ایک گُل ہے، پھول ہے، اس سے بلبل کا پیار اپنا ہے لیکن ایک حقیر سی مکھی ہے وہ بھی گُل کی طرف لپکتی ہے، اس کی بے قراری اپنی جگہ۔ بلبل کی نظر بھی گُل پر ہے اور اس چھوٹی سی بے حیثیت سی مکھی کی نظر بھی گُل پر ہے۔ نہ بلبل کو اپنی شان کی فکر ہے، نہ مکھی کو اپنی ذات کا احساس ہے کہ میری حیثیت کیا ہے۔ یہ کام جنون کرواتا ہے، یہ عقل کے کام نہیں ہیں۔ عقل ہوتی تو بلبل کو ہی غیرت آ جاتی کہ جہاں ایک مکھی بیٹھی ہے وہاں میں محبت کیوں کروں۔ مکھی کو ہی شرم آ جاتی کہ جہاں ایک خوبصورت پرندہ لوٹیں لے رہا ہے میں ایک مکھی ہو کر وہاں کیا کروں۔ نہ اسے خبر ہے کہ میری حیثیت کیا ہے، نہ مکھی کو فکر ہے کہ میں کیا شے ہوں۔ یہ بھی گُل پہ بہک رہی ہے وہ بھی گُل پہ نثار ہے اس لیے کہ دونوں کی نظر گُل پر ہے، اپنا آپ بھول چکی ہیں۔ تو ہم سے اس مکھی جتنا کام بھی نہ ہو سکے تو کیسے مسلمان اور کہاں کے مسلمان!

لایومن احدکم.....

محبتِ رسول ﷺ کے بغیر مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا، یہ بات بالکل ایسے ہے جیسے کوئی کہے کہ سورج طلوع نہ ہو تو دن مکمل نہیں ہوتا۔ بھئی! سورج طلوع نہ ہو تو دن ہوتا ہی کب ہے کہ مکمل نہ ہونے کی بات کریں۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت نہ ہو تو مسلمان ہوتا ہی کب ہے کہ اس کا ایمان مکمل ہونے نہ ہونے کی بات کریں۔

عشقِ رسول ﷺ ایمان کی بنیاد ہے۔ میرے نبی ﷺ سے محبت نہیں ہے تو ایمان ہی نہیں ہے۔ لایومن احدکم..... تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے اپنے والدین، اولاد اور تمام مخلوق سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو جائے۔ فرمایا کوئی مومن نہیں ہو سکتا۔ ارے! کیا کافر کو کہنا تھا کہ مومن نہیں ہو سکتے، کافر تو پہلے ہی کافر تھا، یہ تو دعوی ایمان رکھنے والے کی بات ہو رہی ہے، مدعیٔ ایمان کی بات ہو رہی ہے، مسلمان کہلانے والے کی بات ہو رہی ہے۔ رب اللعالمین اپنی عظمتوں کی، اپنی ربوبیت کی، رب محمد ﷺ کی قسم کھا کر فرماتا ہے کہ یہ مومن نہیں ہو سکتے۔ یہ نمازیں پڑھتے رہیں، یہ چلے کاٹتے رہیں، یہ تسبیحات گلے میں لٹکاتے پھریں، انہیں حج کر لینے دو، میری بارگاہ میں یہ مومن تسلیم نہیں کیے جائیں گے۔ تو پھر کوئی راستہ ہے؟ رب اللعالمین نے فرمایا، ایک راستہ ہے۔ اپنے معاملات میں اس قانونِ صداقت، اس نظامِ عدل، اس طریقِ انصاف کو قبول کر لیں جو میرا حبیب ﷺ لے کر آیا ہے۔ فرمایا: مجبوراً نہیں، محبت سے، جاں نثاری سے، دل کی گہرائیوں سے قبول کریں اور ماننے کا حق ادا کریں لیکن اگر اس محبت میں دراڑ آ جائے، اس محبت میں بال آ جائے، بڑے سے بڑا پارسا بھی نہیں بچے گا۔ پھر نہ پارسائی اس کی حفاظت کرتی ہے نہ نیکیاں اس کے کام آتی ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے، صحابیاتؓ کی زندگیوں کو پڑھا جائے تو

ہم جیسے کم مایہ لوگوں کو تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ غزوۂ اُحد میں ایک صحابیہؓ کا بھائی، بیٹا، خاوند، باپ چار بندے شہید ہو گئے اور وہ میدانِ کارزار کی طرف بے تابانہ دوڑی جا رہی تھیں کہ کیا حضور ﷺ ٹھیک ہیں۔ آپ ﷺ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ جواب ملا کہ حضور ﷺ ٹھیک ہیں، حضور ﷺ تشریف لا رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ سوار تھے، اس نے دیکھا، بے تابانہ بڑھی، پاؤں مبارک پر بوسہ دیا اور بے ساختہ کہا کہ جب آپ ﷺ موجود ہیں تو کوئی مصیبت، مصیبت نہیں ہے۔ اب یہ قصہ سننے سے بات سمجھ میں نہیں آتی اور بھلا ہم لوگوں کو سمجھ آئے گی بھی کیسے جبکہ ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم سے زندگی کی کوئی برائی چھٹتی ہی نہیں ہے اور ہم چھوڑنا چاہتے بھی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا دعویٰ ہو کہ ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے محبت ہے۔ دعویٰ محبت بھی ہے اور ماننے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ پھر یہ کون سا لیول (level) ہے، کون سی قسم ہے محبت کی، کون سا رنگ ہے، سمجھ نہیں آتی۔

محبتِ الٰہی عشقِ رسول ﷺ کے بغیر ممکن نہیں

جب محبت اللہ سے ہوتی ہے تو پھر اللہ کی اطاعت زندگی کا لازمی حصہ بن جاتی ہے بلکہ اطاعت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔ محبتِ الٰہی، عشقِ رسول ﷺ کے علاوہ نصیب ہو، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

محبتِ الٰہی کا انحصار عشقِ رسول ﷺ پر ہے۔ کسی کو پتہ چل جائے کہ مجھے فلاں چیز چاہیے اور فلاں صاحب کے پاس ہے تو وہ اس تک پہنچنے کیلئے کتنے حیلے کرے گا۔ کس کس کے پاس جائے گا، کس کس کی منت سماجت کرے گا، کس کس کا احسان سر لینا چاہے گا۔ جب یہ پتہ چل جائے کہ میرے اندر جو حقیقی انسان ہے اس کی ضرورت جمالِ ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور یہ حبیبِ کبریا ﷺ کے وسیلے سے مل سکتی ہے، تو اپنے آپ کو

بارگاہِ رسالت ﷺ تک پہنچانے کی اور آپ ﷺ کے قدموں میں فدا کرنے کی کتنی طلب پیدا ہو جائے گی۔

محبت یہ ہے کہ پہلے تو یہ ادراک ہو جائے، یہ سمجھ آ جائے کہ جو میری ضرورت ہے وہ کس کے پاس ہے؟ اور وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس۔ اب میں وہاں تک کیسے پہنچوں، وہاں سے کیسے حاصل کروں؟ اس کے حصول کے لیے جو قربانی دو گے، جو کام کرو گے، جو جنون ہو گا، جو رت جگے ہوں گے، جو شب بیداریاں ہوں گے، جو محنت ہو گی، جو مجاہدہ ہو گا اسی کو تو محبت کہتے ہیں، یہ محبت ہے۔ جہاں عشق ہو گا، جہاں محبت ہو گی، وہاں باقی سب باتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

حضرت حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ سے صلح کر لی۔ قیس حضرت حسنؓ کا دوست تھا۔ آپؓ نے اسے فرمایا! چلو بیت اللہ شریف کی زیارت کر آئیں۔ قیس لیلیٰ کی محبت میں گرفتار تھا۔ وہ اپنی اپنی سواری پر بیٹھے تھے۔ راستے میں حضرت حسنؓ فرمانے لگے، قیس! دیکھو، میں نے کتنا بڑا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے نبی ﷺ کی امت کو تباہی سے بچا لیا، سلطنت چھوڑ دی اور صلح کر لی۔ تو قیس کہنے لگا کہ حسنؓ بھائی! حکومت تمہیں جچتی ہی نہیں تھی اور جچتی امیر معاویہؓ کو بھی نہیں۔ تو وہ بڑے حیران ہوئے اور انہوں نے فرمایا: تو تیری نظر میں کون ہے جسے حکومت جچتی؟ کہنے لگا! سجتی تو لیلیٰ کو ہے۔ تب حضرت حسنؓ نے فرمایا۔ ''انت مجنون'' تُو پاگل ہے۔ تب سے اب تک لوگ اسے مجنوں کے نام سے جانتے ہیں، قیس صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔ یہ مجنوں ویسے مجنوں نہیں تھا۔ حضرت حسنؓ نے اسے کہا تھا ''انت مجنون'' تُو پاگل ہے، تُو لیلیٰ کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس کا باپ ساتھ تھا۔ اس نے بیت اللہ کے پردے سے لپٹ کر دعا کی کہ اے اللہ! میرے بیٹے کو شفا دے، اس کو عقل دے، اس کو شعور دے۔ لیکن اس نے دعا کی اے اللہ! لیلیٰ کی محبت کے علاوہ میرے باپ

کی ساری دعائیں قبول کرلے۔ یہ انسانوں سے انسانوں کی محبت ہے۔ اب یہ انسان کے ادراک وشعور پر منحصر ہے، جتنا کسی کے پاس ادراک وشعور ہوگا اس کی محبت اتنی شدید ہوگی ۔کوئی مجنوں ہے یا رانجھا ہے، یہ اس کے اپنے ادراک کی بات ہے اور ادراک کو آلائشوں سے پاک کرنا پڑتا ہے۔

دنیا نے ضرورتوں کا نام محبت رکھ چھوڑا ہے۔ محبت میں ضرورتیں قربان کردی جاتی ہیں۔ جو لوگ ضرورتوں کو محبت کا نام دیتے ہیں وہ محبت سے آشنا ہی نہیں۔ بینائی کا صحیح رہنا ہماری ضرورت ہے، بینائی سے ہمیں عشق نہیں ہے۔ گویائی کا صحیح رہنا ہماری ضرورت ہے، ہمیں اس سے عشق نہیں۔ صحت کا صحیح رہنا ہماری ضرورت ہے، اس سے ہمیں عشق نہیں۔ ہاں کسی کی محبت اور عشق میں ہم آنکھیں نکلوا سکتے ہوں، صحت گنوا سکتے ہوں، آبرو نچھاور کرسکتے ہوں تو یہ محبت ہوگی۔ یہ اپنے اپنے ادراک کی بات ہے۔ کوئی اپنے ادراک کو اتنا ہی صاف کرسکا کہ وہ جسمانی محبتوں، مادی محبتوں تک پہنچ سکا اور کسی نے اس کو ایسا چمکایا کہ حقیقی مقصدِ حیات یعنی محبتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کو پا گیا۔

محبت بہرحال محبت ہے جو گندے، میلے، بدبودار مزاجوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ مُردار کھانے والے، حرام کھانے والے، جھوٹ بولنے والے اور بدکاروں کو وہ احساس وشعور نصیب نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک تقدس ہے، ایک پاکیزگی ہے، ایک خوبصورتی ہے، ایک صفائی ہے جو بدن سے لے کر روح کی گہرائی تک کرنا پڑتی ہے۔ ایک سلجھاؤ جو معاملات سے لے کر اخلاقیات تک، ایک حسن جو ذات سے لے کر، وجود سے لے کر روح تک اتر جاتا ہے۔ اور یہ سارا سودا ایک ہی دوکان سے نصیب ہوتا ہے، وہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ۔ دنیا میں کوئی دوسری دوکان نہیں۔

آدمؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک ہر نبیؑ نے دردِ دل بانٹا۔ ہر نبیؑ نے جمالِ باری

لٹایا۔ ہر نبیؑ نے محبتیں نچھاور کیں لیکن یہ سب دوکانیں بند ہوگئیں، سارے دروازے بند ہو گئے، سارے زمانے بیت گئے۔ اب کسی کو ذرہ ملے یا سمندر، کسی کو قطرہ ملے یا بحر، ایک ہی دروازہ ہے اور وہ ہے درِ محمد رسول اللہ ﷺ۔

عشقِ الٰہی کو اور کتاب وسنت وشریعتِ مطہرہ کو الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ عشقِ الٰہی، شریعتِ مطہرہ کے اندر ہے۔ جو شخص شریعت کی حدود کو پھلانگے گا وہ عشقِ الٰہی سے، عشقِ رسول ﷺ سے محروم ہو جائے گا۔ حدودِ شرعی کو پھلانگنا گویا عشقِ الٰہی کو ترک کرنا ہے، عشقِ رسول ﷺ سے محرومی ہے۔

نگاہِ مصطفیٰ ﷺ کا اثر

آپ ﷺ نے صرف زبانی ہی نہیں بتایا، لوگوں کو خاک سے اٹھایا اور اللہ کے روبرو کردیا، جمالِ باری سے آشنا کردیا۔ لوٹ کر کھانے والے لٹانے پہ آ گئے۔ جن کا پیشہ لوٹ کر کھانا تھا وہ لٹوا کر خوش ہوتے تھے۔ نگاہِ مصطفےٰ نے لوگ بدل دیئے۔

کمال ہے! کھال نہیں بدلی، قد نہیں بدلا، حلیہ نہیں بدلا، رنگ نہیں بدلا، لیکن بندہ بدل گیا۔ جس نے الف، ب نہیں پڑھا تھا وہ عقل وخرد میں بھی، علم وعمل میں بھی دنیا کا امام ہوگیا جو قتل کرنے کیلئے گھر سے نکلے تھے انہیں فاروقِ اعظمؓ بنا دیا، چرواہے آئے اور آپ ﷺ نے جرنیل بنا دیئے۔ کمال ہے!

یہ تاریخ کا حصہ ہے کہ ایک شخص اپنا گلہ چھوڑ کر، ریوڑ چھوڑ کر شام کو بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا کہ مجھے کلمہ پڑھایئے، میں آپ ﷺ پر ایمان لاتا ہوں۔ صبح جو فوج محاذ پر جارہی تھی، آقائے نامدار ﷺ نے اسے اسی کا جرنیل بنا دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ساری ترقی کے باوجود ایک نوعمر بچہ کیڈٹ بھرتی ہوتا ہے اور اس کو جرنیل بنتے بنتے بیس تیس سال لگ جاتے ہیں اور اسے دنیا بھر کے اداروں میں بھیجا جاتا ہے۔ ساری عمر وہ کورسز کرتا

رہتا ہے، پڑھتا رہتا ہے بھنویں سفید ہو جاتی ہیں تب جا کر وہ جرنیل بنتا ہے۔ بتایئے آپ کے کتنے جرنیل، کامیاب جرنیل ہیں، کتنے ایسے ہیں جن کو تاریخ نے یاد رکھا؟ کوئی نہیں ملتا اور وہ شخص جو شام کو آیا، نہ اسے کسی نے فوجی تربیت دی، نہ اسے کسی نے لیکچر دیا، نہ اسے کسی نے سمجھایا، جرنیل بنا کر اسے صبح حضور ﷺ نے محاذ پر روانہ کر دیا، تاریخِ اسلام کے کسی جرنیل کو زمانہ بھلا کر دیکھے، کسی پر انگلی اٹھا کر دیکھے، کسی پر اعتراض کر کے دیکھے۔ یہ سب انہوں نے کہاں سے سیکھا؟ بس نگاہِ پاک ﷺ کا کمال تھا۔ جو جرنیل محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک نگاہ میں بنا دیئے، ان میں سے کسی ایک جرنیل کا نام بتائیں جسے کافر مورخ بھی ناکام جرنیل ثابت کر سکے ہوں۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ کمال تھا کہ ایمان لانے کے بعد کسی کی نگاہ آپ ﷺ کے وجودِ عالی پر پڑی یا آپ ﷺ کی نگاہ اس کے وجود پر پڑی تو ایک نگاہ نے اس بندے کو صحابیؓ بنا دیا۔

وہ جو کسی نے کہا تھا

من سی پارۂ دل می فروشم
بگفت قیمتش
گفتم نگاہے
بگفتہ کم تر است
گفتم کہ گاہے

میں دل کے ٹکڑے بیچتا ہوں، پوچھا! قیمت۔ میں نے کہا، ایک نظر۔ اس نے کہا، بھئی! مول تول کرو، مانگا مول (منہ مانگا) کب ملتا ہے؟۔ میں نے کہا! زندگی میں کبھی ایک نظر سہی۔ تو جسے زندگی میں کبھی آپ ﷺ کی ایک نظر نصیب ہوئی، اسے اس نگاہ نے صحابیؓ

دیا۔

آقائے نامدار ﷺ کی ضیاء پاشیاں

سورج جب نکلتا ہے تو کب کسی سے اپنی کرنوں کو روکتا ہے، سارے عالم پر نور بکھیرتا ہے لیکن کتنے جانور، کتنے، کیڑے پتنگے جو اپنے بلوں میں گھس کر رہتے ہیں انہیں کیا فرق پڑتا ہے کہ سورج نکلا ہوا ہے یا نہیں؟ یہی حال انسانوں کا، بنی آدم کا ہے۔ بعثتِ آقائے نامدار ﷺ سورج سے زیادہ روشن ہے۔ برکاتِ نبوی ﷺ، سورج کی کرنوں سے کروڑہا گنا زیادہ منتشر ہو رہی ہیں لیکن ہم اپنی اپنی ذات کے بلوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان بلوں سے باہر نکلئے، اپنی پسند، اپنی مرضی، اپنی خواہشات کے سوراخوں سے باہر نکلئے، روشنی میں آیئے، سامنے آیئے، سینہ چیر کر رکھیے محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں اور آپ کو پتہ چل جائے گا کہ نورِ نبوت کیا چیز ہے؟

نبی ﷺ سے مادی و روحانی نسبت

نبی کریم ﷺ جب خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوتے تو کھجور کے ایک تنے سے جس کا نام 'حنانہ' تھا، ٹیک لگا لیا کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ کو کھڑے ہونے میں دشواری محسوس ہوئی تو تین سیڑھیوں کا منبر بنا دیا گیا۔ بخاری شریف میں موجود ہے کہ پہلی مرتبہ جب حضور ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو حنانہ کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک خشک لکڑی جو مدتوں وجودِ اطہر ﷺ، جسدِ اطہر ﷺ سے مَس ہوتی رہی، اس میں نہ صرف شعور آ گیا بلکہ اسے محبت کرنا بھی آ گیا۔ اس میں بھی عشق کے جذبات پیدا ہو گئے، اسے بھی ہجر و وصال کا ادراک ہو گیا، اسے بھی دُوری و نزدیکی کی سمجھ آنے لگی اور اس خشک تنے سے بالشت بھر کی دوری برداشت نہ ہو سکی۔ بخاری شریف میں موجود ہے کہ صحابہؓ کی کثیر تعداد جو اس وقت مسجد میں موجود تھی، روایت کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے اٹھ کر اسے گلے سے لگایا، دلاسہ دیا

اور وہ ایک دم سے چپ نہیں کر گیا بلکہ جس طرح سے کوئی بچہ روتے روتے چپ کرتا ہے، سسکیاں لیتے لیتے خاموش ہوتا ہے، اس طرح سے اس کی چیخیں تھمتے تھمتے تھمیں اور سسکیاں لیتے لیتے وہ چپ ہوا۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس سوکھی لکڑی کے وجود میں وہ لطیف جذبات و احساسات پیدا ہو گئے جس سے انسانیت میں سے لوگ محروم رہے۔ کیا کمال تھا اس سوکھی لکڑی میں؟ یہی کہ اس کے وجود کو رسول اللہ ﷺ کا لمسِ اطہر نصیب ہوا تھا۔ سبحان اللہ! لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ روحانی بیعت کیا ہے؟ روح کیسے بیعت کرتی ہے؟ کیا سمجھتے ہو اس روح کو جس نے دستِ اقدس ﷺ کا بوسہ لیا۔ انسانی روح تو انسانی روح ہے تم اس کی فضیلت کیا جانو! حنانہ خشک لکڑی تھی جو مس ہو گئی وجودِ اطہر ﷺ سے تو اس میں کیا احساسات پیدا ہو گئے۔ اگر نبیؐ کے ساتھ مادی، جسمانی رشتہ بھی ہو، بدن مَس ہو جائے بدنِ رسول اللہ ﷺ سے، تو اتنا کمال پیدا ہوتا ہے کہ خشک لکڑی میں بھی عشقِ رسول ﷺ اور عشقِ الٰہی ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے اور اگر کسی کو روح اطہر ﷺ سے اپنی روح کو پیوست کرنا نصیب ہو جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہوگا؟

حضور ﷺ سے نسبی تعلق کا فائدہ

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایمان اور عمل کا رشتہ بھی ہو اور نسب کا بھی ہو، پھر تو "نورٌ علیٰ نور" ہے۔ عقیدہ بھی وہی ہو جو نبی علیہ السلام نے بتایا، کردار بھی وہی ہو جو اللہ کا رسول ﷺ اور اللہ کی کتاب کہتی ہے پھر تو نورٌ علیٰ نور ہے، اس کی تو زیارت کی جانی چاہیے لیکن جو شکل سے لے کر عمل تک اور عقیدے سے لے کر کردار تک نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کوئی رشتہ نہ رکھتا ہو، وہ کیسا آپ ﷺ کا بیٹا ہے، کہاں کا سید ہے؟ یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کیسے ہو سکتے ہیں؟

نوحؑ کا سگا بیٹا تھا، ڈوبنے لگا تو شفقتِ پدری نے جوش مارا اور آپؑ نے دعا کی، بارالٰہا! تیرا تو وعدہ تھا کہ تیری اولاد کو، تیرے اہلِ خانہ کو اور جو لوگ تیرے ساتھ ہیں، ان کو بچاؤں گا، یہ تو میرا سگا بیٹا ہے۔ پتہ ہے کیا جواب ملا؟ اللہ نے فرمایا انہ لیس من اھلک بیٹا سگا ہے لیکن تیرے اہل خانہ میں سے نہیں ہے، اس لیے کہ انہ عمل غیر صالح اس کے اعمال بُرے ہیں اور بُرے اعمال والے کا رشتہ نبیؑ سے نہیں ہوتا۔ اس پر آپؑ نے دعا کی کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھ پر رحم فرما، مجھے اس کیلئے دعا نہیں کرنی چاہیے تھی۔

دعویٰ محبت اور دولتِ دنیا

آج کی نعتوں کا جائزہ لیں، نعت خوانوں پر بھی پیسوں کی بارش ہوتی ہے، جہازوں کے ٹکٹ ملتے ہیں، اعلیٰ کھانے ملتے ہیں۔ مسلمانی کوئی کھیل نہیں ہے، یہاں تو زندگی اپنی پسند کی بجائے اللہ کی پسند سے گزارنا ہوتی ہے۔ کمانا کیسے ہے، کھانا کیسے ہے، اس میں تو اپنی زندگی پر سے اپنا اختیار ہی اٹھ جاتا ہے۔ اس میں تو حضورِ اکرم ﷺ کی شریعت کی پابندی ہوتی ہے۔ اس میں من مانی کرنے کا مطلب ہے حیوانی زندگی گزارنا کہ جہاں سے جی چاہا کھا لیا، جیسے جی چاہا زندگی بسر کی۔

علماءِ حق یا اہل اللہ تو دلوں میں محبتِ آقائے نامدار ﷺ ہی پیدا فرماتے ہیں لیکن جو برائے نام مولوی ہے، اس نے ہماری زندگی کو بھی عجب موڑ دے دیا ہے۔ آپ کوئی نعت کوئی شعر، کوئی قوالی، کوئی بات سنیں، تو کہے گا میری بگڑی سنور جائے گی، میری جھولی بھر جائے، تیرے در پہ جو آیا خالی نہیں گیا، مجھے خالی مت لوٹائیے یعنی وہ اپنی ضرورتوں کیلئے حضور ﷺ سے رشتہ جوڑتا ہے۔ وہ رشتہ جو غرضوں کا رشتہ ہے، ضرورتوں کا رشتہ ہے، حاجتوں کا رشتہ ہے، یہ رُخ ہماری محبتوں کو دے دیا گیا ہے۔ تو ہمارے رشتے میں اور

اس غیر مسلم کے رشتے میں جو اس نے بہت سوں سے جوڑا ہوا ہے فرق کیا رہ جاتا ہے؟ دیکھو کتنا ظلم ہوا ہمارے ساتھ، کتنی زیادتی کی بات ہے۔

ہر نعت مطالبات سے پُر ہے، یارسول اللہ ﷺ! مجھے یہ دے دو، مجھے وہاں بھیج دو، مجھے مدینے بلالو۔ کوئی کربلا کا نام نہیں لیتا، کوئی نہیں کہتا، الٰہی! مجھے کربلا میں قبول کر لے۔ جہاں لینے کی بات ہوتی ہے وہاں سب تیار ہیں اور جہاں دینے کی باری آتی ہے وہاں سب خاموش ہوتے ہیں۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ کے ذریعے سے بھی مانگتے ہیں تو دولت دنیا ہی مانگتے ہیں۔ اسلام سے بھی چند سکے اور چند تعیشات ہی لینے ہیں تو پھر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ کیلئے اللہ کا خوف کرو!

دیکھنا ہمیں یہ ہے کہ اللہ دیتا ہے اور اپنی مرضی سے دیتا ہے اور بے حساب دیتا ہے۔ اللہ کا رسول ﷺ دیتا ہے اور ہمارے اندازوں سے زیادہ دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا انما انا قاسم واللہ یوتی خزانہ رب کا ہے، میں لٹا رہا ہوں۔ پھر وہاں اغراض کا رشتہ جوڑنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ جو ہماری سوچ کا رُخ، دنیوی اغراض کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ ہمارے ساتھ یہ دھوکہ ہوا ہے۔

ادب، محبت کے بغیر کیفیاتِ قلبی کا حصول ممکن نہیں

محبت ایک لطیف جذبہ ہے۔ اگر محبوب زیادتی کرے تو یہ کم نہیں ہوتا اور اگر وہ مہربانی کرے تو یہ بڑھتا نہیں یعنی اگر محبوب لطف و کرم کرے تو یہ اس کا کرم ہے اور اگر زیادتی کرے تو اس کی مرضی۔ لیکن محبت کا جذبہ ہر صورت اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور بندے کو اپنے محبوب کا مطیع اور تابعدار بنائے رکھتا ہے۔

اگر محبت زیادتی کرنے پر گھٹتی ہو اور کچھ ملنے پر بڑھتی ہو تو وہ محبت نہیں، تجارت ہے، سوداگری ہے کہ کچھ ملے تو بندہ آگے بڑھتا رہے، یہ تو مفاد پرستی ہے۔ اللہ اور اللہ کے

رسول ﷺ کے ساتھ تعلق مفادات سے بالاتر ہے، یہ تعلق سود و زیاں سے بلند ہے۔ تکلیف یا دکھ آنے سے یہ گھٹتا نہیں اور فراخی آئے تو اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ محبت، محمد رسول اللہ ﷺ کے قلبِ اطہر سے نصیب ہوتی ہے اور جب تک دلوں کے برتن اس بارش کے، اس ابرِ کرم کے سامنے نہ رکھے جائیں، محبت نصیب نہیں ہوتی۔

رشتوں میں مضبوط ترین رشتہ محبت کا ہے اور یہ رشتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں لیکن اپنی ساری مضبوطی کے ساتھ حساس اور نازک ترین بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا بازار میں کچھ برتن نہایت مضبوط ملتے ہیں اور انہیں unbreakable کہا جاتا ہے لیکن وہی برتن کسی خاص زاویے سے گرے تو ٹوٹ جاتا ہے۔ جب وہ ٹوٹتا ہے تو ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال محبت کے رشتوں کا ہوتا ہے یہ کسی معمولی بات پر نہیں ٹوٹتے لیکن جب ٹوٹتے ہیں تو چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

یہ کیفیات چونکہ قلب اطہر رسول اللہ ﷺ سے حاصل کرنا ہوتی ہیں اس لیے انہیں وہ بندہ حاصل کر سکتا ہے جو اگر قلبِ اطہر رسول اللہ ﷺ میں اپنے لیے محبت کی جگہ نہ بنا سکے تو کم از کم حضور ﷺ کے قلبِ اطہر میں اس کے خلاف کوئی خفگی بھی نہ ہو، کسی ناراضگی کا کوئی عنصر نہ ہو، کیونکہ اگر قلبِ اطہر ﷺ میں تکدر آ جائے، گرانی آ جائے تو وہ گرانی ان کیفیات کو منقطع کر دے گی جو قلبِ اطہر ﷺ سے اس کے قلب کو آ رہی ہیں۔ جب وہ کیفیات منقطع ہوں گی تو ساری نیکیاں ضائع ہو جائیں گی، کچھ نہیں بچے گا، ایمان تک نہیں بچے گا۔ نیکیاں کہاں نیکیاں رہیں گی کہ نیکیوں کی بنیاد تو ایمان ہے۔ بنیاد ہی اگر کھوڑالی تو عمارت کہاں رہے گی؟ اس لیے اللہ کریم نے فرمایا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (الحجرات:2) قرآن حکیم کے اولین مخاطب صحابہ کرامؓ، مہاجرین، جانثارانِ رسول اللہ ﷺ، خلفاءِ راشدینؓ تھے، میں اور آپ نہیں تھے۔ ہماری تو حیثیت ہی

کیا ہے؟ سیدنا فاروقِ اعظمؓ کی آواز فطرتاً بلند تھی اور وہ اتنے محتاط تھے کہ بارگاہِ نبوت ﷺ میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس لئے کہ جب تک ایک خاص درجے کا ادب ملحوظِ خاطر نہیں رہے گا، تب تک کیفیاتِ قلبی نصیب نہیں ہوں گی۔

آج کا دور ادب و احترام سے دُوری کا دور ہے۔ آج کے دور میں رہنمائی کرنا آسان نہیں۔ آج کے ماحول کا اندازہ کریں جو شخص کسی چیز کے قابل نہیں، وہ اسلام کے خلاف بات کر جاتا ہے اور جو کسی اور کی مخالفت کے قابل نہیں، وہ بھی اسلام کی مخالفت میں کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے۔ اسے یہ بھی پتہ ہے کہ اسے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں، اب اس سے زیادہ ابتر حال کیا ہوگا!

احترامِ نبوت

'سورۂ قصص' میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون، فرعون کی بیوی اور جادوگروں کا قصہ ملتا ہے کہ ان میں سے جن کے دلوں میں احترام تھا، محبت تھی، انہیں ایمان کی دولت نصیب ہوگئی جبکہ فرعون محروم رہا۔ ایک فطری محبت جو کسی بھی خاتون کو بچہ دیکھ کر ہوتی ہے پھر خصوصاً جب اس کی اولاد نہ ہو تو ننھا منا بچہ دیکھ کر اس کے دل میں آتی ہے، وہ محبت و شفقت فرعون کی بیوی کے دل میں موسیٰ کے لیے پیدا ہوئی۔ موسیٰ کے لیے فرعون کے دل میں شفقت نہیں آئی، اس نے قتل کا حکم دیا۔ نہ یہ مسلمان تھی، نہ ابھی موسیٰ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا لیکن خلوص کے ساتھ جو شفقت پیدا ہوئی محبت پیدا ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب موسیٰؑ نبی مبعوث ہوئے تو فرعون نے انکار کر دیا اور فرعون کی اہلیہ کو ایمان نصیب ہوا۔ اگرچہ نہ نبیؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور نہ اسے علم تھا کہ یہ اللہ کا نبیؑ ہے لیکن جو رشتہ خلوص کا نبیؑ کے ساتھ تھا، اللہ کو وہ ادا بھی پسند آئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں نورِ ایمان عطا کر دیا۔ فرعون نے بڑی سخت سزا دی تو حضرت آسیہ نے دعا کی وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ

وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (التحریم:11) اتنا پختہ ایمان اللہ پر، اتنا پختہ ایمان آخرت پر، اتنا پختہ یقین جنت پر، حالانکہ تعلیم و تربیت تو کہیں سے نہیں پائی، کتاب پڑھنے کا موقعہ تو نہیں ملا کہ کوئی تعلیمات پاتیں۔ موسیٰؑ نے اعلان فرمایا اور انہوں نے قبول کر لیا تو یہ کیسے ہوا؟ اصل میں برکات، قلبِ نبویؐ سے طالب کے قلب کو سفر کر جاتی ہیں، یہ دلوں سے دلوں میں مترشح ہوتی ہیں۔ وہ شفقت جو موسیٰؑ کیلئے ان کے دل میں پیدا ہوئی تھی، اس نے قلبِ موسیٰؑ کو اتنا متوجہ کر دیا کہ ان کا دل بھی تعلیماتِ نبویؐ سے لبریز ہوگیا اور انہیں اللہ پر، آخرت پر، عذاب و ثواب پر، بن دیکھے یقین ہوگیا۔

اسی طرح موسیٰؑ کے واقعہ میں ملتا ہے کہ جب فرعون نے آپؑ کا لاٹھی کے اژدھا بننے کا معجزہ دیکھا، لاٹھی کے اژدھا بننے کا، تو اس نے کہا کہ مصر تو جادوگروں سے بھرا ہوا ہے، یہ کام تو میرے جادوگر بھی کر لیں گے۔ دن مقرر ہوگیا اس نے پورے ملک سے جادوگروں کو بلوایا۔ جب وہ مقابلے میں آئے تو چونکہ وہ آپؑ کو نبی تو مانتے نہیں تھے، نبی مانتے تو مقابلے میں نہ آتے لیکن ایک پیشہ وارانہ احترام بھی ہوتا ہے، یہ بات تو ان کے دل میں تھی کہ اگر جادوگر بھی ہے تو پائے کا جادوگر ہے، جس نے فرعون کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اس بات نے ان کے دل میں احترام پیدا کر دیا۔ انہوں نے ادباً اور احتراماً کہا کہ حضورؑ! آپ پہلے اژدھا بنائیں گے یا ہمیں اجازت ہے کہ ہم بنائیں۔

وہ ایک لمحہ جو انہوں نے موسیٰؑ کا احترام کیا، جادوگر سمجھ کر کیا، نبی سمجھ کر نہیں کیا۔ وہ جو اُن کے ذہن نے، ان کے دل نے اہمیت دی موسیٰؑ کو، اللہ کو وہ ادا پسند آگئی، اللہ نے انہیں ایمان عطا کر دیا۔ فرعون نے انہیں دھمکی دی لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ (طٰہٰ:71) میں تمہارے ایک طرف کا ہاتھ کٹواؤں گا اور دوسری طرف کا پاؤں کٹواؤں گا اور پھانسی دے دوں گا، تو انہوں نے کہا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ:72) جو

کرسکتا ہے کرگزر۔ حیرت ہے انہیں آخرت کا بھی پتہ چل گیا، حساب کتاب کا بھی لیکن کیسے؟ نہ انہوں نے کتاب پڑھی، نہ انہیں کسی نے وعظ کیا، نہ انہوں نے نماز سیکھی، نہ پڑھی، وہیں ایمان لائے اور وہیں انہیں شہید کر دیا گیا۔ صبح آئے تھے کافر تھے، ڈوبتے سورج نے انہیں شہادت سے ہمکنار دیکھا۔

تو جب موسیٰ کا احترام کافر کے دل میں آئے تو اسے مومن اور شہید بنا دے، فرعون کی بیوی کے دل میں موسیٰ کیلئے احترام آئے تو اسے واصل باللہ کر دے تو پھر کیسے ممکن ہے محمد رسول اللہ ﷺ کیلئے محبت کا کوئی لمحہ دل میں آئے اور زندگی تبدیل نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ دراصل ہم محبت نہیں کرتے، ہم دعوے کرتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں جھاڑ جھنکار ہیں، حسد و کبر کے درندے رہتے ہیں، لالچ و حرص کی بلائیں رہتی ہیں اور اس ساری خباثت کو ہم نے انسانی کھال میں چھپا رکھا ہے اور اس پہ حلیے بنا رکھے ہیں۔ جبہ و دستار پہن لی، لمبی لمبی تسبیحیں لے لیں، لمبی لمبی لاٹھیاں اٹھا لیں اور یہ ساری ملمع سازی کر کے ان اندر کی بلاؤں کو ہم پال رہے ہیں۔ جس دل میں یہ جھاڑ جھنکار ہوں گے، اس طرح کی بلائیں ہوں گی وہاں بھلا محبت جیسا نفیس جذبہ کیسے اترے گا؟

حضور ﷺ کی بے ادبی و بے احترامی کا نقصان

آنحضرت ﷺ کے بارے ادب ملحوظ رکھنے سے احترام بڑھتا ہے اور اگر حضور ﷺ کی ذات کے بارے ہلکی بات (جو بات آپ ﷺ کے شایانِ شان نہ ہو) کی جائے تو توہین کا احتمال ہے جو کفر ہے اور توہینِ رسالت کی توبہ مشکل ہو جاتی ہے کہ جو ایذا قلبِ اطہر ﷺ کو پہنچی اس کا ازالہ کیسے ہو؟ اللہ کریم رنج کی کیفیات سے بالاتر ہیں اور اللہ کے ساتھ توبہ کا معاملہ دوسرا ہے لیکن ایذائے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کریم خود برداشت نہیں کرتے اور بندے کو توبہ کی توفیق نہیں دیتے۔

حضور ﷺ کا نام گرامی اگر عمداً بگاڑا جائے تو یہ کفر ہے اور اس معاملے کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ حرکت ارادتاً، قصداً نہ ہو، بندے کا ارادہ ہتک یا توہین کرنے کا نہ ہو لیکن اس کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نکل جائے کہ سمجھنے والا سمجھے کہ اس نے حضور ﷺ کی توہین کی ہے تو ایسا جملہ کہنے والا بھی کافر ہو جاتا ہے یعنی حضور ﷺ کی ذات عالی کیلئے کوئی ذو معنی لفظ استعمال کرنا کفر میں جاتا ہے۔ یہ فقہ کا قاعدہ ہے۔ جیسے یہود "راعنا" کو اس طرح ادا کرتے کہ اس سے راعی کہنا مراد ہوتا۔ راعی کے معنی ہیں چرواہا۔ نبی کریم ﷺ پر عملاً یہ طنز کرتے کہ یہ تو بکریوں کے چرواہے تھے۔ آج نبوت کا دعویٰ کیے بیٹھے ہیں اور ریاست کے سربراہ بن گئے ہیں۔ اس سے ان کی مراد طعن کرنا ہوتی تھی۔ اللہ کریم نے بارگاہِ رسالت ﷺ میں ایسے الفاظ کا استعمال ہی حرام قرار دے دیا اور حکم فرمایا کہ لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا (البقرہ:.104) کہ "راعنا" نہ کہا جائے بلکہ "انظرنا" کہا جائے۔ عظمتِ رسالت ﷺ میں ادنیٰ سی گستاخی سے بچانے کیلئے ربِ جلیل نے لغتِ عرب تبدیل کر دی اور "راعنا" کا لفظ ہی لغت سے خارج کر دیا۔ دیکھ لیجیے اللہ کریم نے صدیوں سے عرب میں جو لغت آ رہی تھی، تبدیل کر دی کہ اس میں گستاخی کا احتمال ہے۔ اس سے علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ کوئی ایسا ذو معنی لفظ استعمال کرنا جس کے ایک معنی سے توہین رسالت کا پہلو نکلتا ہو تو ایسا لفظ استعمال کرنے والے بندے کا ایمان سلب ہو جائے گا۔ بارگاہِ رسالت ﷺ ایسی عظیم بارگاہ ہے کہ یہاں سرزد ہونے والی غیر شعوری بے ادبی بھی بندے کے ایمان کو لے ڈوبتی ہے۔

فضیلت بیان کریں، بے ادبی نہیں

قاعدہ یہ ہے کہ آپ کسی نبیؑ کی زبان سے کسی دوسرے نبیؑ کے بارے میں کوئی ایسا لفظ ارشاد فرماتے ہوئے نہیں سنیں گے کہ وہ اس کی عزت کی کمی کی طرف اشارہ کرتا

ہو، کبھی نہیں سنیں گے۔ اللہ کریم نے خود یہ اسلوب نہیں اپنایا۔ فرمایا تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (البقرہ:253) بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔ یہ نہیں فرمایا کہ بعض، بعض سے کم ہیں، مفہوم وہی ہے۔ جب بعض کو فضیلت ہوگئی تو دوسرے بعض ان سے درجات میں کم ہوں گے۔ مفہوم وہی ہے لیکن الفاظ وہ نہیں فرمائے، جیسے ماں کو کوئی نہیں کہتا "میرے باپ کی بیوی"، جو کوئی کہتا ہے ماں ہی کہتا ہے حالانکہ اگر وہ کہہ دے تو اس میں جھوٹ تو نہیں کہتا لیکن جو انسان باضمیر ہو، وہ نہیں کہتا۔

اسی طرح آل اللہ کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو ان کی شان میں کمی کا انداز اختیار کرنا شرعاً حرام ہے۔ کوئی بھی ولی اللہ کسی بھی دوسرے ولی کیلئے توہین آمیز یا ہتک آمیز رویہ اختیار نہیں کرتا، وہ اس سے چھوٹا ہو یا بڑا۔ درجات تو من جانب اللہ ہوتے ہیں۔

لذتِ ہمکلامی

حضرت موسیٰ سے طور پر سوال ہوا وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی (طٰہٰ:17) اے موسیٰ! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ جواباً عرض کیا ھی عصای --- یہ میرا عصا ہے، میں اس پر ٹیک بھی لگاتا ہوں، اس سے اپنی بکریاں بھی چراتا ہوں اور اس کے بہت سے دوسرے فائدے گن دیئے۔

مفسرینِ کرام اس کی تفسیر پہ جب بحث فرماتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ادب تو یہ ہے کہ جو بات پوچھی جائے اس کا جواب دے دیا جائے۔ یہ تقاضائے ادب ہے کہ جو بات پوچھی جائے اس کا قصہ نہ بنایا جائے، اسے بڑھایا نہ جائے۔ جتنی بات پوچھی جائے اتنا جواب دیا جائے اور نبیؑ تو ادب سکھانے والے ہوتے ہیں، نبی کی جوتیوں اور انکی خاک پا کے طفیل لوگوں کو ادب نصیب ہوتا ہے اور موسیٰ اولوالعزم رسول ہیں، اگر فرماتے یہ میرا عصا ہے تو بات ختم ہو جاتی پھر انہوں نے اتنی لمبی بات کیوں کی؟ تو وہاں علماء لکھتے ہیں:

بیک لفظ تواں گفتن تمنائے جہانِ را
من از بحرِ حضوری طول دادند داستانِ را

پوری دنیا کی بات ایک لفظ میں ختم ہو جاتی ہے، آپ 'ہاں' کہہ دیں یا 'نہ' کہہ دیں، بات ختم ہو جاتی ہے لیکن مجھے تو اُس (محبوب) سے شرفِ ہم کلامی نے وہ لذت بخشی کہ میں اسے قائم رکھنے کیلئے بات کو بڑھاتا چلا گیا۔ لذتِ ہمکلامی نے موسیٰ کو مجبور کر دیا کہ وہ بات کو بڑھاتے چلے گئے کہ بات رب العالمین سے ہو رہی تھی۔

حکمرانی کی عمدہ مثال

مدینہ منورہ میں ریاست کی بنیاد پڑی۔ ہر شعبۂ زندگی کے حدود و قیود دیئے گئے۔ ایک عام آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے صحابیؓ تک، کسی کیلئے ان حدود میں کسی رعایت کی گنجائش موجود نہیں تھی۔ اگر مدینہ منورہ کی ریاست میں کوئی ایک گھر ایسا ہوتا جس گھر میں پکانے کو کچھ بھی نہ ہوتا تو وہ گھر نبی کریم ﷺ کا ہوتا۔ اگر پورے شہر میں دس آدمی فاقے سے ہوتے پندرہ ہوتے یا ملتے ملتے سب کو مل گیا لیکن کوئی ایک آدمی کھانے سے رہ جاتا تو وہ ایک آدمی اللہ کے رسول ﷺ ہوتے تھے۔

آپ پوری سیرتِ طیبہ ﷺ میں یہ تلاش نہیں کر سکیں گے کہ شہر کا کوئی آدمی بھوکا رہ گیا اور نبی کریم ﷺ نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا۔ کیا ہمارے سیاسی سیٹ اپ کا یہی حال ہے کہ ساری سہولتیں عام آدمی تک پہنچتی ہیں اور اگر لوڈ شیڈنگ کی جائے تو وہ اسلام آباد کی ہوتی ہے، غریبوں کی نہیں کی جاتی؟ کیا ہمارے سیٹ اپ میں یہی بات ہے کہ غریب آدمی کو کھانا، پینا، دوائی ملتی ہے اور اگر کمی آئے تو امیروں کو آتی ہے، غریبوں کو نہیں آتی؟ اگر یہ نہیں ہے اور امراء عیش کرتے ہیں اور غریب پستے ہیں تو یہ قیصر و کسریٰ کا اتباع تو ہو سکتا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا نہیں۔

انبیاءؑ، انسانیت کا کامل نمونہ ہوتے ہیں اور سب سے اعلیٰ نمونہ ہے ذاتِ محمد رسول اللہ ﷺ۔ ایک طرف آپ ﷺ کے مقامات کی وہ عظمتیں ہیں کہ وہاں فرشتہ پر نہیں مار سکتا اور صفاتِ ملکوتی کے حامل بھی وہاں نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اتنی عام انسانی زندگی کی طرح ہے کہ ایک اَن پڑھ، ایک گڈریا، ایک چرواہا یا جنگل میں رہنے والا بھی اس بات کا مکلف ہے کہ اپنی زندگی اس طرح بسر کرے جس طرح نبی کریم ﷺ نے بسر فرمائی۔

آنحضرت ﷺ کی عملی زندگی، آپ ﷺ کی گھریلو زندگی، آپ ﷺ کی دینی زندگی اور آپ ﷺ کی معاشرتی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو بیک وقت وہ ایک ہستی ایک وسیع کنبے کی نگہبان، پورے عالمِ اسلام کی قائد، امام، استاد، مفتی اور قاضی اور وہی ایک ہستی پوری اسلامی سلطنت کی نگہبان، امیر، بادشاہ، حکمران، قانون ساز ہے۔ ان تمام مصروفیات کو ایک لڑی میں پرو کر ایک مثالی معیارِ زندگی بسر کرنا صرف آپ ﷺ کا کمال تھا۔

انبیاءؑ کی زندگی کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی زندگی بسر کرتے ہیں جس میں وہ عام انسانوں کی طرح کماتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، کام کاج کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اللہ کا حکم لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ ایک پورا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ آپ نبی کا کمال دیکھیں کہ سب سے زیادہ قربِ الٰہی، انبیاءؑ کو حاصل ہوتا ہے اور نبیؑ ہی سب سے زیادہ عام سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔ سونے جاگنے، کھانے پینے اور دیگر معاملات میں نبیؑ وہ رویہ اختیار کرتا ہے جو کمزور سے کمزور آدمی بھی کر سکتا ہو۔ یہ نہیں کہ کوئی بہت زیادہ brilliant ہو، کسی کا بہت بڑا ذہن ہو، کوئی بہت qualified آدمی ہو تو صرف وہی اس طرح سے زندگی بسر کر سکے اور ایک اَن پڑھ، جاہل، ان اداؤں کو نہ سیکھ سکے۔ نبیؑ کی زندگی

ایسی نہیں ہوتی۔ اگر ایسی ہوتی تو صرف کوالیفائیڈ (qualified) آدمیوں پر، بڑے brilliant لوگوں پر اتباع واجب ہوتا، مجھ پر اور آپ پر نہ ہوتا۔ ایک چرواہا جو جنگل میں ہمیشہ بھیڑیں چراتا ہے، اس پر بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع اتنا ہی واجب ہے جتنا ایک محدث، فقیہہ اور مفسر پر ہے۔ یعنی اتنی عام زندگی ہے آقائے نامدار ﷺ کی کہ ایک چرواہا بھی ویسی زندگی گزار سکتا ہے۔

نبیؑ کی زندگی انسانی ڈگر سے ہٹ کر نہیں ہوتی، انسانوں سے الگ نہیں ہوتی، ہاں اعلیٰ انسانی اقدار کی حامل ہوتی ہے اور یہی غلط فہمی ولایت کے بارے لوگوں میں پیدا ہو گئی ہے کہ اولیاء اللہ کوئی عجیب و غریب مخلوق ہوتے ہیں اور وہ جنگلوں میں رہتے ہیں، کسی سے بات نہیں کرتے، کھاتے پیتے نہیں ہیں، کوئی بیوی بچہ نہیں ہوتا، کوئی گھر بار نہیں ہوتا۔ تو پھر کمال کیا ہوا؟ ایک شخص معاشرے کا حصہ ہی نہیں بنتا، کسی سے اسے لینا دینا نہیں ہے، کاروبار نہیں ہے، خرید و فروخت نہیں ہے تو اس کے اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل ہونے کا کیا پتہ چلے گا۔ اس کے سچ بولنے کا، اس کی امانت کا معیار کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ ایسا آدمی اگر رات بھر کھڑا ہو کر نوافل پڑھتا رہتا ہے تو ایسے نوافل سے کیا بنے گا؟ نبی کریم ﷺ نے تمام رات عبادت فرمائی ہے لیکن جتنا دنیوی، سیاسی، دینی کام نبی کریم ﷺ نے کیا، روئے زمین پر کوئی دوسرا انسان اس کی مثال پیش کر سکتا ہے؟

نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ عام انسانی معیار کے مطابق تھی۔ اگرچہ آپ ﷺ کے درِ دولت پر فرشتے حاضر ہوتے تھے لیکن حیاتِ طیبہ کا معیار وہی تھا جو ایک عام آدمی اختیار کر سکتا ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کے اتباع کا ہر آدمی مکلف ہے۔ کائنات میں بے مثل، بے نظیر ہستی محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے لیکن آپ ﷺ کی بود و باش ایسی تھی کہ باہر سے لوگ ملنے آتے تو صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرت ابوبکر صدیقؓ اشارہ فرماتے کہ حضور ﷺ

تشریف رکھتے ہیں ورنہ نئے آنے والے کو دقت ہوتی تھی کہ آپ ﷺ کا رہن سہن، آپ ﷺ کا لباس، آپ ﷺ کا اٹھنا بیٹھنا، ویسا ہی ہوتا تھا جیسا عام صحابیؓ کا۔ کوئی ایسا امتیازی نشان نہیں تھا کہ کوئی خاص قسم کی پگڑی ہو، خاص ٹوپی ہو، خاص چادر لپیٹی ہو، جس طرح آج کل رواج ہے۔ گرمی سے مر رہے ہیں اور چھ چھ چادریں لپیٹ رکھی ہیں کہ جی پیر صاحب ہیں۔ اسلام حلیے اور شکلوں سے نہیں، کردار سے جانچا جاتا ہے۔

صاحبِ حال ہوتے ہوئے عام آدمی کی زندگی جینا سب سے مشکل کام ہے لیکن اس کی زندگی میں وہ ترتیب ہونی چاہیے جو اُسے اسلام عطا کرتا ہے۔ عبادت کے وقت عبادت، مزدوری کے وقت مزدوری، کام کے وقت کام اور آرام کو قربان کر کے مزید کام کریں۔ اگر ترتیب نکال دی جائے تو ایک آوارہ گرد بن جاتا ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں بنتی۔ ایک آدمی خود اپنا کردار بطور نمونہ پیش نہیں کرتا اور بڑے بڑے وعظ کرتا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔

حضور ﷺ کے والدین کریمین

آنحضرت ﷺ کے والدین کے متعلق عجیب وغریب حکایتیں بیان کی جاتی ہیں، یہ سب خرافات ہیں۔ وہ سارے موحد تھے اور کھرے موحد تھے۔ ابرہہ نے جب لشکر کشی کی۔ حضور ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ کے لشکری لے گئے۔ وہ ابرہہ کو ملنے کیلئے گئے تو ابرہہ خوش ہوا کہ میں کعبہ کو گرانے کیلئے مکہ پر چڑھائی کرنے لگا ہوں، اہلِ مکہ کا سردار آیا ہے تو یہ اپنے کعبے کی بات میرے ساتھ کرے گا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ آپ کے لشکری میرے اونٹ ہانک کر لے آئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے اونٹ واپس مل جائیں۔ تو اس نے بڑا حیران ہو کر کہا، آپ جانتے ہیں کہ میں کتنا طاقتور ہوں اور میرے ساتھ کتنا لشکر ہے۔ میں آپ لوگوں کا کعبہ گرانے آیا ہوں، مجھے تو بڑی توقع تھی کہ

آپ خانہ کعبہ کی بات کریں گے۔ انہوں نے جواباً بڑا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا۔ انہوں نے فرمایا اونٹ میرے ہیں، میں اونٹوں کی بات کر رہا ہوں۔ اس کعبے کا بھی ایک مالک ہے، جب تم کعبے کی طرف جاؤ گے تو کعبے کی بات وہ تم سے خود کر لے گا۔

اس وقت اس سے زیادہ اسلام کیا ہو سکتا تھا؟ وہ عہدِ فترت تھا لہٰذا تب آدمی مکلف ہی توحیدِ باری کا تھا۔ حضور ﷺ کے والد ماجد مثالی اور خوبصورت نوجوان تھے، صاحبِ کردار تھے اور ایک معروف بات جوان کے بارے بہت زیادہ لکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بڑی خواتین نے کوشش کی ان کے قریب جانے کی لیکن انہوں نے کہا کہ مجھے یہ سب زیب نہیں دیتا۔ یہ کردار کن لوگوں کا ہے! جو اس وقت بھی توحیدِ باری کے قائل تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا فاروقِ اعظمؓ نے عہدِ جاہلیت میں بھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا، بتوں کو نہیں مانا۔ اللہ کو نہیں جانتے تھے لیکن صحابہ کرامؓ میں ایک ایسی تعداد تھی جو بتوں کو نہیں پوجتی تھی بتوں کو نہیں مانتی تھی۔

جنت البقیع مسجد کے جس طرف ہے، اس کے دوسری طرف حضور ﷺ کے والدِ گرامی کا مزارِ مبارک تھا اس پر ترکوں نے بہت بڑی عمارت بنائی تھی۔ وہ عمارت ہم نے دیکھی۔ اندر جانے کی اجازت نہ تھی سعودی حکومت نے گیٹ، دروازے بند کر رکھے تھے لیکن وہ کافی بڑی اور سرخ رنگ کی عمارت تھی۔ کئی دفعہ ہم نے وہاں حاضری دی۔ کچھ صحابہ کرامؓ کے مدفن اس طرف تھے۔ مسجدِ نبوی ﷺ میں جب اضافہ کیا گیا اور وہ جگہ کھودی گئی تو مدفن بھی برآمد ہوئے۔ صحابہ کرامؓ کے وجودِ عالی برآمد ہوئے اور حضور ﷺ کے والد ماجد کی قبر کھود کر وہاں سے نکال کر جنت البقیع میں منتقل کیا گیا تو جتنے وجود ہائے مبارک نکلے وہ ایسے تھے جیسے آرام فرما رہے ہوں۔

آنحضرت ﷺ کی شادیاں

ایک دانشور خاتون نے مجھ سے سوال کیا اور پہلے اپنا حال بتایا کہ میں بچپن میں بڑی دیندار تھی، بڑی نمازیں پڑھیں، بڑے روزے رکھے پھر جب میں نے خود پڑھا، میں نے خود مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے گیارہ شادیاں کی ہیں تو میں بڑی بددل ہوگئی اور میں نے دینداری چھوڑ دی۔

میں نے کہا کہ بی بی! آپ دانشور ہیں، پڑھی لکھی ہیں، اچھا کیا آپ نے دین چھوڑ دیا اس لئے کہ اس کا تو رب کریم نے اختیار دیا ہے، کوئی چاہے تو اختیار کرے چاہے تو چھوڑ دے لیکن جہاں تک بات رسولِ کریم ﷺ کی ہے، آپ ﷺ کی پہلی شادی ۲۵ سال کی عمر میں اپنے سے ۱۵ سالہ بڑی بیوہ خاتون سے ہوئی۔ پچیس سال تک نبی کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے ساتھ بسر فرمائے۔ ۶۵ سال کی عمر میں حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کا انتقال ہوا۔ اس دوران آپ ﷺ پر کسی کافر تک نے انگلی نہیں اٹھائی جو آپ ﷺ کو مال و دولت اور حسین ترین عورتوں سے شادی کی خود پیشکش کیا کرتے تھے۔

'آستان' نام کا ایک رسالہ تقسیم سے قبل ہندوستان سے آیا کرتا تھا۔ اس میں ایک ہندو کا مضمون تھا، اس کا عنوان تھا "پیغمبرِ اسلام ﷺ کی شادیاں" تو اس میں اس ہندو نے لکھا کہ ہر شادی مسلمانوں، اسلامی ریاست کی بہتری یا کسی قبیلے کو اسلام میں داخل کرنے کا سبب بنی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوا تمام خواتین بیوہ، مطلقہ، عمر رسیدہ تھیں، بچوں والی تھیں۔ ان کے بچوں کی پرورش بھی رسول اللہ ﷺ نے کی اور ایک ایک شادی کی وجہ سے خاندانوں کے خاندان نہ صرف اسلام میں داخل ہوئے بلکہ عساکرِ اسلام کا دایاں بازو بن گئے۔ ذمہ داری آپ ﷺ پر، بوجھ محمد رسول ﷺ پر، حقوق ادا فرمائے محمد رسول اللہ ﷺ نے اور فائدہ ہوا امتِ مسلمہ کا اور بی بی تم اس بات پر اللہ کے رسول ﷺ سے روٹھ

تیں۔ تم نے صرف پڑھا ہی نہ ہوتا، کاش اللہ نے تجھے بھی دانش دی ہوتی، کاش تمہارا تعلق محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس ہندو پروفیسر جتنا ہی ہوتا۔ اس ہندو پروفیسر نے نبی کریم ﷺ کو اللہ کا رسول نہ مانا لیکن اس نے قومی لیڈر کے اعتبار سے لکھا کہ دنیا اس پائے کا دوسرا لیڈر پیش نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا بی بی! تجھ سے تو اس ہندو نے بہتر مانا۔ یہ تو اس قوم کے آج کے دانشور ہیں۔ کسی کو اللہ کریم پہ اعتراض ہے اور کسی کو اللہ کے حبیب ﷺ پر۔

بابِ رحمت وا ہے

تعلقات دو طرفہ ہوتے ہیں۔ ایک طرف اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ ہے اور دوسری طرف ہم ہیں۔ اللہ کو بندے سے کوئی غرض نہیں، اللہ کے حبیب ﷺ کو بندوں کی کوئی احتیاج نہیں اور ہم ہر پل غرض مند ہیں، ہر پل محتاج ہیں۔ کمال ہے! وہ بے نیاز دروازہ کھول کے بیٹھا ہے اور محتاج نخرے کر رہا ہے کہ میں تو ادھر نہیں آتا، میں تو ادھر موج میں ہوں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ حضور ﷺ کا بابِ رحمت کھلا ہے اور ہم جو محتاجِ رحمت ہیں تاہم دوسری طرف بھاگے جا رہے ہیں، دور بھاگے جا رہے ہیں۔ کبھی اپنی امیدیں حکمرانوں سے وابستہ کرتے ہیں، کبھی دولتمندوں سے اور کبھی عالمین سے وابستہ کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کے ساتھ جڑنے کی شرط

حضور ﷺ کے معجزات کی فہرست میں ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کا وجودِ عالی اتنا پاک اور نظیف تھا کہ وجودِ عالی پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی۔ اس کی شرح میں علماء یہ لکھتے ہیں کہ مکھی ہر جگہ بیٹھتی ہے۔ گندگی پر بھی بیٹھتی ہے، غلاظت پر بھی بیٹھتی ہے، پھر اس کی شرح میں مزید لکھتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ ہر مکھی غلاظت پر بیٹھتی ہو لیکن اللہ نے اس پوری جنس کو حضور ﷺ کے وجود سے محروم کر دیا اور یاد رکھیے مکھی مکلف نہیں ہے۔ اگر غیر مکلف مخلوق کے ساتھ اتنی احتیاط ہے تو ہم تو مکلف ہیں۔

اگر بندہ غلاظت کے ڈھیر پر بیٹھے گا، اپنے آپ کو غلاظت سے لتھیڑ لے گا، اپنے آپ کو غلاظت سے بھر لے گا۔ اگر جھوٹ بولے گا، سُود کھائے گا، بدکردار اور اخلاق سے عاری ہوگا، اگر حرام کے ڈھیر پر گرے گا، اور اپنے آپ کو لتھیڑے گا تو کیا اللہ اسے اجازت دے دے گا کہ جا اب حضور ﷺ کے پاس جا کے بیٹھ جا۔ یہ تو اللہ کا بڑا کرم ہے کہ مکھی کی طرح اس نے انسانوں کی ساری نسل کو محروم نہیں کر دیا ورنہ جیسے کرتوت انسانوں کے ہیں، جو ظلم انسان کرتے ہیں وہ مکھی نہیں کر سکتی۔ تو کیا بداخلاق، بدکردار، سُود کھانے والا، حرام کھانے والا اور جھوٹ بولنے والا بھلا نبی کریم ﷺ کے ساتھ جڑ سکتا ہے؟ جُڑنے کی شرط ہے کہ اپنے آپ کو جڑنے کے قابل بنائے جس کا طریقہ بڑا آسان ہے۔ نبی کریم ﷺ سے جڑنے کا آسان ذریعہ توبہ ہے۔ مجھے نام تو یاد نہیں لیکن علماءِ کرام میں سے ایک حضرت تھے جو بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، بچہ روٹھ جائے تو منانا مشکل ہو جاتا ہے لیکن اللہ کو منانا تو اس سے بھی آسان ہے کہ صدقِ دل سے کبھی چند آنسو، دردِ دل اور ایک آہ نصیب ہو جائے تو کام بن جاتا ہے۔ لیکن اگر دردِ دل ہی نہیں تو آہ کہاں سے آئے گی۔

رشتہ الفت، محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ

اب تو دنیا زیادہ دانشور ہو گئی ہے، لوگ زیادہ ترقی کر گئے ہیں اور جدید علوم آ گئے ہیں۔ لوگ بھی کیا سادہ ہیں۔ میاں! جدید علوم آئے تو پیٹ بھرنے کیلئے آئے۔ مادی وجود کو سفر کرانے میں سہولتیں دے گئے۔ جدید علوم آئے تو بیماری کا کوئی طریقہ علاج یا آپریشن کا کوئی طریقہ، جدید ہو گیا، دردِ دل کے حصول کا طریقہ تو وہی رہا۔ کوئی جدید علم ایسا نہیں آیا جو دل میں عشق و محبت پیدا کر دے، اس کا طریقہ وہی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا۔ آپ کس کس جدید علم کی بات کرتے ہیں۔ سارے علوم مادی ہیں، ساری ترقی مادی ہے اور

مادی وجود کیلئے ہے جو وقتی اور عارضی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جدید علوم حاصل نہ کرو، ضرور کرو، جدید سہولتیں ضرور حاصل کرو لیکن یہ ساری سہولتیں انسان کیلئے ہیں اور انسان ہی مردہ ہو تو اسے سہولتوں سے کیا حاصل۔ ایک میت کو خوشبودار صابنوں سے دھوتے رہو، خوشبودار تیل لگاتے رہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟ میرے بھائی! بات تو زندگی کی ہے۔

اور زندگی ہے رشتۂ الفت!..... محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ۔

عظمتِ قرآن

تفاسیر و تراجم

سارے علوم براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ سے حاصل ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد فرمایا ہوا ایک ایک جملہ علوم کا خزانہ ہے۔ چودہ سو سال ہو گئے لوگوں کو تشریحات کرتے ہوئے اور وہ خزانے ختم نہیں ہوتے۔ میں نے قرآن کریم کے بارے بھی کتنی دفعہ بیان کرنے کی سعادت پائی۔ ساری عمر گزر گئی الحمدللہ! 'اسرار التنزیل' لکھی اور سمجھا کہ اس میں خزانے لٹا دیئے ہیں۔ اب ہم جب دوبارہ تفسیرِ آیات بیان کرتے ہیں تو اور بے شمار باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں جو پہلے نہیں آئیں۔ ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے، حکمتیں ہی حکمتیں ہیں، تہہ در تہہ معانی ہیں، اور ابھی بھی اس میں بہت سے راز سربستہ ہیں۔ غرض یہ کہ قرآنِ حکیم ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کرتا ہے۔

لوگوں نے فہمِ قرآن میں عمریں بسر کر دیں۔ چودہ صدیوں میں کم و بیش دو لاکھ تفاسیر طبع ہوئیں جس میں عہدِ حاضرہ کی تفاسیر شمار نہیں کی گئیں۔ اس کے علاوہ وہ تفاسیر بھی شامل نہیں جو طبع نہ ہو سکیں۔ اس کے باوجود اب بھی جو غوطہ لگاتا ہے اِس سمندر میں سے ایک نیا موتی نکال کر لے آتا ہے۔ اس کے اندر جو گہرائی ہے وہ کبھی ناپی نہیں جا سکتی۔ اس چھوٹی سی کتاب میں اللہ کریم نے انسانیت کی رہنمائی کیلئے ہر طرح کا علم سمو دیا ہے، حسبِ حیثیت ہر زمانے کے لوگ اس سے استفادہ کرتے جائیں گے اور اس کے خزانوں میں کمی نہیں آئے گی۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر میں اللہ کریم کا احسان شمار کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اللہ نے مجھے سعادت بخشی کہ میں نے تفسیرِ قرآن 'اسرار التنزیل' لکھی۔ اس کا بھی ایک عجیب

نظام تھا۔ میں پورے سال میں صرف ایک مہینہ رمضان المبارک میں تفسیر لکھا کرتا تھا۔ رمضان شریف گزر جاتا تو دوسرے دن اگر میں لکھنا بھی چاہتا تو سمجھ نہیں آتی تھی۔ پھر اگلے سال جیسے ہی رمضان آتا، قلم پھر لکھنا شروع ہو جاتا، یوں دس جلدیں بارہ سالوں میں لکھی گئیں۔ ایک جلد میں کم و بیش تین پارے ہو جاتے تھے، اس طرح دس جلدیں بنیں، پھر اس کی چھ جلدیں بنا دی گئیں، یوں بارہ سال لگے۔ درمیان میں دو سال کسی بیماری، کسی مصروفیت کی وجہ سے رہ گئے۔

پنجابی تفسیر 'رب دیاں گلاں' شروع کر دی۔ ایک ایک لفظ کا ترجمہ اور پھر اس کی تشریح۔ الحمدللہ! وہ بھی مکمل ہو گئی ہے۔ پھر جمعہ پہ تقریری تفسیر 'اکرم التفاسیر' شروع کر دی تو اس کا بھی اب گیارہواں پارہ چل رہا ہے۔ پھر اللہ کریم نے احسان فرمایا، ترجمۂ قرآن 'اکرم التراجم' لکھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے مکمل ہوا؟ نو بجے بیٹھ کر تین بجے تک چھ گھنٹے مسلسل لکھتا رہتا تھا اور کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی تھی حالانکہ عام طور پر مجھ سے زیادہ لکھا نہیں جاتا۔ الحمدللہ! ترجمہ مکمل ہو گیا۔ یوں تین چار بار تفسیر اور ترجمے کے حوالے سے سارے قرآن کریم کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

تاثیرِ قرآن

کسی انسان کی تصنیف پڑھیں اور مسلسل پڑھتے رہیں تو اس شخص کا مزاج آپ میں منتقل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کسی موضوع کو پڑھیں اور مسلسل پڑھتے چلے جائیں تو ایک کیفیت دل پر وارد ہو گی اور موضوع سے دلچسپی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ اگر انسانی تحریر میں انسان کا مزاج منتقل ہوتا ہے تو کلامِ الٰہی میں تجلیاتِ باری کتنی قوی ہوتی ہوں گی!

اگر ہم قرآنِ حکیم پڑھتے ہیں اور مسلسل پڑھتے ہیں اور کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کا مطلب ہے کہ ہم قرآنِ حکیم اس درجے کے ایمان سے نہیں پڑھ رہے جو درجہ حصولِ

کیفیات کے لیئے ضروری ہے اور کیفیاتِ قلبی نبی کریم ﷺ سے تعلق استوار کیے بغیر نہیں ملتیں۔ حضور نبی کریم ﷺ سے تعلق قائم نہ ہو تو بارگاہِ الٰہی کا دروازہ نہیں کھلتا، بندہ وہاں تک پہنچ نہیں پاتا۔

قرآنِ کریم پڑھنے کا قرینہ

قرآن پڑھنے کا قرینہ یہ ہے کہ جب آپ پڑھیں تو سب کو چھوڑ دیں، اپنے آپ کو سامنے کر کے پڑھیں کہ قرآن مجھ سے کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا، کس طرح اللہ کو ماننا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کو ماننا ہے۔ زندگی، موت، مابعد الموت کیا ہے، زندگی کی حقیقتیں کیا ہیں۔ یعنی قرآن اس طرح سے پڑھا جائے کہ یہ میرے لیے ہے۔ ہے تو سب کیلئے لیکن سب کا اپنا اپنا معاملہ ہے، پڑھنے والے کو چاہیے کہ وہ یہ سمجھ کر پڑھے کہ یہ میرے لیے ہے، مجھ سے بات کر رہا ہے۔ ہم قرآن اس طرح پڑھتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اللہ نے اپنے بندوں کیلئے نازل کی ہے۔ اس طرح پڑھنے کا لطف نہیں۔ پڑھنے کا سلیقہ یہ ہے کہ بندہ سوچے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس میں مخاطب کیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم پڑھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو بات پڑھی جائے، اس کی کیفیات وجود پر وارد ہو جائیں۔ قرآنِ حکیم کو بار بار پڑھنے کا حکم اسی لیے ہے کہ کلام باری میں جو کیفیت ہے وہ بندے کی روح میں اتر جائے، اس میں رچ بس جائے۔ یہ کیفیت اگر نصیب ہو تو پھر دنیا و مافیہا سے آخرت بہت زیادہ میٹھی اور پیاری لگتی ہے۔ جس طرح حیاتِ دنیوی کیلئے، زندہ رہنے کیلئے، سانس لینے کیلئے ہوا ضروری ہے، پانی اور غذا ضروری ہے اسی طرح ایمان کی تازگی اور قوت کیلئے تلاوتِ قرآن ضروری ہے۔ یہ صرف مولویوں کیلئے نہیں ہے کہ مولوی صاحب نے پڑھ لیا اور آپ بے فکر ہو گئے کہ ہمارے محلے کے مولوی صاحب بچوں کو پڑھاتے ہیں اور ہمارے بچے قرآن پڑھتے ہیں، یہ ہماری اپنی بھی ضرورت

ہے۔ اسے اپنی ذات کیلئے بھی لازمی بنالیں۔

تلاوتِ قرآن کا اولین مقصد یہ ہے کہ اسے پڑھ کر سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ تلاوت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو اس طرح پڑھا جائے کہ گویا یہ کسی حاکمِ بالا کی طرف سے ہدایت نامہ ہے جس میں وہ خود پڑھنے والے سے مخاطب ہے۔ پھر بھلا کون سا ماتحت ہوگا جو اسے غور سے نہیں پڑھے گا کہ اس میں کیا کرنے کی ہدایت ہے اور کیا نہ کرنے کا حکم ہے، کیا کرنے کی اجازت ہے اور کیا کرنے کی اجازت نہیں ہے؟

قرآنِ حکیم صرف ایک تحریر نہیں ہے بلکہ قرآن کا ہر لفظ اپنے اندر نور کی ایک کیفیت رکھتا ہے۔ جسے معانی نہ بھی سمجھ آئیں، محض اس کے تلاوت کرنے سے وہ انوارات، کیفیات اور تجلیات جو قرآن کریم کا خاصہ ہیں، وہ اس کے دل پر مترشح ہوتی ہیں۔

کتابِ الٰہی کے الفاظ اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ اس میں اللہ کی ذات کے جمال کا عکس ہے، ذاتِ باری کا پرتو ہے، اس میں تجلیاتِ باری ہیں لہذا مسلسل تلاوت ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے، اطاعتِ الٰہی کا ذوق پیدا کر دیتی ہے، اللہ سے محبت کرنے اور اس کا قرب بڑھانے کا شوق پیدا کر دیتی ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم کی تلاوت کو لازم کر لینا چاہیے۔ حق تو یہ ہے کہ کوئی دن تلاوت سے خالی نہ جائے۔

فالیقراء القرآن

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہو کہ میں اللہ سے باتیں کروں فالیقراء القرآن تو وہ قرآن کی تلاوت کرے۔ اللہ اس سے بات کرے گا، بڑے پیار سے اسے سمجھائے گا، یہ کرو یہ نہ کرو۔ پرانے قصے سنائے گا کہ فلاں بندے نے یہ کیا تھا، فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو اس کا یہ حشر ہوا تھا تم اس طرف نہ جانا۔

فلاں نے یہ اچھا کام کیا تھا، اللہ کی راہ میں گردن کٹائی تھی، اسے میں نے یہ انعام دیئے۔ تمہیں بھی موقع آئے تو گردن کٹا دینا، جھکانا نہیں۔ پھر وہ تمہیں نیند سے اٹھائے گا، اٹھو، آجاؤ، میری بارگاہ میں کھڑے ہو جاؤ، مجھے سجدے کرو، مجھ سے بات کرو، اپنا دکھ بیان کرو۔ اٹھ جاؤ اور روزی تلاش کرو، میں نے دنیا میں تمہارا حصہ بکھیر دیا، زمین پر جاؤ، محنت کرو، اس پر تمہیں انعام دوں گا۔ اللہ کہتا ہے دن میں پانچ بار تو ضرور آؤ، مجھ سے اپنا دکھ درد کہو، مجھ سے اپنی پریشانیاں بیان کرو۔ جبکہ ہم کہتے ہیں ہم آتے تو سہی پر فرصت نہیں۔ دیکھو! وہ بے نیاز بلا رہا ہے اور یہ محتاج کہہ رہا ہے مجھے فرصت نہیں ہے۔

قرآن کی روزانہ تلاوت کرو

یہ ضروری ہے کہ ہر روز قرآن پڑھا جائے بلکہ اچھا یہ ہے کہ دن قرآن سے شروع ہو اور قرآن کریم پر ختم ہو۔ سونے سے پہلے بھی چند آیات پڑھ لو اور اٹھ کر پہلے قرآن شریف پڑھو۔ تھوڑا پڑھو یا زیادہ، معانی سمجھو تو سونے پہ سہاگہ ہے اور عمل کی توفیق ہو جائے تو مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن اگر معانی سمجھ میں نہ بھی آئیں تو قرآن کو دیکھنا بھی عبادت ہے اور اس کا پڑھنا بھی عبادت۔ تلاوت کا اپنا ایک نشہ ہے، لذت ہے، ثواب ہے اور زندگی گزارنے کا نسخہ بھی ہے۔ قرآن حکیم کو ہم اونچی اونچی جگہوں پر غلافوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں۔ اس کا ادب یہ نہیں ہے کہ صرف اونچی جگہ پر رکھو، اس کا ادب یہ ہے کہ اسے روز پڑھو، ہر وقت پیشِ نظر رکھو۔ قرآن ہر بندے کیلئے ہے ہر بندے کو اس طرح پڑھنا چاہیے جیسے کسی نے کوئی چٹھی مجھے بھیجی ہے۔ اللہ نے یہ خط مجھے بھیجا ہے، وہ میرے ساتھ بات کر رہا ہے، مجھ سے براہ راست مخاطب ہے۔

قرآن پڑھنے، سننے کا اثر

قرآن حکیم کا اپنا ایک اثر ہے۔ یہ باطنی کیفیات کی اصلاح کرتا ہے، ظاہری

کیفیات کی اصلاح کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم کو دیکھیں، پڑھیں، تو تمام ظاہری بیماریوں کا علاج بھی ہو جائے گا، ایسی بیماریوں کا علاج بھی جنہیں ڈاکٹر لاعلاج قرار دے دیتے ہیں۔ اس طرح کے مریضوں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ اگر پڑھنے کی فرصت نہیں تو قرآنِ حکیم کی کیسٹ ہی سن لیا کرو۔ قرآن کو سنو، اس کے سننے سے ریڈی ایشنز (Radiations) نکلتی ہیں، اس کے انوارات ایمان کی سلامتی کا سبب بھی بنتے ہیں اور مادی وجود کی سلامتی کا بھی سبب ہیں۔

آج میڈیکل سائنس بھی جو علاج کر رہی ہے وہ زیادہ تر ریڈی ایشن سے ہو رہا ہے۔ آپریشنز، لیزر سے ہو رہے ہیں۔ لیزر بھی ایک ریڈی ایشن ہے، ایک باریک سی روشنی کی لہر ہے۔ اگر روشنی کی ایک کرن اتنا کام کرتی ہے تو ذاتِ باری کا کلام تو اس کی صفتِ دائمی ہے جبکہ یہ ساری روشنیاں فانی ہیں، دائمی اور ہمیشہ رہنے والا نور صرف اللہ کا ہے۔ اللہ کی تجلیات ہیں اور تجلیاتِ باری کا سب سے بڑا مظہر قرآن کریم ہے، اللہ کریم کا ذاتی کلام ہے اس کے ذاتی انوارات اس سے Radiate کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا اعجاز

زندگی کے لامحدود موضوعات پر اتنی کتابیں لکھی گئیں جنہیں کوئی گن نہیں سکتا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کوئی بھی کتاب حرفِ آخر نہیں ہے۔ سائنس نے بے شمار اصول وضع کیے اور عجیب بات ہے کہ پھر خود سائنس نے ہی ان کی تردید کی اور ان کی جگہ نئے اصول پیش کیے۔ قرآنِ حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ یہ واحد حقیقی کتاب ہے جس میں زندگی، زندگی سے پہلے، زندگی کے بعد، موت، حشر، مابعد الموت کے سارے موضوعات کو سمیٹ دیا گیا ہے اور ہر موضوع پر جو بات کی ہے وہی حرفِ آخر ہے۔ آپ دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کتابچہ کسی کو ازبر کرا دیں، ہو بہو یاد نہیں رہے گا۔ کہیں کوئی مفہوم چھوٹ جائے گا، کہیں سے

کچھ الفاظ رہ جائیں گے لیکن قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ یہ شروع سے آخر تک حرف بہ حرف یاد ہو جاتا ہے۔ صدیاں بیت گئیں قرآن کا یہ اعجاز قائم ہے کہ یہ انسانی سینوں میں، انسانی دلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ بچے یاد کر لیتے ہیں۔ بوڑھوں کو باقی باتیں بھول جاتی ہیں، قرآن نہیں بھولتا۔

عظمتِ قرآن اور لیلۃ القدر

لیلۃ القدر کس سبب سے لیلۃ القدر بنی؟ کیا ہمیں اس کا ادراک ہے، اس کا احساس ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر آئی تو اللہ نے ان لمحات کو ہزار مہینوں سے زیادہ اہمیت دے دی۔ وہ کتاب منبر پر میرے سامنے رکھی ہوئی ہے، کیا میں اس کی عظمت سے واقف ہوں؟ کیا میرا عقیدہ وہی ہے جس کا مطالبہ یہ کتاب کرتی ہے؟ جس چیز کی طرف دعوت دیتی ہے کیا میں نے اس پر غور کیا؟ جن کاموں کے کرنے کا اور جس طرح کرنے کا کہتی ہے کیا مجھے اس کا پاس ہے؟ اگر ہے تو پھر ہماری ہر رات لیلۃ القدر ہے کہ ہمارے پاس ہر وقت قرآن موجود ہے۔ تم پڑھ بھی سکتے ہو، سمجھ بھی سکتے ہو، سوچ بھی سکتے ہو۔ جب یہ تمہارے لبوں پر ہو، تمہارے ذہن میں ہو، تمہارے دل میں بستا ہو تو تمہارے لئے ہر لمحہ لیلۃ القدر ہے۔ تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ پھر یہ جس کے سینے میں محفوظ ہے تو اس کے سینے کا ذرہ ذرہ لیلۃ القدر کیوں نہیں بنتا؟ وہ جھوٹ کیوں بولتا ہے، چوری کیوں کرتا ہے، کیوں اللہ کی اطاعت نہیں کرتا، اس کے دل میں عشقِ رسول ﷺ کیوں پیدا نہیں ہوتا، اس کے دل میں دردِ محبت کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ ہم نے اس کی عظمت کو محسوس نہیں کیا، اسے لپیٹ کر برکت کیلئے ایک خانے میں رکھ دیا ہے کہ شائد کبھی قسم اٹھانے کے کام آجائے۔ اگر میدانِ حشر میں کسی سے یہ سوال ہو گیا کہ اتنی عظیم کتاب جو میرا ذاتی کلام تھا، وہ کلام تیرے گھر میں رکھا رہا اور تجھے کھول کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی تو

تیرے ساتھ میرا کیا تعلق؟..... کبھی سوچا..... کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

لیلۃ القدر، شبِ قدر کس نے پائی؟ جس کا اپنے رب سے سودا ہو گیا، جس نے اپنی مرضی کتابِ الٰہی کے سامنے چھوڑ دی اور اگر یہ سودا نہیں ہے تو پھر یہ شب بیداری ایک رسم ہے۔ جہاں بیشمار رسوم اور ہیں ان میں یہ ایک رسم اور سہی۔ اتنی رسموں میں ایک اور رسم کا اضافہ ہو گیا تو کیا فرق پڑا؟

شبِ قدر کا مزہ تو جب ہے کہ کوئی کیسا بھی گناہ گار تھا، جاہل و بیوقوف تھا، خطا کار تھا اسے شبِ قدر ملی تو وہ اللہ کا بندہ بن گیا، اس کی سوچ بدل گئی، اس کے فیصلے بدل گئے، وہ انسان ہی بدل گیا۔ اگر کتابِ الٰہی کے لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر آنے میں اتنی فضیلت ہے کہ یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر بنا دی گئی تو جب یہ زمین پر نازل ہونا شروع ہوئی اور جس ہستی پر نازل ہونا شروع ہوئی۔ تیئیس (۲۳) برس جس وجودِ عالی ﷺ اور جس قلبِ اطہر ﷺ پر نازل ہوتی رہی، اس کی عظمت کیا ہو گی۔ کیا ہم اس ہستی سے وفا کر رہے ہیں؟

لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو اللہ کی رحمتیں لے کر آتے ہیں لیکن آگے کوئی وصول کرنے والا بھی تو ہو۔ بارش ہو تو ہر جگہ برستی ہے، زرخیز زمینوں پر بھی، سنگلاخ چٹانوں پر بھی۔ چٹانوں پر اگر مٹی آگئی ہو تو وہ دھل جاتی ہے اور ان کی پوری سختی سامنے آجاتی ہے۔ زرخیز زمین سے تو سبزہ نکلنا شروع ہو جاتا ہے لیکن ابرِ رحمت کے برسنے کے باوجود کئی سخت زمینیں، سخت چٹانیں ایسی ہیں جو دھل کر اور سخت ہو جاتی ہیں۔ کچھ کوڑے کے ڈھیر ہوتے ہیں جن پر بارش برسے تو ان میں بدبو پھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔ ردِ عمل ہر ایک کا اپنا اپنا ہے۔

چٹانیں، چٹانیں ہی رہتی ہیں۔ کتنی برساتیں آتی ہیں انہیں کوئی فرق نہیں

پڑتا، ٹوٹیں بھی تو ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے پھر چھوٹی چٹانیں ہی بنتی ہیں، کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ سے وہ دل مانگو جو اس کی عظمت سے آشنا ہو، جو عظمتِ پیغمبر ﷺ سے آشنا ہو۔ اللہ سے توفیقِ عمل مانگو، قرآن پر عمل کی توفیق مانگو۔

عظمتِ قرآن اور رسومات

ہم رسمیں منانے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ نزولِ قرآن کی رات کو بھی اب جشن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ کہاں اللہ کے کلام کی عظمت اور کہاں یہ رسومات۔ جب سے روحِ دین سے بے اعتنائی برتی گئی، تب سے عظمتِ قرآن نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جشن، جلسے، جلوس کی صورت میں من مانی، کاروائیاں رہ گئیں۔ یہ تبدیلیاں ہمارے دیکھتے دیکھتے آنا شروع ہو گئیں۔

لیلۃ القدر نزولِ قرآن کی رات ہے، یہ جشن کی رات نہیں۔ یہ رات وعدہ کرنے کی رات ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (البقرہ: 285) تو نزولِ قرآن زندگی کا سودا ہے، جشن کی بات نہیں، یہ رات تو زندگی کا سودا کرنے کی رات ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے علوم کی کوئی انتہا نہیں۔ آج تک مفسرین نے اپنی اپنی ہمت کے مطابق جھولیاں بھر بھر کے اس کے خزانے عوام میں لٹائے لیکن اس کے خزانے کم نہیں ہوتے۔ جب بھی کوئی نیا غوطہ لگاتا ہے تو وہ مزید موتیوں سے جھولی بھر کر لے آتا ہے۔

قرآن سے ہمارا واجبی تعلق

یہ میری، آپ کی اور ہم سب کی کہانی ہے۔ یہ دنیا ہمارے دلوں میں اتنی دھنسی ہوئی ہے کہ مرتے ہوئے بھی ہم اس ہی کی فکر کرتے ہیں۔ دین کے ساتھ ہمارا واجبی سا تعلق ہے جیسے گلے پڑ گیا ہو۔ ہم مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے، مسلمان ہیں۔ چلو نماز پڑھ لی، رہ گئی، تو رہ گئی کوئی بات نہیں پھر پڑھ لیں گے، نہ پڑھیں گے تو ایک نماز

کا کیا ہے۔ قرآنِ کریم ہم پڑھ جاتے ہیں، ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کتنا پڑھا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے آپ دنیا کی کوئی کتاب لے لیں، طب کی ہو، ریاضی کی ہو یا کہانیوں کی ہو کسی کے ہاتھ سے کتاب لے کر بند کر دیں وہ پھر وہیں سے کھولے گا جہاں سے اس نے چھوڑی تھی۔ کسی تلاوت کرتے ہوئے شخص سے قرآنِ مجید لے کر بند کر دیں پھر پوچھیں کہاں سے پڑھ رہے تھے، عجیب بات ہے اسے پتہ ہی نہیں ہوگا۔ یہ دین کے ساتھ ہمارا برتاؤ ہے۔

احکامِ قرآن سے بے خبری

جس کتاب کا اتنا اہتمام فرمایا گیا کہ اس کے بغیر زندگی کا کوئی پل بھی گزارنا ممکن نہیں، اب اس کے ماننے والے اسے مانتے تو ہیں، چومتے ہیں، احترام کرتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں لیکن جانتے نہیں اس میں لکھا کیا ہے؟ عمل کرتے وقت انہیں خبر نہیں ہوتی کہ ہم اس کے خلاف کر رہے ہیں یا اس کے مطابق کر رہے ہیں۔ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوگی!

قرآنِ کریم کا حاصل

سارے قرآنِ کریم کا حاصل جو میں سمجھ سکا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ بندے کا اللہ سے تعلق استوار ہو جائے۔ اللہ کو اللہ مانے، ویسا مانے جیسا وہ ہے اور یہ یقین صرف اللہ کے رسول ﷺ ہی دیتے ہیں کہ اس کی ذات اس کی صفات کو کیسے مانا جائے؟ جب اللہ کو اللہ مان لیا جائے، یہ ایمان نصیب ہو جائے تو پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ یہ سمجھ آ جائے تو سب سے پہلی نعمت یہ نصیب ہوتی ہے کہ غیر اللہ سے جان چھوٹ جاتی ہے، بندہ دوسروں کا محتاج نہیں رہتا۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ اس دنیوی زندگی میں غیر اللہ کبھی انسانوں کے روپ میں ہوتے ہیں، کبھی امیدوں اور کبھی خواہشات کے روپ میں ہوتے ہیں۔ انسانوں یا بتوں میں جو مجسم معبود ہیں ان سے جان چھڑانا بھی مشکل کام ہے لیکن سب سے مشکل کام

اپنی خواہشات اور آرزوں کے معبودوں سے جان چھڑانا ہے اس کی اللہ کریم نے نشاندہی فرمائی۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (الفرقان:43)۔ آپ نے ان لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے۔ خواہش کو مجسم کر کے کوئی اس کے آگے سجدہ نہیں کرتا لیکن جب اللہ کا حکم چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کی جائے تو اللہ فرماتا ہے اس نے اس خواہش کی عبادت کی، میری چھوڑ دی۔

عظمتِ صحابہ کرامؓ

صحابیؓ کی تعریف

نبوت کے بعد انسانیت میں سب سے اعلیٰ مقام صحبتِ رسول پاک ﷺ ہے، صحابیت ہے۔ صحابی محض ایک لفظ یا اصطلاح نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ انبیاءؑ کے بعد بلند ترین مرتبے پر فائز ہستی صحابیؓ کی ہے۔ اگر دنیا پر بسنے والے سارے لوگ ولی اللہ ہو جائیں اور سب کی ولایت کو اگر جمع کیا جا سکے یا اس کا کوئی مینار تعمیر کیا جا سکے تو ساری ولایتیں جہاں ختم ہو جائیں گی، وہاں سے صحابہ کرامؓ کے قدموں کی گرد شروع ہو گی۔ آگے منازل یا مراتب یا مقامات صحابہؓ کے اپنے اپنے ہیں۔ سب اچھے ہیں، بعض اچھوں میں بہت اچھے ہیں لیکن کم از کم منصب صحابیت یہ ہے کہ دنیا بھر کی ولایت ان کے قدموں کے نیچے ہے۔ کوئی شخص ساری زندگی صرف اللہ کا ذکر کرتا رہے، عبادات کرتا رہے، صحابیؓ نہیں بن سکتا۔ کمی کیا ہے؟ کمی یہ ہے کہ وہ نظر میسر نہیں، اس کو صحبتِ رسول ﷺ کا ایک لمحہ میسر نہیں۔

صحابیت اعلیٰ ترین مقام

یہ اعلیٰ ترین مقام ہے جو نبوت کے بعد مخلوق میں سے کسی کو نصیب ہو سکتا ہے اور صحابیؓ ہر طرح سے مثالی مسلمان ہوتا ہے۔ امانت و دیانت، خشوع و خضوع، قربِ الٰہی اور خلوص، ان تمام معاملات میں حتیٰ کہ کوئی صحابیؓ اگر بظاہر تعلیم یافتہ نہیں ہے پھر بھی جو مسئلہ صحابیؓ بیان کر دیتا ہے، بڑے سے بڑے فاضل اس پر جرح نہیں کر سکتے۔ کیونکہ صحابیؓ کا قول اپنا ایک خاص حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے محمد رسول اللہ ﷺ سے براہ راست یہ علم حاصل کیا ہے۔ کسی پہلو سے بھی نبوتؑ کے بعد صحابیت، عظمت اور انتہائی منازل کی دلیل ہے۔

عظمتِ سیدنا ابوبکر صدیقؓ

علامہ باذل ایک شیعہ عالم ہوئے ہیں۔ بھلا زمانہ تھا اس زمانے کے علماء جھوٹ سے احتراز کرتے تھے۔ اگرچہ وہ شیعہ تھے لیکن پھر بھی انہوں نے پوری تاریخ اسلام مرتب کی ہے اور وہ ساری فارسی شعروں میں ہے۔ علامہ باذل ایرانی کی ''حملۂ حیدری'' کے نام سے یہ کتاب ایک منظوم کتاب ہے۔ اب نایاب ہے لیکن الحمد للہ! ہماری لائبریری میں موجود ہے۔ آپ ﷺ کے سفرِ ہجرت کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

چوں رفتند چندیں بدامانِ دشت قدومِ فلک سایہ مجروح گشت

کہ جب آپ ﷺ نے کچھ دور تک سفر فرمایا صحرا میں، دشت میں، پہاڑوں میں تو آپ ﷺ کے قدوم مبارک زخمی ہوگئے۔

ابوبکر آنگہ بہ دوشش گرفت ولے ایں حدیث است جائے شگفت

کہ جب آپ ﷺ کے قدومِ مبارک زخمی ہوگئے تو سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے آپ ﷺ کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ وہ کہتے ہیں، یہ بات بڑی حیران کن ہے۔

کہ درکس چناں قوت آمد پدید کہ بار نبوت تواند کشید

کہ کسی فرد میں اتنی طاقت آگئی کہ اس نے نبوت کا بوجھ اٹھالیا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب ساری زمین کا رابطہ حضور ﷺ سے کٹ گیا، زمین سے قدوم مبارک بھی اٹھ گئے، محمد رسول اللہ ﷺ دوشِ ابوبکر صدیقؓ پر تھے اور ساری کائنات صدیقِ اکبرؓ کے قدموں سے برکاتِ نبوت ﷺ حاصل کر رہی تھی۔ لہٰذا ابوبکر صدیقؓ وہ کڑی ہیں جنہیں معیتِ نبوی ﷺ کا اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی انوکھی شان

ارشاد باری تعالیٰ ہے لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ:40) حضور ﷺ نے

فرمایا، آپ رنج نہ کریں، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ اللہ کی معیت، اللہ کا ساتھ ہونے کی بات میں دو ہستیوں کا نام آیا ہے۔ انبیاءؑ میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور غیر انبیاء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اور یہ درجہ دنیا میں کسی تیسرے کو نصیب ہی نہیں۔

علماء اہلِ سنت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاءؑ کے بعد کائنات میں افضل ترین شخصیت، افضل ترین فرد، پوری کائنات میں پہلی پچھلی ساری امتوں میں ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ سورج کسی شخص پر طلوع نہیں ہوا جو نبیوںؑ کے بعد ابوبکرؓ سے افضل ہو۔ انبیاءؑ میں حضرت یوسفؑ چار پشت سے نبی تھے۔ یوسفؑ نبی، یعقوبؑ نبی، اسحاقؑ نبی، ابراہیمؑ نبی۔ ابوبکر صدیقؓ کی چار پشتوں میں صحابیت تھی۔

صحابہ کرامؓ کی عظمت

نبی کریم ﷺ کے صحابیؓ کی اتنی عظمت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک صحابیؓ مٹھی بھر جَو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور غیر صحابی اللہ کی راہ میں اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرتا ہے تو عنداللہ صحابیؓ کے مٹھی بھر جو کا اجر زیادہ ہے، اس لیے کہ صحابیؓ کا خلوص، اس کا اللہ کے ساتھ تعلق، اس میں اطاعتِ الٰہی کا جو جذبہ ہے وہ غیر صحابی میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر نبی کریم ﷺ کے صحابیؓ کا یہ مقام ہے تو انبیاءؑ کا مقام کیا ہوگا؟

صحابہ کرامؓ عظیم انسان تھے۔ کوئی ان کی گردِ پا کو نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ وہ کیفیت جو محبتِ نبی کریم ﷺ کی بنا پر برکات کے زمرے میں نصیب ہوتی ہے، وہ نصیب ہوئی۔ صحابہؓ کسی چلہ کشی سے یا مجاہدوں سے یا وظیفوں سے صحابیؓ نہیں بنے، اس کیفیت سے بنے اور نبیؐ کے ارشاد میں یہ برکت ہوتی ہے کہ جو ارشاداتِ نبوت قبول کرتا ہے، اسے ان کے ساتھ وہ کیفیت بھی عطا ہو جاتی ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرامؓ موجود

تھے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار تو میدانِ عرفات میں تھے، جو نہیں پہنچ سکے وہ کتنے تھے؟ بیویاں، بچے، بوڑھے، جوان، تو اس طرح سے ہم اندازہ لگائیں تو کم از کم پانچ، چھ لاکھ تعداد بن جاتی ہے۔ یہ پانچ، چھ لاکھ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تھے، تو کیا ان کی قبریں وہاں ہی ہیں؟

یہ لوگ پوری دنیا میں پھیل گئے۔ سری لنکا سے لے کر چین کے شمال تک اور ہسپانیہ سے گزر کر امریکہ پر بھی مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ مغربی امریکہ میں اب بھی شہروں، صوبوں اور قصبوں کے نام اسلامی ہیں اور عربی میں ہیں۔ میں نے خود سارا علاقہ پھر کر دیکھا ہے۔ صحابہؓ ہندوستان میں دفن ہیں، برصغیر میں دفن ہیں، چین میں دفن ہیں، سری لنکا میں دفن ہیں، ہسپانیہ میں دفن ہیں، قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے وہ صحابیؓ دفن ہیں جن کے گھر حضورِ اکرم ﷺ نے قیام فرمایا تھا یعنی حضرت ابوایوب انصاریؓ۔

چند سال پہلے چین کے شمالی صحرا سے، غالباً دس سال پہلے کی بات ہے کچھ وجود ملے جو بالکل سلامت تھے اور چین کی حکومت نے یہ کہا کہ یہ ریتلا علاقہ ہے، ریت نے ان جسموں کی تروات جذب کر لی اور جسم خراب نہیں ہوئے۔ لیکن کیا اس ریتلے علاقے میں وہ صرف دس بارہ جسم ہی دفن ہوئے تھے اور لوگوں میں سے کوئی دفن نہیں ہوا، کیا باقیوں کو اس ریتلے علاقے نے محفوظ رکھا؟ یہ یقیناً ان لوگوں کے وجود تھے جو دنیا سے گزر تو گئے لیکن مرے نہیں۔ یہ شہداء کے وجود تھے۔

فتوحاتِ صحابہ کرامؓ

تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہؓ نے زمین کے کس کس خطے میں اسلام پہنچایا۔ جہاں کسی صحابیؓ کے قدم لگے ہیں وہاں سے آج تک اسلام کو مٹایا نہیں جا سکا۔ جس زمین پر کسی صحابیؓ نے اذان کہی ہے، پندرہویں صدی آ گئی ہے آج تک وہاں اذان ہو رہی ہے۔ یہ ان کے

وجود میں برکات کس نے بھر دیں؟ محمد رسول اللہ ﷺ نے۔ آپ تاریخ دیکھئے کہ تینتیس (33) برس کے اندر افواجِ اسلامی سے معلوم دنیا کے تین حصے فتح ہو چکے تھے۔ زیادہ سلطنتیں کلمۂ توحید کے زیرِ نگیں آ چکی تھیں اور افریقہ سے لے کر سائبریا تک اور ہسپانیہ سے لے کر چین تک اسلامی ریاست بن چکی تھی۔ جہاں تک انسانی تاریخ پتہ دیتی ہے، دنیا میں، کسی زمانے میں، نہ اس سے پہلے بیک وقت اتنی بڑی ریاست کسی حکمران کے پاس آئی اور نہ اس کے بعد آئی ہے۔ آج جو آپ کے پاس نصف صدر یاستیں ہیں، یہ سب بھی اسی نقشے کے اندر ہیں، اس کے ساتھ بہت سا حصہ اور بھی تھا جسے مسلمانوں نے کھو دیا۔

تاریخ کا سچ

تاریخ گواہ ہے کہ مٹھی بھر خانہ بدوش جزیرہ نمائے عرب سے اٹھے اور جدھر جدھر ان پروانوں نے کروٹ لی، زمانہ کروٹیں بدلتا چلا گیا۔ بڑی بڑی عظیم قوتیں نابود ہوتی چلی گئیں، بڑے بڑے لاؤ لشکر ناکام ہوتے چلے گئے۔ اور یہ نہیں کہ جسے فتح کیا اسے تاخت و تاراج کر دیا، مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس سارے بگاڑ کو سنوارا اور ایسا سنوارا کہ زمین کو جنت نظیر بنا دیا۔

مؤرخ نے عہدِ فاروقیؓ کے بارے میں ایک جملہ لکھا ہے، میں نے جب سے پڑھا ہے میرے سینے میں اس طرح کندہ ہو گیا ہے جیسے پتھر کھود کر چیز اس میں لکھ دی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے ''عہدِ فاروقیؓ میں چھبیس ہزار (26000) مربع میل علاقہ فتح ہوا، جس میں پینتیس ہزار (35,000) بڑے بڑے شہر اور دس ہزار (10,000) ایسے قلعے تھے جو ناقابلِ شکست تھے۔ آگے ایک جملہ لکھتا ہے لیکن کہتا ہے عجیب بات یہ نہیں کہ یہ سارا علاقہ فتح ہوا، عجیب بات یہ ہے کہ ان ساری فتوحات میں کسی بوڑھے کی آہ، کسی عورت کی چیخ اور کسی مظلوم کے آنسو گرتے نظر نہیں آتے یعنی عجیب بات یہ ہے کہ فتح کر کے تاراج نہیں

کیا بلکہ سنوار کر اسے گل و گلزار بنا دیا۔

صحابہ کرامؓ کی کرامت

صحابہ کرامؓ کی کرامت ہے کہ روئے زمین پر جہاں جہاں صحابہؓ تشریف لے گئے وہاں سے اسلام کو مٹایا نہیں جا سکا۔ یہ جو چھپن (56) ریاستیں ہم نے بنا رکھی ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ مسلمانوں کے پاس 56 ریاستیں ہیں، یہ اسی ریاست کے چھپن حصے ہیں جو صحابہ کرامؓ نے بنائی تھی اور یہ انہی کے دم قدم کی برکت ہے کہ جہاں ان کے قدم پڑے وہاں سے اسلام مٹایا نہیں جا سکتا، وہاں سے اللہ اکبر کی صدائیں ختم نہیں کی جا سکتیں، وہاں آج بھی اذان ہوتی ہے۔

جن فاصلوں کیلئے ہم آج ہوائی جہازوں کا انتظار کرتے ہیں، انہوں نے گھوڑوں کی پیٹھوں پر طے فرمائے اور صحرائے عرب میں پیدا ہونے والے افغانستان کے شمال سے گذرتے ہوئے چین تک نکل گئے۔ جس درے سے گذر کر صحابہ کرامؓ چین پہنچے ہیں، اس کا عالم یہ ہے کہ گرمیوں میں وہاں سے کوئی بندہ بے خوف ہو کر نہیں گزرتا کیونکہ ہمیشہ برف جمی رہتی ہے اور غالباً درے کی بلندی اٹھارہ ہزار (18000) فٹ سے زیادہ ہے، پہاڑ تو اور بھی بلند ہے۔ سردیوں میں وہاں سے گذرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ریگستانوں کے باسی ان دروں کو عبور کر کے چین میں بھی اللہ کا پیغام لے کر پہنچ گئے۔ میں نے یہ تاریخ میں پڑھا ہے کہ مغرب سے داخل ہوئے اور مشرقی ساحل پر چین تک گئے۔ میرے پاس اُس مسجد اور وہاں کے مزارات کی تصاویر موجود ہیں جو صحابہ کرامؓ کے مزارات ہیں اور جو مسجد انھوں نے بنائی تھی اس کے اب کچھ کھنڈر سے، کچھ دیواریں، کچھ ستون کھڑے ہیں یعنی وہ پورا چین روند کر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچانے کے لئے مشرقی کنارے تک، سمندر تک پہنچ گئے اور یہی وجہ ہے کہ ابھی تک چین میں اسلام باقی

ہے۔ صحابہ کرامؓ کی یہ خصوصیت تھی کہ کہیں بھی جاتے، کسی رنگ میں جاتے، کسی جگہ جاتے تو پہچانے جاتے تھے۔ ایسا رنگ چڑھا تھا ان پر کہ بھیڑ میں گم نہیں ہوتے تھے۔

انقلاب آفرین لوگ

صحابہ کرامؓ نے زندگی اس طرح نہیں گزاری کہ جب سے دین قبول کیا، تب سے ساری زندگی اپنے آپ کو ہی سنبھالتے گزار دی کہ آج یہ غلطی ہو گئی اور کل دوسری ہو گئی۔ آج توبہ کی، کل پھر سہی۔ یا یہ کہ مجھ سے یہ نہیں ہو رہا اور مجھ سے وہ نہیں ہو رہا۔ ایسے لوگ انقلاب آفرین نہیں ہوتے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں یہ نہیں ملتا بلکہ یہ پتہ چلتا ہے کہ جسے جو نصیب ہوا اس نے پوری کوششیں اس بات پر صرف کر دیں کہ وہ اس پر عمل کرے اور پھر خود ہی عمل نہیں کیا، اس پیغام کو ہر فرد و بشر تک پہنچانے کی کوشش کی۔

صحابہ کرامؓ نے اللہ سے کیا مانگا؟

صحابہ کرامؓ کی تمام کی تمام دعائیں دنیا ہی کیلئے نہیں ہوتی تھیں۔ انہیں یہ یقین تھا کہ جب وہ ہاتھ اٹھائیں گے تو وہ خالی نہیں جائیں گے اور انہوں نے مانگنے کی چیز مانگی، انہوں نے اسلام کی سربلندی مانگی، آخرت کی سرخروئی مانگی۔ آج کی ساری دعائیں یہی ہیں میرا بیٹا پاس ہو جائے، میرے بچے کی نوکری لگ جائے، میری دکان چمک جائے۔

یہ کیسے عجیب لوگ تھے حضور ﷺ کی رفاقت، حضور ﷺ کی معیت نے انہیں کیا دے دیا تھا؟ آپ ﷺ پر غیر متزلزل یقین اور ایمان۔ حضور ﷺ نے ان کے ذوقِ طلب کو وہ بلندی عطا کی کہ وہ طالبِ آخرت ہوئے۔ انہوں نے توفیقِ عمل مانگی اور عمل کیلئے محنت کی۔ اگر انہوں نے دنیا کی کوئی شے مانگی بھی تو وہ بھی اسلام کی سربلندی کیلئے مانگی۔ آج تو دل ترس جاتا ہے کہ کوئی ایسا آدمی ملے جو آخرت کا طالب ہو۔

صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں، کیسے؟

صحابہ کرامؓ بڑی بلند پایہ ہستیاں تھیں، انہوں نے گھر بار، کاروبار سب اللہ کے لیے چھوڑ کر ہجرتیں کیں اللہ بھی بڑا قدر دان ہے جنہوں نے مٹی کے گھروندے چھوڑے تھے، انہیں روئے زمین کی سلطنتیں عطا کر دیں لیکن انہیں اس درجے کی معیتِ رسالت حاصل تھی کہ جب انہیں ہجرت کا حکم ہوا تو وہ تہی دست، تہی دامن مسافر ہو کر نکل پڑے، تب بھی دل کی کیفیت وہی تھی اللہ پر یقین و ایمان بے مثال تھا اور جب انہیں دنیا کی ریاست مل گئی تو دل کی دنیا تب بھی ویسے ہی اللہ کے نام سے آباد رہی۔

صحابہ کرامؓ نے وہی کلمہ پڑھا جو الحمد اللہ! ہمیں بھی نصیب ہے۔ یہی پانچ نمازیں ان پر فرض تھیں جو ہم بھی پڑھتے ہیں۔ پھر ہمارے ساتھ کیا مسئلہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی ہماری عملی زندگی میں کچھ نہیں بدلتا۔ صحابہ کرامؓ تو اس وقت بدل گئے تھے جب ابھی نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں، رمضان کا حکم بعد میں آیا، سود بعد میں حرام ہوا، حلال حرام کی حدود وقیود وقتاً فوقتاً نازل ہوئیں لیکن صحابہ کرامؓ کی مبارک زندگیاں کلمہ پڑھتے ہی بدل گئیں۔

فرق کیا تھا؟ فرق یہ تھا کہ صحبتِ پیغمبر ﷺ سے جو انوارات قلبِ اطہر رسول اللہ ﷺ سے صحابہؓ کے دلوں میں آئے، انہوں نے ان کی زندگیاں بدل دیں۔ برکاتِ نبوی ﷺ کے باعث صحابہ کرامؓ کی جلدیں اور ظاہری شکل وصورت تو نہیں بدلی لیکن ان کا کردار یکسر بدل گیا۔ لوٹ کر کھانے والے مہمان کو کھانا کھلانے لیے خود بھوکے رہنے کو ترجیح دینے لگ گئے۔ پہلے شرک میں مبتلا تھے جب صحبتِ نبوی ﷺ میں آئے تو روئے زمین سے شرک کی بیخ کنی کرنے کے لئے جانیں نچھاور کرنے لگے۔ رسومات کے اسیر تھے، بارگاہِ رسالت ﷺ میں آئے تو ہر رواج کو مٹا کر سنتِ نبوی ﷺ کو رائج کرنے

والے بن گئے۔

جس سرزمین پر صرف طاقت کی حکومت تھی، ظلم کا دور دورہ تھا، بارگاہِ رسالت پناہی میں آئے تو روئے زمین پر انسانوں کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے مجاہد بن کر پھیل گئے۔ بندوں کو جھوٹے خداؤں کی غلامی سے آزاد کروا کے ایک اللہ کی محبت سے سرشار کرنا ان کا مقصدِ حیات بن گیا۔

وہ تو خود طاقت کے پجاری تھے، ان کے دل میں انسانوں کا درد کیسے آ گیا کہ انہیں دوسروں کو آزاد کروانے کی فکر لاحق ہو گئی۔ یہ کردار کیوں اور کیسے تبدیل ہوا؟ یہ تھیں برکاتِ نبوت و رسالت ﷺ۔ قرآن نے اس پر گواہی دی ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:23) پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں یعنی ان کی کھال سے لے کر نہاں خانۂ دل تک ہر جزو بدن اللہ اللہ کرنے لگا۔ سائنس کی موجودہ تحقیق کے مطابق ایک انسان کے وجود میں تقریباً دس ہزار کھرب سیل ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی آیتِ مبارکہ کے مطابق کھال سے دل تک ہر ذرۂ وجود ذکر اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا تو گویا جس وجود کے 10 ہزار کھرب خلیے سے اللہ اللہ نکلا۔ اس میں تبدیلی کیوں نہیں آئے گی؟

ہم میں تبدیلی اس لیے نہیں آتی کہ ہم ارشاداتِ شریعت صرف پڑھتے، سنتے ہیں اور ایکٹنگ کرتے ہیں۔ اس عمل کی اداکاری کرتے ہیں۔ ہم نے احکامِ شریعت کو درونِ دل جانے نہیں دیا۔ وقتِ صلوٰۃ ہم بھاگتے دوڑتے مسجد میں آتے ہیں، تیزی اور جلدی میں وضو کرتے ہیں، آدھے اعضاء گیلے اور آدھے خشک رہ جاتے ہیں۔ پھر اس افراتفری میں اٹھک بیٹھک کر کے بھاگ جاتے ہیں اور نماز کا بوجھ اتار دیتے ہیں۔

جو لوگ حضور ﷺ پر ایمان لائے، کیا سوائے چند ایک کے، اس سے پہلے

والے آدمی کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ رہ گیا؟ کوئی بھی شخص جب مسلمان ہوا تو اس سے پہلے اس کی دس، بیس، تیس، چالیس، پچاس سال زندگی بھی تھی..... سب کچھ بدل نہیں جاتا، قد وہی رہتا ہے، رنگ وہی رہتا ہے لیکن پہلے والا آدمی وہاں نظر ہی نہیں آتا۔ یعنی ایک شخص ڈاکو تھا، لوٹ کر کھانے والا تھا جب ایمان لایا، لٹاتا ہوا نظر آیا۔ لوٹنے اور لٹانے میں کتنا فرق ہے؟ ایک شخص جاہل تھا، ایمان لایا تو ایسا فاضل نظر آتا ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا عالم اس کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔ ایک شخص مشرک تھا، کافر تھا، ایمان لایا تو کفر کو اس نے ملکوں سے خارج کر دیا۔ صرف اپنے وجود سے ہی نہیں بلکہ دنیا سے کفر کی بساط لپیٹ دی۔ تو کتنا فرق ہوتا ہے کافر اور مومن میں۔ ہم کیسے مومن ہیں کہ ہم بدلتے بھی نہیں ہیں اور مومن بھی ہیں یعنی جیسے ہم پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ جیسا ہم بازار میں سوچتے ہیں، وہی سوچ ہماری مسجد میں بھی ہوتی ہے۔ جبکہ نورِ نبوت سے صحابہ کرامؓ کے ضمیر روشن، ان کے مزاج روشن، ان کا کردار روشن، ان کے چہرے روشن، ان کی سوچ روشن ہوگئی۔

ہجرتِ صحابہ کرامؓ

صحابہؓ نے بے انتہا قربانیاں دیں۔ پھر تیرہ سال بعد حکم ہوا، گھر چھوڑ دو۔ کمال ہے، کیسا بے نیاز ہے۔ اے اللہ! تُو قادرؒ ہے، تیرا نام لینے پر کفار خفا ہیں، مار پیٹ رہے ہیں، کتنوں کو شہید کر دیا۔ آگ سے جلاتے، گرم لوہے سے داغتے، گرم ریت پر لٹاتے، مظالم کرتے کرتے تیرہ برس بیت گئے، جو تیرہ برس بعد دستگیری فرمائی تو فرمایا تم شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ واہ بے نیاز! تیرے رنگ ہیں۔ وہ کہہ تو سکتے تھے کہ یا اللہ! کیا تُو کمزور ہے کہ ہم بھاگ جائیں، تُو قادر ہے ان کو بھگا۔ فرمایا نہیں! تم شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ انہوں نے فرمایا۔ یا اللہ! تُو راضی ہے، تو ہمیں کسی سے کیا لینا دینا۔ گھر بھی چھوڑ دیئے، جائیدادیں، جاگیریں چھوڑ دیں حتیٰ کہ مکہ مکرمہ فتح ہوگیا، کسی مہاجر نے اپنی جاگیر واپس لی نہ اپنی جائیداد نہ گھر بلکہ

مکہ مکرمہ میں قصر نمازیں پڑھتے تھے کہ ہم مسافر ہیں، ہم نے تو اللہ کے نام پر یہ جگہ چھوڑ دی تھی اب ہمارا اس سے کیا لینا دینا۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے جو اللہ کریم نے نبی ﷺ کی رفاقت کیلئے پیدا فرمائے تھے۔ ان میں سوال کرنے یا بہانے بنانے والی بات نہیں تھی۔ وہ سنتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔

سارے کا سارا اِسلام

بدر میں نظامِ دنیا کے اعتبار سے مسلمانوں کی فتح کے اسباب نظر نہ آتے تھے لیکن آپ ﷺ نے مدینہ منورہ سے بدر تک کا سفر فرمایا۔ تین سو تیرہ (313) وہ جانثار تھے جن میں کچھ عمر رسیدہ، کچھ نوعمر اور کچھ بچے تھے۔ وسائل و اسباب کا یہ عالم تھا کہ بعض صحابہ کرامؓ کے پاس صرف دو چادریں تھیں جو انہوں نے ستر چھپانے کیلئے باندھ رکھی تھیں۔ یہی حال اسلحہ، خوراک و راشن کا تھا لیکن حضورِ اکرم ﷺ مدینہ منورہ سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر تک کا سفر کر کے تشریف لے گئے۔ صحابہ کرامؓ کی باقاعدہ صف بندی فرمائی، سالار متعین فرمائے، مہاجرین و انصار کے علیحدہ علیحدہ جھنڈے مقرر فرمائے، اپنا علم مبارک اپنی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دوپٹے سے بنایا۔ آپ ﷺ نے اس کی حرمت کی اہمیت کے پیشِ نظر علم بنایا۔ یہ وہ تمام ظاہری اسباب تھے جو آپ ﷺ نے اختیار فرمائے اور پھر عریشِ بدر میں دعا فرمائی۔ اے اللہ! میں آج سارے کا سارا اِسلام لے آیا ہوں، اگر آج یہ لوگ کھیت رہے تو قیامت تک کوئی پیشانی تیرے سجدوں سے آشنا نہ ہو سکے گی۔ یہ لوگ کون تھے؟ مٹھی بھر کمزور و ضعیف، بچے اور چند جوان، وسائل کے لحاظ سے بے مایہ لیکن جذبہ دُل ایسا تھا کہ گوشت پوست کے انسان، جذبہ ایمان میں ڈھل گئے۔ وہ وجود نہ رہے، نظریہ بن گئے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں بڑے مخلص، نیک بندے لایا ہوں، بلکہ فرمایا، اے اللہ! میں سارے کا سارا اسلام لے آیا ہوں۔ یعنی ایک

فزیکل سٹرکچر (مادی وجود) کا ایک نظریے میں تبدیل ہو جانا۔ یہ تھے صحابہ کرامؓ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، جن کا یقینِ قلبی اس درجے کامل تھا کہ ان کی ذات باقی نہ رہی، وہ مجسم اسلام بن گئے۔ اب جو حضور ﷺ نے فرمایا وہ برحق ہے۔ آپ ﷺ اصدق الصادقین ہیں، آپ ﷺ کا ایک ایک لفظ سچ اور صرف سچ ہے تو حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ یہ 313 صرف افراد نہیں ہیں، یہ سارے کے سارے سرتاپا اسلام بن گئے ہیں یعنی فرد کا نظریے میں ڈھل جانا۔ اسے کہتے ہیں۔ ''تزکیہ''

وصالِ نبوی ﷺ اور صحابہ کرامؓ

صحبت کا کمال اور اثر یہ ہوا کہ محبت کی مثال قائم ہوگئی۔ وصالِ نبوی ﷺ کا صحابہؓ پر کیا اثر ہوا، صحابہ کرامؓ کے سوا کون سمجھ سکتا تھا؟ کسی کا بوڑھا باپ مر جائے تو اس کے دکھ کا اندازہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا اور جب بوڑھے باپ کا جوان بیٹا بچھڑ جائے تو کون ہے جو اس کے دل کی کیفیت جان سکتے؟ دنیا میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا وصال جس کیفیت میں صحابہ کرامؓ کو مبتلا کر گیا وہ میری اور آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ نہ ہم میں وہ محبت ہے، نہ ہم نے وہ محبت کی۔ نہ ہمیں وصالِ محبوب کی وہ لذت نصیب ہوئی، نہ ہم اس جدائی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ فرماتے کہ ہم سمجھتے تھے کہ مدینہ منورہ میں شاید رات ہوگئی ہے، ہمیں روشنی بھی نظر نہیں آتی تھی حالانکہ سورج روشن تھا لیکن ہمارا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ رات ہوگئی ہے ہمیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

اک نگاہ نے صحابیؓ بنا دیا

صاحبِ 'جذب القلوب الی دیار محبوب' لکھتے ہیں کہ میں جب حج کیلئے حاضر ہوا تو مکہ مکرمہ کے نواح میں، گلیوں میں نقوشِ کفِ پائے رسول اللہ ﷺ تلاش کیا کرتا تھا کیونکہ وہ صاحبِ کشف تھے، صاحبِ حال تھے۔ فرماتے ہیں، زمین کے جس خطے پر، جس ٹکڑے

پر حضور ﷺ کا تلوا مبارک لگا ہے، وہ مجھے زمین میں اس طرح نظر آتا تھا جس طرح آسمان پر چاند دکھائی دیتا ہے۔ تو میں انہی کی تلاش میں پھرا کرتا تھا۔ پھر جب میں مدینہ منورہ کو چلا تو راستے میں حضور ﷺ کے نقوشِ کفِ پا کو تلاش کرتا چلا جاتا تھا کہ کہاں حضور ﷺ نے قیام فرمایا، کہاں سواری سے نزولِ اقدام فرمایا، کس زمین پر آپ ﷺ نے قدم مبارک رکھا۔

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب میں نے صحراؤں کو دیکھا، بیابانوں کو دیکھا تو ریت کے ہر ذرے سے نور پھوٹتا تھا۔ فرماتے ہیں میں نے دعا کی کہ بارالٰہا! یہ صحرا، بیاباں کیونکر منور ہیں؟ تو وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کریم کی طرف سے یہ بات سمجھائی گئی کہ جہاں تک حضور ﷺ کی نگاہ پہنچی ہے، ہر ذرہ منور ہو گیا۔ تو جس نگاہِ پاک ﷺ نے صحراؤں، بیابانوں کو روشنی عطا کر دی، اس سے قلوب کس حد تک منور ہوئے ہوں گے۔ جب کوئی ایمان لا کر آپ ﷺ کے سامنے پہنچتا تھا تو ایک نگاہ میں صحابیؓ بن جاتا تھا۔ مرد آیا صحابیؓ، عورت آئی صحابیہؓ، بچہ پہنچا صحابیؓ، بوڑھا پہنچا صحابیؓ، جو خدمت عالی میں پہنچا ایمان لاتے ہی بیک نگاہ جتنے اوصافِ جمیلہ قرآن نے بیان فرمائے، ان کا حامل مسلمان بن جاتا۔ انبیاءؑ کے بعد کوئی غیر صحابی اُن کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔

کمالِ صحابیت ہی تھا کہ ایک دفعہ انہوں نے توحیدِ باری کا اقرار کیا تو دنیائے کفر کی ساری طاقتیں سر پھوڑ کر رہ گئیں، کوئی ان کی زبان سے پھر یہ بات نہ نکلوا سکا کہ ہم اس (توحیدِ باری) کا اقرار نہیں کرتے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ان کی پسند ختم ہوگئی تھی۔ آپ اندازہ کریں کتنا مشکل ہے کہ حضور ﷺ نے کہہ دیا تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا۔ دن نہیں، ہفتے نہیں، مہینے نہیں، تیرہ سال اذیتیں برداشت کرتے رہے اور کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ اگر لڑتے نہ تھے تو یہ تو کہہ سکتے تھے کہ آپ ﷺ ان کافروں کے حق میں بددعا کر دیجیے، اتنا نہیں کرتے تو ہماری حفاظت کی دعا ہی کر دیجیے۔ آپ پوری سیرت میں

یہ بات تلاش نہیں کر سکتے یعنی انہیں مار کھانے پر بھی لطف آتا تھا کہ یہی حق ہے ہمارا، ہمیں حضور ﷺ نے مار کھانے اور برداشت کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ اب بظاہر تو یہ چاہیے تھا کہ جو تیرہ برس مار کھاتے رہے انہیں اللہ کریم مکہ پر غلبہ دے دیتا لیکن ربِ کریم بے نیاز ہے، اس نے حکم دے دیا، میرے حبیب ﷺ! انہیں کہہ دو، گھر بار چھوڑ دو اور حضور ﷺ نے جب ارشاد فرمایا تو اہلِ مکہ ہجرت سے روکتے تھے اور وہ چھپ چھپ کر ہجرت کرتے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ مکہ کی اکثریت نے حضور ﷺ کی قدر نہ کی۔ جبکہ مدینہ منورہ والے مدینہ سے چل کر وہاں پہنچے کہ حضور ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ تو یہ رب کی تقسیم تھی کہ حضور ﷺ کی عظمت کو نہ پہنچانا تو مکہ کی زمین آج تک گنبدِ خضریٰ کو ترستی ہے۔ جہاں بیت اللہ کھڑا ہے، اگر بیت اللہ کے ساتھ وہاں گنبدِ خضریٰ بھی ہوتا تو کیا ہوتا! اب نہ صرف مکہ مکرمہ بلکہ بیت اللہ بھی گنبدِ خضریٰ کی طرف نگاہیں اٹھائے دیکھتا ہے۔

مشاجراتِ صحابہ کرامؓ

مشاجرہ، شجر سے نکلا ہے۔ جس طرح درخت کی شاخیں ایک دوسرے میں الجھ جاتی ہیں، اسے مشاجرہ کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ صحابہؓ کا اختلاف میری امت کیلئے رحمت ہے۔ جس طرح شجر کی ٹہنیاں الجھ جاتی ہیں تو وہ سایہ دار ہو جاتا ہے، اس کا سایہ گھنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صحابہؓ کا اگر کسی مسئلے پر اختلاف ہے تو فرمایا، سارے حق پر ہیں جس کے پیچھے چل پڑو گے تمہیں مجھ تک لے آئے گا الصحابی کالنجوم ایّھم اقتدیتم اھتدیتم میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں تم جس کسی کا دامن تھام لو گے، ہدایت پا جاؤ گے۔ آج بھی ہمارے لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کا نمونہ مہاجرین وانصار صحابہ کرامؓ ہیں۔ آج بھی مسلمانی کا معیار وہی لوگ ہیں، آج بھی کردار کی سند وہی

لوگ ہیں اور قیامت تک وہی رہیں گے۔

صحابہ کرامؓ پر اعتراض

آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ جتنے باطل فرقے وجود میں آئے سب نے صحابہ کرامؓ پر تنقید کی۔ عبداللہ ابن سباء سے لے کر قادیانی ملعون وفتنہ پرویز تک، سب نے اپنی توپوں کا رخ صحابہ کرامؓ کی طرف موڑا۔ سب نے صحابہ کرامؓ پر اعتراض کیے۔ کیوں؟ اس لیے کہ عظمتِ صحابہؓ مجروح ہو جائے تو اسلام مجروح ہو جاتا ہے، اسلام ثابت نہیں ہوتا۔ صحابہ کرامؓ کو درمیان سے نکال دو تو آپ ثابت نہیں کر سکتے کہ محمد رسول اللہ ﷺ، اللہ کے نبی ہیں۔ آج بھی انہی کے مقدس وجود اسلام کا قلعہ ہیں، اس لیے حملہ آور انہی کی عظمت پر حملہ کرتا ہے۔

مجھے، آپ کو کون پوچھتا ہے، ہم رہیں نہ رہیں کیا فرق پڑے گا۔ ہمیں کوئی نیک کہے یا بدکار کہہ دے، اسلام کا کیا بگڑے گا، کچھ بھی نہیں۔ لیکن صحابہ کرامؓ کی صداقت مجروح ہو جائے تو سارا اسلام مجروح ہو جاتا ہے۔ قرآن کو قرآن ثابت کرنا ممکن نہیں رہتا، اعلانِ نبوت اور نورِ نبوت کا ثبوت ممکن نہیں رہتا۔ صحابہ کرامؓ کے علاوہ تو پھر مشرکین اور کفار رہ جاتے ہیں تو کیا مشرک اور کفار شہادت دیں گے؟

بعض بدبخت لوگ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر براہِ راست تنقید کرنا ممکن نہیں سمجھتے لیکن بات گھما پھرا کر حضور ﷺ پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ تھوڑی سی بات گھما کر کر دیتے ہیں لیکن جب صحابہ کرامؓ کی باری آتی ہے تو انہیں نعوذ باللہ اپنے سے بھی کمتر انسان سمجھ کر اُس پر بحث کرتے ہیں کہ یہاں انہوں نے یہ غلطی کی، یہاں یہ غلط کیا، یہاں وہ غلط کیا۔ کیسے عجیب لوگ ہیں! ہم کتنے بھی بڑے بنیں، بزرگ بنیں، ہمارا حساب روزِ محشر ہوگا، ہمارے پاس کوئی سند نہیں بخشش کی لیکن صحابہ کرامؓ جو ہیں، اُن کو اللہ نے بخشش

کی سند دے دی ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ (التوبہ:100) تو کہتے ہیں بات ٹھیک ہے لیکن صحابہؓ معصوم تو نہیں ہیں بات تو ہو سکتی ہے۔ اگر کہہ دیا جائے کہ اچھا جی! صحابہؓ پر بات ہو سکتی ہے تو اگر آپ پر بات کی جائے تو! پھر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں یعنی ان پر اگر اعتراض کر دیا جائے تو بھڑک اٹھتے ہیں۔

وہ لوگ ایمان کے اس درجے پر تھے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو بدر میں موجود تھے، وہ آج کے بعد جو جی چاہے کریں، جنت ان کیلئے واجب ہو گئی۔ شارحین حدیث، اس حدیث کی شرح میں یہ تفصیل بتاتے ہیں کہ آپ ﷺ کے ارشادِ پاک میں، انہیں جنتی ہونے کی نوید بغیر کسی شرط اور قید کے دی گئی ہے، گویا کچھ بھی کریں سے مراد اچھائی و برائی دونوں ہو سکتے ہیں لیکن اس سے مرادِ نبوی ﷺ یہ ہے کہ جسے اللہ جنتی بنا دیتا ہے، اس کی آرزوئیں اور تمنائیں بھی اہلِ جنت کی سی ہو جاتی ہیں، اس کا کردار بھی اہلِ جنت جیسا ہو جاتا ہے، اس کا عمل بھی وہی ہو جاتا ہے جو اہلِ جنت کو سزاوار ہے۔ آج کے بزعمِ خود علماء کہلانے والوں کا یہ حال ہے کہ اپنی تحریروں و تقریروں میں وہ اپنے آپ کو جج بنا کر صحابہ کرامؓ کو جواب طلبی کیلئے اپنی بارگاہ میں کھڑا کر کے ان پر اعتراض کرتے ہیں اور اپنی طرف سے جواب طلبی کرتے ہیں۔

کفر سے بیزاری کا جذبہ

مسلمان جاہل ہو سکتا ہے، دھوکہ باز مولویوں، پیروں کے ہاتھوں دھوکہ کھا کر شرکیہ امور اپنا لیتا ہے، شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے، جاہلیت کے باعث نہیں جانتا کہ یہ کفر ہے اور جب اسے بتا دیا جائے کہ یہ کفر ہے تو فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ بندہ کتنا گناہگار ہو، کیسا بھی ہو، گناہ کرتا رہے گا، اگر اسے بتا دیا جائے کہ یہ کفر ہے یا شرک ہے تو فوراً ہٹ جاتا ہے اور کہتا ہے میں کفر نہیں کروں گا یعنی کفر کو اللہ نے مومن کے لئے ایسا کر دیا گویا ہمیشہ کیلئے

مٹ گیا، ختم ہو گیا، مومن کیلئے ہمیشہ کیلئے ناقابلِ قبول ہو گیا۔ تو آج کفر سے بیزاری کا جو جذبہ ہمارے دلوں میں ہے اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ ہمارے پاس جو اسلام ہے اس کی قیمت اُن 313 نفوسِ قدسیہؓ نے چکائی اس لئے کہ وہ 313 نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق سارے کا سارا اسلام تھے۔ ان کی پُرخلوص قربانیوں نے رہتی دنیا تک کیلئے وہ دائمی اثرات چھوڑے ہیں کہ ان کی بدولت تا قیامت مسلمان کفر سے بیزار رہیں گے۔

اس بات سے کوئی کسی مغالطے میں نہ پڑے کہ کفار تو مسلمانوں کے قتل کے درپے ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا رہے ہیں لیکن بندے مارنا کامیابی نہیں ہے اور نہ ہی بندے مارنا فتح کی نشانی ہے بلکہ فتح یہ ہے کہ فاتح اپنا فلسفہ رائج کر لے اور پرانے نشانات مٹا دے تو کیا معرکہ بدر سے لے کر آج تک کفر کی بڑی سے بڑی طاقت ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکی ہے؟

فرش سے عرش تک

صحابہ کرامؓ بڑی بلند پایہ ہستیاں تھیں۔ انہوں نے گھر بار، کاروبار سب اللہ کیلئے چھوڑ کر ہجرتیں کیں لیکن اللہ بھی بڑا قدردان ہے۔ جنہوں نے مٹی کے گھروندے چھوڑے تھے، انہیں روئے زمین کی سلطنتیں عطا کر دیں لیکن کس درجے کی معیتِ رسالت انہیں حاصل تھی کہ جب انہیں ہجرت کا حکم ہوا تو وہ تہی دست، تہی دامن مسافر ہو کر نکل پڑے، اس وقت بھی دل کی کیفیت وہی تھی، اللہ پر یقین و ایمان بے مثال تھا اور جب انہیں دنیا کی ریاست مل گئی تب بھی دل کی دنیا ویسے ہی اللہ کے نام سے آباد رہی۔

برکاتِ نبوی ﷺ کے باعث صحابہ کرامؓ کی جلدیں اور ظاہری شکل و صورت تو نہیں بدلی لیکن ان کا کردار یکسر بدل گیا۔ لوٹ کر کھانے والے مہمان کو کھانا کھلانے کیلئے خود بھوکے رہنے کو ترجیح دینے لگ گئے۔ پہلے شرک میں مبتلا تھے جب صحبتِ نبوی ﷺ میں

آئے تو روئے زمین سے شرک کی بیخ کنی کرنے کیلئے جانیں نچھاور کرنے لگے۔ رسومات کے اسیر تھے، بارگاہِ رسالت ﷺ میں آئے تو ہر رواج کو مٹا کر سنتِ نبوی ﷺ کو رائج کرنے والے بن گئے۔ جس سرزمین پر صرف طاقت کی حکومت تھی، ظلم کا دور دورہ تھا، بارگاہِ رسالت پناہی ﷺ میں آئے تو روئے زمین پر انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کروانے کیلئے مجاہد بن کر پھیل گئے۔ بندوں کو جھوٹے خداؤں کی غلامی سے آزاد کروا کے، ایک اللہ کی محبت سے سرشار کرنا ان کا مقصدِ حیات بن گیا۔

وہ تو خود طاقت کے پجاری تھے، ان کے دل میں اتنا درد کیسے آ گیا کہ انہیں دوسروں کو آزاد کروانے کی فکر لاحق ہوگئی؟ یہ کردار کیوں تبدیل ہوا، کیسے تبدیل ہوا؟ یہ تھیں برکاتِ نبوت و رسالت ﷺ۔

مہاجرینؓ و انصارؓ اور ان کا اتباع

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (التوبہ:100) اور سبقت لے جانے والے، اولیت رکھنے والے (ایمان لانے میں) مہاجرین اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے خلوص کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوئے اور وہ اللہ سے خوش ہوئے۔

امام شافعیؒ بیت اللہ شریف میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے ان کے سامنے حضرت عثمان غنی ذوالنورینؓ پر اعتراضات پیش کیے۔ آپ نے پوچھا! تم مہاجرین میں سے ہو۔ اس نے کہا حضرت! مہاجرین کا زمانہ تو گزر گیا، میں تو آج کا آدمی ہوں۔ فرمایا! پھر انصار میں سے ہو۔ حضرت! مہاجرین و انصار کا تو ایک ہی زمانہ ہے وہ عہد تو گیا۔ فرمایا! پھر مسلمانوں کے تین گروہ ہیں۔ مہاجرین، انصار اور تیسرا وہ جو اُن کا خلوصِ دل سے اتباع کرتا ہے۔ تم مہاجر بھی نہیں، انصار بھی نہیں اور تمہیں ان پر اعتراض ہے، اس کا مطلب ہے تم ان

کا اتباع کرنے والوں میں سے بھی نہیں، تو تم مسلمان ہی نہیں ہو، میں تمہارے سوالوں کا جواب کیوں دیتا پھروں؟

والذین اتبعوھم باحسان جس نے خلوصِ دل سے، صدقِ دل سے، مہاجرین اور انصار کی پیروی کی رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ اللہ اس سے راضی ہے اور اسے اتنا دے گا کہ وہ بھی اللہ سے راضی ہو جائے گا۔ گویا اللہ کریم ان تین گروہوں سے راضی ہے، مہاجرین سے، انصار سے اور جس نے خلوص سے ان کی پیروی کی اور ان کا اتباع کیا اور فرمایا کہ مہاجرین و انصار کے اتباع کے بغیر تو اللہ کی رضا نصیب ہی نہیں ہو سکتی۔

جذبات پر حکمرانی کرنے والے

ساری انسانیت دو جذبوں سے بڑی شدت کے ساتھ متاثر ہوتی ہے یعنی قوت غضبیہ اور قوتِ شہوانیہ۔ کہیں جوشِ غضب میں کوئی برس رہا ہے اور کہیں لالچ سے مغلوب ہو کر یا اغراض کی تکمیل کیلئے کوئی سر توڑ کوشش کر رہا ہے، مگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے، بلکہ جذبات پر حکومت کرتے ہیں۔ ان کا غضب کفار اور کفر کیلئے ہے اور مومن کیلئے وہ نسیمِ سحر کا جھونکا بن جاتے ہیں۔ بیک وقت دونوں طرح کے جذبات ان کے قابو میں ہیں۔ دنیا کے دوسرے سرے تک کفر کا تعاقب انہی لوگوں نے کیا مگر جیسے ہی کسی کافر کو بھی کلمۂ حق نصیب ہوا، بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ کسی کافر پر تلوار بکف اٹھا ہوا ہاتھ، اس کے کلمہ پڑھتے ہی تلوار پھینک کر اسے سینے سے بھینچنے لگا۔ ان کا جوشِ غضب صرف کفر کیلئے ہے ورنہ بحیثیتِ انسان کافر بھی ان کے کرم سے محروم نہیں رہا۔ اس کے انسانی حقوق کی حفاظت کرنا بھی ان ہی کا شیوہ تھا۔

مخلوقات / تخلیقاتِ الٰہی

مخلوق کی اقسام

''احکام المرجان فی احکام جان'' جنات پر ایک بہت معلومات افزا کتاب ہے جس میں قرآن وحدیث کے حوالے دے کر جنوں کا وجود، ان کی تخلیق، ان کا رہن سہن، ان کا کھانا پینا، انکی مناکحت، ان کا توالد وتناسل اور ان کا حساب کتاب، اس سب پہ بحث کی گئی ہے۔ وہ ہے ہی ساری جنات کے بارے میں کہ ان کی تخلیق کس طرح سے ہے، پھر وہ زندگی کس طرح گزارتے ہیں، کھاتے پیتے کیا ہیں؟ کاروبار کیسے کرتے ہیں، رہتے کہاں ہیں، جینا مرنا کیسا ہے، عمریں ان کی کتنی ہوتی ہیں؟ وغیرہ۔

مکلف مخلوق چار قسم کی ہے۔ فرشتے، شیاطین، جن اور انسان۔ تو اس بارے میں انہوں نے حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ نے مخلوق پیدا فرمائی تو اس ساری مخلوق کے نو حصے ملائکہ اور دسواں حصہ باقی مخلوق تھی۔ اس کے پھر اللہ کریم نے دس حصے بنائے جس میں نو حصے شیاطین تھے اور دسواں حصہ جن اور انسان تھے۔ اس کے پھر دس حصے فرمائے ان میں نو حصے جنات ہیں اور دسواں حصہ انسان ہیں اس مخلوق کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔ آپ ﷺ کے ارشادِ گرامی کا مفہوم ہے کہ اگر زمین پر انسانوں کی آبادی ایک حصہ ہے تو جنات کی آبادی نو گنا ہے یعنی اگر 100 انسان ہیں تو 900 جنات ہیں اور جنوں اور انسانوں کی کل آبادی سے 9 گنا آبادی شیاطین کی ہے۔ اس حدیث مبارکہ کے مفہوم کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر چھ ارب انسان ہیں تو چون ارب جن ہوں گے پھر اس کو 9 سے ضرب دیں تو اتنی آبادی ابلیس کی اولاد کی ہوگی۔ اس کا مطلب ہے جہاں ایک انسان ہے وہاں 9 کے قریب جنات ہیں اور 90 یا سو کے قریب

شیاطین ہیں۔

اول: ملائکہ:

یہ نوری مخلوق ہے۔ ان کا کوئی نسب ہے نہ ہی انہیں بھوک، پیاس، خواہش، ضرورت، تھکاوٹ، آرام جیسے عارضے لاحق ہیں۔ ان میں انکار کا مادہ بھی نہیں۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (التحریم:6) جو حکم ملتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں۔ یہ سراپا نیکی ہیں، کبھی نافرمانی نہیں کرتے۔ ان کی غذا بس ذکرِ الٰہی ہے۔

دوم: شیاطین:

ابلیس اگرچہ جنات میں سے ہے، تخلیقی اعتبار سے ایک جن ہی ہے لیکن اپنی حیثیت میں بالکل ایک الگ نوع اور الگ خلق قرار پایا اس لئے کہ اس نے جنات میں سے ہوتے ہوئے اتنی عبادت، اتنی محنت کی کہ فرشتوں میں اسے شمار کیا گیا اور اسے آسمانوں میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ انکار کے بعد، مردود اور ملعون ہونے کے بعد اس سے نیکی کی توفیق سلب ہوگئی ہے، اب اسے ہمیشہ برائی کرنا ہے، وہ نیکی کر ہی نہیں سکتا۔ جس طرح ملائکہ غلطی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح شیاطین درست کام کر ہی نہیں سکتے۔ ابلیس کی اولاد برائی اور غضب کی علامت ہیں، مردود ہیں اور انہوں نے ہمیشہ برائی ہی کرنی ہے الا ماشاء اللہ ان میں سے بہت ہی کم کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ ایک نہایت ضعیف العمر شخص حضورِ اکرم ﷺ سے ملا اور اُس نے حضرت موسیٰ کا سلام پہنچایا۔ آپ ﷺ کے استفسار پر اس نے اپنا نام ابن ہیثم بتایا اور یہ کہ اس کے باپ کا نام جیم اور اس کے دادا کا نام لاقیس ہے جو ابلیس کا بیٹا ہے اور یہ بھی عرض کیا کہ وہ ابلیس کی چوتھی پشت سے ہے۔ 'حیات الحیوان' میں علامہ نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے پوچھا تمہاری عمر کتنی ہے؟ اس نے

عرض کیا، جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا تو اس وقت میں بچہ تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تم اُس زمانے سے اِس زمانے تک زندہ ہو؟ اس نے عرض کیا، ہماری عمریں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ اس نے عرض کیا کہ وہ حضرت موسیٰ کی خدمت میں حاضر تھا تو آپؑ نے فرمایا تھا کہ اگر تم حضور ﷺ کا زمانہ پاؤ تو انہیں میرا اسلام پیش کرنا۔ تو وہ تب سے مسلمان چلا آ رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ تو شیاطین میں بھی کسی کسی کو ایمان نصیب ہونے کے باعث یہ استثنائی صورت ملتی ہے لیکن پوری تاریخ میں شیاطین کے ایمان لانے کے واقعات گنتی کے تین چار ہی ملتے ہیں۔

ابلیس کا تعلق اللہ سے کیوں ٹوٹا؟

شیطان نے بھی مجاہدہ کیا تھا، وہ جن تھا اور جب زمین پر جنات آباد تھے تو اس نے اتنی محنت کی، اتنی عبادت کی، اتنا مجاہدہ کیا کہ جن ہو کر فرشتوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ اس کے مجاہدے سے اسے ترقی ملتی رہی۔ پھر وہ وقت آیا جب حاصلِ عبادت سامنے آنا تھا یعنی جب اللہ کی فرمانبرداری کرنے کا وقت آیا، اسے سجدے کا حکم ہوا اس نے تکبر کیا اور سجدے سے انکار کر دیا اور اللہ کریم نے اسے راندۂ درگاہ قرار دے دیا۔ شاعر نے اس کے تکبر کے بارے کہا تھا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
ہزاروں بار گر سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

قرآن حکیم میں اس کا تذکرہ یوں آیا ہے اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ:32)۔ اس کا ترجمہ یوں لکھا جاتا ہے کہ 'وہ کافروں میں سے ہو گیا حالانکہ لفظ ''كَانَ'' ماضی کے صیغے پر آتا ہے اور اس کا ترجمہ بنتا ہے۔ ''تھا ہی کافروں میں سے'' اس کے بارے میں اللہ کریم جانتے تھے۔ اس میں یکدم خبث پیدا نہیں ہوا بلکہ جب

سے یہ عبادتیں کر رہا تھا، تب سے اس کے دل میں یہ بات بھی تھی کہ وہ اب بڑا اور بزرگ بنتا جا رہا ہے لیکن اس کا پول اس واقعے سے کھل گیا۔ جس طرح کسی بھی شخص کو اس لئے پھانسی نہیں دی جاتی کہ آنے والے زمانے میں وہ قاتل ہو گا بلکہ جب تک وہ شخص قتل نہیں کر لیتا اور اس کا قتل ثابت نہیں ہو جاتا، تب تک اسے کوئی سزا نہیں دی جاتی۔ ایسے ہی اللہ کریم جو عالم الغیب ہیں محض علمِ الٰہی پر کسی کو سزا نہیں دیتے جیسے ابلیس کی عبادات پر نتائج مرتب ہوتے رہے اور وہ ترقی کرتا رہا لیکن اس کے دل کی تہہ میں خبثِ باطن دبا رہا اور اس کا خبثِ باطن ظاہر ہو گیا تو اس کے اثرات بھی مرتب ہو گئے۔

شیطان سے دوستی

شیطان سے دوستی کیا ہے؟ مسلسل گناہ کرنا اور کبھی توبہ نہ کرنا۔ جب اللہ سے تعلق ختم ہو جاتا ہے تو لامحالہ ابلیس سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر چھت پر ایک اینٹینا لگا ہوا ہے، اس نے وہ اشارات وصول کرنے ہیں۔ اگر وہ ایک فریکوئینسی سے ہٹ گیا تو خود بخود دوسری فریکوئینسی پر آ جائے گا، اسی طرح ہر آدمی کے دل میں اینٹینا لگا ہوا ہے، دل وصول کرنے کا ایک مرکز ہے، اب اگر اللہ جل شانہ کے ساتھ اس کا رابطہ ہے تو اس کی فریکوئینسی الگ ہے، وہ رابطہ ٹوٹ جائے تو پھر ایک اور فریکوئینسی آ جائے گی، جس سے شیطان کے ساتھ اس کا رابطہ ہو جائے گا اور قرآن کریم میں ہے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ (الانعام:121) شیطان اپنے دوستوں سے باتیں کرتے ہیں، دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں۔ شیاطین انسانوں کو اپنا تابع بنا لیتے ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ میں نے جنوں کو اپنے قابو کر لیا۔

ہمزاد:

حضور اکرم ﷺ کے ارشادِ پاک کا مفہوم ہے کہ ہر پیدا ہونے والے کے ساتھ

ایک شیطان بھی پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اسے قرینِ شیطان کا نام دیا گیا ہے۔ وہ شیطان ساری زندگی اس انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ جب رسولِ اکرم ﷺ نے قرینِ شیطان یا ہمزاد کے متعلق صحابہ کرامؓ کو بتایا تو یہ سوال بھی کیا گیا کہ کیا آپ ﷺ کے ساتھ بھی شیطان پیدا ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ''ہاں میرے ساتھ بھی ہے لیکن جو میرا قرین ہے وہ مجھ پر ایمان لے آیا ہے اور یہ برکت ہے نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی کی۔ انسان کے ساتھ پیدا ہونے والے شیطان، قرین کو ہمزاد اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ شیاطین کی عمریں چونکہ بہت طویل ہوتی ہیں اس لیے انسان کے مر جانے کے بعد اس کے قرین کا ٹھکانہ اس کا مدفن یا اس کے جلائے جانے کی جگہ یا پھر جہاں اس کے اجزائے بدن ہوں، وہیں ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ وہیں بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی بول چال، لباس، شکل وصورت، حلیہ اور آواز ہو بہو اُس انسان جیسی ہوتی ہے۔ زندگی بھر ہمہ وقت اُس انسان کے ساتھ رہنے کے باعث وہ اس شخص کے ہر عمل، ارادے اور تمام احساسات و خیالات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

عامل حضرات قرینِ شیطان کو ہمزاد کے علاوہ 'حاضرات' بھی کہتے ہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''عامل نے فلاں کی روح کو بلایا''، تو یاد رہے کہ وہ روح ہرگز نہیں ہوتی، یہی ہمزاد ہوتے ہیں کیونکہ حلیہ و آواز میں اس شخص سے ہو بہو ملتے ہیں اور اس کی ہر بات سے آگاہ بھی ہوتے ہیں۔ بات بھی اس شخص کے انداز میں کرتے ہیں اس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کی روح آ گئی۔ مغرب میں تو 'حاضرات' کو بلانے کا کام باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ عامل مشرق کے ہوں یا مغرب کے، آتا بہر حال وہی قرینِ شیطان ہی ہے جسے روح سمجھ لیا جاتا ہے جبکہ روح تو اللہ کے حکم سے عالم برزخ میں اللہ کی نعمتوں میں خوش ہوتی ہے یا عذابِ الٰہی میں گرفتار۔ روح اگر جنتی ہے تو کوئی عامل اسے جنت سے

کیونکر کھینچ لائے گا۔ اور اگر جہنمی ہے تو اُسے جہنم سے کون نکلنے دے گا۔ ارواح کو برزخ سے واپس دارِ دنیا میں بلانا ناممکن ہے۔ اس لیے ارواح کی حاضری کا کوئی concept نہیں۔ ویسے بھی عام فہم سی بات ہے کہ اگر جنتیوں کو عملیات کے ذریعے دنیا میں بلا لیا جائے تو پھر جنت جانے کا فائدہ؟ جنت ایسی جگہ نہیں کہ وہاں میری، آپ کی رسائی ہو کہ ہر کس و ناکس جنتی کو کان سے پکڑ کر دنیا میں واپس لے آئے۔ جنت میں داخلہ ''حکمِ ربی'' کے سوا ناممکن ہے۔ اسی طرح جو کوئی بھی دوزخ میں ہے تو وہ حوالاتی ہے۔ دنیا میں حوالاتی کو حوالات سے نہیں نکالا جا سکتا۔ تو دوزخ والے حوالاتی کو اللہ کی حوالات (دوزخ) سے کون نکلنے دے گا۔ جسے اللہ نے گرفتار کر رکھا ہے اسے چھڑانے کی کس میں مجال ہے۔

عامل کی رسائی عالمِ برزخ میں سرے سے ہوتی ہی نہیں ہے اس لیے حاضرات، روحیں نہیں ہوتیں بلکہ یہی شیاطین ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو ان کا مشاہدہ ہو تو لباس اور حلیہ مرنے والے کا ہی ہوتا ہے۔ آپ عملیات والوں سے کہیں کہ برزخ کے حالات بتاؤ تو وہ نہیں بتا سکے گا۔ وہ صرف دنیا سے متعلق وہ باتیں بتا سکتا ہے جو آج کل مادی Instruments سے بھی دیکھی، سنی جا سکتی ہیں۔

سوئم: جنات:

جنات کے بارے میں قرآن کریم میں یہ خبر تو ملتی ہے کہ اگر وہ اللہ کی اطاعت کریں گے تو انہیں عذاب سے نجات مل جائے گی لیکن انہیں دوام نہیں اور ان کے لیے دخولِ جنت کی بشارت کہیں نہیں ملتی۔ جنوں کی زندگی عارضی ہے۔ جو کفر کرے گا وہ اپنے کفر کے درجے کے مطابق جہنم میں رہے گا۔ گناہ کی اور جرم کی سزا پائے گا لیکن جو نجات پائے گا، اسے عذاب سے بچا کر معدوم کر دیا جائے گا۔ جو جنات سزا یافتہ ہوں گے ان کی سزا بھی ایک دن ختم ہو جائے گی خواہ وہ لاکھوں صدیاں سزا پاتے رہیں، جب سزا ختم ہو جائے گی تو

وہ معدوم کر دیئے جائیں گے۔

جنوں کے ساتھ ضروریاتِ زندگی اور خواہشات ہیں۔ کھانا پینا، سونا جاگنا، بیوی بچے، مال و اولاد، گرمی سردی، دوست دشمن، زندگی کے اس سارے عمل سے جنات بھی گزرتے ہیں۔ جو جنات ایمان لاتے ہیں، اطاعت کرتے ہیں، نیکی کرتے ہیں تو انہیں بھی نورِ الٰہی سے اتنا حصہ ملتا ہے کہ وہ زندگی کو بھلائی سے گزار سکیں۔ لیکن جنات کی نیکی پر جو اجر قرآن حکیم میں ارشاد ہوا وہ ہے وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (الاحقاف:31) کہ تم اللہ کے عذابوں سے نجات پاؤ گے۔ جنات کیلئے جنت میں داخلے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ سورۃ رحمٰن میں جنت کی ایک مخلوق 'حور' کا ذکر آیا ہے اور حور کی تعریف کرتے ہوئے ایک وصف یا خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ حور کو کسی انسان یا جن نے چھوا تک نہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جنات جنت میں جائیں گے اور انہیں حوریں عطا کی جائیں گی۔ یہ آخرت کے اعتبار سے نہیں کہا گیا بلکہ اس سے مراد ہے کہ حور کو نہ کسی انسان نے ہی چھوا ہے نہ انہیں کسی جن نے مَس کیا ہے۔ جس طرح کہ دنیا میں جنات بعض خواتین کو مَس کر جاتے ہیں۔

جنات میں نبوت نہیں، کیوں

اس بات پر سب علماء کا اتفاق ہے کہ جنوں میں نبوت نہیں تھی، نبوت صرف انسانوں میں ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یوسف ابن یاسف نام کا ایک جن گزرا ہے، وہ نبی تھا لیکن جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے۔ جنات بنی آدم میں مبعوث رسولوں کے تابع ہیں۔ انہیں حضرت آدمؑ سے لے کر حضور ﷺ تک اپنے اپنے دور کے انبیاءؑ کی اطاعت کا حکم ہوا لیکن ان کے پاس معرفتِ باری کا وہ معیار نہیں جو نبوت کے طفیل نصیب ہوتا ہے۔ باقی برکاتِ دین اور لذاتِ دنیوی انہیں بھی نصیب ہوتی ہیں۔

جنات کی کثرت، اثرات اور علاج

جنات کیفیاتِ ولایت و برکاتِ نبوت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر یہی توجہ جو احدیت، معیت، اقربیت یا لطائف پر انسان کی تربیت کرتی ہے، یہ جن پر القاء کی جائے تو وہ جل جاتا ہے، برداشت نہیں کر سکتا۔ جبکہ اس طرح کے صاحبِ حال لوگ جہاں جہاں مدفون ہیں وہاں جنات میلوں دور سے گزرتے ہیں چونکہ ان میں وہ تجلیات برداشت کرنے کی استعداد نہیں ہے۔ یہ استعداد صرف انسان کو دی گئی جس میں اللہ نے نبوت رکھی۔ آدمؑ سے لے کر حضور نبی کریم ﷺ تک سارے نبی انسانوں میں آئے، اگر جنوں میں کوئی نبی ہوتا تو ان میں بھی یہ انوارات و تجلیات برداشت کرنے کی قوت ضرور ہوتی لیکن ان میں نہیں ہے۔

جنات باقی قطعاتِ زمین کی نسبت پہاڑوں پر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین پر انسانوں سے پہلے جن آباد تھے پھر انہیں پہاڑوں کی طرف ہنکا دیا گیا اور زمین خالی کرا لی گئی۔ اب بھی جو نہایت طاقتور جن ہیں، وہ پہاڑی علاقوں ہی میں رہتے ہیں۔ یہ میرے ذاتی مشاہدے کی چیز ہے۔ آزاد کشمیر، گلگت، چترال وغیرہ کے علاقوں میں دیکھا کہ جنات کثرت سے آباد ہیں اور انتہائی طاقتور بھی ہیں۔

کئی دفعہ یوں ہوتا ہے کہ جنات کسی انسان کو مَس کر جاتے ہیں جیسے عرفِ عام میں آسیب کی تکلیف کہا جاتا ہے۔ جنات کی یہ تکلیف اتنی اذیت ناک ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ میرے پاس جنات کے پریشان کردہ لوگ آتے ہیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ یہ آپ کی زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ موت سے بھیانک بیماری آپ کو لاحق ہے۔ اس کے علاج کے لیے آپ کچھ عرصہ دارالعرفان میں رہیے۔ یہاں کیا ہے؟..... نمازیں، ذکر اذکار، تلاوتِ قرآن، دینی مسائل سے آگہی کا بندوبست، یہ یہاں کے معمولات ہیں اور یہی آپ

کی تکلیف کا علاج بھی ہیں۔ آپ کی رہائش وخوراک مفت ہے۔ یہاں ان معمولات سے آسیب زدہ کو گذارا جاتا ہے۔ لطائف کرنے سے انوارات بدن میں آنا شروع ہو جائیں تو جنات چونکہ انوارات سے جل جاتے ہیں وہ انوارات کو برداشت نہیں کر پاتے۔ اس لیے خود ہی اس شخص کو چھوڑ جاتے ہیں۔

یہاں اولیاء اللہ اور عاملین کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ عامل عملیات کے ذریعے علاج کرتا ہے جبکہ ولیٔ کامل کی ایک توجہ جادو اور جنات کے اثر کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ میرے پاس جو لوگ جنات کی تکلیف لے کر آتے ہیں، میں نے تو کبھی اُن پر دم نہیں کیا نہ مجھے کبھی دم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بس میں جنات کو جھڑک دیتا ہوں، کہتا ہوں چلے جاؤ اور وہ اللہ کے حکم سے چلے جاتے ہیں۔ اللہ کریم کی توفیق سے یہ کام ہو جاتا ہے۔ ایک دو نہیں، ایسے سینکڑوں واقعات ہیں۔ ایسے لوگ بھی آئے جنہیں جنات ساری ساری رات جنگلوں میں بھگائے پھرتے تھے۔ پکڑ کر تنگ کرتے تھے۔ میرے ہتھے چڑھے تو میں اُن پر ناراض ہوا اور وہ اس شخص کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ناراض ہونا یا غصہ کرنا کون سا دم ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل ہے۔ اُس نے اپنے کرم سے اپنا نام لینے کی توفیق دے رکھی ہے۔

چہارم: انسان، قدرتِ باری کا شاہکار

مکلّف مخلوق میں سب سے اعلیٰ مخلوق انسان ہے، یہ بہت اعلیٰ مدارج تک جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جنات ہیں، عذاب سے بچ گئے تو فنا کر دیئے جائیں گے اور جو گناہگار ہوں گے وہ اپنے گناہ کے برابر عذاب بھگت کر فنا ہو جائیں گے۔ جانور بھی میدانِ جزاء میں جمع کیے جائیں گے اور جزا و سزا کے بعد پھر فنا کر دیئے جائیں گے۔

انسان اللہ کی قدرت کا شاہکار ہے، جس کے بارے اللہ کریم فرماتے ہیں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین:4) ہم نے انسان کی تخلیق بہت بہترین

انداز میں کی ہے۔ یہ اللہ کی ایسی عجیب مخلوق ہے کہ اس کا جسم مادی ہے اور روح علوی۔ مادے کی انتہائی کثیف شکل یعنی گلے سڑے کیچڑ سے انسانی بدن بنایا اور نہایت بلند مقام جو عالمِ خلق سے بلند ہے جسے عالمِ امر کہتے ہیں اس میں سے بدن میں انتہائی اعلیٰ لطیفہ رَبانی یعنی روح پھونکی یعنی ایک طرف مادے کی کثافت کی انتہا ہے اور دوسری طرف صفاتِ باری کی نفاست کی انتہا ہے۔ یعنی انسان کا وجود تو عالمِ خلق سے ہے لیکن روح عالمِ امر سے ہے۔ انسانی وجود، آگ، ہوا، مٹی اور پانی سے مل کر بنا ہے۔ ان مادی اجزاء کے باہم ملنے سے نفسِ انسانی بنا ہے، اسے روحِ حیوانی یا نفس کہتے ہیں جبکہ روح اس مادی وجود میں عالمِ امر سے آتی ہے۔ یہ اس کی قدرت ہے کہ اس کے بدن کو کثیف ترین مادے سے بنا کر اس نازک ترین اعلیٰ چیز کو جسے روح کہتے ہیں سے ایسا پکا جوڑ لگا دیا جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ روح کا جوڑ مادے سے کیسے لگایا گیا یہ بات سمجھنا انسانی علم سے بالاتر ہے۔ اسی حقیقت کے بارے میں قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (بنی اسرائیل:85) آپ سے روح کے بارے سوال کرتے ہیں، فرما دیجیے کہ روح امرِ ربی میں سے ہے۔ امرِ ربی کیا ہے؟ یہ عالمِ امر سے ہے۔

عالم دو ہیں: ایک عالمِ خلق اور دوسرا عالمِ امر اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (الاعراف:54)۔ عالمِ خلق کا تعلق اللہ کریم کی تخلیقات سے ہے۔ ساری تخلیق عدم سے وجود میں لائی گئی، اس کے مزاج میں فنا ہے۔ انسان جتنا جتنا بوڑھا ہوتا چلا جاتا ہے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ درخت وقت کے ساتھ ساتھ کمزور اور خشک ہوتے چلے جائیں گے، ایک دن کھوکھلے یا خشک ہو کر گر جائیں گے یعنی عالمِ خلق کے مزاج میں اللہ نے فنا رکھ دی ہے۔ جہاں تمام مخلوقات کی، عرش و فرش کی حدود ختم ہو جاتی ہیں، اس کے اوپر عالمِ امر شروع ہو جاتا ہے۔ عالمِ امر صفاتِ الٰہی سے ہے اور صفاتِ الٰہی کا مظہر ہے۔ جس طرح اللہ کی ذات

کو فنا نہیں، اسی طرح اس کی صفات کو بھی فنا نہیں، دوام حاصل ہے۔ اسی طرح روح عالمِ امر سے ہے، اسے دوام حاصل ہے اور اتنا مضبوط دوام ہے کہ جو وجود عالمِ آب وگل سے بنا وہ فانی ہے لیکن خاک کا وہ حصہ جو انسان کا بدن بنا، جب اس کا تعلق روح سے ہو جاتا ہے تو اسے بھی دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ انسانی وجود تو مادی عناصر سے بنا تھا جسے بکھرنا تھا لیکن اس میں روح داخل کر دی گئی اور اس کے ساتھ روح کا جوڑ لگا دیا گیا تو اس نہ ٹوٹنے والے جوڑ کے باعث خالقِ کائنات نے اسے بھی ہمیشگی عطا کر دی۔

روح چونکہ عالم امر سے ہے اور یہ واپس اپنے گھر، اپنے وطن کو لوٹنا چاہتی ہے لیکن اس کا بدنِ انسانی سے ایسا رشتہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ نہیں سکتی۔ روح کے سبب سے ہی انسان کے لیے معرفتِ الٰہی کا حصول ممکن ہے۔ اگر کسی کو ایمان نصیب نہ ہو تو بھی روح میں ایمان قبول کرنے کی استعداد تو رہتی ہے کہ دارِ دنیا میں مہلتِ عمل ہے لیکن ایمان سے محروم لوگوں کے بدن ان کی روحوں کی قبریں ہوتی ہیں۔

مر کے انسان کی خاک اتنی منتشر نہیں ہوتی جتنا اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے وجود کے ذرات دنیا کے گوشوں تک بکھرے ہوتے ہیں۔ یہ ذرات کہاں کہاں ہیں، دنیا کے کن کن گوشوں سے اور کہاں کہاں سے روپ تبدیل کرتے ہوئے ہم تک پہنچتے ہیں۔ کبھی غذا کی صورت میں، کبھی دوا کی صورت میں، کہیں یہ غلہ کی شکل میں ہوتے ہیں، کہیں پھل، کہیں گوشت، کہیں دودھ کی صورت میں۔ کہاں کہاں سے سفر کر کے اس شخص تک پہنچتے ہیں جس کے لیے اللہ نے وہ حصہ مقرر کر رکھا ہوتا ہے۔ اس کے حصے کے ذرات کسی دوسرے یا تیسرے جسم کو نہیں پہنچائے جاتے۔ کمال ہے! کتنی عجیب بات ہے، وہ کہاں کہاں سے لاتا ہے، کس طرح تقسیم فرماتا ہے۔ ایک ہی وجود میں بندے کا اپنا حصہ بھی ہے اور آنے والے انسانوں کا حصہ بھی محفوظ رکھا ہوا ہے۔ شکمِ مادر میں بھی ہر بچے کا اپنا حصہ

ہے۔ ماں کا حصہ ماں کو اور بچے کا حصہ بچے کو جاتا ہے اور اس بچے کا حصہ آئندہ آنے والے بچوں کو نہیں ملتا۔

مقصدِ تخلیق

اس دارِ دنیا میں انسان کے آنے اور گزر جانے کا مقصد کیا ہے؟ بچہ پیدا ہوتا ہے، بالغ ہوتا ہے، ذمہ داریاں سنبھالتا ہے، بچے پالتا ہے اور مر جاتا ہے، تو اس ساری تگ و تاز کا نتیجہ کیا ہے؟ ہر چیز کی تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ انسان بھی کسی چیز کو بنائے، خواہ مٹی کا برتن ہی کیوں نہ ہو یا بچے کا کھلونا ہی ہو تو وہ بھی کسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے بناتا ہے۔ جب انسان چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی کسی مقصد کیلئے بناتا ہے تو جس پروردگارِ عالم نے اتنی وسیع کائنات اور اس میں طرح طرح کی تخلیقات کی ہیں وہ بے مقصد تو نہیں ہو سکتا، تو اس کا مقصدِ تخلیق بھی یقیناً ہوگا، وہ مقصد کیا ہے؟

زندگی کا مقصد تلاشِ حق ہے۔ زندگی وصالِ حق کیلئے ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر دنیا کی زندگی اور حصولِ دنیا ہی کو مقصد بنا بیٹھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ بہت سرمایہ جمع کرے، دولت مند ہو جائے، وہ صاحبِ اقتدار ہو جائے، وہ بچوں کیلئے فلاں جائیداد چھوڑ جائے۔ یہ کام بقائے حیات کیلئے تو ضروری ہیں لیکن انہیں ہی مقصدِ حیات بنا لینا، یہ انسان کے بلند مقام کے شایانِ شان نہیں، اس لیے کہ بقائے حیات کا یہ کام صرف انسان ہی نہیں کرتا، ہر جاندار کرتا ہے۔ جب انسان دنیا کو مقصدِ حیات بنا کر طلبِ الٰہی کے مقام سے گرتا ہے تو اس کے بارے ارشاد ہوتا ہے اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (الاعراف:179) یہ لوگ انسانی درجے سے گرے اور جانوروں کی طرح ہو گئے بلکہ جانوروں سے بھی نیچے گر گئے۔ جانوروں سے نیچے اس لیے چلے گئے کہ جانوروں میں تو معرفتِ حق کی وہ استعداد نہیں جو انسانوں کو دی گئی

ہے۔ جانوروں کو تو صرف زندہ رہنے کا شعور دیا گیا ہے، ان میں تو تلاشِ حق کی استعداد ہی نہیں اور انسان نے یہ شعور رکھتے ہوئے بھی جانوروں کی زندگی اختیار کر لی اور انسان ہوتے ہوئے بھی صرف بقائے حیات کے کاموں کو ہی مقصد بنا بیٹھا۔

اگر ہم تنہا بیٹھ کر سوچیں اور اپنے حالات پہ غور کر کے یہی بات سمجھ میں آئے کہ ہم نے بڑی محنت کر کے پیسے کمائے، بچے پالے اور بس، تو پھر صرف یہی کام تو چڑیا بھی کرتی ہے، گیدڑ اور شیر بھی کرتا ہے۔ ہر جانور اپنے بچے پالتا ہے، ان کیلئے ٹھکانے بناتا ہے، ان کیلئے غذا کا اہتمام کرتا ہے تو جو کام ایک جانور، ایک پرندہ اور ایک درندہ کرتا ہے، اللہ کی ساری مخلوق کرتی ہے۔ انسان بھی بس اسی کام پر خوش ہو جائے کہ یہی کر کے اس نے بڑی کامیاب زندگی گزار دی تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہے وہ اپنے آپ کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے۔ وہ انسانی زندگی میں داخل ہی نہیں ہوا اور عرصۂ محشر میں جب جواب دینا ہوگا تو صرف اسی ایک سوال کا کہ میں نے تمہیں کیا استعداد دی تھی اور تم کیا کر کے آئے ہو؟ بندے کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ صرف حیوانی سطح پر گزاری ہوئی زندگی کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں ہوگا۔

ہر شخص نے خوش رہنے کا اپنا معیار بنا رکھا ہے۔ جس کے پاس جو نعمت کم ہے یا نہیں ہے، اسی کے حصول پر اس کی خوشیوں کا دارومدار ہے۔ حالانکہ اگر وہ نعمت اسے مل جائے تو کسی اور کی تمنا اسے بے چین کیے رکھے گی۔ کچھ نے اچھے گھر بنانے، دولت مند ہونے، بچوں کی تعلیم ہی کو کامیاب زندگی کا معیار بنا رکھا ہے۔ گو یہ سب کام ضروری ہیں انہیں کرنا احسن کام ہے لیکن جس شخص نے انہیں مقصدِ حیات سمجھ لیا، اس نے انسانی زندگی کو (touch) کیا ہی نہیں، اس نے معیارِ انسانیت کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس بندے کے اندر یہ سوچ بیدار ہی نہیں ہوتی کہ

وہ کون ہے، کس نے اسے پیدا کیا ہے، وہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ اس کا مطلب ہے ایسا شخص انسانی درجے کو پہنچا ہی نہیں، وہ جانوروں کی طرح غذا، آرام، توالد و تناسل اور صحت و بیماری کے مراحل تک ہی رہا۔ انسانی نسل میں ہونے کے باوجود، انسانی ذمہ داریوں کا مکلف ہونے کے باوجود، اس نے انسانیت میں قدم ہی نہیں رکھا کیونکہ جس کا قدم انسانیت میں آئے گا، اس کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس کا بنانے والا کون ہے، کہاں ہے؟

انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ صرف اسے یہ سوال کرنے کی استعداد دی گئی ہے کہ اس کائنات کا بنانے والا کون ہے؟ اس خصوصیت کی وجہ سے یہ مخلوق ساری کائنات سے افضل ہو گئی ہے، یہ سوال کوئی دوسری مخلوق نہیں کر سکی۔ کسی میں اس کی جرأت ہی نہیں، یہ سوچ ہی کسی کو نہیں دی گئی، ایسی استعداد ہی کسی اور مخلوق میں نہیں ہے۔ جنات میں نہ فرشتوں میں، حتیٰ کہ حاملینِ عرش فرشتے بھی حکم کی تعمیل کرتے ہیں لیکن کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہونے کی استعداد ہی نہیں کہ مالک کون ہے، کیسا ہے، کہاں ہے؟ جبکہ انسان کا بچہ ہوش سنبھالتے ہی یہ احساس رکھتا ہے کہ اللہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ یہ خصوصیت صرف نوعِ انسانی کو عطا ہوئی ہے اس لئے صرف بنی آدم کو عظمتِ نبوت سے نوازا گیا۔ انبیاءؑ و رسلؑ نسلِ انسانی سے ہی ہوئے ہیں، فرشتہ، جن یا کسی اور نوع میں سے نہیں۔

جن انسانوں کے اندر یہ سوال اٹھا، ان کیلئے اللہ نے جواب عطا فرما دیا کہ میں ہی وہ ذات ہوں اور تمہارے سارے سوالوں کا جواب ایک ہستی کے پاس ہے اور وہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔ جو پوچھنا چاہتے ہو ان سے پوچھ لو۔ کائنات کیسے بنی؟ کیوں بنی؟ خالق و مالک کون ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ انسان کی کیا ہستی ہے؟ اس کی ذمہ داری کیا ہے؟ مخلوق کہاں سے آ رہی ہے؟ کہاں جا رہی ہے؟ ذرے کا ذرے سے کیا تعلق ہے؟

وجود کے حقائق معلوم کرنا چاہو یا روح کے، ہر سوال کا جواب صرف محمد رسول اللہ ﷺ سے مل سکتا ہے۔ اللہ کی ذات سے آشنائی صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ممکن ہے۔

یوں تو یہ بڑا سادہ سا سوال نظر آتا ہے کہ اللہ کون ہے، اس کی ذات و صفات کیا ہیں، ہمارا اس سے رشتہ کیا ہے اور وہ ہمیں کیا دے رہا ہے، ہم سے کیا مطالبہ کر رہا ہے، اور کیا ہم اللہ کو کچھ دے سکتے ہیں؟ انسان جب انبیاءؑ کی تعلیمات سے محروم ہوا تو اس نے اس سوال کا جواب بتوں کی صورت میں گھڑا۔ توہمات، رسومات اور رواجوں کی صورت میں اس سوال کی تشفی کرنا چاہی لیکن اسے کبھی جواب نہ مل سکا۔ اس کا جواب صرف اور صرف اللہ کے نبیؐ ہی دے سکتے ہیں اور وہ اپنے اپنے عہد میں دیتے رہے۔ نبی کریم ﷺ تمام انسانیت کیلئے اور قیامت تک کیلئے مبعوث ہو کر آئے اور آپ ﷺ نے ہر سوال کا جواب دیا۔ لا الہ الا اللہ

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

لا الہ الا اللہ نے اس سوال کا جواب دے دیا کہ وہ سب کا خالق و مالک ہے، اکیلا ہے، لاشریک ہے، تمام خوبیاں، تمام بھلائیاں اسی کی ہیں، تمام صلاحیتیں اور قابلیتیں اسی نے مخلوق میں بانٹی ہیں۔ صرف اسی کی ذات ہے کہ جس کی غیر مشروط اور بلا چون و چراں اطاعت کرنا مخلوق کی اپنی ضرورت ہے اور یہ صرف اسی کو سزاوار ہے کہ اس کے حکم کے سامنے سرِ خم کر دیا جائے۔ اس بات میں وہ اکیلا ہے، واحد ہے اور لاشریک ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین:4)

کوئی بھی آمیزش جو مختلف چیزوں کو ملا کر بنتی ہو، اس کے اجزاء کا تناسب اس کی تقویم کہلاتی ہے۔ مثلاً طب کا کوئی نسخہ لے لیں جن چیزوں کی ایک تقویم بنائی جاتی ہے کہ

کس کا کتنا وزن ہو، اس کے اثر کا سارا دارومدار اس تقویم پر ہوتا ہے۔ اگر وہی چیزیں ترتیب بدل کر ملا دیں تو وہ فائدہ مرتب نہیں ہوتا بلکہ شاید نقصان دے۔ یعنی مختلف اوصاف والی اشیاء کو اس انداز سے ملایا جائے کہ وہ ایک نفع بخش یا خوبصورت چیز بن جائے۔ ربِ کریم فرماتے ہیں کہ جو اوصاف میں نے انسان کی تخلیق میں ملائے ہیں اور جس انداز سے ملائے ہیں، ساری کائنات میں اتنا خوبصورت آمیزہ میں نے نہیں تیار کیا۔

یہ ایسی مخلوق ہے جس کا خمیر مادے سے ہے اور یہ مادہ ساری مخلوق میں سب سے گھٹیا چیز ہے اور یہ سڑے ہوئے کیچڑ کی مٹی سے ہے اور پھر اس میں روح ڈال دی۔ کمال ہے ایک طرف وہ مادہ جو پوری کائنات میں سب سے گھٹیا شے ہے، پھر اسے ایسے پراسیس یعنی عمل میں سے گزارا کہ جسے خوشگوار یا خوبصورت نہیں کہا جا سکتا اور بظاہر اس پر کسی خوشگوار نتیجے کی توقع نہیں کی جا سکتی، لیکن نتیجہ اتنا خوشگوار نکلتا ہے کہ اس میں سے انبیاءؑ پیدا ہوتے ہیں، اولیاء پیدا ہوتے ہیں، صلحاء پیدا ہوتے ہیں، شہداء پیدا ہوتے ہیں، مفسرین، مفکرین پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی اس آمیزے کو جو سب سے نچلے درجے کا ہے، سب سے اعلیٰ درجے کی شے یعنی روح کو اس کے ساتھ پیوست کر دیا گیا۔ یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے جو اللہ ہی کر سکتا ہے کہ عالمِ امر کی تجلیات کو عالمِ خلق کی سب سے ادنیٰ چیز مٹی کے پتلے سے ایسا جوڑ لگایا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ مادے کی ساری صورتیں فنا ہو جائیں گی، آسمان ٹوٹ جائیں گے، ستارے جھڑ جائیں گے، زمین ختم ہو جائے گی، نیا عالم ہوگا لیکن انسانی وجود جس کا تعلق عالمِ امر کی اس روح سے پیدا ہو چکا تھا، جسے ہمیشہ رہنا ہے تو اس کے ساتھ پیوست ہو کر یہ مشتِ غبار بھی ہمیشہ رہے گی، جو انسانی سانچے میں ڈھل گئی۔

اب انسان ایک ایسی شے بن گیا جو کہ جب مادے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور راز نکال کر لے آتا ہے، نئی سے نئی ایجادات کرتا ہے،

نئی سے نئی چیزیں بناتا ہے اور جب روح کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو عالمِ امر جو اس کا گھر ہے اپنے روحانی تعلق یا نسبت سے اگر وہ مقامات و منازل طے کرتا ہوا عالمِ امر میں پہنچتا ہے تو وہ عرش بریں کو طے کرتا ہوا اوپر چلا جاتا ہے اور قربِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی کو پالیتا ہے۔

افسوس انسان نے یہ تقویم ڈسٹرب کردی

بنی آدم میں سے انسان کے درجے پر وہی پہنچا جسے اسلام نصیب ہوا، جس نے محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی قبول کی۔ لیکن جسے نورِ ایمان نصیب نہیں ہوا، ان کے بارے میں فرمایا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ یہ تو چارپاؤں کی طرح ہیں بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (الاعراف:179) بلکہ ان سے بھی گئے گذرے کہ جانوروں کو تو معرفتِ الٰہی کی استعداد ہی نہیں ملی تھی اور یہ فطرتاً اس استعداد سے نوازے گئے اور پھر جانوروں کی سطح پر زندگی گزار کر چلے گئے۔ تو مسلمان کی کامیابی اپنی پسند سے دستبردار ہو کر محمد رسول اللہ ﷺ کی پسند میں ڈھل جانا ہے۔

ہوا یہ کہ انسان نے روح کا تو خانہ ہی بند کر دیا اور نرے مادے کی طرف متوجہ ہو گیا تو پھر باقی درندے اور جانور تو فطرت سے مجبور تھے اور یہ فطرت سے مجبور نہیں، باشعور ہے۔ شیر درندہ ہے لیکن جب بھوکا ہو تو شکار کرتا ہے اور جب پیٹ بھرا ہو تو اس کے اوپر سے ہرن اچھلتے ہوئے گزرتے ہیں لیکن وہ آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتا اور اپنا آرام ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ مزے سے سو رہا ہوتا ہے، سینکڑوں جانور پاس چر رہے ہوتے ہیں، وہ نہیں دیکھتا اس لیے کہ وہ فطرت سے مجبور ہے۔

جب بھوک لگے گی تو اُس کا شکار کرنے کی جبلّت جاگے گی اور اس میں درندگی پیدا ہو جائے گی، جو سامنے آئے گا، چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ لیکن انسان ایسا نہیں ہے، اس میں شعور ہے۔ جب یہ درندگی پر آئے گا تو یہ لطف اندوز ہونے کیلئے گردنیں کاٹے گا اور کاٹنا

ہی چلا جائے گا اور مادہ سب سے گھٹیا چیز ہے تو یہ سب سے زیادہ ظالم، سب سے زیادہ چور، سب سے زیادہ دغاباز اور سب سے زیادہ بدکار ثابت ہوتا ہے۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (بنی اسرائیل:65)

اللہ نے شیطان سے مخاطب ہو کر فرمایا! جو میرے بندے ہوں گے ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ اب اس میں شرط یہ ہے کہ جو 'میرے بندے ہوں گے' یعنی جن کا مقصد میری رضا ہوگا۔ اگر مقصد میں کھوٹ آ گیا، خدانخواستہ اپنی بڑائی کا خیال آ گیا، اپنی پارسائی کا خیال آ گیا، یہی تو کھوٹ ہے۔ یا دوسروں پر رعب جمانے کا خیال آ گیا یا پیسے لینے اور تحفے تحائف وصول کرنے کا خیال آ گیا، 'میرے بندے' والی بات میں ٹوٹ پھوٹ ہو گئی، پھر حفاظت نہیں ہوگی۔ یہ حفاظت کا وعدہ تو ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ یقیناً پکی بات ہے جو میرے بندے ہیں، جو میرے لئے محنت کرتے ہیں، جو میری رضا کے طالب ہیں لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ ان پر تیرا کوئی بس نہیں چلے گا، تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، تو پھر تو بے بس ہے۔ ہماری کمزوریاں شیطان کو راستہ دیتی ہیں۔ ہمارے نظریات میں، ارادوں میں جب کمزوریاں آتی ہیں، تو پھر اسے بھی راستہ مل جاتا ہے۔ یہ بڑا نازک سا معاملہ ہے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اپنا کام کریں اور شیطان اپنی کوشش چھوڑ دے، وہ تو نہیں چھوڑے گا۔ آپ اُس کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں، جو وہ کرتا ہے، اللہ اس سے نپٹ لے گا۔ آپ اگر کسی کے گھر جائیں اور اس کا کتا بھونکنے، کاٹنے دوڑے تو کیا آپ کتے سے الجھیں گے یا مالک کو بلائیں گے؟ میرا خیال ہے آسان طریقہ یہ ہے کہ مالک سے کہا جائے۔ اس کی جھڑک پہ وہ رُک جاتا ہے اور کتے سے الجھ کر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کپڑے پھاڑ دے گا، ہاتھ پاؤں پہ کاٹ لے گا۔ یہ اللہ کریم کا کتا ہے لہٰذا اللہ سے ہی بات کیا کرو کہ اے اللہ! ہمیں اپنے اس کتے سے بچائیو اور اُس نے ذمہ لیا ہے

کہ ان عبادی لیس لک علیھم سلطان میرے بندوں کو تو نہیں کاٹ سکے گا۔ لہٰذا کسی گھبراہٹ کی، کسی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ منجانب اللہ چیزیں آتی ہیں، ہم کمزور لوگ ہیں، میں دعا کیا کرتا ہوں کہ اللہ ہم امتحانوں کے قابل نہیں ہیں خواہ مخواہ فیل ہو جائیں گے، ہمارے امتحان نہ لے، ہمارا بھرم رہنے دے۔

ہم شیطان کو الزام دیتے ہیں کہ شیطان ہمیں تنگ کرتا ہے لیکن کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ شیطان سے اس نے نیکی کی امید کیوں کر رکھی ہے؟ شیطان نے تو روزِ اول سے کہہ دیا کہ میں برائی کروں گا۔ اللہ کی نافرمانی اور دوزخ کی طرف انسان کو لے کر جاؤں گا۔ یہ اس کا مشن ہے اور ہم کتنے سادہ ہیں کہ شیطان سے کسی نیکی کی توقع رکھتے ہیں۔ جس روز شیطان نے یہ بات کہی تھی کہ اے اللہ! میں تیرے بندوں کو چاروں طرف سے گھیر لوں گا اور وہ میری بات مانیں گے اور آپ کی بات نہیں مانیں گے تو رب کریم نے فرمایا تھا کہ میں تجھے دوزخ میں ڈالوں گا اور جو تیری سنے گا وہ بھی جہنم میں جائے گا۔ لیکن ایک بات تو بھی سن لے ان عبادی لیس لک علیھم سلطان جو میرے بندے ہوں گے، ان پر تیرا کوئی بس نہیں چلے گا۔ تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ شیطان نے اپنا وعدہ نبھایا اور اللہ کریم نے اپنا وعدہ چھوڑ دیا۔ شیطان تو ایک عاجز مخلوق ہے، پھر اگر ہم شیطان کے ہاتھوں نالاں ہیں تو ہمیں شیطان کا شکوہ کرنے کی بجائے اپنے آپ کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم اللہ کے بندوں میں آ جائیں تو پھر تو اللہ ذمہ دار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے بندوں پر تیرا بس نہیں چلے گا، پھر شیطان کیا بگاڑ سکتا ہے۔ شیطان کو مسلمان سے ڈرنا چاہیے، مسلمان کو شیطان سے نہیں۔

شیطان عملاً کچھ نہیں کر سکتا، چھو نہیں سکتا، زخم نہیں لگا سکتا، قتل نہیں کر سکتا، کچھ نہیں کر سکتا، وہ صرف وہم ڈال سکتا ہے، وسوسہ ڈال سکتا ہے۔ اگر کوئی اللہ اللہ کرنے بیٹھ جائے تو اس ملعون کے پیٹ میں درد ہوتا ہے، اور کچھ نہیں تو دو دن ڈراؤنے خواب ہی دکھلا دے

گا۔ آپ مزید اللہ اللہ کریں تو بھاگ جائے گا اور فرمایا وَ اِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ فِی الْغَیِّ (الاعراف:202) شیطان سے بھی خطرناک ایک اور چیز ہے اور وہ ہیں تمہارے وہ رشتہ دار جو اللہ پر یقین سے دُور ہیں، تمہارے بھائی، تمہارے رشتہ دار، تمہارے عزیز، تمہارے کنبے قبیلے والے۔ ایسے لوگ اپنی پسند کی زندگی تم پر بھی مسلط کرنا چاہتے ہیں اور یمدونھم فی الغی تمہیں بھی اس کا باغی بنانے کیلئے زور لگا دیتے ہیں اور اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے، مجبور کر دیتے ہیں کہ یہ بھی کرو، وہ بھی کرو، فلاں سے لڑنا ہے، فلاں کو مارنا ہے، فلاں کی طرف جانا ہے۔ چھوڑو یار! تمہیں نماز کی پڑی رہتی ہے، تم نے فلاں کام بھی کرنا ہے یعنی شیطان سے زیادہ خطرناک تمہارے خویش و اقارب ہیں کیونکہ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اور عزیز و اقارب فزیکلی (physically) بازو سے پکڑ کر کھینچ رہے ہوتے ہیں۔

اسلام یہ ہے کہ شیطان کو فکر ہو کہ یہ بندہ مجھے پریشان کرے گا، یہ بندہ میری محفلیں اجاڑے گا، جہاں یہ جائے گا، وہاں میری رونقیں ماند پڑیں گی یہ فکر شیطان کو ہونی چاہیے۔ یہ کون سی مسلمانی ہے کہ مجھے شیطان سے چھڑالو مجھے شیطان سے چھڑالو، اگر کسی کو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ شیطان سے نہیں چھڑا سکا تو پھر شاید اس نے دل سے کلمہ پڑھا ہی نہیں۔ زبان تو الفاظ ادا کر دیتی ہے۔

زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جسم اور روح کی شکل

جو شکل و صورت اللہ کریم نے وجودِ انسانی کو عطا فرمائی، روح وہی شکل اختیار کرتی ہے، سو اصل شکل وجود کی ہے۔ جتنے وجود اللہ کریم نے تخلیق فرمائے ہیں، ان سب میں سب سے اعلیٰ شکل و صورت، سب سے بہترین، سب سے خوبصورت آقائے

نامدار حضرت محمد ﷺ کی صورتِ مبارکہ ہے اور آپ ﷺ کی صورتِ مبارکہ کی وہ عظمت ہے کہ انسانی شکل میں کوئی جہنم میں نہیں جائے گا۔ یوم حشر اگر کسی کی شکل انسانی ہوگی تو اس کی نجات ان شاء اللہ یقینی ہے۔

روحانی شکل کردار سے بدلتی ہے اور کردار میں عقیدہ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ایمان درست نہیں، عقیدہ درست نہیں تو روح کی شکل انسانی نہیں رہتی۔ ایمان لانے کے بعد جتنی جتنی کسی کی سیرت حسین ہوتی جاتی ہے، اتنی اتنی اس کی روحانی شکل بھی درست ہوتی جاتی ہے یعنی اللہ کریم ایمان نصیب کرے اور اس کے ساتھ حسنِ عمل نصیب ہو، بندہ نیک کردار ہو جائے تو اس کے حسنِ صورت میں، جمال میں، ترقی ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا شکل وصورت روح کی نہیں ہوتی، شکل انسانی کردار کی ہوتی ہے۔

انسان بظاہر تو انسان ہی نظر آتا ہے لیکن جوں جوں برائی میں غرق ہوتا جاتا ہے توں توں اس کی روح کی شکل انسانی نہیں رہتی، بدل جاتی ہے۔ درندے کی شکل بن جاتی ہے، موذی جانور کی شکل بن جاتی ہے۔ جب روح کی شکل اس طرح بدلتی ہے تو انسان کا کردار مکمل طور پر اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اس کے اعمال اس جانور کی مشابہت اختیار کر لیتے ہیں۔ پہلے مشائخِ عظام رویتِ اشکال کا مراقبہ کرایا کرتے تھے۔ صاحب مشاہدہ ساتھی کو احدیت پر لے جا کر واپس لا کر کسی ایک شہر پر روحانی طور پر کھڑا کر دیتے اور اسے دکھایا جاتا تھا کہ اس شہر میں بسنے والوں کی روحانی شکلیں کیسی ہیں؟ تو آبادیاں اژدھوں، خنزیروں، ریچھوں، بندروں اور دیگر جانوروں سے بھری پڑی ہوتی تھیں اور خال خال خوش نصیب ہوتے تھے جن کی شکل انسانی ہوتی تھی بلکہ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص حلال جانور کی شکل پر نظر آئے تو اس کی نجات کی امید رکھنی چاہیے۔ انسانی معیار سے تو گر چکا ہے لیکن حلال جانور کی شکل کا ہے۔ حضرتؒ نے یہ مراقبہ کرانا بند کر دیا پھر اس کے

بعد ہم نے بھی نہیں کرایا کیونکہ یہ لوازماتِ تصوف میں سے نہیں ہے۔ پھر وہ زمانہ ایسا تھا کہ کچھ انسان بھی نظر آجاتے تھے۔ آج یہ مراقبہ کریں تو شاید کچھ بھی پلے نہ پڑے، اور ہم نے جان بوجھ کر یہ مراقبات چھوڑ دیئے ہیں کہ لوگوں میں استعداد ہی نہیں۔ کسی کو ذرہ بھر مشاہدہ ہو جائے تو وہ دوکان لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ لوگ اردگرد جمع ہو کر اپنے دنیوی کاموں کا پٹارہ کھول لیتے ہیں۔

یہ خرابی تب ختم ہوگی جب ہم محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع کریں گے۔ ہمارے اندر بھیڑیے کی جگہ انسان بن جائے گا کیونکہ قبر تک، موت تک تو اسے توبہ سے بدلا جا سکتا ہے۔ کوئی توبہ کرتا ہے خلوص سے اور اتباعِ شریعت اختیار کرتا ہے تو روح کی شکل انسانی بن جاتی ہے، لیکن اگر اس پر موت آگئی تو پھر معاملہ مشکل ہو جائے گا۔

لہٰذا ہماری سب کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ ہم روح کی حیات کی، اُس کی صحت کی فکر کریں۔ بدن کی زندگی مختصر ہے اگرچہ لگتی بہت لمبی ہے۔ آج کسی سے کہا جائے کہ بیس سال بعد یہ کام ہوگا تو وہ بے فکر ہو جاتا ہے کہ ابھی بڑا وقت پڑا ہے، لیکن کسی ستر سال کے شخص سے پوچھا جائے کہ اتنا وقت گزرنے کا کچھ پتہ چلا تو وہ کہتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلا۔

شیاطین الجن والانس

نبی کریم ﷺ نے ایسے شیطانوں سے زیادہ خبردار رہنے کی ہدایت کی ہے جو انسانوں میں سے ہیں۔ یہ وہی شیطان ہیں جو شیطان کی غلامی کرتے کرتے مجسم شیطان بن گئے۔ فرمایا، جو شیطان انسانوں میں سے ہے، وہ زیادہ خطرناک ہے کہ وہ آپ کو ہاتھ سے پکڑ کر برائی کی طرف لے جاتا ہے یا آپ کے سامنے برائی کرتا ہے تاکہ آپ اس برائی میں شامل ہوں جبکہ ابلیس کو اللہ نے انسان کا ہاتھ پکڑ کر برائی کروانے کی قوت نہیں دی، وہ صرف وسوسہ ڈال سکتا ہے۔

جنات اور انسان اطاعت کیلئے پیدا کیے گئے ہیں۔ جن اور انسان دونوں کے پاس اختیار ہے کہ وہ اطاعت کریں یا نافرمانی۔ انسان بھی اس حد تک چلا جاتا ہے کہ اللہ کریم نے سورۃ والناس میں فرمایا اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (الناس: 5-6) یعنی انسان برائی کرتے کرتے اس نہج پہ آ گیا کہ شیطان کے ساتھ ملا کر پکارا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو شیطان انسانوں میں سے ہوتا ہے وہ زیادہ خطرناک ہے۔

جنات اور انسان دونوں مکلف ہیں لیکن مکلف ہونے میں فرق ہے۔ ہم دو افراد کو کام پر لگاتے ہیں ایک مزدور، دوسرا کاریگر۔ مزدور مشقت زیادہ کرتا ہے اور کاریگر اپنے فن کی اجرت لیتا ہے، جو مزدور سے زیادہ ہے اس لیے کہ مزدور کے پاس وہ فن نہیں، وہ کمال نہیں۔ اسی طرح انسانوں اور جنوں کا فرق سمجھ لیں۔ انسانوں کے پاس نورِ نبوت ہے، منصبِ نبوت ہے، جنات کے پاس وہ نہیں۔ معرفتِ باری کو پانے کی جو استعداد اللہ نے انسان کو دی ہے، وہ جنوں کے پاس نہیں۔ اسلئے جو رحمتِ باری انسان پر مرتب ہوتی ہے، وہ ان سے مختلف ہے۔

جنات اور جنت کی حوریں

سورۃ الرحمٰن میں جنت کی ایک مخلوق حور کا ذکر آیا ہے اور حور کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کو کسی جن یا انسان نے مَس تک نہیں کیا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جنات جنت میں جائیں گے اور انہیں ایسی حوریں عطا کی جائیں گی۔ اس بات کا یہاں رد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح دنیا میں بعض خواتین کو جن کا اثر ہو جاتا ہے یا ان وہ مَس کر جاتے ہیں، ایسی کوئی صورت جنت کی حوروں کے ساتھ نہیں ہوگی۔

انسان اور جنت کی حوریں

حور جنت کی مخلوق ہے۔ اللہ نے جنت کیلئے پیدا کی، جنت ہی میں رہے گی لیکن انسانوں کی خدمت کیلئے بنائی گئی ہے۔ حوریں ان خواتین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، جو دنیا میں آئیں، انبیاء پر ایمان لائیں، جنہوں نے تمام شدائد و تکالیف برداشت کیں اور اس کے ساتھ اللہ کو یاد کیا، اللہ کے نبی ﷺ کی اطاعت کی، اسلام پر قائم رہیں، اللہ کی اطاعت سے سرفراز ہو کر رخصت ہوئیں۔ ان کیلئے حوریں، کنیزوں اور غلاموں کا درجہ رکھتی ہیں اور مومن خواتین جنت میں داخل ہوں گی تو یہ جنت کی مالک ہوں گی۔ انہیں اللہ پاک جنت عطا فرمائیں گے۔ جس طرح مردوں کو جنت عطا ہوگی، اسی طرح خواتین کو بھی عطا ہوگی اور حوروں کی حیثیت بطور خادمہ ہوگی کہ جنت کی یہ مخلوق نہ دنیا میں آئی، نہ اسے اطاعت نصیب ہوئی، نہ اس نے دنیا کی تکالیف دیکھیں، نہ اس نے کفر سے مقابلہ کیا، نہ شیطان سے مقابلہ ہوا، نہ نفس دیا گیا، نہ نفس سے مجاہدہ کیا۔

عالمِ انسانیت سے جو مرد و خواتین جنت میں داخل ہوں گے، انہیں اُن سے زیادہ حسن دیا جائیگا۔ وہ چہرے کنیزوں اور غلاموں (حور و غلماں) سے زیادہ خوبصورت ہوں گے جنہیں دیدارِ باری سے سرفراز کیا جائے گا اور جمالِ باری سے سرفراز ہونا ان کے حسن کو بڑھاتا رہے گا۔ یہ نعمت صرف انسانوں کیلئے ہے۔ اس لئے یہ غلط خیال جو عام کر دیا گیا ہے کہ خواتین کی تو جنت میں کوئی قدر و منزلت نہیں ہوگی، حوروں ہی کی ہوگی، اس کو سمجھ لینا چاہیے۔

مرد و عورت کی ذمہ داریاں

عورت کی تخلیق اس کی ذمہ داریوں کے مطابق کی گئی ہے اور مرد کو اس کی ذمہ داریوں کے مطابق سخت، مضبوط اور نگران بنایا گیا ہے ورنہ انسان ہونے میں دونوں

برابر ہیں۔ مرد کا وجود ایسا ہے کہ مشقت اور سختی برداشت کر سکتا ہے اس لیے اس کے مزاج میں سختی ہے۔ اس کی گفتگو میں بھی سختی ہوتی ہے۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ محنت و مشقت کر کے، ملازمت، کاروبار یا مزدوری کر کے روزی کما کر لائے۔ گھر کی حفاظت سے لے کر ملک کی حفاظت تک کی ذمہ داری مرد پہ ہے۔ عورت کو مشقت کرنے والا وجود نہیں دیا گیا، اسے تربیت کرنے کیلئے وجود دیا گیا ہے۔ اس کی باتوں میں رحمت، محبت و شفقت، پیار، نرمی، برداشت ہوتی ہے لہٰذا نازک ہوتی ہے۔

اللہ نے ایک ہی جنس سے انسان کا جوڑا بنایا ہے۔ فرائض دونوں کے اپنے اپنے ہیں۔ دونوں اللہ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ دونوں ایک باغ کی پرورش پر ملازم رکھے گئے ہیں۔ ایک کی ذمہ داری اندر کے کاموں کی ہے، دوسرے کی ذمہ داری باہر کے کاموں کی ہے، سوائے مخصوص حالات کے کیونکہ مستثنیات ہر جگہ ہیں۔

عورت اور مرد کے فرائض کو ربِ جلیل نے یوں تقسیم کیا ہے جیسے کوئی شخص بہت خوبصورت باغ لگوانا چاہے، اسے وہاں دو طرح کے مزدور چاہئیں۔

☆ ایک ملازم چاہیے جو تگڑا اور مضبوط ہو، جو اس باغ کی حفاظت اور چوکیداری کرے۔ کسی جانور یا کسی ناپسندیدہ شے کو جو اس باغ کو اجاڑنے کا یا خراب کرنے کا سبب بنتی ہے، قریب نہ آنے دے۔ اس کی باڑ لگائے، اس کی حفاظت کرے، اس کیلئے کھاد ڈھوئے، پانی کی نالی کھود کر لے آئے، اس کی ضروریات کی تکمیل کے اسباب اختیار کرے۔

☆ اب اس باغ کے اندر بھی ایک ملازم چاہیے جو قوت و طاقت میں بیشک اس باہر والے سے کمزور ہو لیکن محبت و شفقت میں اس سے بڑھ کر ہو، جو چھوٹے چھوٹے پودوں کی نگہداشت کرے، جو ایک ایک کلی کو دیکھے یا ایک ایک پھول کا

احساس رکھے، جو ایک ایک پھوٹتے ہوئے شگوفے کا احساس رکھے، اس کی ضروریات کو سمجھتا ہو، ہر ایک کو نرمی، محبت، پیار اور تحفظ دے۔

تو میرے خیال میں نازک اور حساس ترین کام اس اندر والے ملازم کا ہے اور یہ کام اللہ نے خاتون کے، عورت کے سپرد کیا ہے۔ انسانی باغیچے اور انسانی گلشن میں جو نونہال پھلتے پھولتے ہیں، ان کی تربیت، ان کا دیکھنا بھالنا، ان کی پرورش، ان کو سنبھالنا یہ خاتون کی ذمہ داری ہے اور اس کیلئے باہر سے روزی کما کے لانا، ان کے تحفظ کا خیال رکھنا یہ مرد کی ذمہ داری ہے۔

عورت اور حیاء

عورت کا تقدس، عورت کی عظمت، عورت کی محبت، اس کی شفقت اور اس کا سارا کمال ایک بات پر انحصار کرتا ہے کہ اس میں کتنی حیا ہے۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے، کام کرنا تو بہت بڑی بات ہے، حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو باہر ایک کنواں تھا جہاں سے وہ لوگ مویشیوں کو پانی پلاتے تھے۔ دو نوجوان بچیاں الگ ہو کر کھڑی ہیں۔ فرمایا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ (القصص:25) وہ قدم بھی اٹھاتی تھی تو پتہ چلتا تھا کہ اس کے قدم اٹھانے کے انداز سے بھی حیا ٹپکتی ہے، یعنی سرتاپا حیا ہی حیا ہے، تو حیا کو چھوڑ کر عورت عورت نہیں رہتی۔

ایک مغربی مفکر کا بھی قول ہے۔ بڑا اچھا جملہ کہا اس نے، عورت گھر سے باہر آ کر ہر وہ کام کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے لیکن پھر وہ عورت نہیں رہتی۔

وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ

میاں بیوی دونوں میں اتفاق و اتحاد بنانے کیلئے، ایک دوسرے کا احساس کرنے کیلئے فرمایا کہ دونوں میں محبت پیدا کر دی۔ دونوں میں ایک دوسرے کی بھلائی، بہتری اور خوشی دیکھنے کا جذبہ اللہ نے رکھ دیا ہے جسے مودّت کہتے ہیں۔ رحمت کا ترجمہ بھی یہی بنتا ہے

کہ جس کے نتیجے میں انجامِ کار بہتری نصیب ہوتی ہے۔

بگڑتی کب ہے؟ جہاں اطاعت الٰہی اٹھ جاتی ہے، ایمان کمزور پڑ جاتا ہے وہاں سے یہ مودّت اور رحمت بھی ختم ہو جاتی ہے، پھر میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں اولاد تباہ ہو جاتی ہے۔ اگر مرد طاقتور ہے، غالب ہے تو زیادہ رسوائی خاتون کے حصے میں آتی ہے لیکن جب خواتین بگڑتی ہیں، دین سے دُور ہوتی ہیں تو گھر کو جہنم بنا دیتی ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ جتنا ظلم خواتین، دوسری خواتین پر کرتی ہیں کبھی ساس کے روپ میں، کبھی بہو کے روپ، کبھی سوکن کے روپ میں، اتنا ظلم مرد، خواتین پر نہیں کرتے۔ اس سب کی بنیادی وجہ عظمتِ الٰہی سے غفلت، اللہ سے تعلق نہ ہونا اور سنتِ آقائے نامدار ﷺ سے دوری ہے۔

خواتین کے معاملے میں مَردوں کی غیر ذمہ داری

ایک بہت بڑی کمی آج کے دور میں یہ ہے کہ

☆ اچھے بھلے دیندار گھرانوں میں بھی اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو خود دینی علم سے بہت زیادہ بے بہرہ ہیں اور اس سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔

☆ لیکن جن لوگوں کو خود دینی علوم سے اللہ نے حصہ دیا ہے اور پھر وہ اپنی زندگی میں دین پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان میں بھی کمزوری پائی جاتی ہے کہ گھروں میں دین بہت کم ہوتا ہے اور بالخصوص خواتین اپنی ضروریاتِ زندگی کے مسائل سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔

☆ بہت کم خوش نصیب ایسے ہیں جو یہ فکر کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، اسے ہم اپنی ماؤں، بہنوں، بیویوں، بیٹیوں تک بھی پہنچائیں۔

ہر فرد انسانیت کے باغ کا حصہ ہے

انسانیت کا ہر فرد اپنی جگہ اللہ نے اہم بنایا ہے۔ سب لوگ انسانیت کے گلشن کے پتے، پھل، پھول ہیں۔ جس طرح درخت کا تنا ایک ہوتا ہے اس پر ڈالیں، شاخیں پھول کھلتے ہیں، پھل بنتے ہیں اس طرح ہر فرد انسانیت کے باغ کا اہم حصہ ہے۔ ہر فرد ضروری ہے، کوئی شخص فالتو نہیں، کوئی شخص اس قابل نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ ہر شخص اتنا ہی اہم ہے جتنا ہم اپنے آپ کو اہم سمجھتے ہیں۔ یہ فلسفہ سمجھ میں آ جائے تو جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ فلسفہ سمجھنے کیلئے انسانوں کی خالق سے آشنائی ضروری ہے۔ جیسے کسی مشین کے سارے پرزے اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ گاڑی کیلئے کیچڑ والے ٹائر بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنی اس کی آرام دہ نشستیں۔ انسانیت کی بقاء ایک دوسرے کا حق دینے میں ہے، چھیننے میں نہیں۔ مخلوق میں کوئی کمتر نہیں، کوئی برتر نہیں، ہر فرد اپنی جگہ ضروری ہے۔

زندگی کی اصل کچھ دینے پر ہے

کسی بھی وجود کی حیات آگے دینے میں ہے۔ زندگی کا اصول کچھ دینے پر ہے۔ اگر سورج اپنی روشنی اپنے تک روک لے تو حیات ختم ہو جائے گی۔ ہوا انسان سے روک لی جائے تو آکسیجن کے بغیر موت واقع ہو جائے گی۔ سو زندگی کا اصول کچھ دینے پر ہے، آپ دوسرے کو کیا دے رہے ہیں؟ اگر آپ حیات آگے پہنچا رہے ہیں تو آپ کے مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگلی حیات کا انحصار آپ پر ہے اور اگر آپ دوسرے کے حقوق روک رہے ہیں، اس کی حیات روک رہے ہیں تو آپ کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر بازو کو باندھ دیا جائے اور خون کو بازو تک روک دیا جائے، تو کیا ہوگا؟ بازو میں ناسور بن جائیں گے۔

ہر انسان جب دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو اس پر بہیمیت، حیوانیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ جب انسان دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ کچھ بھی نہ جانتا ہو لیکن اپنی حیاتِ حیوانی یا جسمانی زندگی کی بقاء کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔ چھوٹا بچہ بھی بھوک پیاس محسوس کرتا ہے، اس کے لئے روتا چلاتا، دودھ پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے جو حیوانی زندگی ہے۔ اگر اسے صحیح تربیت یا ایمان یا اچھے لوگوں کی صحبت نصیب نہ ہو تو پھر وہ ساری زندگی اسی حیوانیت کے تابع بسر کر دیتا ہے۔ اسی لیے رب جلیل نے ان لوگوں کو جو ایمان، اطاعتِ الٰہی یا نبی کریم ﷺ سے رشتہ جوڑنے سے محروم رہے، انہیں حیوانوں سے بھی بدتر کہا ہے۔ جب نورِ ایمان نصیب ہوتا ہے اور صالحین کی صحبت نصیب ہوتی ہے تو انسان میں تبدیلی کا ایک عمل شروع ہوتا ہے جو اس کے احساسِ حیوانی کو مغلوب کر کے اس پر اوصافِ ملکوتی کا رنگ چڑھاتا ہے۔ پھر اس میں وہ عادات یا وہ صفات پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں جو فرشتوں میں ہوتی ہیں جیسے کم کھانا، کم سونا، لوگوں سے کم ملنا، کم باتیں کرنا، اپنے کام سے کام رکھنا، ہمہ وقت اللہ کی عبادت کرنا، ذکر اذکار کرنا وغیرہ۔ لیکن فرشتہ بننا انسان کی منزل نہیں ہے، اسے اپنے نکتۂ کمال تک پہنچنے کیلئے انسان بننا پڑتا ہے۔ انسانیت یہ ہے کہ اسے زندگی کا احساس ہو، کھانا پینا، معاملات، بیوی بچے، والدین، دوست و دشمن، قوم و ملک ہر کے ایک ساتھ ان کے حقوق کو بھی پہچانتا ہو اور انہیں ادا بھی کرتا ہو۔

جب یہ دونوں صفات انسان میں بیک وقت پائی جائیں تو وہ درجۂ انسانیت پر فائز ہوتا ہے۔ پھر اسے انسان کہتے ہیں۔ اگر اسے حلال حرام، جائز ناجائز، پاک ناپاک کی تمیز نہ ہو لیکن وہ کھاتا پیتا اور خرچ کرتا ہو، اسے درجۂ حیوانیت کہتے ہیں۔

انسان آمیزہ ہے اوصافِ حمیدہ، اوصافِ ملکوتی اور بہیمیت کا۔ اس میں بدن کی نسبت سے جو خصوصیات ہیں، وہ وہی ہیں جو دوسرے بہائم میں ہوتی ہیں۔ بھوک کا لگنا، آرام کی طلب، اولاد کا پالنا، دنیا کی خواہش، یہ ساری وہی چیزیں ہیں جو ہر جانور میں پائی جاتی ہیں۔ بدن کی خصوصیات یہی ہیں کہ وہ اپنے آرام کی فکر کرے، اپنی بقاء کی فکر کرے، اپنے آپ کو ہر چیز پر مقدم رکھے۔

روح چونکہ عالمِ امر سے ہے، ازلی و ابدی ہے، اس کے لیے فنا نہیں ہے، مخلوق ہے لیکن لافانی ہے۔ اب روح کی نسبت سے جو اوصاف انسان میں آتے ہیں وہ فرشتوں سے بلند تر ہیں، اوصافِ ملکوتی ہیں بلکہ ملائکہ سے بھی زیادہ منزہ اور شفاف ہیں۔ انسان اتنا معزز کیوں ہو گیا کہ عرشِ عظیم تک توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے، اس لیے کہ اس میں روح ہے۔ وہ روح جو عالمِ امر سے متعلق ہے، وہ عرشوں کے تقدس سے زیادہ پاک، آسمانوں کی لطافت سے زیادہ لطیف، فرشتوں کے وجود سے نازک تر، کائنات کی تمام رنگینیوں سے زیادہ رنگین، زیادہ خوبصورت، زیادہ حسین اور آئینہ دار ہے تجلیاتِ باری کا، پرتوِ جمالِ باری ہے، کرن ہے نورِ جمال کی۔ (باقی انسان تو مشتِ غبار ہے، اس میں کیا رکھا ہے؟ سائنسدانوں نے انسانی وجود کا تجزیہ کر کے اس میں جو جو عناصر ہیں ان کی قیمت لگائی، اڑھائی روپے۔ اس اڑھائی روپے کو تو کوئی سجدہ نہیں کرتا، اس کی تو کوئی غلامی نہیں کرتا، اس پر تو کوئی قربان نہیں ہوتا)۔ اب اس انسان کو دیکھو جو اس وجود کو اتنا گندہ کر دے جو اس کو اس درجہ آلودہ کرے کہ اسے روح سے نسبت دیتے ہوئے بھی حیا آئے۔ سب سے بڑی غلاظت کفر و شرک ہے اگر وہ کفر و شرک سے تو بچ گیا لیکن اس نے دل، جو جمالِ باری کا مسکن تھا، اسے غلاظتوں، آلائشوں سے بھر دیا، آلودہ کر دیا، اس میں گناہ کی ظلمت ڈالتے ڈالتے اسے

تاریک کر دیا، حرام کھاتے کھاتے اس پر کیا سے کیا غلاف چڑھا دیئے، سود کھالیا، چوری کا مال کھالیا، جھوٹ بول لیا تو کیا اُس کا محاسبہ نہ ہوگا؟

شیطان نے ایک جہان کو مٹی اور گارے کے بدن کا شیدائی بنا دیا ہے۔ اسی بدن کو دنیا سب کچھ سمجھنے لگ گئی ہے۔ اس کی پرورش، اس کی زیبائش، اس کے لئے حصولِ زر، اس کیلئے حصولِ اقتدار اور نہ جانے کیا کیا۔ شب و روز بھاگ بھاگ کر اس کیلئے ساری محنت کی جا رہی ہے۔ اصل انسان وہ روح ہے جو اللہ نے اس میں ڈال دی۔ خود ابلیس نے بھی روح کو نظر انداز کر کے اس مٹی اور گارے والے بت کی بات کی تھی۔

کتنے لوگ ہیں جو روح کی تربیت کیلئے راتوں کو جاگتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو اللہ کی اس صفت جوان کے وجود میں سمو دی گئی، اس کا احساس کرتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو سجدہ اس لیے کرتے ہیں کہ ہماری روح کو تسکین ملے، انوارات و برکات ملیں قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (السبا:13) میرے بہت تھوڑے بندے ہیں جو شکر گزار ہیں۔ انسان کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اس حقیقت سے آشنائی پیدا کرے جو قرآن نے اس کی اصل کے متعلق بتائی ہے کہ تیرا وجود انسان نہیں بلکہ یہ وجود تو صرف مٹی کا ڈھیر ہے۔ تیرے اندر امرِ الٰہی میں سے روح ہے، وہ انسان ہے، اس کی عظمت ہے۔ اور روح کی حیات ہے اسلام اور ایمان۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر صرف بدن کی خواہشات و ضروریات کیلئے پوری زندگی محنت کرتا رہتا ہے اور روح اور روحانیت ثانوی درجے میں چلی جاتی ہے۔ جب اوصافِ روحانی بدن پر غالب آ جائیں تو پھر انسان محض بدن پالنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ بدن کی ضرورتیں اس طرح پوری کرتا ہے جو روح کے کام میں رکاوٹ نہ ڈالے۔

نفس، روح، ضمیر

نفسِ انسانی

انسان دس اجزاء کا مجموعہ ہے۔ پانچ اجزاء مادی ہیں، آگ، ہوا، پانی اور مٹی انہیں عناصرِ اربعہ کہتے ہیں اور ان چاروں کے ملنے سے پانچواں جز نفسِ انسانی تشکیل پاتا ہے۔ نفس چونکہ مادے سے پیدا ہوتا ہے، اس کا رجحان مادی زندگی کی طرف ہوتا ہے۔ اسے مادی زندگی کا شعور ہوتا ہے اور یہ مادی لذتوں سے آشنا ہوتا ہے تو وہ آدمی کو مادی لذتوں کی طرف کھینچتا ہے۔ اس طرح پانچ لطائف عالمِ امر کے ہیں، جنہیں لطائفِ ربانی بھی کہا جاتا ہے یعنی قلب، روح، سری، خفی اور اخفاء۔ یہ روح کی اساس ہیں۔

اگر انسان کو ایمان نصیب ہو، اتباعِ رسالت ﷺ نصیب ہو تو اس سے لطائف مضبوط ہونا شروع ہوتے ہیں اگر لطائف مضبوط ہوتے ہیں تو یقیناً نفس میں تبدیلی آئے گی، وہ کمزور ہوگا اور ان دونوں میں سے ایک کی قوت دوسرے کی کمزوری ہے (ایک کی erichment دوسرے کی depletion ہے)۔

نفسِ انسانی کی تین حالتیں ہیں

نفسِ امارہ: ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف:11) نفسِ امارہ ہوتا ہے برائی کی طرف رجحان یعنی مادی خواہشات و لذات اس کا مقصد ہوتی ہیں۔ اسے حلال و حرام، جائز و ناجائز سے سروکار نہیں ہوتا، وہ مادی لذات کا شیدا ہوتا ہے۔ جب لطیفۂ قلب میں نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے اور وہ طاقت پکڑتا ہے تو پھر نفسِ امارہ سے نفسِ لوّامہ بن جاتا ہے۔

نفسِ لوّامہ: لوّامہ وہ نفس ہوتا ہے جو غلطی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور غلطی ہو جائے تو اس پر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، اللہ سے توبہ کرتا ہے، رجوع الی اللہ کرتا ہے۔ اگر لطائف

مسلسل مضبوط ہو رہے ہوں تو نفس تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر مطمئنہ بن جاتا ہے۔

نفس مطمئنہ: یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (الفجر:27) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا پہ راضی ہے۔ پھر اس کی خوشی رضائے الٰہی اور اطاعتِ حق میں ہو جاتی ہے تو اس طرح سے انسانی زندگی سیدھے راستے پر کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

اس لیے نفس، فی نفسہٖ ذاتی طور پر بُرا نہیں ہوتا۔ یہ انسان میں استعداد ہے کہ وہ ایمان قبول کر کے تعلیماتِ نبوی ﷺ حاصل کر کے اسے نفسِ لوّامہ بنائے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر محنت و مجاہدہ کر کے، اطاعتِ الٰہی کر کے ایسے نفس کو نفسِ مطمئنہ میں تبدیل کر لے۔

اگر روح میں قوت نہ ہو تو انسان میں بھی خصوصیاتِ حیوانی غالب آ جاتی ہیں، اس کا کردار حیوانوں جیسا ہو جاتا ہے اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ (الاعراف:179) اگر قلب نورِ ایمان سے، برکاتِ نبوت سے، یادِ الٰہی سے محروم رہ جائے تو پھر وہ کمزور ہوتا ہوتا مر جاتا ہے اور نفس کلی طور پر حکمران ہو جاتا ہے۔

دونوں، قلب بھی اور نفس بھی، اپنے اپنے اجزاء کے امام ہیں اور ان کی چپقلش آپس میں ساری زندگی چلتی رہتی ہے۔ اگر نفس امام ہو جائے تو پھر وہ جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتا اور اگر قلب حاکم ہو جائے تو خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں پھر وہ اپنے طریقے سے ان کی تکمیل کرتا ہے۔ تو یہ چیزیں مربوط ہیں۔

روح

روح امرِ الٰہی ہے۔ اس کی تخلیق امر سے ہے۔ کیسے ہے کیوں ہے، یہ انسانی فکر سے بالاتر ہے۔ یہ وہ لطیفۂ ربانی ہے جو امرِ الٰہی سے متعلق ہے اور وجود کو حیات بخشتا ہے اور اگر الگ ہو جائے تو مادہ بکھر جاتا ہے، نفس بھی ختم ہو جاتا ہے، ذرہ ذرہ خاک کا واپس چلا

جاتا ہے۔ لیکن روح چونکہ عالمِ امر سے ہے، امرِ الٰہی ہے اس کے لیے اِسے فنا نہیں ہے۔ یہ روز پیدا نہیں ہوتی بلکہ روزِ ازل سب ارواح ایک ساتھ تخلیق کی گئیں۔ یہ ہمیشہ رہے گی، بدن کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوتا ہے تو بدن میں حیات آ جاتی ہے، اس کا تعلق منقطع ہوتا ہے تو اسے موت کہہ دیتے ہیں۔ آخر میں پھر سے قائم ہو گا پھر سے حیات کہلائے گی۔ برزخ میں اس کا رابطہ جسم سے قائم رہتا ہے۔

ضمیر

ضمیر تو انسانی فکر کا نام ہے۔ اگر وہ صالح ہو تو کہتے ہیں کہ اس کا ضمیر زندہ ہے۔ اگر فکر غیر صالح ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا ضمیر مر گیا ہے۔

دل اور دماغ

دل کیا ہے؟

دل ایک ایسا عجیب آلہ ہے جو ماں کے پیٹ سے دھڑکنا شروع کرتا ہے اور آخری سانس تک دھڑکتا رہتا ہے۔ کوئی صدیاں جیئے یا برسوں، چلتا ہی رہتا ہے اور جب تک یہ چلتا رہتا ہے، زندگی چلتی رہتی ہے۔ صحت میں، بیماری میں، نیند میں، سفر میں، حضر میں، دُکھ میں، سکھ میں یہ چلتا ہی رہتا ہے۔ یہ دل گوشت کا لوتھڑا ہے جو خون پمپ کرتا ہے۔

قلب کیا ہے؟

اسی دل کے اندر ایک لطیفہ رُبانی ہے جس کے باعث اس کی اتنی عظمت ہے کہ رب کریم نے انبیاء کرامؑ سے جو کلام فرمایا، اس کا نزول قلبِ انبیاءؑ پر ہوا حالانکہ نبیوںؑ کے دماغ بھی ان کی ذات کی طرح منفرد ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے بارے میں قرآنِ کریم میں اللہ کریم فرماتے ہیں کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعرآء:193) اس کلام کو روح الامین حضرت جبرائیلؑ لے کر نازل ہوئے عَلٰى قَلْبِكَ (الشعرآء:194) آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر۔

اللہ سے کلام کرنے کا شرف صرف قلب کو نصیب ہے۔ زبان ماوشما سے بات کرنے کیلئے ہے۔ زبان ضرورت کیلئے ہے، یاوہ گوئی کیلئے نہیں ہے۔ زبان مخلوق سے بات کرنے کیلئے ہے، اللہ سے بات کرنے کیلئے دِل ہے۔ دِل اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کو بسانے کیلئے ہے، خرافات کیلئے نہیں ہے۔ زندگی حصولِ رضائے باری کیلئے ہے، ضائع کرنے کیلئے نہیں ہے۔ کفر کے سارے معاملات دماغ سے چلتے ہیں اور ایمان کے سارے معاملات دِل پر مدار رکھتے ہیں۔

دل کے اندر ایک وسیع کائنات ہے۔ سلطان باہوؒ فرماتے ہیں

چوداں طبق دلے دے اندر تنبو وانگر تانڑے ہُو

وچ بیڑے، وچ جھیڑے وچ ونج مہانڑے ہُو

دل دریا، سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانڑے ہُو

یہ الگ جہان ہے اور اس میں بڑی آبادی ہوتی ہے۔ اس میں بہت بڑے وسیع شہر ہیں، اپنوں کے شہر، بیشمار اپنے اس میں بستے ہیں، عزیز واقارب، دوست احباب، جاننے والے۔ کچھ ایسے لوگوں کے گھر اس میں ہوتے ہیں جن کو ہم نے صرف سن رکھا ہوتا ہے، دیکھے نہیں ہوتے، اُن کے مکان بھی ہوتے ہیں، اُن کے گھر بھی ہوتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے کبھی اُن پہ بھی نظر پڑ جاتی ہے، کوئی بات کرتا ہے، کوئی نام لیتا ہے تو ہم کہتے ہیں، ہاں! میں بھی جانتا ہوں، میں نے انہیں پڑھا ہے یا سنا ہے۔

بڑی مزے کی بات یہ ہے کہ دشمنوں کا گھر، دشمنوں کا قیام بھی اسی دل کے اندر ہوتا ہے۔ آپ کی جس سے جتنی دشمنی ہوتی ہے، اس کا گھر اس میں اتنا بڑا ہوتا ہے، وہ بھی آپ کو کروٹ کروٹ نظر آتا ہے، بھولتا نہیں۔ اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے، امیر غریب سب ہی یہاں بستے ہیں۔ بڑی عجیب آبادی ہے۔ اس میں اس کے اپنے سورج ہیں، اپنی راتیں ہیں، اپنے چاند، اپنے ستارے ہیں، اپنا جہان ہے، بہاریں ہیں، خزائیں ہیں۔ اس میں خوشیاں بھی ہوتی ہیں، یہ ماتم کدہ بھی ہے۔ دُکھ سکھ کو سب سے زیادہ یہی محسوس کرتا ہے۔ ساری زندگی کی راہیں یہی متعین کرتا ہے۔ دل کے اندر بسنے والے سارے باسی اس کے بس میں نہیں ہیں۔ یہ چاہے نہ چاہے، اس میں بستے ہیں، اس میں انسان کا دخل نہیں ہے۔ جتنے لوگوں سے ملتا ہے، جتنے لوگوں کو دیکھتا ہے، جن کے بارے میں سنتا ہے، سب

اس کے دل میں آباد ہو جاتے ہیں، یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

جب اس میں اتنی آبادی ہوتی ہے تو اس میں بیقراریاں بھی اتنی ہی ہوتی ہیں۔ آبادی کے ہر شخص کی اپنی ایک آرزو، اپنی ایک تمنا، ایک طلب ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنا راگ الاپتا ہے۔ انسان کبھی اس طرف لپکتا ہے، کبھی اس کی بات سنتا ہے، کبھی دشمن پر چڑھ دوڑتا ہے، کبھی دوستوں پر پیار آتا ہے۔ کبھی کسی کو دھوکہ دینا چاہتا ہے، کبھی کسی کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کسی کو مٹا دینا چاہتا ہے کبھی کسی کو اونچا بٹھانا چاہتا ہے۔ اس کی یہ ساری بھاگ دوڑ لگی رہتی ہے اور عمرِ عزیز ختم ہو جاتی ہے۔

یا اللہ! یہ دل تو آپ نے دیا، یہ بڑا قیمتی تھا اور اس کو اتنی مصیبتیں ڈال دیں کہ اب یہ سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے۔ زندگی کے سارے شور شرابے اس کے اندر آ گئے، اسے اب کسی کل چین ہی نہیں۔ یہ تڑپتا ہے، بھاگتا ہے، دوڑتا ہے

دل کی بیقراری کا علاج

اللہ فرماتے ہیں کہ اس دِل کی بیقراری کا علاج صرف ذکر اللہ ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی محفل میں کتنی ہی قسم کے لوگ ہوں، ان کی کتنی قسم کی رائے ہو، ان کے کتنی قسم کے لباس ہوں، ان کی سوچیں کتنی مختلف ہوں، وہ کتنا شور کر رہے ہوں، اگر وہاں بادشاہ آ جائے تو سب شور ختم ہو جائے گا۔ سب اس کو دیکھنے لگ جائیں گے، سب اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے، سب ہمہ تن گوش ہو جائیں گے۔ فرمایا: اس کی بیقراری کا علاج بھی ایک ہی ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد:28) میری یاد کو اس میں بسا لو سب شور شرابا ختم ہو جائے گا۔ یہ سب حشرات الارض کی طرح ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کی اہمیت صرف اس لئے بنی ہوئی ہے کہ اُن سے بڑا درمیان میں کوئی نہیں۔ یہ شور کر رہے ہیں، یہ تمہیں کبھی اس طرف کھینچتے ہیں، دوسرا اُدھر کھینچ رہا ہے، تیسرا ادھر کھینچ رہا ہے، چوتھا

اُدھر کھینچ رہا ہے۔ ہر ایک شور کر رہا ہے لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ اس شہر میں ایک مسجد بھی بنا ڈالو۔ یہ سارا شہر تم نے نہیں بنایا۔ تمہاری تو کسی پر ذرا سی نظر پڑی وہ دل میں بس گیا۔ کسی کی بات سنی، اس کا دل میں گھر بن گیا۔ کسی کو دیکھا، کسی سے ملے، کسی سے تعلق ہوا، کسی سے دوستی، کسی سے دشمنی، کسی سے کاروبار کیا، وہ سارے دل میں بستے گئے، از خود ان کے گھر بنتے گئے، اب وہ مٹائے نہیں مٹتے۔

تمہارے ذمے یہ ہے کہ تم اپنے ارادے سے، اپنی مرضی سے اِس میں ایک مسجد بنا ڈالو اور اس مسجد کو آباد رکھو، کسی لمحے اس میں ذکرِ الٰہی ختم نہیں ہونا چاہئے۔ اذان کے وقت اذان ہو، نماز کے وقت نماز ہو، سجدے کے وقت سجدہ ہو، تلاوت کے وقت تلاوت ہو لیکن کبھی اس کے دیئے گل نہیں ہونے چاہئیں، اس کی روشنیاں بجھنی نہیں چاہئیں، وہ مسلسل آباد رہے اور اس کی آبادی میرے ذکر، میری یاد سے ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے قرار آ جانا۔ قرار کا مطلب ہے اسے سکون مل جاتا ہے، کھینچا تانی ختم ہو جاتی ہے۔

سکونِ دل

آدمی جب غلط کاری کرتا ہے یا اللہ کے احکام سے روگردانی کرتا ہے اور حکمتِ الٰہی کو نہیں سمجھتا تو دنیا میں بھی اس کی سانسیں اس کیلئے عذاب بن جاتی ہیں، اس کے دل کو سکون نہیں ملتا، اس کے دل پر آخرت کا عکس پڑتا رہتا ہے۔ اگر آخرت میں اپنے لئے جہنم خرید رہا ہے تو اس کی تپش یہاں دنیا میں بھی اس کے دل کو پہنچتی رہتی ہے، اسے سکون نصیب نہیں ہوتا۔ اور نیکی کرتا ہے تو آخرت میں اس کے درجات بلند ہو رہے ہوتے ہیں اور دنیا میں بھی سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کی ٹھنڈک اور خوشبو اُسے نصیب رہتی ہے۔ اللہ نقد در نقد حساب کرتا ہے، ادائیگی فوری ہوتی ہے۔ جو کچھ بندہ کرتا

چلا جاتا ہے اس کی ادائیگی اسے ہوتی چلی جاتی ہے۔ نیکی کی ادائیگی سکون ہے، بندہ اطمینان سے جیتا ہے۔ برائی بے سکونی پہنچاتی ہے۔ لوگ دکھوں کو بھلانے کیلئے نشے کرتے ہیں، ہوش میں آتے ہیں تو دکھ کئی گنا بڑھ چکے ہوتے ہیں۔

باتیں دل میں کیوں نہیں اترتیں؟

یہ جو ہم روز قرآنِ حکیم، احادیثِ مبارکہ اور علماءِ حق کے مواعظ سنتے رہتے ہیں، بیشمار مضامین بھی پڑھتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو ہمارا کردار اِسلام کے مطابق نہیں رہتا، ہم برائی کی طرف چلے جاتے ہیں، سود کھاتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور غلطیاں کرتے چلے جاتے ہیں، یہ کیوں ہوتا ہے؟ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ باتیں ہمارے سر سے گزر جاتی ہیں، دلوں میں نہیں اترتیں، کیوں نہیں اترتیں۔ وہ بندے کا اپنا کردار ہوتا ہے، اس کے اعمال ہوتے ہیں۔ جو برائیاں وہ کرتا ہے، وہ دل کو سیاہ کرتی ہیں كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (المطففین:14) ان کے دل زنگ خوردہ ہو گئے ہیں، کسی کام کے نہیں رہے۔ اس لئے اپنے اعمال و کردار کی ایک ایک حرکت کی خبر رکھنی چاہئے۔

انسان دنیا کی اتنی خبر رکھتا ہے تو اپنی خبر کیوں نہیں رکھتا، اپنی بات کیوں نہیں کرتا، اپنے آپ کو تلاش کیوں نہیں کرتا کہ میں کیا ہوں۔ اصل سوچنے کی بات یہ ہے کہ میرے اللہ کا حکم کیا ہے، میرے نبی ﷺ کی سنت کیا ہے اور میں کیا کر رہا ہوں؟ دوسروں کو بعد میں سوچو پہلے اپنے بارے سوچو۔ جو اپنے بارے میں سوچتے ہیں ان کے پاس فرصت ہی نہیں بچتی کہ کسی اور کے بارے میں سوچیں۔

دل اور دماغ

حضور اکرم ﷺ کی ذات کائنات میں افضل ترین ہستی ہے۔ آپ ﷺ خیر البشر ہیں، کوئی دوسرا بشر آپ ﷺ کا ثانی اور آپ ﷺ کی مثال نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ

امام الانبیاء ہیں۔ جس طرح آپ ﷺ کی ذات بے مثل و بے مثال ہے، اسی طرح آپ ﷺ کا ایک ایک جزوِ بدن، ایک ایک قطرۂ خون مبارک، ایک ایک بال مبارک، بے مثل و بے مثال ہے۔ آپ ﷺ کا دماغِ عالی بھی کائنات میں منفرد ہے، کوئی دُوسرا دماغ اس پائے کا اللہ نے تخلیق نہیں فرمایا لیکن اس کے باوجود خطابِ الٰہی کا سزاوار قلبِ اطہر رسول اللہ ﷺ ہے کہ دل ہی میں وہ قوت ہے جو اللہ کے کلام کو حاصل کر سکے۔

میں نے بعض علماء کو بھی سنا، جب اُن سے یہ سوال کیا گیا تو فرما رہے تھے "قلب سے مراد دماغ ہی ہے"۔ بڑے بڑے فاضل، برائے نام وردانشور جو ٹی وی پر بیان کرتے ہیں اور پاکستانی ہی نہیں، غیر ملکی سکالرز بھی یہی کہتے ہیں کہ ساری بات سمجھنا دماغ کا کام ہے، دماغ ہی کو عقل کہتے ہیں۔ سارا بھلا برا سمجھنا دماغ کا کام ہے۔ اگلے دن بھی ٹی وی پر ایک شخص بڑا زور لگا رہا تھا کہ جہاں جہاں قلب کا لفظ آیا ہے، اُس سے مراد دماغ ہے۔ یہ لوگ پڑھ لکھ کر کیوں گمراہ ہو جاتے ہیں؟ اس لئے کہ پڑھ لکھ تو جاتے ہیں، اتباعِ رسالت ﷺ نصیب نہیں ہوتا۔ زندگی نبی کریم ﷺ کی مرضی سے نہیں، اپنی مرضی سے گزارتے ہیں اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے دِل مُردہ ہو جاتے ہیں۔ قلب سے مراد دماغ کیسے ہو گیا؟ قرآن کا بہترین معنی وہ ہے جو خود قرآن سے لیا جائے، پھر نبی کریم ﷺ نے سمجھایا، صحابہ کرامؓ نے سمجھا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ (الاحزاب:4) کسی انسان کے پہلو میں، اس کے سینے میں، ہم نے دو دل نہیں رکھے۔ کیا کسی نے قلب کو دماغ سمجھا ہے؟ حالانکہ دماغ تو سینے میں نہیں ہوتا، دماغ تو سر میں ہوتا ہے، تو یہ دماغ کو دل کیسے کہتے ہیں؟

دماغ مادی ہے اور مادی وجود (بدن) کی ضروریات کا ادراک کرنا، ان کو پورا کرنے کے بارے میں سوچنا دماغ کا کام ہے۔ دماغ اگرچہ کیفیاتِ ایمانی نہیں پا سکتا

لیکن عظمتِ باری، صداقتِ نبوت، آخرت کے عذاب و ثواب کے دلائل سمجھ سکتا ہے۔ موجودہ ایجادات انسانی دماغ (ذہن) ہی کا کرشمہ ہیں حالانکہ ماہرین کے مطابق ابھی انسان نے اپنے دماغ کا، اپنے ذہن کا، اپنی عقل کا محض 10 یا 14 فیصد استعمال کیا ہے۔ جب یہ قوت سو (100) فیصد استعمال ہوگی تو کیا کیا ایجادات ہوں گی اور دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؟

قلب ایک لطیفہ رُبانی ہے جو اس دل کے اندر ہے اور وہ دماغ پر بھی حکمران ہے۔ حقیقتاً دل ہی بادشاہ ہوتا ہے۔ دماغ ایک کنٹرولنگ اتھارٹی (Controlling Authority) ہے۔ دماغ بھی وہ کام کرتا ہے جو دِل کہتا ہے۔ دماغ خود سیکریٹریٹ ہے، ادارہ ہے حکومت چلانے کا لیکن حاکم نہیں ہے۔ اس کا بادشاہ، صدر یا وزیرِ اعظم دل ہے۔ آپ کتنے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ بعض اُمور کو اُن کا دماغ نہیں چاہتا کہ وہ کریں لیکن وہ کرتے ہیں۔ جو جواری جوئے میں ہارتا ہے اس کا دماغ بھی اسے سمجھاتا ہے کہ یہ کیوں کرتے ہو؟ لیکن وہ کہتا ہے کہ دل چاہتا ہے۔

دماغ مشورہ تو دے سکتا ہے روک نہیں سکتا۔ جو فیصلہ دل کرتا ہے دماغ اس پر عمل درآمد کرتا ہے۔ مشورہ دے سکتا ہے لیکن دل کا فیصلہ رد نہیں کر سکتا۔ دل وہ جگہ ہے جہاں خواہشات پیدا ہوتی ہیں، آرزوئیں جنم لیتی ہیں، ارادے بنتے ہیں، پھر وہ دماغ تک جاتے ہیں، آگے implement ہوتے ہیں اور دل ہی میں وہ لطیفہ رُبانی ہے جو انوارات رُبانی کو اپنے اندر سمو سکتا ہے، جو کلامِ باری کا مفہوم سمجھ سکتا ہے، جو اللہ کی طلب کر سکتا ہے، جو اللہ کو جان سکتا ہے، جو اللہ کو پہچان سکتا ہے۔ یہ کام دماغ کی رسائی سے بالاتر ہے۔

دلائل دماغ کیلئے ہوتے ہیں، دل کیلئے نہیں

الفاظ دماغ کو متاثر کرتے ہیں، دلائل دماغ کیلئے ہوتے ہیں، آپ جتنی دلیلیں

بھی دیں وہ دماغ کو قائل کرنے کیلئے ہیں، دل کیلئے دلیل نہیں ہوتی، دل دلیلوں کو نہیں مانتا۔ آپ بدکاروں کو دیکھیں، چوروں کو دیکھیں، جواریوں کو دیکھیں، شرابیوں کو دیکھیں، آپ آرام سے ان کو پاس بٹھا کر ان کی بات سننے کی کوشش کریں گے تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ وہ شراب نہیں پینا چاہتے، یہ انہیں نقصان دے رہی ہے، صحت بھی تباہ ہو رہی ہے، مال بھی برباد ہو رہا ہے۔ وہ جوا نہیں کھیلنا چاہتے، اپنی ساری جائیداد وہ جوئے میں ہار چکے ہیں تو پھر وہ کیوں کھیلتے ہیں؟ کہیں گے، دل کرتا ہے۔ اب عقل کے پاس تو ثبوت بھی موجود ہیں کہ یہ بُرا کام ہے لیکن دل اس کے ثبوتوں کی پروا نہیں کرتا۔ دل چاہتا ہے، عقل بے بس ہے، مجبور ہے۔ اعضاء و جوارح وہی کام کرتے ہیں جو دل کہتا ہے۔

اسی لئے اللہ کا رسول ﷺ عقل سے بات کرنے سے پہلے دِل سے ارشاد فرماتا ہے۔ حضور ﷺ پہلے تزکیہ فرماتے ہیں۔ فرائضِ نبوت میں پہلے تزکیہ ہے کہ پہلے دل سے بات کی جائے۔ وہ کیفیات دل میں اتاری جائیں، دل کو پاک کیا جائے، پھر عقل کو دلائل سے قائل کیا جائے، پھر کتاب کی تعلیم دی جائے، پھر حکمت کی تعلیم دی جائے تو وہ تعلیمِ کتاب و حکمت جو ہوگی، وہ انسان کی عملی زندگی میں رہنمائی کرے گی، اس لئے کہ اس کا دل اس پر عمل کرنے کیلئے پہلے سے تیار بیٹھا ہوگا۔

کتاب اللہ کا نزول حضور ﷺ کے قلبِ اطہر پر ہوا حالانکہ آپ ﷺ کا دماغ عالی بھی بے مثال تھا۔ کتاب اللہ ذہن کو مطمئن تو کر دیتی ہے اور اس کا کوئی حکم خلافِ عقل نہیں ہوتا مگر اسے قبول کرنا اور سمجھنا، یہ دل کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے محروم رہے، انہیں عقلی دلائل نے لاجواب تو کر دیا مگر وہ خود کو قائل نہ کر سکے یا وہ قبول کرنے سے محروم رہے۔

دماغ دل کے تابع ہے

دماغ جسم کا سیکریٹیریٹ ہے اور جسم کے ہر ہر حصے کی حرکت اس کی نتائج ہے۔ جب وہ حکم دیتا ہے تو اس کے حکم کے مطابق ہی حرکت وسکون پیدا ہوتے ہیں اور بڑی عجیب بات یہ بھی ہے اور یہ خصوصاً قابلِ غور ہے کہ اعضاء کی حرکت سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں، ان سے دماغ ضرور متاثر ہوتا ہے۔

دماغ کسی خواہش کی تکمیل کیلئے اعضاء کو احکام جاری کرتا ہے۔ اگر نتیجہ اس کے مطابق ہو تو دماغ کو فرحت وانبساط نصیب ہوتا ہے لیکن نتیجہ خلافِ توقع ہو تو دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور اگر یہ پریشانیاں مسلسل ہوں یا کوئی ایک بڑی پریشانی بھی دماغی امراض کا سبب بن سکتی ہے اور پھر ماہرین مختلف طریقوں سے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس کے اثرات سے اس کو نکالا جا سکے۔

میرے خیال سے میڈیکل سائنس کی تمام کاوشوں کی حد یہاں تک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ خواہش کہاں سے آتی ہے؟ کیا دماغ از خود خواہش کرتا ہے یا کوئی دوسرا ہے جو دماغ سے بھی بڑی طاقت ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے کام بھی کرتے ہیں جن کو خود ان کی عقل بھی درست نہیں سمجھتی تو پھر ایسا کام کیوں کرتے ہیں؟ مثلاً ایک آدمی نشہ کرتا ہے، اس کا دماغ بھی کہتا ہے کہ یہ غلط ہے مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دل دماغ پر حکومت کرتا ہے اور خواہش و آرزو دل میں پیدا ہوتی ہے۔

مگر دل تو محض ایک مشین ہے جو بدن کو خون پہنچاتی ہے اور بس۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسی مشین کے اندر ایک لطیفۂ ربانی ہے جسے قلب کہا گیا ہے اور کتاب اللہ میں اس کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ دراصل انسانی زندگی کی تمام خواہشات اور آرزوؤں کا مرکز یہی

لطیفۂ قلب ہے۔ اس میں عجیب صلاحیتیں ہیں کہ یہ اپنے خالقِ حقیقی سے مربوط ہو سکتا ہے، کیفیاتِ ہجر و وصال سے دوچار ہوتا ہے، روشن اور صاف ہو جاتا ہے تو اس کی خواہشات بھی اجلی اجلی اور شفاف ہوتی ہیں۔ اگر غلط خواہشات بطورِ احکام دماغ کو جاتی ہیں، اور ان کی تکمیل ہوتی ہے تو وقتی لذت ضرور ملتی ہے لیکن اس کے اثرات بد سے جسمانی صحت بھی متاثر ہوتی ہے اور دماغی صحت اس سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

دل (قلب)

دل جو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اس میں بھی ایک لطیفۂ ربانی ہے جسے قلب کہتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ یہ سب کیا ہے اور کیسے ہوا، سمجھ نہیں آتا۔ اب یہ بڑی سادہ سی بات ہے جو کہ سب کی سمجھ میں آتی ہے کہ آنکھیں ہیں تو خون، گوشت اور پانی ہی لیکن ان میں بصارت ہے۔ زبان ہے تو گوشت کا ٹکڑا لیکن اس میں گویائی ہے۔ کان ہے تو گوشت کا ٹکڑا لیکن اس میں سماعت ہے۔ ہاتھ میں لمس ہے، گرمی سردی محسوس کرنے کی حس ساری جلد میں موجود ہے۔ دماغ میں سوچنے کی صلاحیت ہے، ناک میں سونگھنے کی حس، صلاحیت ہے۔ آنکھ، کان، زبان، ناک ویسے ہی گوشت کے ٹکڑے ہیں لیکن ان میں بصارت، سماعت، گویائی اور سونگھنے کے کمالات ہیں لیکن جب دل پہ بات آتی ہے تو کہتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتا کہ اس میں لطیفۂ ربانی کس طرح سے ہے، جسے قرآن قلب کہتا ہے۔ سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو اللہ کے پاس اپنے قلب کو سلامت لایا اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعرآء:89) یہ مراد نہیں ہے کہ یہ جو دھڑکنے والا گوشت کا لوتھڑا سلامت لے آیا، یہ تو سب کا سلامت ہی جاتا ہے۔ جب تک زندہ رہتے ہیں، دھڑکتا رہتا ہے، جب دھڑکنا بند کرتا ہے تو آگے چلا جاتا ہے اس وقت یہ کٹا ہوا تو آگے نہیں جاتا۔

قلب کی سلامتی سے مراد وہ لطیفہ ربانی ہے، وہ کمال ہے جو اس پمپنگ مشین کے اندر ودیعت کر دیا گیا ہے۔ وہ سلامت کیسے ہو؟ اس کا اپنا ایک جہان ہے، اسے بھلا چاہئے، روشنی چاہئے، نور چاہئے، زندگی چاہئے، حیات چاہئے، روح چاہئے اور قلوب کی روح ہوتی ہے نورِ نبوت۔ اگر نورِ نبوت نہ ملے تو قرآنِ حکیم اسے زندہ شمار نہیں کرتا۔ یعنی جس طرح انسانی وجود روح کے بغیر محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اسی طرح قلب میں نورِ نبوت نہ پہنچے تو وہ ایک مُردار شے ہوتا ہے، نورِ نبوت اسے حیات دیتا ہے۔ تو ہم جو اقرار کرتے ہیں لا الہ الا اللہ محمد ارسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے اقرار باللسان وتصدیق بالقلب زبان سے میں نے اقرار کیا اور میرا قلب (دل) اس پر یقین کرتا ہے۔ اگر تصدیقِ قلبی نہ ہو تو بندہ مسلمان نہیں ہوتا۔ تصدیقِ قلبی یہ ہے کہ دل کا تعلق نورِ نبوت سے قائم ہو۔ اب اسے تربیت کی ضرورت ہے۔

بڑی عجیب بات ہے آپ دماغ کو تربیت دینے کیلئے بیس پچیس برس یا ساری زندگی مختلف انسٹی ٹیوشنز، اداروں، مدارس، یونیورسٹیوں میں دھکے کھاتے ہیں تب جا کر کہیں بات بنتی ہے لیکن جب دل کو جلا ملتی ہے دل کو حیات ملتی ہے تو خواہ کوئی علم کسی نے سیکھا یا نہ سیکھا، ان اعضاء و جوارح میں اس کے خزانے آجاتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔

دراصل کرنے کا کام یہی ہے، باقی سارے کام اس مقصد کیلئے ہیں کہ یہ کام نصیب ہو۔ یہ اللہ کریم کا احسان ہے کہ ہمیں اس طرح گھیر کر اگلوں نے یہ نعمت پہنچائی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم پرائمری کے استادوں کے پیچھے پھرے، مڈل، ہائی سکول کے استادوں کے پیچھے پھرے، نوکری کے لئے لوگوں کے پیچھے پھرے، محنت مشقت کیلئے لوگوں کے پیچھے پھرے، لیکن اس دولت کیلئے ہم نہیں گئے، انہوں نے ہمیں پکڑ کر عطا کی۔ جو سب سے

قیمتی چیز تھی، اسے ڈھونڈنے کیلئے ہم نہیں گئے، دینے والوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر، پکڑ پکڑ کر کہا تم بھی لے لو یار! کام آئے گی، تم بھی لے لو اور ہم ہیں کہ ابھی تک بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ لطیفۂ ربانی ہوتا بھی ہے کہ نہیں۔

میرے بھائی! بات بڑی سادہ اور سیدھی سی ہے کہ اس کے بغیر انسان، انسان نہیں رہتا اور یہ نصیب ہو جائے تو زندگی اور موت کا حقیقی تصور سامنے آتا ہے۔

دل کی حیات کا تعلق ایمان سے ہے

جس طرح بدن کا تعلق روح سے ہے کہ اس میں روح ہوتی ہے تو یہ زندہ ہوتا ہے اور روح نہیں ہوتی تو گل سڑ جاتا ہے، بکھر جاتا ہے، لاش بن جاتا ہے اسی طرح دل کی حیات کا تعلق ایمان سے ہے اور ایمان کی قوت ہی اس کی حیات میں، اس کی بصیرت میں، اس کی بصارت میں، اس کی سماعت میں، اس کے سمجھنے میں، اس کے شعور میں قوت پیدا کرتی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کیا یہ لوگ زمین میں چل پھر کر دیکھتے نہیں؟ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ کاش ان کے پاس دل ہوتے یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ جس سے انہیں بات سمجھ آتی، اس فلسفے کو اپنی عقل میں بھی سمو لیتے کہ یہ جو بربادی کے نشان ہیں اور آبادیوں کے کھنڈرات بنے ہوئے ہیں اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ان کے کان سلامت ہوتے تو زبانِ حال سے جو کچھ یہ چیزیں بتا رہی ہیں، یہ سنتے۔ فرمایا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ یہ لوگ آنکھوں کے اندھے نہیں ہیں، ظاہری آنکھوں سے تو دیکھ رہے ہیں وَ لٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (الحج:46) لیکن اس سے متاثر ہونا دل کا کام ہے جبکہ ان کے دل بینا نہیں ہیں، ان کے دلوں میں حیات نہیں ہے یا ان کے دل بیہوش ہیں، سوئے ہوئے ہیں۔

دماغ مادی ہے اور مادی وجود کی ضروریات کا ادراک کرنا، ان کو پورا کرنے کے بارے میں سوچنا دماغ کا کام ہے۔ عقل، فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ علوم کتابوں سے، تجربات سے جلا پاتی ہے۔ حالات و واقعات سے سبق سیکھتی ہے اور مادی دنیا کے عجائب و غرائب کو ترقی دیتی ہے۔ کردار کے ساتھ یا تعمیرِ کردار کے ساتھ عقل کا کوئی تعلق نہیں۔ عقل، جسم کی مادی سہولتوں کی بات کرتی ہے، جسمانی لذتوں کے حصول کی بات کرتی ہے، جسمانی اور مادی راحتوں کی بات کرتی ہے اور یہی اس کی منتہائے منزل ہے کہ اپنی ساری قوت صرف کر کے اپنے وجود کو زیادہ سے زیادہ لذتیں فراہم کرے، آرام فراہم کرے۔ عقل کی رسائی ہی مادی ضروریات، مادی فوائد و نقصانات تک ہے۔ وہ مادی ضروریات کی تکمیل کیلئے ہی بنائی گئی ہے اور اس کی پہنچ وہیں تک ہے۔

اس سے آگے کی باتیں سمجھنا قلب کا کام ہے۔ دل میں جب تک نورِ ایمان نہ ہو اس میں حیات نہیں۔ نورِ ایمان کے بغیر دل مردہ ہے۔ جب دل کو حیات بھی نصیب ہو اور برکاتِ نبوت بھی تو اس میں وہ قوت و بصیرت اور دور بینی آجاتی ہے کہ بندہ اپنے لمحات کو قیمتی سمجھ کر ان کو گن گن کر بھلائی کے کاموں میں بسر کرتا ہے اور جنہیں یہ چیزیں نصیب نہ ہوں وہ صرف زندگی گزارتے ہیں، اسے بسر نہیں کرتے۔ اس کی مثالیں آج کے دور میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بیشمار ایسے لوگ ہیں جب ان سے پوچھیں کہ کیا ہو رہا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بس وقت گزار رہے ہیں۔ بھلا جس بندے کو رب العالمین نے گن گن کر سانسیں دی ہوں، جس کے پاس گنتی کے لمحات ہوں وہ انہیں فضول کیوں گزار رہا ہے؟ اس لئے کہ اسے احساس ہی نہیں کہ اس کی قیمت کتنی ہے۔

اسی طرح روح کی بھی ضروریات ہیں اور ان ضروریات کا ادراک کرنے

انہیں پورا کرنے کی استعداد اللہ نے قلب کو عطا کی ہے۔ جس طرح بدن کو دل، دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ دیئے ہیں، اسی طرح روح کو عالمِ امر کے لطائفِ خمسہ دیئے ہیں۔ قلب، روح، سری، خفی اور اخفاء۔ یہ لطائفِ ربانی عالمِ امر سے ہیں جو روح کے اعضائے رئیسہ ہیں۔ روح چیزِ دیگر است۔

☆ جس طرح بدن کے اعضائے رئیسہ دل، گردے یا جگر کام چھوڑ دیں تو بدن سلامت نہیں رہتا اور اگر دماغ ہی کام کرنا چھوڑ دے تو خود وجودِ انسانی کو اپنا ہوش نہیں رہتا، کھانے پینے، لباس وغیرہ کا ہوش نہیں رہتا۔

☆ اسی طرح اگر روح کے اعضائے رئیسہ میں حیات نہ رہے تو پھر انسان روح کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ کس کھائی میں گرتا ہے، اسے اس کا شعور نہیں رہتا۔

جو لوگ عظمتِ پیغمبر ﷺ سے آشنا نہیں ہوتے، ان کے مادی اعضائے رئیسہ (دل، دماغ، گردے، جگر۔۔۔) کام کر رہے ہوتے ہیں، انہیں دنیا کی نعمتیں نظر آتی ہیں، دنیا کی لذتیں محسوس ہوتی ہیں، دنیا کی بڑائی کا خیال رہتا ہے لیکن دنیا میں دھنس جاتے ہیں اور روح کی بالیدگی سے محروم ہو کر آخرت کو بھول جاتے ہیں۔

روح بدن کو اپنی سواری سمجھتی ہے۔ روح کو جو روحانی لذتیں، روحانی قربتیں، روحانی مقامات نصیب ہوتے ہیں، اُن کو وہ جسمانی اعضاء پر لاگو کر دیتی ہے۔ وہ جسم کی پروا نہیں کرتی کہ اسے سردیوں میں سحری کے وقت اٹھ کر وضو کرنا پڑے گا، آدھی رات کو اٹھ کر اسے سجدے کرنے سے تکلیف ہوگی، وہ کہتی ہے، اسے تکلیف ہوگی، ہونی چاہئے لیکن میرا سفر تو کٹے گا۔ روحانی برکات یا روح کی ترقی یا روح کی تعلیم یا روح کے معاملات سارے برکاتِ نبوی ﷺ سے متعلق ہیں۔ جب روح قوی ہوتی ہے، جب روحانی اسباق کسی کو نصیب ہوتے ہیں تو کردار کی اصلاح یقینی ہوتی ہے یعنی وہ بدن کو اس کی

سہولتوں کے تابع نہیں کرتی بلکہ ان احکام کے تابع کرتی ہے جن سے اسے قربِ الٰہی نصیب ہو اور اس کا کردار ایک سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے تو کسی مفکر نے کہا تھا کہ اسلام ماننے کا نام نہیں ہے، اسلام جینے کا نام ہے۔ اسلام پہنا جائے، اسلام اوڑھا جائے، اسلام برتا جائے، اسلام جیا جائے۔ اسلام جینے کی چیز ہے کیونکہ اس کا تعلق روح کے قرار سے ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ہر لفظ میں، ہر عمل میں، ہر قدم مبارک میں صداقت اور نور ہے۔ تو لوگ نور کو، صداقت و شرافت کو، پیغامِ الٰہی کی عظمت کو چھوڑ کر رذالت و نجاست کی طرف کیوں لپکتے ہیں؟ اس لئے کہ جو لطائفِ ربانی ان کے پاس تھے، وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ مادی لذتوں، مادی غذاؤں سے مادی احساسات کو جگاتے رہے، انہی پر فریفتہ ہوتے رہے۔ مادہ سامنے تھا، اسی پر لپکتے رہے اور روح جو باطن میں تھی، جس کے لطائفِ ربانی کو باطن سے حیات ملنا تھی، اس کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ روح کے اعضائے رئیسہ (قلب، روح، سری، خفی اور اخفاء) کی حیات کیلئے سینے میں ایک چراغ تھا، اس میں بتی بھی تھی، تیل بھی تھا لیکن اس میں روشنی نورِ نبوت سے آنی تھی، اس نے یہ چراغ ہی روشن نہ کیا۔ جب اس میں روشنی ہی نہ آنے دی تو انسان روح کی طرف سے بے خبر ہو گیا، اسے پھر آخرت کی فکر ہی نہ رہی، وہ صرف دنیا ہی کا ہو کر رہ گیا۔

جب بندہ اس راستے کا انتخاب کر لیتا ہے تو اس کی سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے، اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اس کی سمجھ الٹی ہو جاتی ہے۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَ سَمْعِھِمْ وَ اَبْصَارِھِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ (النحل: 108) لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوئی کافر اندھا یا بہرا نہیں ہوتا۔ زندگی میں اُس کے دل کی دھڑکن بھی بند نہیں ہوتی، نظر بھی صحیح آتا ہے، اُس کی سماعت بھی اچھی بھلی

ہوتی ہے تو پھر یہ کس سماعت اور بصارت پر مہر کی بات ہو رہی ہے؟ یہ باطن کی آنکھ، باطن کی بصارت کی بات ہو رہی ہے ورنہ سماعت میں تو بعض جانور انسانوں سے بھی آگے ہیں۔ بعض جانوروں کی قوتِ سماعت انسانوں سے چالیس گنا زیادہ ہے لیکن کیا وہ انبیاءؑ کی تعلیمات کو سمجھنے کی استطاعت رکھتے ہیں؟ ان میں نیک و بد کا شعور ہے؟ اسی طرح بعض جانوروں کی قوتِ بصارت بھی انسانوں کی نسبت زیادہ ہے۔ اتنی تیز بصارت کے باوجود کیا اُنو اتنا نکتہ سنج ہے کہ وہ روح کے معاملات کو، صداقتِ انبیاءؑ کو، آخرت کے امور کو سمجھ سکے۔

عقلِ انسانی کی مجبوری

ایک ایسی طاقت کو ماننا کہ وہ آخری طاقت ہے، یہ عقلِ انسانی کی مجبوری ہے۔ جو لوگ کسی مذہب کو نہیں مانتے، درحقیقت یہ بھی ایک مذہب ہے کہ کسی مذہب کو نہ مانا جائے۔ اسی طرح ہندوؤں کے بہت سارے فرقے ہیں۔ بیشمار بتوں کو دیوی، دیوتاؤں کے نام سے مانتے ہیں لیکن تمام دیویوں کو، دیوتاؤں کو کچھ نہ کچھ اختیار دیتے چلے جاتے ہیں۔ پھر آخر میں انہیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ مہادیو ہے۔ سب سے بڑا دیوتا ہے کہ سارے اس کے تابع ہیں۔

عقلِ انسانی کی یہ مجبوری ہے کہ آخراً سے ایک ایسی طاقت کو ماننا پڑتا ہے جو سب پر غالب ہے۔ تخلیق کے اعتبار سے چلیں تو پھر انسان سوچتا ہے کہ اس دیوتا کو کس نے بنایا؟ اُس نے بنایا۔ اُسے کس نے بنایا؟ اُس نے بنایا۔ تو پھر اُسے کس نے بنایا؟ آپ چلتے رہیں، جب تک ایک آخری طاقت نہ مان لیں جو اپنی ذات سے قائم ہے، اُسے کسی نے نہیں بنایا، تب تک تسلسل ختم نہیں ہوتا۔ لہٰذا مجبوراً عقلِ انسانی کو ایک آخری طاقت کو ماننا پڑتا ہے، یہ عقل کی مجبوری ہے اور یہی معرفتِ الٰہی کا دروازہ ہے۔

اولوالالباب (عقل مند) کون؟

عقلمند وہ ہیں جن کے دل میں شعور ہے، جو اللہ کو پہچانتے ہیں، بے ساختہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ غیر شعوری طور پر بھی، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (آل عمران:191) عقل دماغ میں نہیں ہوتی، عقل دل میں ہوتی ہے۔ دماغ کی عقل مادی ہوتی ہے اور دل کی عقل عالمِ امر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ میری بات نہیں، یہ آپ کا بھی تجربہ ہوگا کہ جو لوگ صرف دماغ کی عقل پر بھروسہ کر کے محمد رسول اللہ ﷺ کی رہنمائی چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ کو خود سمجھ سکتے ہیں، وہ اپنی مرضی سے ترجمے ایجاد کرتے ہیں، اپنی مرضی سے تفسیریں بناتے ہیں، پیغمبر ﷺ کی حدیثوں کو ٹھکراتے ہیں، پھر گمراہ ہو جاتے ہیں اور کفر میں مرجاتے ہیں۔ اُن کا حال یہی ہوتا ہے، وہ اللہ کی بارگاہ سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ باپ دادا مسلمان، پشت ہا پشت سے مسلمان، خود مسلمان، آدھی زندگی اسلام میں بسر کر دی، آج انہیں کیا ہو گیا؟ ان کی جڑ وہاں سے کٹ گئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ عقل دماغ میں نہیں ہوتی بلکہ عقل دل میں ہوتی ہے اور دانشور وہی ہیں جن کے دل میں شعور ہے، جو اللہ کو پہچانتے ہیں، اللہ کے حبیب ﷺ کو پہچانتے ہیں۔

میرے بھائی! جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ چشمے جاری ہوتے ہیں، اسی طرح قلبِ اطہر ﷺ سے دلوں کو نہریں جاتی ہیں، دلوں کو سوتے جاتے ہیں، دلوں کو چشمے جاتے ہیں اور جب وہ اس وجود کی کھیتی میں پہنچتے ہیں تو پھر وہاں سے طرح طرح کے پھول نکلتے ہیں۔ کوئی مفسر بنتے ہیں، کوئی محدث بنتے ہیں، کوئی فقیہہ بنتے ہیں، کوئی عابد و زاہد بنتے ہیں، کوئی ولی اللہ بنتے ہیں، کوئی غوث اور قطب بنتے ہیں، کوئی مجاہد غازی اور شہید بنتے ہیں۔ اپنی اپنی استعداد، اپنی اپنی قوت، اپنی اپنی طاقت کے مطابق فیضانِ نبوی ﷺ کو لوگ

حاصل کرتے ہیں اور جب مومن کے دل کا تعلق محمد رسول اللہ ﷺ سے کمزور پڑتا ہے تو اس سے سب کچھ چھوٹنا شروع ہو جاتا ہے اور اعتراضات سر اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ بات بڑھتے بڑھتے ایمان بھی ضبط ہو جاتا ہے۔ جب جڑ ہی سوکھ گئی تو پھر کیا بچے گا؟

قلبِ مومن کی وسعت

کیفیات، ایمان اور اعمال کے بدلے قلوب پر مرتب ہوتی ہیں کہ ایک تسبیح قبول ہو جائے، اس کا نور دل میں پیدا ہو جائے تو نجات کیلئے کافی ہے۔ زندگی میں کتنے فرائض، کتنے واجبات، کتنے نوافل، کتنے سجدے، کتنی تسبیحات، کتنے اذکار اور ہر ذکر پر ایک تجلی، ہر لمحے ایک نئی روشنی، ہر آن ایک نیا نور، ایک دل کو کیا کیا دیتا چلا جاتا ہے اور وہ کیا کیا کما لیتا ہے۔ یہ زمینیں، یہ آسمان، یہ عرشوں کی وسعتیں سمٹ جاتی ہیں اور مومن کا قلب پھیلتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے، اتنا پھیلتا ہے کہ سب سے کم درجے کا مسلمان جو صرف نجات پا کر جنت میں پہنچ جائے گا، اس کے پاس جو بھی جنت ہوگی وہ ملکِ کبیر ہوگا۔

ختمِ قلوب

اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے، کانوں پر مہر کر دی ہے اور آنکھوں پر پردے گرا دیئے ہیں اور انہیں بہت شدید عذاب ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے مہر زبردستی نہیں کی۔ بارگاہِ رسالت ﷺ میں یہی سوال کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! جب اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی تو پھر ان کا کیا قصور ہے؟ تو فرمایا: اللہ نے زبردستی مہر نہیں کر دی۔ جب بندہ ظلم کرتا ہے، گناہ کرتا ہے تو دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، توبہ سے دھو ڈالے تو دھل جاتا ہے۔ توبہ نہیں کرتا، پھر ظلم کرتا ہے تو وہ نقطے اور بڑھتے رہتے ہیں۔ جب سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے تو اللہ ناراض ہو کر مہر کر دیتا ہے کہ تم رہو اب اس حال میں۔ اب تمہیں توبہ بھی نصیب نہیں ہوگی، اب بات بھی سمجھ نہیں آئے گی۔

قرآنِ کریم میں اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آنکھیں رکھتے ہیں مگر اندھے ہیں۔ اللہ نے کیسے اندھا کیا انہیں، اس طرح کہ وہ حضورِ اکرم ﷺ کے وجودِ اطہر کو دیکھ رہے ہیں لیکن وہ انہیں اپنا ایک قریشی بھائی سمجھتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نہیں سمجھتے۔ اگر آپ ﷺ کے ارشاداتِ عالی سنتے تو انکار کیوں کرتے، سوال، جواب کیوں کرتے، اعتراض کیوں کرتے؟ وہ سب کچھ کرتے رہے۔ اس کا مطلب ہے سنتے بھی ہیں، دیکھتے بھی ہیں لیکن اللہ کریم فرماتا ہے کہ نہیں یہ سنتے بھی نہیں، دیکھتے بھی نہیں، حقیقت سے بے خبر ہیں۔ کیسی لطیف بات ہے کہ اللہ نے نگاہ میں ایسی عجیب تبدیلی کر دی کہ اندھے بھی نہیں ہوئے اور اندھے ہو بھی گئے۔

تصوف اور سلوک

تزکیہ سے کیا مراد ہے؟

قرآن کے لفظ تزکیہ کی علماء و، مفسرین نے اپنی اپنی وسعتِ نظر کے مطابق تشریحات و توجیہات کی ہیں۔ اللہ ان پر کروڑوں، کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، ہر ایک کا اپنا اپنا خیال ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآنِ حکیم کے لفظ تزکیہ کا اگر ہم فارسی یا اردو ترجمہ کریں تو وہ تصوف بنتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ترجمہ غیر ملکی زبانوں میں سب سے پہلے فارسی میں ہوا تو فارسی میں تزکیہ کا ترجمہ تصوف کر دیا گیا۔ تزکیہ، دل کی پاکیزگی ہے، صفائے قلب ہے، صفائے باطن ہے، تصوف کا معنی بھی یہی ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (آل عمران:164)

نبیؐ جو کچھ فرماتا ہے وہ تھیوری نہیں ہوتی ہے، محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اسکے ساتھ Feelings، کیفیات بھی ہوتی ہیں۔ نبیؐ جب کہتا ہے کہ اللہ ایک ہے تو جو ایمان لاتا ہے، اُسے نظر تو نہیں آتا لیکن وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ وہ ہے ایک ہی۔ اِن نگاہوں سے نظر نہیں آتا لیکن ایسی کیفیت اس پر وارد ہوتی ہے کہ ان آنکھوں سے دیکھنے سے زیادہ اسے یقین ہو جاتا ہے۔

تزکیہ، جو حضور ﷺ نے فرمایا، وہ کیا تھا؟ آپ ﷺ نے جو تزکیہ فرمایا وہ دلوں کی پاکیزگی تھی۔ نہا دھو کر صاف کپڑے پہن لینا تزکیہ نہیں ہوتا، یہ تو پہلے بھی ہوتا تھا، حضور ﷺ نے دلوں کو پاک کر دیا۔ فرائضِ نبوت میں پہلے تزکیہ ہے کہ پہلے بات دل سے کی جائے، پھر عقل کو دلائل سے قائل کیا جائے، پھر کتاب و حکمت کی تعلیم دی جائے تو وہ تعلیم انسان کی عملی زندگی میں رہنمائی کا کام کرے گی، اس لئے کہ دل اس پر عمل کرنے کیلئے پہلے

سے تیار بیٹھا ہوگا۔

تزکیے سے مراد یہ ہے کہ اس کے قلب میں وہ کیفیات بھر دی جائیں کہ جو اس کی سوچ میں آئے وہ مثبت آئے، اس میں طلبِ حق پیدا ہو، اس کے دل میں جو جھاڑ جھنکار ہے، نخواہشات انسانی ہیں، خود غرضی ہے، بے شمار خرابیاں ہیں، وہ صاف کر دی جائیں۔ تزکیہ کیا ہے؟ یہ کہ انسان صرف وجود مسجد میں نہ لائے، وجود بعد میں آئے دل پہلے مسجد میں ہو۔ اب یہ کس کی ضرورت نہیں ہے کہ دل میں خلوص آجائے، قربِ الٰہی کی آرزو پیدا ہو جائے، سینے کے اندر مدینہ بنا لے، برکاتِ نبوت، دِل پر ابرِ رحمت کی طرح برستی ہوں، دِل نورِ نبوت کی کرنیں منعکس کرتا ہو اور دوسروں کیلئے بھی باعثِ ہدایت بنتا چلا جائے۔

تصوف کیا ہے؟

تصوف کا مطلب ہے "کچھ بھی نہیں"، یعنی جب کچھ بھی باقی نہ رہے صرف اللہ رہ جائے تو تصوف بن جاتا ہے۔ جب تک کچھ باقی رہے تصوف نہیں ہوتا۔ میں پیر ہوں، میں مولوی ہوں، میں بزرگ ہوں، میں تکڑا ہوں، میں فلاں ہوں، جب تک میں رہے تب تک تصوف نہیں ہوتا جب 'میں' نہ رہے، انا نہ رہے، کچھ بھی نہ رہے، پھر تصوف ہوتا ہے۔

سارے کا سارا تصوف یہ ہے کہ اللہ پر اعتماد بحال ہو جائے۔ بندہ اپنے معاملات اپنے رب سے ڈسکس کرے، اپنے رب سے لڑے بھڑے، دعا مانگے اور چیخ کر مانگے، رو رو کر مانگے، گڑگڑا کر مانگے، لڑ کر مانگے، وہ جانے اس کا رب جانے۔

تصوف صرف یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی جو پیروی کی جائے اس میں انتہائی خلوص ہو، دل کی گہرائی سے کی جائے، ان کیفیات کو تصوف کہتے ہیں۔ وہ کون سا تصوف ہے جو اطاعت ہی چھڑوا دے؟ یہ جو تصوف میں بہت سی چیزیں در آئی ہیں اور یہ سمجھا جاتا

ہے کہ یہ دین کے خلاف ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ لوگوں نے اپنی کمزوریوں کے باعث اس کو بھی دنیا کمانے کا ذریعہ بنا لیا ہے، تصوف کے نام پر لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا ہے یا مادی فوائد حاصل کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ تو یوں یہ الزام، یہ بہتان تصوف پہ آ گیا۔

تصوف دین سے الگ چیز نہیں ہے بلکہ ہم دین پر جو یقین رکھتے ہیں یا عمل کرتے ہیں یا جو ہمارا دعویٰ ہے اس میں خلوص پیدا کرنے کیلئے جو محنت کی جاتی ہے، اسے تصوف کہتے ہیں۔ دین پر جو عمل ہم کرتے ہیں اس میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کیلئے جو محنت کی جاتی ہے، وہ تصوف ہے۔ تصوف سے مراد ہے کہ عظمتِ الٰہی کا ادراک، اپنی بے مائیگی اور کم مائیگی کا احساس کہ میں کچھ بھی نہیں، سب کچھ وہی ہے۔

شریعت اور طریقت

شریعت تھیوری کو کہتے ہیں طریقت پریکٹیکل ہے، شریعت پر عمل کرنے کا نام ہے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی عمل تو کرتا ہے لیکن وہ محض خانہ پری ہوتی ہے، اس میں خلوص نہیں ہوتا، اس میں گہرائی نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز ادا کر رہے ہیں، خیال کہیں بھٹک رہا ہے، دل کہیں اور ہے، کبھی اپنے پر جبر کر کے پڑھ لی، کبھی ادا نہ کی۔ اس صورتحال سے نکل کر یہ کوشش کرنا کہ شریعت پر خلوص سے عمل کروں، شریعت کو سمجھنے کا احساس پیدا ہو، اس کیلئے جو کوشش کی جاتی ہے، اسے طریقت کہتے ہیں۔

شریعت، نام ہے ان الفاظ کا جو حضور ﷺ نے تعلیم فرمائے اور تصوف و سلوک و طریقت نام ہے دل میں اُس خلوص کی گہرائی کا جو حضور ﷺ کی اطاعت میں شامل ہو، ارشاداتِ عالی پر عمل کرنے میں شاملِ حال ہو۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، دونوں الگ نہیں ہیں۔

جنہیں واقعی کشف ہوتا ہے، وہ دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

1۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کے ذہن میں یا دل میں جو بات آتی ہے، قوتِ متخیلہ اسے متشکل کر دیتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں انہیں کشف ہوا ہے حالانکہ انہیں کشف نہیں ہوتا۔

2۔ اور جنہیں کشف ہوتا ہے اُن کیلئے تو مصیبت بن جاتی ہے۔ حضرت قاضی صاحبؒ حج پر گئے، تیس دن جہاز پہ انہوں نے کھانا نہیں کھایا، انہیں کشف ہوتا تھا۔ کہتے تھے یار! کھانا حلال بھی نہیں ہے، پاک بھی نہیں ہے، میں تو نہیں کھا سکتا۔ تو یہ انعامِ الٰہی (کشف) اطاعتِ الٰہی کیلئے ہوتا ہے۔ پھر اگر اس کا کشف شرعی حدود کے اندر ہے تو صاحبِ کشف اپنے کشف پر خود عمل کرنے کا پابند ہے اور اگر شریعت سے ٹکراتا ہے تو وہ تو ہے ہی باطل، پھر وہ کشف نہیں، شیطانی القاء ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو الہام ہوا کہ بیٹے کو دریا میں پھینک دو تو کیا بنی اسرائیل کی ساری عورتیں اپنے بچوں کو دریا میں پھینک دیتیں، وہ سارے کیا نبی بن جاتے؟ نہیں! بلکہ ڈوب جاتے۔ جب دوسرا بندہ صاحبِ کشف کا کشف ماننے کا مکلف نہیں تو مجھے لوگوں پہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ کشف والوں سے باتیں پوچھتے کیوں ہیں؟ وہ اس کے مکلف ہی نہیں ان کو اس کا فائدہ ہی نہیں ہے۔

کشف اس لیے نہیں ہوتا کہ فلاں کا کاروبار چلے گا یا نہیں؟ فلاں کی بھینس گم ہو گئی ہے، فلاں کا بیٹا بھاگ گیا ہے۔ اگر ہم اب اسے اس طرح استعمال کرنے لگ جائیں کہ تیرے بیٹے کو نوکری مل جائے گی، تیرا بیٹا پیدا ہوگا، تیرے کاروبار میں ترقی ہوگی، تو یہ کام

نجومیوں کا اور دوسرے پیشہ وروں کا ہے۔

کشف ثمرات کی قسم سے ہے پھل ہے۔ کشف منجانب اللہ ہوتا ہے اور اہل اللہ کو ہوتا ہے۔ مشاہدات، ضرورت اور مقصد نہیں محض اللہ کا انعام ہیں۔ یہ از قسم ثمرات ہوتے ہیں یا آپ اسے ایک اضافی محرک (supporting factor) کہہ لیں۔ گناہ سے بچنے کیلئے یہ اللہ کی عطا ہوتی ہے کہ بظاہر جو چیز جرم نظر نہیں آ رہی ہے اگر اس کے اندر کوئی برائی چھپی ہوئی ہے تو صاحبِ کشف کو وہ سمجھ آ جاتی ہے۔ برزخ میں نگاہ وسیع ہو جاتی ہے، مادی آلائش روح سے دُور ہو جاتی ہے اور وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔

اعلیٰ پائے کے صوفیوں کا قول ہے کہ ''تصوف میں آنے والے نو آموز طالب علموں کو اللہ ان کھلونوں سے بہلاتا ہے'' کشف کے بارے میں صوفیاء کا ارشاد ہے کہ کشف طریقت و سلوک کے بچوں کا کھلونا ہے۔ اس راستے کے مسافروں میں بعض ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں کہ ان کی ظاہری عمر خواہ کتنی طویل ہو، ان کی باطنی عمر بچوں جیسی ہوتی ہے۔ ان کا یقین بھی پختہ نہیں ہوتا۔ ایک وقت میں ایک کھلونے پر فدا ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا کھلونا دیکھ لیں تو پہلے والے کو پھینک کر دوسرے کی طرف لپکتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کا یقین مستحکم نہیں ہوتا، جب تصوف و طریقت میں آتے ہیں تو اللہ اس پر قائم رکھنے کیلئے مشاہدات کے کھلونے دے دیتا ہے اور یہ ان پر اللہ کا بہت کرم ہوتا ہے اور جو لوگ باطنی طور پر مضبوط ہوتے ہیں، ان کے مشاہدات کم ہوتے ہیں۔ حضرتؒ نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ کسی شخص کو بلند ترین منازل ہو جائیں اور اسے کشف نہ ہو تو ایسے لوگ صدیوں میں کہیں ملتے ہیں، بلکہ لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے۔ آپ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہیں بھی ایسے روحانی تجربات پیش آئے لیکن کم، اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ وہ تعمیرِ فطرت اور عملی زندگی پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ جو لوگ روحانی مشاہدات و

مکاشفات کی لذت میں مارے گئے وہ گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ مشاہدات ہرگز مقصود بالذات نہیں ہیں، انہیں منزل نہیں بنایا جا سکتا۔ مقصود یہ ہے کہ تصوف اور ذکرِ الٰہی سے آپ کی عملی زندگی میں ایک انقلاب آئے۔ جب آپ عملی زندگی میں جاتے ہیں، لوگوں سے ملتے جلتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں تو روحانی زندگی ایک حد تک متاثر ہوتی ہے اور مکاشفات کم ہونے لگتے ہیں۔

مشاہدات نہ شیخ کے اختیار میں ہوتے ہیں نہ بندے کے اپنے اختیار میں، یہ صرف اللہ کریم کے اختیار میں ہوتے ہیں اور یہ اس کی اپنی قدرتِ کاملہ ہے اور اس کی اپنی تقسیم ہے کہ وہ کس کو، کس وقت، کتنی قوتِ مشاہدہ عطا کرتا ہے۔ رہی یہ بات کہ لطائف منور ہوتے ہیں یا نہیں تو یہ ایک نگاہ اور ایک ذکر میں منور ہو جاتے ہیں۔ عملی زندگی میں مثبت تبدیلی کی فکر بیدار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سالک کی اپنی محنت ہے کہ وہ اس فکری بیداری کے بعد اعمالِ صالحہ کے لیے کتنی کوششیں کرتا ہے۔ بندے کو مشاہدہ ہوتا ہے یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ کسی کو سارے مراقبات ہو جائیں اور اسے مشاہدہ نہ ہو تو یہ اللہ کی مرضی۔

☆ جو لوگ مزاجاً کمزور ہوتے ہیں اور جن کے ڈگمگانے کا خطرہ ہوتا ہے، انہیں مشاہدات جلد کروا دیئے جاتے ہیں اور اللہ کریم مشاہدات کو ان کیلئے اس راستے پر قائم رہنے کا سبب بنا دیتے ہیں۔

☆ جو لوگ مضبوط ہوتے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ اللہ کرنے سے پہلے ان کے اعمال نیک نہیں تھے، اگر اعمال صالح کرتے تھے تو ان میں خلوص نہیں تھا، جیسا کہ انہیں ذکر کے بعد نصیب ہوا ہے اور وہ اس تبدیلی کو معیار بنا کر اس پر جمے رہتے ہیں عموماً انہیں مشاہدات کم ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو مشاہدات ہوتے ہیں وہ لوگ اپنی بہت سی محنت کا بدلہ اس دنیا میں وصول کر لیتے ہیں۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ ذاتی تشہیر کیلئے اور اپنے آپ کو بڑا منوانے کیلئے مکاشفات کا اظہار اور انہیں بیان کرنا درست نہیں۔ ایسی باتوں کو شہرت نہیں دینی چاہیے لیکن سرے سے تصوف کو بیان ہی نہ کیا جائے، اس کی تبلیغ ہی نہ کی جائے، یہ درست نہیں۔

تصوف، مشاہدہ اور نظم وضبط

انوارات کا دیکھنا، دکھانا مقصود نہیں ہے۔ ساری زندگی کسی کو کشف نہ ہو اور اس کو انوارات نظر نہ آئیں تو شیخ کے ساتھ چلنا اور شیخ کی خبر پر زندہ رہنا، یہ اس کے اعتماد کیلئے کافی ہے۔ وہ دیکھ کر دھوکا کھا سکتا ہے لیکن شیخ اُس کے ساتھ غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ انوارات نظر نہ آنے کے باوجود اگر اُس کی زندگی میں ایک ضبط آ جائے، ایک باقاعدگی آ جائے اور ایک حسِ حیات آ جائے تو اس نے گویا مقصد کو پا لیا اور ایک شخص کو آپ عرشِ عظیم تک کا مشاہدہ کروا دیجیے اور اُس کی زندگی میں کوئی ضبط اور نظم نہ آئے تو وہ اس کی چند دن بھی حفاظت نہیں کر سکے گا، پھر اس مشاہدے کا کیا فائدہ؟

ہونا تو یہ چاہیے کہ ڈنڈا ہاتھ میں ہو اور جو اُس طرح سے بے قاعدگی کرے اس کی پٹائی کی جائے کہ صوفی بنتا ہے اور جھک مارتا ہے۔ لیکن اگر کوئی زبردستی احساس دلانے والا نہیں تو پھر ہمیں بہت زیادہ احساسِ ذمہ داری اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔ جو احباب یہاں رہتے ہوئے اپنے آپ کو ضابطے کا پابند نہیں کر پاتے تو ان سے کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہ جب یہاں سے جائیں گے تو ان کے اٹھنے بیٹھنے میں کوئی باقاعدگی آ جائے گی۔ احکامِ شریعت ہر جگہ سے مل جاتے ہیں، اُن پر عمل کرنے میں خلوص کیسے پیدا کیا جائے؟ اس کیلئے ذکرِ الٰہی ضروری ہے اور اگر اس شعبے میں بھی منافقت ملے تو اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو گی؟ اگر اسے بھی دوسروں کا پیسہ ہڑپ کرنے کا ذریعہ بنا لیا جائے تو اس سے بڑا ظلم کیا

ہوگا؟ سوا اللہ کا خوف کرو، اللہ کیلئے اس کام کو خالص رہنے دو۔ تف ہے اُن لوگوں پر اور اللہ کی لعنت ہے اُن لوگوں پر جو کشف کو لوگوں سے پیسہ بٹورنے کا ذریعہ بناتے ہیں، انہیں تب پتہ چلے گا جب عندالموت یہ محاسبہ ہوگا کہ یہ کام کس لئے تھا اور تم نے اسے کہاں استعمال کیا؟

کشف، الہام، القاء، وجدان

القاء، الہام، کشف اور وجدان، دل کے پاس یہ چار ذریعے ہوتے ہیں جن سے انہیں مخاطبۂ الٰہی ہوتا ہے۔

الہام: اگر واضح الفاظ پہنچیں تو انہیں الہام کہا جاتا ہے یعنی کسی بات یا کسی چیز کے واضح الفاظ دل میں آجائیں تو وہ الہام ہوگا۔ جیسے حضرت موسیٰؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کے بارے میں قرآن کریم بڑے صاف الفاظ میں کہتا ہے وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی (القصص:7) ہم نے موسیٰ کی ماں سے بات کی تھی۔ کتنا قرب محسوس ہوتا ہے اس جملے میں "اَوْحَیْنَا" سے مراد وہ وحی نہیں تھی جو انبیاءؑ پر نازل کی جاتی ہے لیکن چونکہ یہ بات اللہ کریم کی طرف سے پوری قوت کے ساتھ اُن تک پہنچادی گئی اس لئے اسے بھی اللہ کریم نے وحی کہا ہے۔ حالانکہ وحی نبیؑ کی خصوصیت ہے اور وہ نبی نہیں تھیں، نہ ہی کوئی خاتون کبھی نبی ہوئی ہے۔ اس طریقے کو الہام کہتے ہیں۔ اب یہ جو وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی (القصص:7) ہے، تو امّ موسیٰ کو اپنے اس الہام پر اتنا یقین تھا، اتنا اعتماد تھا کہ یہ جو بات میرے دل میں آرہی ہے یہ میرے رب کی بات ہے کسی دوسرے کی نہیں ہے اور بات معمولی نہیں تھی۔ قدرتِ باری کی بات علیحدہ ہے لیکن آپ عورت کے مقام کو دیکھیں کہ اس زمانے کی پوری تاریخ میں ایک مثبت موڑ ایک عورت کے الہام کا محتاج ہے، فرعون کی تباہی اور فرعون کا غرقِ دریا ہونا۔

قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے قصے میں فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا (مریم:17) ہم نے روح الامین کو حکم دیا کہ جاؤ، مریم سے بات کرو اور حضرت مریمؑ نبی نہیں تھیں لیکن فرشتے نے ان کے پاس مجسم ہوکر انسانی شکل میں آکر بات کی اور اللہ کی بات پہنچائی۔

القاء: اس طرح ہوتا ہے جس طرح کوئی چیز منعکس کی جاتی ہے یا اوپر سے یا دُور سے روشنی ڈالی جاتی ہے، اس طرح کی کیفیت وارد ہو تو اسے القاء کہتے ہیں۔ اس میں جو بات اللہ کریم تعلیم فرمانا چاہتے ہیں وہ بات دِل میں پہنچ جاتی ہے۔ گویا القاء ایک انعکاسی عمل ہے جس کے ذریعے کوئی بات دل میں من جانب اللہ آجائے۔

وجدان: دل اپنے محسوسات کی وجہ سے کسی بات کی گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ ایسے ہے اور ایسے نہیں ہے یعنی دل از خود کسی بات کی صحت، عدمِ صحت کے بارے گواہی دے تو اسے وجدان کہتے ہیں۔

کشف: یہ کہ اللہ کریم پردہ ہٹادے اور کوئی چیز واضح دکھائی دے اور سمجھ میں آجائے۔ مگر یہ سب اللہ کریم کی عطا پر منحصر ہوتا ہے جو بات واضح فرمانا چاہے، اس کا احسان اور جب چاہے، وہ واضح کرے۔ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام جُدا ہوئے اور انہیں خبر نہ ہوسکی مگر جب اللہ کریم نے بتانا چاہا تو برسوں بعد جب اُنؑ کی بھائیوں سے ملاقات ہوئی اور آپ علیہ السلام نے کرتہ مبارک دیا کہ میرے والدِ گرامی کی آنکھوں پہ پھیرو، تندرست ہوجائیں گی۔ اور قافلہ مصر سے نکلا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں فرمایا، آج یوسف علیہ السلام کی خوشبو آرہی ہے حالانکہ دونوں حضرات اللہ کے نبیؑ تھے۔

کشف و مشاہدہ کا ایک اور درجہ ہے جس میں اشیاء یا بات واضح نہیں ہوتی بلکہ تعبیر کی محتاج ہوتی ہے اور ایسی بات یا مشاہدہ جب طالب، شیخ کے سامنے کو پیش کرتا ہے تو

وہ اسے تعبیر سے آگاہ فرماتا ہے۔ کشف ہوتا ہی دین کی تفہیم اور سمجھ کے لیے ہے۔ آپ کسی صاحبِ کشف سے بات کریں گے تو وہ دوسرے آدمی کی نسبت آپ کی بات کو جلدی سمجھ لے گا یا جو سوال کریں گے اس کا جواب وہ دوسرے کی نسبت زیادہ اچھی طرح دے سکے گا کیونکہ اس کے قلب میں وہ لطافت اور نزاکت ہے جو حقائق کو قبول کرتی ہے۔

ان تمام ذرائع میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ کشف ہو یا القاء، الہام ہو یا وجدان، یہ اگر شریعت کے مطابق ہے تو درست، ورنہ مردود ہے۔ یہ نہایت اہم بات ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی کو کشف ہے تو وہ اس کے اپنے لئے ہے، کوئی دوسرا اس کے کشف کا مکلف نہیں ہے۔ آپ میری وہی بات مانیں گے جو میں آپ کو قرآن سے، نبی کریم ﷺ کی شریعت کے حوالے سے بتاؤں گا یعنی کوئی پیر، شیخ، استاد یا مولانا اپنا کشف منوانے کا مجاز نہیں ہے۔

اظہارِ کشف کی حوصلہ شکنی کیوں؟

میں عموماً اظہارِ کشف کی حوصلہ شکنی اس لئے کرتا رہتا ہوں کہ ہم رسومات میں نہ پڑیں، حقائق پہ رہیں۔ یہ نہیں کہ جسے اللہ مشاہدہ عطا کرتا ہے میں اُس کا لحاظ نہیں کرتا یا اس کا احترام نہیں کرتا، ایسی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر کسی کو کشف ہوتا ہے اور وہ شرعی حدود کے اندر ہوتا ہے تو وہ اس کے اپنے لئے ہے، بات ختم۔ دوسرے کیلئے تو وہ حجت ہے ہی نہیں اور اگر دوسرے کے کشف کو حجت مانے گا تو اس کا اپنا عقیدہ خراب ہوگا، چونکہ صرف نبیؑ ایک ایسی ذات ہے جس کا کشف، جس کا خواب، وحی الٰہی، امت کیلئے حجت ہے۔

تصوف وسلوک اور بدعت

بدعت کے ساتھ سلوک جمع نہیں ہو سکتا۔ سلوک اعلیٰ ترین برکات ہیں جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وراثت ہیں اور بدعت قاطع ہوتی ہے سنت کی۔ ہر بدعت کوئی

سنت گرا کر اس پر کھڑی کی جاتی ہے۔ تو جب سنتیں گرا کر ان کی جگہ بدعات لائی جائیں تو ایسا آدمی صاحبِ سلوک، صاحبِ حال نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ کس بات کو سلوک سمجھ رہا ہے، اسے بتانے والوں نے کیا بتایا ہے۔ اکثر کو تو اس کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ سلوک کیا ہے۔

پیری مریدی

ہمارے ہاں پیری مریدی کا ایک رواج ہے اور ہم چاہتے ہیں کہیں خانہ پری ہو جائے، ہم کہہ سکیں کہ کسی مشہور خانقاہ، کسی مشہور عالم سے میں نے بیعت کر لی ہے۔ پھر جو چاہے کرتے رہیں، پیر صاحب جانیں اور اللہ جانے اس کے بعد پھر پیر صاحب خود بھگتیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (النجم:38) کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، ہر شخص کو اپنے اعمال خود بھگتنے پڑیں گے۔ پیری مریدی اس لیے نہیں کہ قیامت کے دن سارے گناہ پیر پر لاد دیئے جائیں گے اور مرید چلے جائیں گے، پیر مار کھاتا رہے گا، ایسا نہیں ہوگا۔

پیر کیا تھا؟ پیر استاد تھا، پیر حاملِ برکاتِ نبوی ﷺ تھا۔ مرید طالبِ برکاتِ نبوی ﷺ تھا۔ اب اس میں جو چیزیں داخل ہو گئیں کہ فلاں پیر کے پاس جاؤ تو بیماری ٹھیک ہو جائے گی، فلاں کے پاس جاؤ تو بیٹا ہوگا تو یہ ساری چیزیں ہم نے ہندوؤں سے لے لیں۔ پیری مریدی میں کسی کی صحت بیماری، کسی کی ملازمت مزدوری، اولاد کا کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔ یہ سارے کام اللہ خود کرتا ہے اور اللہ ہر بندے کی سنتا ہے اور سب سے بہتر دُعا وہ ہے جو بندہ خود اپنے لئے کرتا ہے، خود اللہ سے درخواست کرتا ہے کہ اے اللہ! میں تیرا مجبور و بے بس بندہ ہوں، میری یہ ضرورت ہے پوری فرما دے۔ یہ بات اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کے پاس جاؤ تو اولاد ملے گی، نوکری ملے گی، بیماری سے شفا ملے گی۔ بیماری کا علاج کرنے کیلئے ڈاکٹر، طبیب ہیں، روزی کیلئے محنت و مشقت ہے۔ جو اللہ کو نہیں مانتے وہ بھی کھا رہے ہیں، ان کو بھی مل رہی ہے۔ جو کافر ہیں، ان کو بھی مل رہی ہے۔ جو بت پرست ہیں ان کو بھی مل رہی ہے، تو پھر اس میں پیر کا کیا کمال ہے؟ کوئی ایسی بات بتاؤ جو پیر کے علاوہ نہیں مل رہی۔ اولاد اور روزی ساری دنیا کو مل رہی ہے۔ کافروں کو بھی، بدکاروں کو بھی، ظالموں کو بھی، سارے کھا پی رہے ہیں بلکہ اکثر بدکار زیادہ دولت مند ہیں تو پھر پیر کے پاس کیا لینے جانا ہے؟ پھر ان بدکاروں کے پاس جاؤ جن کے پاس زیادہ دولت ہے، شاید کوئی ذرہ دے دیں۔ اگر شیخ کی برکت سے بھی اولاد ہی ہونی ہے تو اولاد تو جانوروں کی بھی ہوتی ہے بلکہ بکریاں یا بھیڑیں، بچہ پیدا کرتی ہیں تو ان کی مادائیں کون سی خانقاہ پر جاتی ہیں؟ حلال اور حرام میں مادی طور پر بھی فرق سامنے آتا ہے۔ مادی ضروریات اللہ کریم بن مانگے پورا کرتے ہیں۔ ہم نہیں تھے، ہماری خواہش نہیں تھی، اللہ نے ہمیں پیدا کیا، ہمیں انسانی کمالات دیئے، اپنی معرفت کا شعور ہمارے دل میں رکھا، ہمیں دنیا میں رزق پہنچانا اپنے ذمے رکھا اور یہ سب کچھ بن مانگے دے رہا ہے۔ انہیں بھی دے رہا ہے جو اسے نہیں مانتے تو پھر عابد و زاہد کو دال روٹی پر گمراہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

پالن والا سر تے حاضر کل جہان نوں پالے ہو؟

وہ ناراض بھی ہو جائے تو کسی کا کھانا پانی بند نہیں کرتا، مہلت دیئے رکھتا ہے کہ کھاؤ پیو۔ جب میرے پاس آؤ گے تو حساب کریں گے کہ کھایا کس کا اور شکر کس کا ادا کیا؟

پیر کا کام تھا کہ ذاتِ باری اور خود وجودِ انسانی میں جو دیواریں حائل ہیں وہ کاٹ کے بندے کو اللہ کے روبرو کر دے۔ بندے میں وہ شعور پیدا کر دے کہ اللہ کو حاضر و موجود

مان لے۔ جانتے تو ہم سب ہیں لیکن ماننا اور چیز ہے۔ اگر مان لیا جائے تو کون ہے جو اللہ کے روبرو گناہ کرے؟ یہ جو ہم مسلسل گناہ کرتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ ہم جانتے تو ہیں کہ اللہ موجود ہے لیکن اس کا ہمیں یقین نہیں، مانتے نہیں۔ اور پیر اس لئے ہوتے ہیں کہ طالب کے دل میں وہ برکات انڈیل دیں اور اس میں ایسی کیفیت پیدا کر دیں کہ وہ اللہ کو حاضر و موجود ماننے لگ جائے۔ پیر کے پاس وہ دولت ملتی ہے جو دنیا میں نایاب ہے اور وہ ہے ایمان باللہ، اللہ پر یقین، محمد رسول اللہ ﷺ پر وہ یقین جو ہمیں آپ ﷺ کی غلامی پر مجبور کر دے اور جہاں سے یہ نہ ملے، وہاں پر جانے کی ضرورت نہیں۔ باقی چیزیں تو دنیا میں ملتی ہیں، ہر ایک کو ہر جگہ مل رہی ہیں۔ اہل اللہ سے لینا ہے تو خلوص کا خزینہ حاصل کرو۔ اللہ ہم سب کو اس کے حصول کی توفیق دے اور خلوص کی دولت سے مالا مال کرے۔

جعلی پیر

حضرتؒ کے زمانے میں ایک پیر صاحب تھے۔ وہ نماز روزہ نہیں کرتے تھے۔ عموماً اس طرح کے لوگوں کی پیری کی دوکانیں چمکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کے ایک مرید تھے، حضرتؒ نے پوچھ لیا کہ بھئی تم نے انہیں پیر بنا رکھا ہے اور وہ خود نماز ادا نہیں کرتے، اللہ کی اطاعت نہیں کرتے، تمہاری پیری کیا کریں گے؟ وہ کہنے لگا جی وہ تو پانچوں نمازیں حرم میں جا کر ادا کرتے ہیں تو حضرتؒ نے فرمایا، اس نیک بخت سے کہو کہ ایک دن کھانا بھی حرم ہی سے کھا کر آ جائے۔ کھانا تو یہاں سے کھاتا ہے صبح شام، اسے کہو جب اتنا سفر کرتے ہو تو پھر تم کھانا بھی وہیں کھا لیا کرو۔ اس کا کھانا دو چار دن بند کر دو، پتہ چل جائے گا حرم جاتا ہے کہ نہیں۔

شیخ کی تلاش

اب یہ ہر فرد کے ذمے ہے کہ وہ خود تلاش کرے کہ یہ نعمت اسے کہاں سے مل سکتی ہے اور جب کہیں سے مل رہی ہو تو وہاں سے اٹھ کر نہ جائے۔ علماء کا تو یہ کام ہے کہ وہ اس نعمت کو حاصل کریں، اس کی نشاندہی کریں، دوسروں کو اللہ سے کھرا تعلق پانے کی ترغیب دیں لیکن اب تو کہانیاں ہی سنائی جاتی ہیں، واقعات دہرائے جاتے ہیں، عمل وہیں کا وہیں ہے، بیٹھے وقت ضائع کیے جا رہے ہیں۔ شیخ نصیب ہو جائے تو ایک ملاقات اور چند جملوں میں اپنے دل کی دنیا میں ہلچل محسوس ہوتی ہے، الحمدللہ! ہمیں تو وہ ہلچل محسوس ہوئی۔

ہمیں وہ یقین کی دولت چاہیے، وہ ایمان چاہیے، وہ اعتماد چاہیے جو ہماری ناک میں نکیل ڈال دے اور ہمیں برائی سے بچائے۔ ہمارے اندر وہ یقین اور اعتماد پیدا کرے کہ ہم خود کو برائی سے بچائیں تو ہم اس کیلئے کسی شیخ کے پاس جاتے ہیں۔ اب اس کے اپنے پاس تو زیادہ ہونا چاہیے کہ ہمیں کوئی ذرہ دے سکے۔ وہ کہاں سے لے گا؟ وہ اپنے شیخ سے لے گا اور یہ سلسلہ بارگاہِ نبوت ﷺ تک پہنچے گا۔ ساری برکات کی تقسیم وہاں سے ہوتی ہیں۔

ایک صحابیؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ تو چشمِ عالم سے پردہ فرما جائیں گے تو لوگ کہاں جائیں گے، کس کے پاس جائیں گے، کس سے سیکھیں گے؟ فرمایا! اس بندے کے ساتھ رہو جس کے پاس بیٹھنے سے اللہ یاد آ جائے یعنی جس کے پاس جا کر آپ بیٹھیں تو اللہ یاد آ جائے، اس کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ لیکن اللہ بھی تب ہی یاد آئے گا جب کہ اس کے اپنے دل میں اللہ بستا ہو۔

شیخ اور پیر کیا کرتا ہے؟

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو پیر کہتا ہے میں لوگوں کو رزق دیتا ہوں، ایسے لوگ خود روپیہ روپیہ مانگ کر عمر گزار دیتے ہیں۔ یہ ساری جہالتیں ہیں۔ جو کہتا ہے میں لوگوں کو

صحت دیتا ہوں اس کا medical examination کرائیں، وہ خود بیمار ہوگا۔ یہ سارے فراڈ ہیں۔

پیرِ سلسلۂ تصوف، شیخ، استاد کیا دے سکتا ہے، صرف یہ کہ آپ اپنا دل اس کے پاس لے جائیں اور وہ ایک خاکروب کی طرح اس میں جھاڑو دے دے، وہ ایک دھوبی کی طرح اسے دھوئے، وہ ایک مزدور کی طرح اس کے ساتھ محنت کرے تاکہ وہ دل اس قابل ہو سکے کہ وہ فیصلہ کر سکے کہ مجھے اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔ لیکن پیر یا شیخ بھی تب ہی ایسا کر سکے گا جب آپ اپنا دل خلوص کے ساتھ اس کے سپرد کریں گے۔

ٹی وی کے ایک پروگرام میں راگ اور کلاسیکل گانے کے استاد کی بابت کسی نے ایک گلوکار سے سوال کیا کہ سیکھنے کے کیا ضابطے ہیں؟ تو اس فنکار نے جواب دیا کہ یہ چیز تو استاد کے دل کی گہرائی سے حاصل کرنا ہوتی ہے، جو اس کے دل تک رسائی حاصل کرے گا وہی پائے گا اور جو دل میں نہ اتر سکا وہ حاصل نہ کر سکے گا۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ کیسی نازک بات کہہ گیا ہے۔ بات گانے بجانے کی کر رہا ہے اور مسئلہ سلوک کا بیان کر رہا ہے۔

شیخ کا مخلص ہونا بھی شرط ہے اور مرید کا مخلص ہونا بھی لازم۔ جو شیخ نبی کریم ﷺ کی بجائے اپنی باتیں منواتا ہو، اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہو، شیخ نہیں ہے۔ شیخ وہ ہے جس کی اپنی ذات کی نفی ہو جائے، وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بات پہنچائے۔

شیخ اور پیر کی پہچان

شیخ اور پیر کی پہچان یہ ہوگی کہ کسی نے اپنا دل چیر کے اس کے آگے رکھا تو اس میں کیا تبدیلی آئی۔ اگر تو ایک، دو، دس دل اس نے مرمت کر دیئے تو کاریگر ہے۔ یاد رکھیں! کسی نااہل اور جاہل اور دنیادار کے ساتھ نہ پھنس جانا کہ دل بہت بڑی دولت ہے، یہ اللہ نے دی ہے۔ اور جس میں اہلیت نہ ہوئی، آپ نے اس کے حوالے کر دیا تو شاید وہ اسے

ایسا بگاڑ دے کہ پھر دنیا میں زندگی بھر اس کی اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے۔ اور آپ نے دیکھا کہ کتنی مخلوق پھنسی ہوئی ہے۔ بے چاروں کو عقیدے کی خبر نہیں، دین کا علم نہیں، عمل کی توفیق نہیں اور جو کماتے ہیں وہ بھی پیر کھا جاتے ہیں۔ دین بھی گیا اور دنیا بھی پیروں کے حوالے ہوگئی۔

شیخ کی ذمہ داری

شیخ وہ ہوتا ہے جو بارگاہِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تقسیم ہونے والی برکات کو دلوں میں انڈیل دے اور بندے کا تعلق رب العالمین سے کھرا کر دے۔ شیخ کے ذمے یہ نہیں ہے کہ وہ سالکین کے بچوں کو ملازمتیں دلوائے نہ اس کے ذمہ ہے کہ بیماری کا علاج کرے نہ اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے کہنے سے فصل زیادہ آئے، یہ سب کام اللہ رب العالمین کے ہیں۔ شیخ کی ذمہ داری یہ ہے کہ دلوں میں حضور ﷺ کی غلامی کرنے کا درد جگائے۔ وہ درد اور خلوص عطا کر دے کہ بندے کا سارا بھروسہ، سارا اعتماد ذاتِ باری پر آجائے۔ یہ نعمت ہر جگہ نہیں ملتی۔ یہ نبی کریم ﷺ کے سینۂ اطہر سے مقبولانِ بارگاہ الٰہی کے سینوں میں آتی ہے اور طالبینِ بارگاہ الٰہی کے سینوں میں اتاری جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ بھی انسان ہوتا ہے اپنی ذمہ داری کا مکلف ہوتا ہے۔ وہ بھی مجبورِ محض ہوتا ہے۔ اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا، سب اللہ کا کرم ہوتا ہے۔ اس سے محض کام لیا جاتا ہے وہ عالمِ اسباب میں ایک سبب ہوتا ہے۔ جس طرح بادل کی ذمہ داری برسنا ہے لہٰذا وہ برستا ہے، اسے یہ فرق کرنے کا حق نہیں کہ بارش کھیتوں پر برس رہی ہے، چٹانوں پر یا کوڑے کے ڈھیر پر۔ اسے برسنے کا حکم ہے سو وہ برسے گا، ہر جگہ یکساں بارش ہوگی۔ اس سے کیا نتائج پیدا ہوں گے، یہ اللہ کا کام ہے۔ جیسی جیسی کیفیت ہوگی، ویسے ویسے نتائج پیدا ہوں گے۔ اگر زمین زرخیز ہوگی، اس میں ہل چلایا جائے گا۔ کسی نے باغ لگایا ہوگا تو پھل

پھول آجائیں گے اور کوڑے کے ڈھیر پر برسے گی تو اس میں سے مزید تعفن اٹھے گا۔ اس طرح اثرات مختلف ہوتے ہیں۔

سلوک میں شیخ اور سالک کا تعلق

تصوف وسلوک میں شیخ اور سالک کا رشتہ بڑا مضبوط بھی ہے اور نہایت نازک بھی، جیسے کانچ کے وہ برتن جو بہت مضبوط ہوتے ہیں جنہیں Unbreakable کہا جاتا ہے وہ اپنی تمام تر مضبوطی کے باوجود جب ٹوٹتے ہیں تو پھر ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہوتے، ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ رشتہ بھی قلب سے قلب کو ہوتا ہے اور بہت مضبوط ہوتا ہے۔ یہ رشتہ محض اللہ کیلئے، اللہ کی رضا پانے کیلئے، وہ کیفیاتِ قلبی پانے کیلئے ہوتا ہے جو بندے کیلئے اصلاحِ احوال کا سبب بنے۔ چونکہ کیفیات دل سے وصول کی جاتی ہیں لہٰذا شیخ کے ساتھ رشتہ قلبی ہوتا ہے۔ دل میں جتنی کھری طلبِ الٰہی ہو، شیخ کیلئے دِل میں جتنا خلوص ہو، جتنی محبت ہو، سالک کو اتنی ہی برکات نصیب ہوتی ہیں۔ یہ معاملہ ہی دل کا دل سے ہے۔

مشائخ کو جب اللہ کریم ذمہ داری دیتے ہیں، ان سے قلوب کی تربیت کا کام لیتے ہیں تو انہیں کچھ علوم بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھا کریں کہ شیخ کو کچھ علم نہیں ہوتا۔ شیخ کو علوم عطا فرمانا اللہ کا اپنا نظام ہے۔ انہیں اللہ کریم بندوں کی اصلاح کیلئے بقدر ضرورت علم عطا فرماتا ہے، وہ جان رہے ہوتے ہیں کہ کہاں کیا کرنا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہر بندے پر گرفت نہیں کرتے۔ نبی کریم ﷺ کی سنتِ مبارکہ یہی ہے کہ آپ ﷺ کو کسی کی بات ناگوار گذرتی تو حضور ﷺ اسے انفرادی طور پر نہیں ٹوکتے تھے بلکہ اجتماعی طور پر بیان فرماتے تھے۔ شیخ کی ذات تو ایک دریا ہوتی ہے، سمندر ہوتی ہے۔ لوگ اگر سمندر میں ہوں تو ان کے پاس پانی کی کمی نہیں ہوتی، حدِ نظر تک پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ دریا میں

ہوں تو پانی کی کمی نہیں ہوتی لیکن جب دریا سے نکلتے ہیں تو پاس وہی رہ جاتا ہے جو چند قطرے لباس پر ہوتے ہیں اس کے علاوہ تو نہیں ہوتا۔ تو شیخ کی معیت میں مراقبات اور کیفیات چلتی رہتی ہیں لیکن جب بندہ موت کے پل سے گزر کر اس پار جاتا ہے تو پھر جتنا اس کا اپنے دل کا برتن ہے اتنی ہی کیفیات اس کے پاس ہوتی ہیں اور میں نے بارہا فوت شدہ احباب کو دیکھا ہے کہ یہاں وہ کیا باتیں کرتے تھے اور وہاں کیا کہتے ہیں؟ یہاں کتنا سرمایہ شمار کرتے تھے وہاں پہنچے تو کیا نکلا؟ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ ہمیں دامن وسیع کرنا ہے، برتن بڑا کرنا ہے اور ان برکات کو لے کر پل صراط سے گزرنا ہے۔

طالب کیلئے یہی ضروری ہے کہ وہ اپنی طلب پر نظر رکھے اور اس پر اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ ورنہ طلب میں وہی فتور آتا ہے، جس فتور نے ابلیس کو راندۂ درگاہ کیا تھا کہ وہ طالب سے بڑھ کر بڑا بزرگ بن جائے۔ شیخ کی محفل، گپ شپ کی محفل نہیں ہوتی۔ شیخ کا وقت نہایت قیمتی ہوتا ہے اور اسے اپنے مقصد سے لگاؤ ہوتا ہے، وہ برکاتِ نبوت کی ترسیل کے کام میں ہمہ تن محو ہوتا ہے۔ یوں تو آپ کسی بھی کاریگر کے پاس بیٹھ جائیں خواہ وہ چارپائیاں ہی ٹھونک رہا ہو، آپ اس سے باتیں کرتے رہیں وہ سنتا رہے گا لیکن اس کا سارا دھیان اپنے کام پر ہوگا، آپ کی باتوں کی طرف توجہ دے گا تو لکڑی کی بجائے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھے گا۔ اسے اپنی فکر ہوتی ہے کہ اس نے دن بھر کتنی مزدوری کی، گپ شپ کیلئے وہ اپنا کام نہیں روکتا۔ شیخ کی بھی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں، جو طالبِ حقیقی ہوتے ہیں اور مقصد لے کر آتے ہیں ان کا کام تو ایک نگاہ میں ہو جاتا ہے اور جو آتے ہی گپ شپ کیلئے ہیں انہیں نہ ہی گپ شپ ملتی ہے نہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو شیخ کی ذات پر ہی اعتراض ہوں تو پھر اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا، پھر اسے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے، پھر انہیں کوئی اور ہستی تلاش کرنی چاہیے جس پر اعتراض نہ ہو کیونکہ اعتراض مانع فیض ہوتا ہے، مانع برکات

ہوتا ہے۔

روحانی تربیت کا نظام

یہ جو سلوک ہے، یہ جو کیفیاتِ قلبی ہیں، ان کی مثال بجلی کے اس بلب کی سی ہے کہ جب تک اس کی تار پاور ہاؤس یا جہاں سے بجلی آرہی ہے وہاں سے جڑی ہوئی ہے تو اس میں زندگی ہے۔ وہاں سے کٹ گئی یا خلا آ گیا تو یہ ختم ہو جاتی ہیں۔ تو جو روحانی تربیت ہے اس کا نظام اس طرح سے ہے کہ جو برکاتِ نبوی ﷺ داں کو سیراب کرتی ہیں وہ گستاخی سے کٹ جاتی ہیں۔ بندہ نمازیں پڑھتا رہے، روزے رکھتا رہے لیکن جب قبر میں آنکھ کھلے گی تو پتہ چلے گا کہ یہ تو میں صرف ظاہری ایکسرسائز (Exercise) کرتا رہا، اندر والی بات تو تھی ہی نہیں۔

روحانیت میں یہ ہے کہ جب گستاخی ہو جاتی ہے تو وہ رشتہ الفت ختم ہو جاتا ہے۔ جب وہ از خود کٹ جاتا ہے تو انسانی کردار بگڑ جاتا ہے، اس کی زبان بگڑ جاتی ہے، بات کرنے کا انداز بگڑ جاتا ہے، جھوٹ بولتا ہے اور بے دھڑک بولتا ہے، دوسروں کا مال کھاتا ہے تو بے دھڑک کھاتا ہے۔

تزکیے کا کمال

ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:23) ایمان لانے کے بعد جس پر نگاہِ مصطفوی ﷺ پڑ گئی، کھال سے لے کر نہاں خانہ دل تک ہر باڈی سیل ذاکر ہو گیا۔ اس کا تزکیہ ہو گیا، اس کی سوچ پاک ہو گئی، اس کی فکر پاک ہو گئی، اس کا کردار پاک ہو گیا۔ غلطی ہونا یہ انسانی کمزوری ہے اور غلطی نہ ہونا یہ انبیاءؑ کا وصف ہے۔ انبیاءؑ معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ غیر نبی صحابیؓ بھی ہو تو خطا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے عہدِ نبوی ﷺ میں بھی عدالتیں تھیں، انصاف ہوتا تھا۔ صحابہ کرامؓ کو سزائیں بھی ہوئیں لیکن یہ انسانی

زندگی کا عمل ہے جو ہر جگہ جاری رہتا ہے۔ وہ اور طرح کے لوگ تھے۔ انہیں ہم اپنے پر قیاس نہیں کر سکتے۔

ایک صحابیؓ سے غلطی ہوگئی لیکن اس غلطی نے انہیں بے قرار کر دیا۔ ہم سے غلطی ہوتی ہے ہم فخر کرتے ہیں۔ ذکر اللہ اور تزکیے کا کمال یہ ہے کہ اس غلطی نے انہیں بے قرار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں قیامت کی شرمندگی برداشت نہیں کر سکتی، جو ہونا ہے مجھ پر یہیں بیت جائے۔ بالآخر اس بے قراری میں بارگاہِ نبوی ﷺ میں پہنچ کر عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ نے رخِ انور دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے بار بار عرض کیا، آپ ﷺ نے بار بار فرمایا اللہ سے معافی مانگو۔ بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا وضعِ حمل کے بعد آنا۔ بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو لے کر آپ ﷺ کے پاس پھر حاضر ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا دو سال دودھ پینا بچے کا حق ہے۔ پونے دو سال بعد بچے کو اٹھائے ہوئے پھر حاضر ہوگئیں، روٹی کا ٹکڑا بچے کے ہاتھ میں تھا کہ یارسول اللہ ﷺ! اب تو اس نے کھانا کھانا بھی شروع کر دیا ہے اب مجھ پر حد جاری کر دیجیے۔

کیا اُن لوگوں سے جو بتقضائے بشریت غلطی ہوئی، اسے ہم اپنے پر قیاس کر سکتے ہیں؟ کیا ہمارے دل میں اتنا درد ہے؟ وقتی اور لحاتی پریشانی ایک اور چیز ہوتی ہے اور تین سال تک اس درد میں مبتلا رہنا اور بے چین رہنا کہ نہیں میں پاک ہو کر اللہ کے حضور جاؤں گی، یہ کام صحابہ کرامؓ کا ہی ہے۔

یہ عقل کا نہیں، عشق کا کام ہے

یہ جو شعبہ ہے تصوف کا اس کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک آپ کے ذہن میں اس کے بارے میں سوال رہیں گے آپ کو جواب نہیں ملے گا۔ ایک بات میں سمجھا دوں گا، آپ کو ایک سوال کا جواب ملے گا تو ذہن دوسرا سوال پیدا کر دے گا۔ اس کا جواب مل

جائے گا تو عقلِ انسانی ایک تیسرا سوال پیدا کر دے گی۔ تو یہ عقل کا کام نہیں ہے، یہ کام ہے عشق کا اور عشق سوال نہیں کیا کرتا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور جب سوال ختم ہو جائیں جواب مل جاتا ہے۔ یہ حکمتِ الٰہی ہے۔ آپ نے فقہ پڑھنی ہے سوال کریں، تفسیر پڑھنی ہے سوال کریں، حدیث پڑھنی ہے سوال کریں، سمجھیں، برکاتِ نبوی ﷺ سمیٹنی ہیں تو چمٹ جائیں۔ سوال تب تک ہوتا ہے جب تک اپنا وجود باقی ہو، اپنی ذات باقی ہو، اپنی انا باقی ہو کہ میں ہوں۔ میں ہوں تو میں سوال کروں گا، میں ہوں ہی نہیں تو سوال کون کرے گا؟ سوال کا مطلب ہے کہ میں ہوں اور جب تک میں ہوں یہ نعمت نہیں ملے گی کیونکہ اس کی ابتدا ہی فناء سے ہوتی ہے۔

برزخ میں رابطہ

ہمارے لئے ہمارا وجود بھی ایک قبر ہے اور روح اس کے اندر ہے۔ پہلے تو اس صاحبِ قبر کو ذاکر بنائیں۔ قبر کی بات تو وہ کرے جس کیلئے قبر کا عالم اور دنیا کا عالم ایک ہو چکا ہو۔ آپ ایسا مقام حاصل کریں جہاں برزخ اور یہ دنیا ایک جیسی ہو اور دنیا میں بیٹھ کر برزخ میں دیکھا جا سکے۔ جنہیں برزخ میں رسائی حاصل ہے ان کیلئے یہ بات ایک معمول ہے۔ جس طرح تم آپس میں بات کر لیتے ہو، اس طرح وہ اہلِ برزخ سے بات کر لیتے ہیں۔

اگر کسی روح کو کوئی شیخ دنیا سے توجہ دے، اس کا اثر ایصالِ ثواب کی طرح ہوتا ہے، منازل بھی کرائے جا سکتے ہیں لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے، یہ من جانب اللہ ہوتا ہے، کسی کو نصیب ہو تو اللہ کریم وہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ برزخ میں ایسی توجہ عموماً ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جن کو دنیا میں اس کے حصول کی بڑی طلب، دلی تمنا، آرزو اور خواہش ہوتی

ہے۔ حصولِ برکات کی اس آرزو کو لے کر وہ برزخ میں جاتے ہیں تو اللہ کریم ان کیلئے ایسے اسباب بنا دیتے ہیں کہ انہیں برزخ میں توجہ نصیب ہو جاتی ہے۔

حضرتؒ جب کسی کو برزخ میں کلام سکھانا چاہتے تو اسے اپنے گاؤں سے متصل مکانوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا قدیم قبرستان تھا وہاں ایک بزرگ کی قبر پر لے جاتے اور برزخ میں بات کرنے کا طریقہ سکھاتے۔ ایک دن خود ہی فرمانے لگے کہ یہ شخص تلہ گنگ کے نواح کا رہنے والا تھا۔ برکاتِ نبوی ﷺ کا طالب تھا، اسی طلب میں یہ شخص سفر کرتا کرتا پیدل ہی دہلی تک پہنچ گیا، دہلی میں اسے شیخ ملا۔ شیخ نے غالباً اسے فنافی الرسول ﷺ تک مراقبات کروا دیئے اور شیخ نے کہا کہ وہ اسے ان مراقبات تک لا سکتا تھا، لہٰذا اب وہ ان کی طرف سے فارغ ہے۔ اس پر اس نے شیخ سے اجازت طلب کی کہ کیا وہ اب اپنے گھر واپس جا سکتا ہے؟ شیخ نے فرمایا! گھر جاؤ گے تو خانگی امور میں کھو جاؤ گے، رشتہ داروں کی دوستیاں دشمنیاں تمہاری توجہ اپنی طرف کر کے تم سے یہ نعمت چھین لیں گی۔ گھر نہ جانا کہ پھر گھریلو امور میں تم اس نعمت کی حفاظت نہ کر سکو گے۔ وہ شخص شیخ کے پاس سے نکل کر گھر کی طرف چلا لیکن گھر نہیں گیا اور اسی علاقے میں مقیم رہا، یہیں فوت ہوا اور یہیں دفن ہوا۔ برکات اتنی سستی چیز نہیں، اس نعمت کی حفاظت بھی قربانی مانگتی ہے۔ آج اللہ کریم نے اسے عام کر دیا ہے کہ ہر آنے والے کیلئے اس کا حصول آسان ہے۔ مرد ہوں یا خواتین، جو چاہے آئے، طالبِ الٰہی ہو کر آئے اور مالا مال ہو کر جائے۔

تصوف کا حاصل کیا ہے؟

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ تصوف کا حاصل یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ کے سامنے بندہ ایسا ہو جائے جیسے غسال کے ہاتھ میں میت ہو۔ جدھر پلٹے، جدھر سے نہلائے، جیسے رکھے، جو کرے اس میں میت نہ اُف کرتی ہے، نہ مشورہ دیتی ہے بلکہ تعمیل کیے جاتی

ہے۔ شریعت کے سامنے اس بے جان میت کی طرح ہو جاؤ کہ اپنی کوئی مرضی نہ رہے، اپنی کوئی حیثیت نہ رہے، اپنا کوئی مشورہ نہ ہو۔ اب یہ بات سیکھتے سیکھتے جب بندہ راستہ بدل کر اس مقام پر آ جائے کہ میری مانی جائے تو وہ بالکل الٹ ہو گیا۔ اس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ بندہ پھر پل بھر نہیں رہ سکتا، گر جاتا ہے، کٹ جاتا ہے۔ اللہ کو کیا پرواہ ہے کہ کس نے کتنے سجدے کیے؟

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
ہزاروں سال گر سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

عقیدے میں خلوص، عمل میں خلوص، عقیدہ وہی ہو جو حضرت محمد ﷺ نے بتایا، عمل وہی ہو جو حضور ﷺ نے سکھایا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص کے کھرے پن کا اپنا درجہ ہے، ہر فرد کی گہرائی اور گیرائی الگ ہوتی ہے۔ اس لئے ہر شخص کا علم الگ ہوتا ہے، تجربہ الگ اور اسی طرح خلوص کا معیار بھی الگ ہے۔ عمل خواہ تھوڑا ہی ہو لیکن خلوص اور کھرا پن ہو تو مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہوتا ہے۔

ساری محنت، سارے مجاہدے، تصوف کا حاصل یہ ہے کہ طلبِ الٰہی میں کھرے سے کھرا پن آتا چلا جائے، شخصیت ظاہر و باطن میں نکھر جائے، کوئی تکدر نہ رہے۔ ہر آرزو سے بڑھ کر ایک ہی تمنا ہو کہ میرا خالق و مالک مجھ سے راضی ہو جائے۔ جسے یہ نعمت مل گئی، اس نے دونوں جہان پا لیے۔ جو اس سے محروم رہا، وہ دونوں جہان میں خسارے میں رہا خواہ دنیا میں اس کے پاس بے شمار دولت ہو، اولاد و جاگیر ہو۔ تصوف کا حاصل فنائے ذات ہے جو علومِ ظاہریہ کی ضد ہے۔ علومِ ظاہریہ پڑھنے والوں کی اکثریت میں اپنی ذات کی برتری اور بڑائی کا خیال آ جاتا ہے۔ یہ علومِ ظاہریہ کی خصوصیت ہے کہ میں اتنا فاضل ہوں، میں اب مفتی بن گیا ہوں، میں اب محدث ہو گیا ہوں۔ اس کے برعکس جو علومِ باطنی

ہیں، یہ انسان کو اپنے کچھ نہ ہونے کا یقین دلاتے ہیں کہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے، ساری عظمت اللہ کیلئے ہے۔ اسی لئے علماء کیلئے ضروری ہے کہ اللہ کریم جنہیں علومِ ظاہریہ عطا فرمائے وہ کمالاتِ باطنی بھی حاصل کریں۔

مراقبات پہ وقت لگایا کریں

مجھے اس کا تجربہ کچھ ایسے احباب سے ہوا جو اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو بڑی عجیب بات مشاہدے میں آئی کہ ایک شخص کے مراقبات زندگی میں تو سالک المجذوبی تک تھے، بعد وفات دیکھا تو اقربیت پر کھڑے ہیں، پوچھا، کیا ہوا؟ کہنے لگے، جی تھے لیکن اب میں وہاں نہیں جا سکتا، کیوں کس نے روکا؟ جی روح میں قوتِ پرواز نہیں ہے یہاں آتے آتے ختم ہو جاتا ہوں۔ اور ایسا ایک بار نہیں متعدد بار مجھے یہ تجربہ ہوا ہے۔ تو پھر میں نے دیکھا کہ واقعی احباب مراقبات پر وقت نہیں لگاتے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ مراقبات نوافل سے افضل ہیں اور مراقبات پر الگ سے وقت لگانا چاہئے۔ اگر فرصت ہو تو گھنٹوں لگانے چاہئیں چونکہ جب تک مراقبات مضبوط نہیں ہوں گے روح میں قوتِ پرواز نہیں رہے گی۔ جتنا آپ مراقبہ کریں گے اتنی قلب میں استعداد بڑھتی جائے گی اتنے اس میں انوارات آئیں گے۔ جتنے انوارات اس میں آئیں گے اُتنی روح میں قوتِ پرواز آئے گی۔ جب آپ آدھا گھنٹہ، پندرہ منٹ مراقبات پر لگائیں گے اور باقی ساڑھے تیئیس گھنٹے اس عہدِ حاضر کی خرافات میں گزاریں گے تو روح میں قوتِ پرواز کہاں سے آئے گی؟

مراقبات کی پرکھ کا معیار یہ نہیں ہے کہ کسی کو دوائرِ ثلاثہ ہو گئے، فناء بقاء ہو گئی، سالک المجذوبی ہو گئی تو بندہ منزل پا گیا نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کی پہچان یہ ہے کہ جتنی برکات نصیب ہوتی جائیں اتنی بندے کو احکامِ الٰہی سے محبت ہوتی چلی جائے اور حضور نبی کریم ﷺ کی نافرمانی سے نفرت ہوتی چلی جائے۔ اگر احباب کی زندگی میں یہ

تبدیلی آ رہی ہے تو انہیں بحمد اللہ برکات نصیب ہو رہی ہیں ورنہ یہ سارے مراقبے ایک پل میں ختم ہو جاتے ہیں۔

نسبتِ نقشبندیہ

ایک غور طلب بات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر نسبت کا ایک لون (رنگ) ہوتا ہے اور جب کبھی کسی خاص نسبت کا ظہور ہوتا ہے تو اس صاحبِ نسبت سے اسی رنگ کے مخصوص کمالات ظاہر ہوتے ہیں اور نسبتوں کے ان اَلوان کے اشارات خود احادیثِ نبویہ ﷺ سے ملتے ہیں مثلاً حضرات نقشبندیہ جو نسبتِ صدیقی کے حامل ہیں، ان میں سینہ بسینہ القاء کا ظہور زیادہ ہے۔ اس کا اشارہ اس ارشادِ نبوی ﷺ میں صاف ملتا ہے کہ **ما صب اللہ فی صدری شیاً الا صببہ فی صدر ابو بکر** اللہ تعالیٰ نے میرے سینے میں کوئی بات ایسی نہیں ڈالی جو میں نے ابوبکر کے سینے میں نہ ڈالی ہو۔

نسبتِ اویسیہ

شاہ ولی اللہؒ نے ''الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے بارہ یا غالباً چودہ سلسلوں کا ذکر فرمایا ہے۔ یاد رہے سلسلہ ہوتا ہے فرد سے فرد تک کے نام۔ جس طرح روایتِ حدیث ہے، اسی طرح سے شجرہ یا سلسلۂ اولیاء اللہ اُسے کہتے ہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ کس نے کس سے برکاتِ نبوی ﷺ حاصل کیں۔ ان کیفیات و برکات و تعلق کو جو قلب سے قلب کو حاصل ہو جائے نسبت کہتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے یہ بارگاہِ نبوی ﷺ سے حاصل کیں لیکن عہدِ نبوی ﷺ میں ایک شخص تھے سیدنا اویس قرنیؓ، قرن کے رہنے والے تھے۔ ان کے حالات میں ملتا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے مدینہ منورہ میں حاضری بھی دی لیکن حضور ﷺ سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکے۔ ان کا بدن، ان کا وجودِ ظاہری بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر نہ ہو سکا لیکن ان کے قلب نے قلبِ اطہر ﷺ سے

وہ قرب حاصل کرلیا کہ انہوں نے دُوررہ کر وہ برکات حاصل کرلیں۔ان کی روح نے قلب اطہر ﷺ سے اکتساب فیض کیا۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ صرف ایک نسبتِ اویسیہ ہے جس میں ملاقات شرط نہیں۔اویسیہ اس لئے کہتے ہیں کہ حصولِ فیض کا طریقہ وہ ہے جو اویس قرنیؓ کا تھا کہ بدن وہاں نہ پہنچ سکا،ظاہری ملاقات نہ ہوئی لیکن روح نے دُوررہ کر بھی وہ برکات حاصل کرلیں کہ سیدنا عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ نبی کریم ﷺ کا پیغام لے کران کے پاس گئے۔

اگر کسی دل کو یہ قوت نصیب ہوجائے کہ روحانی طور پر اس کی روح، پہلے بزرگوں سے یا بارگاہِ نبوی ﷺ سے براہ راست برکات وفیوضات حاصل کرلے تو اس طریقے کو نسبت اویسیہ کہتے ہیں۔نسبت اویسیہ واحد نسبت ہے جو براہ راست نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد سیدنا ابو بکر صدیقؓ سے برکات حاصل کرتی ہے۔باقی جتنی نسبتیں ہیں وہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے چلتی ہیں۔

نسبتِ نقشبندیہ اویسیہ۔۔۔تیز ترین نسبت

ہمارے لڑکپن، جوانی تک میلوں دُور اطباء اور حکماء ہوتے تھے اور ڈاکٹروں کا نام اس زمانے میں ہم نے نہیں سنا۔ان کا علاج بہت لمبا ہوتا تھا۔اب آپ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، وہ ایک ٹیکہ لگاتا ہے، ڈرپ لگاتا ہے اور آپ ٹھیک ٹھاک ہوجاتے ہیں۔تو اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آج انجکشن کیوں لگتا ہے آج بھی وہ علاج ہونا چاہئے جس میں چھ مہینے لگتے ہیں تو کیا یہ دانشمندی ہوگی؟

اسی طرح یہ کہنا کہ فلاں بزرگ نے اتنی محنت کی، فلاں نے اتنے برس کی، آپ کے پاس بندہ شام کو آتا ہے، صبح اس کا قلب روشن ہوجاتا ہے، کیوں؟ یہ عجیب احمقانہ بات ہے۔یہ تو اللہ کا احسان ہے، کسی کا احسان نہیں ہے، کسی کی دین نہیں ہے۔پہلے لوگوں کے

پاس اتنے علوم نہیں تھے جو لوگوں کو آج اللہ نے دیئے ہیں۔یہ کسی کے بس کی بات تو نہیں۔علوم بھی تو وہی عطا کرتا ہے اور ہر وقت کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔وہ رب ہے اور سارے جہانوں کا رب ہے تو جیسی جیسی وہ ضرورتیں پیدا فرماتا ہے، ویسے ویسے تکمیلِ ضرورت کے اسباب بھی پیدا فرمادیتا ہے۔

زندگی اتنی تیز ہوگئی، مالک الملک نے خود حالات اتنے بدل دیئے، لوگوں کو ایسی چیزیں عطا کردیں کہ اب اگر آپ کسی کو کہیں کہ چالیس دن بیٹھ کر چلہ کشی کرو، تو کون کرے، کسی کے پاس فرصت ہے؟ تو اس نے روشنیٔ قلب وجگر کیلئے، قلب ونظر کیلئے بھی ایسا ہی ایک نسخہ، ایک انجکشن دے دیا کہ جہاں جاتے ہو جاؤ، دل میں اللہ کی یاد سمولو، ایک توجہ لے لو، ایک نسبت حاصل کرلو۔پھر جہاں جاتے ہو، جاؤ، وہیں انوارات پہنچتے رہیں گے۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آج کل مجاہدے کی ضرورت نہیں ہے، میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدے سے نسبت نصیب نہیں ہوتی، نسبت الگ سے ہے اور قلبِ اطہر ﷺ سے نصیب ہوتی ہے۔اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جس کے دل میں آپ ﷺ کی برکات ہوں اور وہ عطا کردے تو مجاہدہ وہ کام نہیں کرسکتا جو ایک نگاہ کرسکتی ہے۔

یہ تو نسبتِ اویسیہ نے آسان کردیا

یاد رکھیں! دوسری چیزوں کو بھلانا ہی تو مجاہدہ ہے۔نفل پڑھنے کی مشقت آسان ہوتی ہے کہ بندے کو اٹھک بیٹھک کروالو، اس سے نفلیں پڑھوالو، پچاس سو پڑھ لے گا لیکن ذہن سے سب نکال دو سوائے اللہ کے، یہی تو مشکل کام ہے۔اس کیلئے صوفیاء خلوت نشین کردیا کرتے تھے، کم سونے دیتے تھے، کھانا کم دیتے تھے، قلتِ طعام، قلتِ منام اور قلتِ اختلاط مع الانام۔کھانا کم، سونا کم، لوگوں سے ملنا کم، خلوت نشین، گوشہ نشین،

چلہ کشیاں کراتے تھے تب جا کے بندے کے ذہن سے یہ اُمور نکلتے تھے۔ یہ تو نسبتِ اویسیہ نے ہر کام آسان کر دیا اللہ کی شان ہے کہ ہر بندہ آج بتوفیقِ الٰہی اس کو حاصل کر سکتا ہے۔ آج عجیب لوگ ہیں تجارت بھی کرتے ہیں، بیوی بچے بھی پالتے ہیں، گھر بھی ہیں اور فنافی الرسول ﷺ اور فناء، بقاء بھی ہے۔

سرزمینِ برصغیر میں اولیاء اللہ

برصغیر کی سرزمین کو اگر دِل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو آسمان پر اتنے ستارے نہیں جتنے زمین میں اہل اللہ دفن ہیں اور ان کی ہر قبر۔ ۔ور پھوٹ رہا ہے لیکن اگر عالمِ امر میں پہنچنے والے گنے جائیں تو اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، ان کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں۔ برصغیر میں صحابہؓ کے مدفن بھی ہیں۔ برصغیر میں پہلی قوموں میں جو نبیؑ مبعوث ہوئے ان کے مدفن بھی ہیں جو غیر معروف ہیں۔ نبیوںؑ کے بعد صحابہ کرامؓ جنہوں نے یہ زمین اسلام سے روشناس کرائی اور اس زمین میں جن کا وصال ہوا اور وہ اسی زمین میں دفن ہوئے اُن کے بعد جب ولی اللہ کی بات آتی ہے تو قلب کی نظر سے یہ سرزمین اس طرح نظر آتی ہے جس طرح تاروں بھرا آسمان تاریک رات میں صاف نظر آتا ہے، اتنے ولی اللہ ہیں اس میں۔ لیکن عالمِ امر میں پہنچنے والے انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں اور نسبتِ اویسیہ والے ولایت کو شعار اس طرح کرتے ہیں کہ جو عالمِ امر میں پہنچا وہ گھر پہنچا، ترقی اس سے آگے کرے گا۔

ولایت کیا ہے؟

لوگوں نے شعبدہ بازی کو ولایت سمجھ لیا۔ دعاؤں کی قبولیت کو ولایت سمجھ لیا کہ فلاں کی دعا سے بیٹا پیدا ہو گیا حالانکہ یہ اللہ کا کمپیوٹرائزڈ پروگرام ہے۔ جسے کسی کی دعا سے بیٹا ملا وہ اللہ کا مقرر کردہ پروگرام تھا، اس کے نصیب میں تھا، کسی بندے کی دعا کو سبب بنا دیا۔ ہماری کوئی بات قبولیت پا جائے تو یہ ہماری کرامت اور بزرگی نہیں اور نہ یہ کوئی شرط

ولایت ہے کہ ولی اللہ غیب کی باتیں جانتا ہو یا فضا میں اڑتا ہو، یہ کام تو آج کی مادی مشینیں کر رہی ہیں۔ ولایت، ولی اللہ کو اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں شریک نہیں کر دیتی بلکہ اس کی ذات کو اللہ کی عظمت کے سامنے فنا کر دیتی ہے۔

کمال یہ ہے کہ ان باتوں کا پتہ چلے جو صرف نورِ نبوت سے ہویدا ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے ہیں تو فرشتے نظر آئیں، برزخ نظر آئے، اس کے لئے ایمان باللہ، ایمان بالرسالت چاہئے۔ قرآن پاک میں ہے کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (الاعراف:40) غیر مومن کیلئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ کمال تو یہ ہے کہ بندہ زمین پر ہو اور عرشِ الٰہی کا نظارہ کر رہا ہو۔ مشتِ غبار ہو، خاک نشیں ہو اور نگاہ تجلیاتِ ذاتی اور جمالِ باری پہ ہو، مزہ تو جب ہے

یا قلب مدینے جا پہنچے یا دل میں مدینہ آ جائے

اور یہ حقیقت صرف حضور ﷺ نے بتائی کہ دلوں کا قرار، دلوں کا اطمینان کیا ہے؟ وہ راز جو حضور ﷺ نے بتایا وہ راز دل پر روشن ہو جائے اور دل کی نگاہ وہاں جا پہنچے جہاں حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا تو اسے تزکیہ و تصوف کہتے ہیں۔

نبوت وہبی ہوتی ہے اور ولایت کا تعلق اِکتساب سے ہے، محنت سے ہے، مجاہدے سے ہے، طلب سے ہے۔ بات انابت کی ہے، بات جستجو کی ہے، بات آرزو کی ہے، دیتا اللہ ہے۔ وہبی اور کسبی میں یہ فرق ہے کہ جو چیز وہبی ہوتی ہے جیسے نبوت، اُسے حاصل کرنے کیلئے کوئی محنت نہیں ہوتی، اللہ کی طرف سے عطا کر دی جاتی ہے، جبکہ ولایت کسبی ہے۔ برکات اگرچہ توجہ سے نصیب ہوتی ہیں، مشائخ کے قلوب سے آتی ہیں لیکن اپنے بدن میں قبولیت کی استعداد پیدا کرنے کیلئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ اب سورج کی شعاع پتھر پہ پڑتی ہے، آئینے پہ بھی پڑتی ہے تو پتھر سے اس طرح منعکس نہیں ہوتی جس

طرح آئینے سے ہوتی ہے اس لئے کہ وہ شفاف ہے، آگے سے چمک دیتا ہے، پتھر اس طرح شفاف نہیں ہے۔ تو یہ جو مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، ذکر اذکار کرنے پڑتے ہیں، لطائف کرنے پڑتے ہیں تو یہ اپنے وجود میں، اپنی روح میں، اپنے اندر استعداد پیدا کرنے کیلئے کئے جاتے ہیں۔ جتنی کوئی استعداد پیدا کر لیتا ہے اتنی برکات اخذ کر لیتا ہے۔

صوفی کون ہوتا ہے؟

صوفی وہ ہوتا ہے جو اپنے ایمان و اسلام کے ساتھ صفائے قلب کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ وہ زبانی اسلام اور ظاہری اعمال پر نہیں رہتا، وہ چاہتا ہے کہ جب میں رکوع کروں تو میرا دل، میری روح بھی جھک جائے۔ جب میں سجدہ کروں تو میرا وجود ہی نہیں میرا دل بھی سبحان ربی الاعلیٰ کہہ رہا ہو۔ جب میں اللہ کو یاد کروں تو میرے بدن کا رواں رواں، ایک ایک جزو، بال، کھال، ہڈیاں، گوشت پوست اللہ اللہ کر رہے ہوں۔ اس کا مطلب ہے صوفی کیلئے پاسِ منشاء باری اور اتباعِ رسول، صفائے قلب کی بنیاد بن جاتی ہے۔

صوفی خرقہ پوش نہیں ہوتا، صوفی بارگاہِ رسالت ﷺ کا ایک ایسا غلام بن جاتا ہے جو ضرورت پڑنے پر شمشیر اٹھا سکتا ہے، تاجر بن سکتا ہے، مزدور بن سکتا ہے۔ صوفی جو ہوتا ہے وہ ہمہ جہت انسان بن جاتا ہے۔ تصوف تو مردِ میدان بناتا ہے اور حق کی نگہداشت ہمیشہ غازی اور مردِ میدان کیا کرتے ہیں، برقعہ پوش خواتین اور گوشہ نشین مرد نہیں۔ گوشے اللہ نے عورتوں کیلئے بنائے ہیں، جنگل جانوروں کیلئے بنائے ہیں۔ یہ کون سا تصوف ہے جو گوشہ نشین کر دے یا جنگل میں بھگا دے۔ یہ میں آپ کو بتا دوں کہ جن اکابر صوفیاء کے بارے میں آپ پڑھتے ہیں کہ وہ جنگلوں میں چلے گئے، انہیں حکومتوں نے جنگلوں میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بادشاہوں کو، لوگوں کے ان سے مستفید ہونے اور ان کے پاس انبوہ

ہونے سے خطرات لاحق ہونے لگ گئے تھے۔ صوفی گوشہ نشین نہیں ہو سکتا، کیا خوشبو کسی گوشے میں بند ہو سکتی ہے؟ پھول تو چمن کی زینت ہوا کرتے ہیں، پھول تو گلشن میں کھلا کرتے ہیں، کیا بند کمروں میں اور کونے میں پھول کھلا کرتے ہیں؟

نبی کریم ﷺ سے کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! میں تو بدوی ہوں، صحرا میں رہتا ہوں، مجھے آسان سی بات بتا دیجیے جس سے میری نجات ہو جائے تو آپ ﷺ نے فرمایا، ایمان پر قائم رہو، نمازِ پنجگانہ ادا کرو، روزے رکھو، زکوٰۃ فرض ہو جائے تو ادا کرو، میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے لئے یہ کافی ہے اور چلا گیا۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ایک خادم تھا، وضو کروا رہا تھا۔ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! اللہ اگر مجھے یہ سعادت جنت میں بھی دے دیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت کیا کروں۔ اب جس نے نجات کی بات کی، آپ ﷺ نے فرائض ارشاد فرمائے اور جس نے قرب کی بات کی، حضوری کی بات کی، خدمتِ عالی میں حاضر رہنے کی بات کی تو آپ ﷺ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا، ''نوافل کے ذریعے میری مدد کرو، تہجد نہ چھوڑو''۔ تہجد فرض تو نہیں ہے، اگر کوئی نہ پڑھے تو گناہ گار تو نہیں ہوگا لیکن صوفی کیلئے وہ فرض نہ ہونے کے باوجود فرض جتنا اہم ہو جاتی ہے۔

اس کا مطلب ہے جو قرب کے متلاشی ہیں، جو جمال کے عاشق ہیں، جو طالب ہیں رسول اللہ ﷺ کے، جو آپ ﷺ کی بارگاہ کی حضوری چاہتے ہیں وہ صوفی کہلاتے ہیں۔

صوفی اور تہجد

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ بندہ طلبِ الٰہی کا دعویدار بھی ہو اور اس کو رات کا اٹھنا مشکل بھی لگے۔ دن سارا تو دنیوی مصروفیات کی نذر ہو جاتا ہے۔ بندہ نہ چاہے تو بھی اس کی توجہ ہر طرف بٹی رہتی ہے۔ کہیں کوئی کام ہے، کوئی مزدوری ہے، تجارت

ہے، کاروبار ہے، دن تو دنیوی کاموں سے فارغ نہیں ہونے دیتا، متوجہ الی اللہ ہو کر اللہ اللہ کرنے کا وقت تو رات ہی کو ہوتا ہے۔ اپنی راتوں کو زندہ کیجیے۔ آرام بھی کیجئے لیکن جاگیے بھی۔ تہجد کا اہتمام کیجیے اور کوئی سمجھے کہ میں بالکل اٹھ نہیں سکوں گا، سفر سے تھک کے آیا ہے یا بیمار ہے تو پھر کم از کم تہجد پڑھ کے سو جائے۔ افضل یہ ہے کہ عشاء کے بعد سو کر اٹھا جائے اور تہجد پڑھی جائے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس میں جدوجہد، محنت مشقت لگتی ہے، اوکھا ہونا پڑتا ہے، مشکل کام ہے۔ تو تہجد کا اہتمام کم از کم صوفی کیلئے بہت ضروری ہے۔

صوفی کیلئے خطرناک بات

سب سے خطرناک بات جو انسان کو مارتی ہے وہ لوگوں کا رویہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے عزت دیتے ہیں، احترام کرتے ہیں تو آدمی کے اندر عبادات کی وجہ سے عجز و انکسار پیدا نہ ہو تو وہ فرعون بن جاتا ہے اور فرعونیت جب آتی ہے تو اس کے الگ الگ مدارج ہوتے ہیں۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا، لیکن آ فرعونیت ہی جاتی ہے، تکبر آ جاتا ہے، بندہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگ جاتا ہے۔ جب ایسی بات ہوتی ہے تو پہلے لذتِ عبادت جاتی ہے، پھر عبادات چلی جاتی ہیں۔ پھر اگر کچھ کرتا بھی ہے تو دکھاوا رہ جاتا ہے، عبادت نہیں رہتی۔ تو بنیادی طور پر اس بات پہ نگاہ رکھنی چاہئے بلکہ یہاں تک نگاہ ہونی چاہئے کہ کل میرے مزاج کا، میری طبیعت کا کیا حال تھا؟ ذکر اذکار، نمازوں سے مجھ میں کیا مثبت تبدیلی آئی؟ کیا کچھ غلطیوں اور کوتاہیوں سے میری جان چھوٹی، کچھ بہتری کی طرف میں رواں ہوا، ذوقِ عبادت اور بڑھا، کچھ قربِ الٰہی کی تمنا اور بڑھی، میں نے کچھ دردِ دل پایا۔ کسی حد تک یہ تجزیہ کرتے رہنا چاہئے۔

بات بگڑتی کب ہے؟

بات تب بگڑتی ہے جب بندہ اپنی انا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ وہی جرم ہے جو

ابلیس نے کیا تھا اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ (الاعراف:12) میں اس سے اچھا ہوں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں الکبر ردائی بڑائی تو میری چادر ہے۔ اب اگر کوئی دُوسرا کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں تو اس نے گویا میری چادر میں ہاتھ ڈال دیا۔ یقیناً وہ بندہ تباہ ہو جاتا ہے جو اللہ کے ساتھ اپنا ذاتی تعلق بگاڑتا ہے، دنیوی لالچ میں آتا ہے یا اپنی بڑائی میں آ جاتا ہے یا کسی نہ کسی طرح کی ایسی خرابی میں آ جاتا ہے جس سے اللہ اُسے رد کر دیتا ہے۔

نظریے کا بدل جانا، بڑائی میں گرفتار ہو جانا، دنیا کی محبت میں الجھ جانا، شہرت کے لالچ میں پھنس جانا، یہ غلطی نہیں اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ اسلام تو شروع ہی اللہ کی بڑائی سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ میں بھی بڑا ہوں تو پھر یہ غلطی تو نہیں ہے یہ صریحاً شراکت کا دعویٰ ہے جس پر بندہ بچ نہیں سکتا۔

تصوف اور نقل

جو چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے اس کی نقل بھی بنتی ہے اور پھر اگر وہ کمیاب بھی ہو تو اور زیادہ نقل آ جاتی ہے۔ نقلی سونا تو بازار میں آتا ہے لیکن نقلی ریت، مٹی تو کوئی نہیں لائے گا۔ سونے ہی کی نقل بنے گی، ریت کی کوئی نقل بنا کر کیا لائے گا۔ اسے کون خریدے گا؟ یہ چونکہ شعبہ بہت قیمتی تھا، اس کی نقل بھی آ گئی۔ لوگ نقلی خدا بنے اور لوگوں نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ لوگ نبی بھی بنے اور نبوت کا دعویٰ کیا لہٰذا نقلی ولی بن جانا یا نقلی صوفی کہلا لینا، یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ تو تصوف کی نقل بازار میں اتنی آئی کہ ہمارے دانشور حضرات نے اور بیشتر علماء نے اس کا انکار ہی کر دیا اور ابھی تک کئے جا رہے ہیں۔ ایک نقل جو عام ہوئی، اس میں خرافات آئیں، اس میں حرام چیزیں آئیں، اس میں ہندوؤں کی رسومات بھی داخل کی گئیں لیکن یہ سب نقالوں نے کیا۔ اس کا اصل اور بنیادی سبب عدم تحقیق اور نقلی صوفیوں کا کردار ہے تو اگر نقل عام ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصل کا انکار کر دیا جائے۔ وہ نقل

خود اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ یہ چیز ہے تب ہی تو اس کی نقل آ رہی ہے۔ حق یہ ہے کہ بجائے انکار کے اصل کو تلاش کیا جائے۔

جنہیں تزکیۂ قلوب نصیب ہوا، اُن کے پائے کا اللہ کی توحید ماننے والا بھی کوئی دوسرا روئے زمین پر نہیں ملتا۔ نقل کے رد کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اصل کو میدان میں لے آئیں۔ کوئی نقلی گھی بیچتا ہے تو آپ اصلی گھی عام کر دیں۔ کوئی نقلی سونا بیچتا ہے تو آپ اصل سونا مارکیٹ میں لے آئیں۔ حق تو یہ تھا کہ اسے اتنا عام کیا جاتا کہ نقالوں کی دوکانیں ماند پڑ جاتیں اور لوگوں کو حق نصیب ہوتا تو لوگ باطل میں پھنسنے سے بچ جاتے۔ نقل کو کم کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ اصل کی اساس ہی ختم کر دو، نقل ختم ہو جائے گی۔ نہیں.... بلکہ دنیا میں رہ ہی نقل جائے گی۔

تصوف اور شعبدہ بازی

جتنے مجاہدے غیر مسلم کرتے ہیں اس میں صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دماغی قوت کو کسی ایک جگہ مرتکز کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم وغیرہ۔ یہ سب کچھ مادی قوت سے ہوتا ہے اور مادی وجود پہ اثر انداز ہوتا ہے یعنی زیرِ آسماں اور بالائے زمین۔ اگر دماغی قوتوں کو جلا بخشی جائے اور بھوک پیاس کاٹی جائے، نیند کم کی جائے، باتیں کم کی جائیں، دماغ کو ایک جگہ یکسو رکھا جائے تو اس طرح کے عجائبات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن تصوف، اسلام کی بنیاد ہے، فرائض نبوت میں سے ہے۔ تزکیہ، کتاب و حکمت سے مقدم ہے۔ اللہ کریم نے نبی کریم ﷺ کے قلبِ اطہر میں وہ قوت ودیعت فرمائی کہ اول و آخر ساری کائنات کے قلوب اس قلبِ اطہر ﷺ سے روشن ہوئے اور قیامت تک جو بھی دل روشن ہوگا وہ روشنی محمد رسول اللہ ﷺ سے حاصل کرے گا۔ یہ عقل کی نہیں دِل کی بات ہو رہی ہے، مادے کی نہیں روح کی ہو رہی ہے۔

غیر مذاہب کے لوگ یا کوئی مسلمان بھی اگر عقلی، دماغی قوتوں کو جلا بخشتا ہے اور اس طرح کی چلہ کشیاں، مجاہدے، کفریہ کلمات اور شیطانی وظائف شروع کر دیتا ہے تو اس میں شیطان بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کردار تباہ ہو جاتا ہے، اُن میں سے شرافت نکل جاتی ہے، برائی بڑھتی جاتی ہے اور وہ لوگوں کیلئے ایذا کا باعث بن جاتے ہیں یعنی اس کا عملی زندگی میں حاصل یہ ہوتا ہے کہ آدمی بدکار اور بے عمل ہو جاتا ہے اس کے عقائد تباہ ہو جاتے ہیں۔

علومِ انبیاء کرامؑ

جو علوم انبیاءؑ تقسیم فرماتے ہیں اس میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔

1۔ ایک ارشاداتِ ظاہری، احکامِ دین، انبیاءؑ کے اقوال و افعال، یہ علومِ ظاہری کہلاتے ہیں۔ یہ سیکھے اور سکھائے جاتے ہیں۔

2۔ دوسری چیز ہے کیفیات۔ انبیاءؑ سے جب قلبی تعلق بنتا ہے تو قلبِ اطہرِ پیغمبرؐ سے فیض پانے والے کے قلب پر وہ کیفیت آ جاتی ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی، بیان نہیں کی جا سکتی، جس کیلئے کوئی الفاظ نہیں ملتے، جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسے کہتے ہیں برکاتِ نبوت ﷺ۔

کیفیات کیا ہیں؟

تلاوت کے ساتھ، عبادت کے ساتھ، الفاظ و حروف کی تعلیم کے ساتھ، نورِ ایمان ہو تو ایک لذت عطا ہوتی ہے جو عمل پر اُکساتی ہے، اسے کیفیت کہتے ہیں۔ کیفیات ہی عمل پر مجبور کرتی ہیں اور اس کے خلاف کرنے کو جی نہیں چاہتا اور اگر سرزد ہو جائے تو آدمی دُکھ محسوس کرتا ہے۔

کسی بھی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے خواہ صفحات سیاہ کر دیئے جائیں یا اس پر

گھنٹوں تقریر کی جائے، کیفیت کی سمجھ نہیں آئے گی۔ اس کی سمجھ تو اُسے حاصل کر کے ہی آئے گی۔ جو شخص کبھی بھوکا نہ رہا ہو، وہ بھوک کو کیسے جانے گا؟ اسے چوبیس گھنٹے بھوکا رہنے دیں اسے خود سمجھ آ جائے گی کہ بھوک کیا ہوتی ہے۔ اسی طرح غصہ ایک کیفیت ہے کسی بندے کو بیٹھے بٹھائے کوئی تھپڑ رسید کر دے تو اُسے پتہ چل جائے گا کہ غصہ کیا ہے۔

علومِ ظاہرہ کیلئے ہمیں کسی استاد کی خدمت کرنا پڑتی ہے، کسی کتاب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح کیفیاتِ باطنی کو حاصل کرنے کیلئے اُن سینوں سے، اُن دلوں سے اُن کیفیات کو حاصل کرنا پڑتا ہے جو اُن کے امین ہوتے ہیں۔ کیفیاتِ باطنی، ظاہری علوم سے زیادہ لطیف تر اور اس سے زیادہ قیمتی ہیں۔ کیفیاتِ باطنی ایسی چیز ہیں کہ جب اور جہاں سے ڈور ٹوٹی، کیفیت غائب ہوگئی کیونکہ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں کہ کوئی لفظ ہو اور ذہن میں بیٹھ جائے۔ یہ تو کیفیت ہے اور کیفیت ہمیشہ طبیعت کے بدل جانے سے بدل جایا کرتی ہے۔ پھر آپ اسے روک نہیں سکتے۔ اس پر تو آپ قادر نہیں ہو سکتے کہ جو حالت دل کی خوشی کے وقت ہوتی ہے غصے میں بھی وہی رہے۔ وہ تو ایک کیفیت تھی جو خوشی سے متعلق تھی تو جب خوشی دل سے رخصت ہوگئی اور دل میں غصہ آ گیا تو کیفیت بھی غضب کی آ گئی۔

چونکہ یہ کیفیات ہوتی ہیں، یہ دل کی ایک حالت ہوتی ہے، دل ایک خاص اُنس حاصل کرتا ہے، تو جب شریعت سے یا ان لوگوں کے ساتھ جہاں سے اس نے وہ کیفیت حاصل کی تھی تعلق ٹوٹتا ہے تو پھر یہ کیفیت چلی جاتی ہے۔

انبیاءؑ کے علوم اور کیفیات

اللہ کے نبیؐ جب کسی موضوع پر بات کرتے ہیں تو وہ صرف جملے ہی نہیں کہتے بلکہ اس کے ساتھ وہ کیفیات بھی تقسیم فرما دیتے ہیں جس سے اُس ارشاد پر عمل کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیات قلبِ اطہر ﷺ سے ان قلوب کو منتقل ہوتی ہیں جن میں قبولیت

کی استعداد باقی ہوتی ہے۔

جب اللہ کے نبیؐ کسی چیز کے بارے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ نیکی ہے تو صرف یہ علم ہی منتقل نہیں ہوتا بلکہ ایک کیفیت بھی منتقل ہوتی ہے جس سے نیکی کرنے کو جی چاہتا ہے اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس کمال کا اثر ہے کہ جب وہ ارشاد فرمائیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو تو لوگ بے تابانہ دوڑ پڑتے ہیں، سینے چھلنی کروا لیتے ہیں، گردنیں کٹوا دیتے ہیں اور خود کو قربان کر دیتے ہیں۔

اسی طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کسی کام سے منع فرما دیتے ہیں تو اس کام سے ایک نفرت پیدا ہو جاتی ہے، ایک کراہت آنے لگتی ہے۔ اور یہ کیفیت عہدِ مبارکہ میں اعلیٰ ترین درجے میں عطا ہوئی لیکن ختم کبھی نہیں ہوئی، آج کے برائے نام مسلمان میں بھی موجود ہے۔ ذرا ہم خود ہی دل میں سوال کر لیں کہ جب گناہ کی بات ہو تو کیا بُرا محسوس نہیں ہوتا؟ کیا گناہ، چوری، رشوت، جھوٹ کیلئے دل کے اندر ایک نفرت سی محسوس نہیں ہوتی؟

ہم سے اگر کوئی نیکی ہو جائے، کبھی رمضان کے روزے عطا ہو جائیں، درود، کلمہ پڑھنا نصیب ہو جائے، فرائض اور سجدے نصیب ہو جائیں، کسی کی مدد کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے تو کیا ہمارے اندر ایک چھوٹی سی تشفی پیدا نہیں ہوتی کہ ہم نے اچھے کام کیے! یہ محسوسات کہاں سے آتے ہیں؟ یہ کیفیات ارشاداتِ نبوی ﷺ سے آتی ہیں۔ یہ کمال ہمارا نہیں، یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات کا کمال ہے؟

تعلیمات و برکاتِ نبوت ﷺ

تعلیماتِ نبوت ﷺ کے ساتھ دوسرا شعبہ برکاتِ نبوت ﷺ کا ہے۔ اللہ نے ایسے لوگ پیدا کیے جنہوں نے یہ برکات اپنے پہلوؤں کے سینوں سے اپنے سینے میں لیں اور اپنے سینوں سے اگلے سینے، اگلے دِل روشن کیے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس دنیا سے

پردہ فرمالیا تو پھر روبرو ہونے کی نعمت کسی کے نصیب میں نہ آسکی۔ کسی کو یہ نعمت نصیب نہ ہو سکی کہ وہ ظاہری آنکھوں سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھتا۔ یوں عالمِ دنیا اور عالم برزخ الگ الگ ہو گئے اور پھر کوئی صحابیؓ نہ بن سکا لیکن کیا آپ ﷺ کی برکات ختم ہو گئیں؟ ایسا ہونا ممکن نہیں اس لیے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کو تا قیامت باقی رہنا ہے اور رسالت میں آپ ﷺ کے ارشادات و برکات دونوں شامل ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ خیال آ جائے کہ برکات ختم ہو گئیں تو پھر صرف الفاظ، جملے اور تعلیمات رہ جائیں گی۔ لوگ دیگر علومِ دنیوی کی طرح دینی کتب پڑھ لیں گے۔ جس طرح تاریخ و فلسفہ پڑھ کر کسی بھی شخص کی زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آتی، اسی طرح برکات کے بغیر محض تعلیمات پڑھنے والے کا کردار بھی ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔

جس طرح عملِ صالح کیلئے طیب غذا ضروری ہے، اسی طرح اس عملِ صالح میں خلوص پیدا کرنے کیلئے، یہ برکاتِ نبوت ﷺ اس سے زیادہ ضروری ہیں۔ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ کے پاس بھی وہی تعلیمات تھیں جو آج میرے اور آپ کے پاس ہیں، پھر ہمیں توفیقِ عمل کیوں نہیں؟ جبکہ ان کی جان جا سکتی تھی، عمل نہیں چھوٹتا تھا۔ تعلیماتِ نبوی ﷺ پر عمل چھوڑنے کا وہ تصور نہیں کر سکتے تھے اور ہماری ذرا سی بھی طبیعت خراب ہو تو سارا دین چھوٹ جاتا ہے۔ آج دنیا میں جس قدر تبلیغ ہو رہی ہے، جس قدر ذرائع رسل و رسائل ہیں، جتنا ریڈیو ٹی وی کام کرتا ہے تو گویا تعلیماتِ نبوت ﷺ تو اس حد تک پھیلائی جا رہی ہیں کہ جس کا اُس زمانے میں تصور بھی موجود نہیں تھا لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے زمانے میں عمل بہت زیادہ تھا۔ اب جب کہ تعلیمات پہنچانے کے ذرائع زیادہ ہیں، عمل نہ ہونے کے برابر ہے۔ کوئی بات تو ہے اور وہ یہ ایک ہی بات ہے کہ ان کے پاس صرف تعلیماتِ نبوت ﷺ نہیں تھیں بلکہ برکاتِ نبوت ﷺ بھی تھیں اور ہم

نے تعلیمات پر قناعت کر لی اور برکات کے حصول کی کوشش نہیں کی۔

جب تک تعلیمات کے ساتھ برکات، کیفیات نہیں آئیں گی بندہ ویسے کا ویسا ہی رہے گا۔ فقہ بھی پڑھ جائے گا، حدیث بھی، عالم بھی بن جائے گا اور مفتی بھی لیکن نہ تو مفتیانِ کرام جیسا کردار ہو گا، نہ علماءِ حق جیسا۔ جب تک تعلیمات کے ساتھ برکاتِ نبوت ﷺ حاصل نہیں ہوں گی، جب تک کہ آپ ﷺ کا نور دل میں نہیں اترے گا، کردار نہیں بدلے گا۔ آج نہ تو تبلیغ کم ہو رہی، ہے نہ رمضان و حج میں کمی ہے، نہ ہی کتب و رسائل کم چھپ رہے ہیں۔ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن بندے ویسے کے ویسے ہیں۔ روزہ رکھ کر جھوٹ بول لیتے ہیں، حج کر کے دھوکہ دیتے ہیں۔ بندوں میں تبدیلی کیوں نہیں آتی اس لیے کہ الفاظ پہنچائے جا رہے ہیں، کیفیات نہیں پہنچائی جا رہیں۔

جب کوئی بندہ اللہ کے نبیؐ کے ساتھ جڑتا ہے تو جو کیفیتِ صحبت از خود در آتی ہے، وہ آدابِ نبوت بھی سکھا دیتی ہے، عشق و جنوں بھی پیدا کر دیتی ہے۔ جب تک برکاتِ نبوت ﷺ دل میں نہ آئیں، اللہ کی توحید تو بہت بڑی بات ہے، اللہ کو رازق کوئی نہیں مانتا۔ کیوں رشوت لیتے ہیں کیوں چوری کرتے ہیں، رازق تو اللہ ہے، کیوں دوسرے کا مال چھینتے ہیں، رازق تو اللہ ہے وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ (ہود:6)

تصوف و سلوک کا تعلق کیفیات و احساسات سے ہے

تصوف و سلوک کے شعبے کا تعلق کیفیات سے ہے، قلبی واردات سے ہے۔ یہ الفاظ کا گورکھ دھندہ نہیں ہے، کتابی اسباق نہیں ہیں کہ کوئی یاد کرے۔ یہ تو محسوسات ہیں، کیفیات ہیں جو دلوں کو دلوں سے نصیب ہوتی ہیں۔ بہت نازک معاملہ ہے، بہت لطیف معاملہ ہے۔

اس میں پہلی بات یہ ہے کہ اس میں ایسے لوگ ہمیشہ گنتی کے ہوتے ہیں جو یہ

کیفیات آگے منتقل بھی کر سکیں۔ ایسے لوگ کمیاب نہیں، نایاب ہوتے ہیں جو کیفیاتِ قلبی دوسرے قلوب میں انڈیلنے کا فن جانتے ہوں۔ جاننا اور شے ہے اور دوسرے کو سکھا دینا اور شے۔ یہ لوگ بڑے کمیاب ہوتے ہیں، وظیفہ بتانے والے مل جاتے ہیں، نیک، مخلص، اصلاح کرنے والے، الحمدللہ دنیا میں موجود ہیں جو محض اللہ کی رضا کیلئے ساری عمر لوگوں کی اصلاح کرنے کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ قرآن، تفسیر، فقہ پڑھانے والے، الحمدللہ موجود ہیں اور اللہ انہیں ہمیشہ قائم رکھے گا لیکن تصوف، یہ اتنا نازک معاملہ ہے کہ آپ اگر چاہیں تو پھر کر دیکھ لیں، میں نہیں سمجھتا کہ کہیں کوئی آپ کو لطائف بھی کرا سکے گا یا کسی کو ابتدائی مراقبات کی خبر ہو۔ اول تو بہت کم ہیں اگر ہیں تو اپنے گزارے کیلئے ہیں۔

جو لوگ صوفیاء کے، متقدمین کے حالات پڑھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ظاہری اصلاح کے طالب، دعائیں کروانے والے، مصیبتوں کے مارے ہوئے، بیماریوں سے نجات کیلئے، کاروبار کیلئے دعائیں کروانے والوں کا جمگھٹا تو شاید لاکھوں کا ہوتا تھا لیکن کیفیاتِ قلبی کے طالب اور پھر اتنی تعداد میں، تاریخِ تصوف میں نہیں ملتے جتنا فضل اللہ پاک نے آج سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ پر فرمایا ہے۔

برکات کا flow

یہ ایک قاعدہ اور اصول ہے کہ جس طرح پانی نیچے کو بہتا ہے، اسی طرح برکات بھی اوپر سے نیچے کو آتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی عظمت کا اقرار کئے بغیر، آپ ﷺ کا خادم بنے بغیر جو بھی آپ ﷺ کی برابری کی سطح پر کھڑا ہو کر سیکھنا چاہے، اسے برکات نصیب نہیں ہو سکتیں۔ برکات انہیں کو نصیب ہو سکتی ہیں جو آپ ﷺ سے نیچے نشیب میں کھڑے ہوں۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ کے مقابلے میں کھڑا ہونے والا اُن سے مستفید نہ ہو سکا۔ اہل اللہ کی برکات سے بھی وہی لوگ محروم رہتے ہیں جو ان کی عظمت کو قبول کرنے سے انکار

کرتے ہیں۔

لہٰذا حصولِ علم اور حصولِ برکات کا ایک لازمی اصول ہے کہ تعلیمات و برکاتِ نبوت ﷺ حاصل کرنے والے کو سلف صالحین اور اہل اللہ کی جو عنداللہ حیثیت ہے، اسے ماننا پڑتا ہے اور آدمی ان سے نیچے رہ کر ہی برکات حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر کبھی اُسے ان کی برابری کا گمان آ جائے تو وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

برکات و کیفیات کی نزاکت

کوئی بادشاہ کسی کو ملازم رکھ لے تو نوکر احسان نہیں رکھتا کہ اُس نے بادشاہ کی خدمت کی بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ احسان بادشاہ کا ہے کہ جس نے اسے ملازم رکھ لیا۔ سو یہ اللہ کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہمیں نوکر رکھ لیا ہے اس نے توفیق ارزاں کر دی ہے لیکن اس ملازمت میں خطرہ بھی ہے۔ جو دربارِ شاہی کے ملازم ہوں وہ بہت عیش میں رہتے ہیں لیکن ان کی زندگی ہر وقت تلوار کی دھار پر رہتی ہے کہ کب کوئی جملہ غلط نکل جائے اور کب گردن ماردی جائے۔ وہ دربارِ شاہی میں ہوں یا اپنے گھر میں، اُن کا رویہ بڑا محتاط ہوتا ہے۔

برکات و کیفیات نازک چیزیں ہیں، ان کی سخت حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے مشائخ اپنے ماحول سے دور بھیج دیا کرتے تھے کہ بندہ اپنے ماحول سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ کہیں رشتہ داری، دوستی، دشمنی، لین دین رہتا ہے اور یہ چیزیں بندے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں اور کیفیات کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے نئی جگہوں پر جانے سے انسان یوں بچ جاتا ہے کہ وہاں رشتہ داریاں نہیں ہوتیں اور ایسی مجبوریاں نہیں ہوتیں۔

تزکیہ کیسے ہو، کیفیات کہاں سے ملیں؟

قرآنِ حکیم تو بازار سے مل جاتا ہے، ہم پڑھ سکتے ہیں الحمدللہ۔ دنیا کی ہر زبان

میں اس کا ترجمہ، تفسیر مل جاتی ہے، ہم پڑھ سکتے ہیں، ہمیں پڑھانے والے مل جاتے ہیں، اُن سے پڑھ سکتے ہیں۔ حدیث شریف کی ہر کتاب ہر علمی کتب خانے سے مل جاتی ہے۔ خود پڑھ سکتے ہیں، پڑھانے والے، بتانے والے مل جاتے ہیں۔ تو یہ کیفیات کس کتب خانے پہ، کس دوکان پہ، کس جگہ پہ بکتی ہیں؟ کہاں ہے ان کی کوئی دوکان، کوئی ایسی جگہ جہاں سے یہ کیفیات بھی دل میں انڈیلی جاسکیں؟

بارگاہِ نبوی ﷺ میں تو یہ دولت بٹتی نہیں تھی، لٹتی تھی کہ جس کی نگاہ حضور ﷺ پر پڑ گئی یا حضور ﷺ نے اُسے دیکھ لیا تو کیفیات کا خزانہ اس کے سینے میں انڈیل دیا اور وہ شرفِ صحابیت سے مشرف ہوگیا۔ وہ تو اِک نظر تھی محمد رسول اللہ ﷺ کی جو زندگی میں کسی کو ایک بار نصیب ہوگئی، دل بک گئے، دل فروخت ہوگئے، دل اپنے نہ رہے، دل غلام ہوگئے محمد رسول اللہ ﷺ کے، دلوں کا تزکیہ ہوگیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو کتابیں پڑھتا ہے وہ عالم بن جاتا ہے۔ اب جس نے کتابیں نہیں پڑھیں وہ کیا کرے؟ تزکیے کیلئے کتابیں پڑھنا شرط نہیں تھا بلکہ کتابیں پڑھنے کے لیے تزکیہ شرط تھا۔ کتابوں کے پڑھنے سے تزکیہ ہو جاتا تو کتابیں پڑھنا سہل ہو جاتا، ان کے مفاہیم دل میں اترنے لگتے اور وہ کام پر آمادہ ہو جاتا۔ تزکیہ سے تو کیفیات دل میں اتر جاتی ہیں اور بندہ، اللہ کا بندہ بنتا چلا جاتا ہے۔

فیض کیا ہے اور کسے ملتا ہے؟

تصوف وسلوک میں، ایمان ویقین کی کیفیات نبی کریم ﷺ کے قلبِ اطہر سے مشائخ کے قلوب میں آتی ہیں، مشائخ سے سالکین وصول کرتے ہیں یہ بہت نازک کام ہے، اس میں دل سے کیفیات لینی ہیں اور دل میں بسانی ہیں۔ یہ کیفیات شیخ سے ظاہری تعلق کے ذریعے نہیں لینی اور لے کر جیب میں یا پلو سے باندھ کر نہیں رکھنی، اپنے دل میں بسانی ہیں۔ یہ دل کا معاملہ ہے اور حساس ترین ہے۔

وہ شخص جس کا دل بنیادی طور پر طے کرلے، ذاتی طور پر طے کرلے کہ مجھے اللہ کا قرب چاہیے، اللہ کی رضا چاہیے، جو یہ طے کرلے کہ مجھے اللہ کی طلب، اللہ کی آرزو میں، اس کی رضا کی تلاش میں سب کچھ ہی ہار دینا چاہیے، اسے یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ جس کے دل میں یہ فیصلہ نہیں ہوسکتا، جو خود یہ طے نہیں کرسکتا، اس کیلئے نہ کوئی ولی ہوتا ہے نہ کوئی ہادی ہوتا ہے نہ رہنما، نہ کوئی واعظ ہوتا ہے نہ ہی کوئی مبلغ اُس کے کام آسکتا ہے۔ یہ سارا معاملہ انسان کے ذاتی فیصلے پر ہے۔ ہر واعظ، ہر مقرر، ہر پیر، ہر مولوی، ہر استاد ہمیں اس کے فوائد ونقصانات سے آگاہ تو کرسکتا ہے لیکن فیصلہ کرنا ہمارا اپنا ذاتی کام ہے۔

فیض کسے کہتے ہیں؟ اسی طلب و آرزو کو، اسی کرم و رحمت کو، اسی شفقتِ الٰہی کو، اسی کیفیت کو پانا، یہ ولی کا فیض ہے۔ انسان اگر خلوص کے ساتھ کسی ولی کے دروازے پر جم جائے، شرط یہ ہے کہ وہ حقیقتاً ولی ہو بھی ولی، تو انسان کتنی بڑی نعمتیں پاسکتا ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔

گوشہ نشینی اور روحانی ترقی

ترقی کا انحصار اتباعِ شریعت پر ہے۔ اگر ایک آدمی کاروبارِ حیات چھوڑ دے، دنیا سے الگ ہو جائے، گوشہ نشین ہو جائے اور رات دن متوجہ الی اللہ رہے تو ترقی نہیں ہوتی کیونکہ اس کے پاس اعمال کیلئے کوئی میدان نہیں ہے۔ روح جہاں ہے وہیں رہے گی، اس میں بڑھتی رہے گی، انوارات بڑھتے رہیں گے، طاقت بڑھتی رہے گی لیکن ترقی نہیں ہوگی اس لیے کہ ترقی کا انحصار اتباعِ شریعت پر ہے۔ ورنہ انبیاء اس کے سب سے زیادہ مستحق تھے جنہیں وحی، الٰہی نصیب ہوئی، مکالمہ الٰہی عطا ہوا وہ اسے لے کر گوشہ نشین ہو جاتے، کسی سے بات ہی نہ کرتے، ہر لمحہ قربِ الٰہی میں بسر ہوتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آدمؑ سے لے کر

حضور آقائے نامدار ﷺ تک ان کا ہر لمحہ احکامِ الٰہی کی تعمیل میں بسر ہوا۔

تعامل صحابہؓ، تعامل اہل اللہ، تعامل امت سے یہی بات ثابت ہے کہ جتنا آپ اپنی زندگیوں کو شریعت کے مطابق ڈھالیں گے، ذاتی طور پر شریعت پر عمل پیرا ہوں گے، دوسروں کیلئے نمونہ بنیں گے، دوسروں کو پیار، محبت اور شفقت سے شریعت کی تعلیم دیں گے، اتنی روحانی ترقی نصیب ہوگی۔ پھر جب مراقبات کریں گے تو روح کو قوتِ پرواز بھی نصیب ہوگی یعنی دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اگر شریعت پر عمل نہ ہو تو جو کچھ ہے اس کے چھن جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ معاشرے میں اتنا بگاڑ آچکا ہے کہ میدانِ عمل میں رہ کر، لوگوں سے تعلقات رکھتے ہوئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دین پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ جو لوگ مشکل حالات کا سامنا کرتے ہوئے دین پر قائم رہتے ہیں، انہیں اجر بھی بہت بڑا ملتا ہے اور ان کے اعمال تھوڑے ہو کر بھی بہت اجر پاتے ہیں۔ ماحول اور معاشرے کی شکایت لے کر اپنے لئے جواز تلاش کرنا بہت بڑی کمزوری ہے۔ ماحول جیسا بھی ہو، معاشرہ جیسا بھی ہو، آدمی کو نیکی پر چل کر دکھانا ہے۔ اگر معاشرہ برائی پر بضد ہے تو کیا کوئی نیکی پر استقامت نہیں دکھا سکتا؟ اگر کوئی غلط کاری پر قائم ہے تو کیا اس شخص کو جسے نورِ ایمان نصیب ہے، جسے ذکر اذکار سے قوتِ ایمان نصیب ہے، اسے نیکی پر اصرار نہیں کرنا چاہیے؟

ترقیٔ درجات

ہر مومن زندگی بھر ترقی کر سکتا ہے، اہل اللہ ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اہل اللہ ہی نہیں، اللہ کے نبی اور مقرب رسول بھی ترقی کرتے رہتے ہیں۔ خود نبی کریم ﷺ کے منازل میں ہر لمحہ ترقی ہوتی رہتی ہے۔

آپ اس کو اگر دوسرے انداز سے بھی دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیں کہ جو شخص بھی نیکی کی داغ بیل ڈالتا ہے جب تک لوگ اس پر عمل کرتے رہتے ہیں، اس کا ثواب اس شخص کو پہنچتا رہتا ہے۔ روئے زمین پر اللہ کا نام، اللہ سے آشنائی، اللہ کے احکام، اللہ کا دین کس نے بتایا؟ حضور نبی کریم ﷺ نے بتایا۔ بعثت سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ سجدے کریں گے، ذکر کریں گے، تلاوت کریں گے، تہجد پڑھیں گے اور جتنی نیکیاں کریں گے، قربِ الٰہی کے مدارج پائیں گے۔ اس پر جتنا ثواب ان سب کو ہوگا، اتنا ثواب اُس اکیلی ہستی کو ہوگا جس نے یہ سب کچھ سکھایا۔ تو اگر حساب کتاب سے بھی دیکھیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ آپ ﷺ کے مدارج میں ہر آن ترقی ہوتی رہتی ہے۔ جنتیوں کی ترقی ہر آن جنت میں ہوتی رہے گی۔ صلحاء، اولیاء کے منازل میں ترقی ہوتی رہے گی۔ زندگی میں، عند الموت اور موت کے بعد بھی قرب کی لذات میں ترقی ہوتی رہے گی۔

تجلیاتِ باری کا مشاہدہ

حدیثِ احسان میں ہے کہ اللہ کی عبادت ایسے کر جیسا کہ تُو اسے دیکھ رہا ہے۔ اب یہ دیکھنا بڑی عجیب بات ہے کہ اس عالم میں، اس مادی وجود کی آنکھ سے اللہ کو دیکھنا ممکن نہیں۔ دنیا میں یہ مادی آنکھ ایسا نہیں کر سکتی، اس میں استعداد ہی نہیں ہے۔

یہ یاد رہے کہ جو کام انسان کیلئے ناممکن ہوتا ہے وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا جیسے بندے کے پَر نہیں ہیں لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میرے پَر نکل آئے ہیں اور میں اڑ رہا ہوں تو وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف اگر وہ کسی کو کہہ دے کہ میں پیدل چل کر ہمالیہ پر چڑھ سکتا ہوں تو وہ تصور کر سکتا ہے، چاہے وہ ساری زندگی نہ چڑھ سکے۔ تو جو چیز ممکن ہو تصور اس کا کیا جا سکتا ہے، جو چیز ممکن نہ ہو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حضور ﷺ کے ارشاداتِ عالی کہ ''اللہ کی عبادت ایسے کر جیسا کہ تو اسے دیکھ رہا

ہے" سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ یہ انسان کے بس میں ہے لیکن کیسے؟ اللہ کے اولوالعزم رسول حضرت موسیٰؑ نے عرض کی تھی رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (الاعراف:143) اے اللہ! مجھے اپنا جمال دکھا، میرے سامنے آ، میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ انظر کا لفظ اِس مادی آنکھ پر، اِس نظر پر لاگو ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا لَنْ تَرٰىنِیْ (الاعراف:143) اس آنکھ سے آپ مجھے دیکھ نہیں سکتے حالانکہ تجلیاتِ باری تو موسیٰؑ نے درخت پر بھی دیکھیں اور آواز آئی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ (طٰهٰ:14) میں اللہ ہوں لیکن یہ سب دیکھنا دِل کی آنکھ سے تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ کو شوقِ دیدار ہوا تو عرض کی رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ اے میرے پروردگار! مجھے اپنا دیدار کرا دیجیے تو ارشاد ہوا لَن ترانی تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔

تو جب اولوالعزم رسول ظاہری آنکھ سے اِس دنیا میں نہیں دیکھ سکتا تو حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ اللہ کی عبادت ایسے کر جیسا کہ تُو اسے دیکھ رہا ہے اس میں کیسے تطابق ہو؟ تو اس کی صورت یہ ہے کہ اگر قلب کی آنکھ کھل جائے، دِل کی آنکھ کھل جائے، دِل کو نظر مل جائے تو آدمی اپنی حیثیت کے مطابق تجلیاتِ باری کو دیکھ سکتا ہے، نبیؑ اپنی شان کے مطابق، صحابیؓ اپنی شان کے مطابق اور اگر کوئی ولی دیکھے گا تو وہ اپنے مقام کے مطابق۔ اب ذاتِ باری کا مشاہدہ ہو نہ ہو، تجلیاتِ باری کا مشاہدہ مبتدی سے لے کر منتہی تک کو ہو سکتا ہے اور وہ بھی دِل کی آنکھ سے۔

یاد رہے کہ ہر صلوٰۃ میں یہ کیفیت وارد ہونی چاہیے، یہ محسوس ہونا چاہیے کہ میرے سامنے میرے اللہ کی تجلیات ہیں، میرا اللہ میرے روبرو ہے اور یہ ظاہری آنکھ سے ممکن نہیں اور قلبی آنکھ سے پوشیدہ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قلب کی آنکھ ہی نہ ہو۔ قلبی آنکھ کھل جائے تو قلبی بصیرت سے اس دنیا میں یہ سب ممکن ہے۔

فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُکَ وَ کُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ (الاعراف:144)

حضرت موسیٰؑ کو اللہ کریم فرماتے ہیں "جو کچھ میں نے عطا کیا ہے وہ لے لو اور میرا شکر ادا کرتے رہو"۔ اب یہ سارا مسئلہ تصوف و سلوک کا ہے اور ایک بہت اہم بات، ایک بہت بڑے مسئلے کا حل بتا دیتا ہے۔

آدمی فطرتاً لین دین کا بڑا حساب رکھنے والا ہے۔ بندوں کا تو یہ عالم ہے کہ اگر صلوٰۃِ پنجگانہ ادا کرتے ہیں تو اُن کا خیال یہ ہوتا ہے کہ میں نے تو اللہ کا بڑا کام کیا ہے اب اللہ کو چاہیے کہ میرا کوئی بچہ بیمار نہ ہو، میری اپنی طبیعت خراب نہ ہو، میرے کاروبار میں کوئی نقصان نہ ہو یعنی بندوں نے حساب رکھا ہوا ہے۔ میرے پاس ایسے معاملات پر سینکڑوں خطوط آتے ہیں گویا ایک بزنس ہے، ایک کاروبار ہے ربِ جلیل کے ساتھ کہ میں تیری نمازیں پڑھوں گا، تُو میرے کام کر۔ اب اس سوداگری میں تو کوئی عشق و محبت کی بُو باس نہیں ہے۔ اب اگر اس مصیبت سے کوئی نکلتا ہے تو ایک اور مصیبت آ جاتی ہے، اسے اپنی بڑائی کا خیال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو اس آیۂ کریمہ میں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ ان چیزوں کو شمار نہ کرو کہ مجھے کیا ملا؟ یہ تمہارا کمال نہیں ہے۔ شمار اس بات کو کرو کہ تمہاری طلب کتنی سچی اور کتنی کھری ہے فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُکَ جو میں دیتا ہوں اسے روک کر رکھ، اُسے قابو رکھ، اُسے پکا کر، یہ نہ ہو کہ اُس پر اترانا شروع کر دے اور اسے ضائع کر بیٹھے۔ انسانی ذوقِ طلب ماند پڑنے لگتا ہے تو پھر وہ چیز بندے کے پاس نہیں رہتی۔ فخذ ما آتیتک جو کچھ میں تمہیں عطا کرتا ہوں، اُسے قابو میں رکھ وَ کُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ اور کبھی اپنی بڑائی، اپنی محنت اور اپنے کام کی طرف نہ سوچ بلکہ ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتا رہ۔

تصوف کے بارے میں ایک غلط فہمی

تصوف کے بارے میں علماء حضرات میں بھی ایک بڑی غلط فہمی جگہ پا گئی ہے اور اس کی تائید میں متقدمین کے اقوال بھی پیش کیے جاتے ہیں خصوصاً مولانا اشرف علی تھانویؒ

کا یہ قول بہت معروف ہے کہ ''نبوت کا اظہار واجب ہے اور ولایت کا استتار واجب ہے''۔

حضرتؒ کے سامنے جب یہ بات پیش کی گئی تو آپؒ نے فرمایا کہ دین چھپانے کی چیز نہیں، دین بیان کرنے کی چیز ہے اور تصوف اگر دین ہے تو پھر اس کا اظہار واجب ہے اسے چھپانے کی اجازت نہیں اور اگر یہ دین نہیں تو پھر اسے ترک کر دینا واجب ہے۔

ولی اللہ کی توہین واعتراض سے بچیں

مشائخ کا اگر کوئی قائل نہیں تو اسے ان کی تردید وتکذیب سے ضرور بچنا چاہیے کہ اللہ کے ولی کی دشمنی حقیقت میں اللہ سے دشمنی ہوتی ہے اور یہ چیز ایمان کے سلب ہونے کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ اس میں یہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے کہ اگر ان کی تائید نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم انہیں اللہ کے سپرد کر دے، ان کی تردید نہ کرے۔

یہ جو قلوب کی کیفیات ہوتی ہیں، یہ اتنی مضبوط، طاقتور اور راسخ ہوتی ہیں کہ کوئی صوفی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی بندہ ایمان ضائع کر کے مرے لیکن جب یہ چیزیں جاتی ہیں تو پھر یہ ایمان کو بھی ساتھ لے جاتی ہیں۔ مولانا تھانویؒ نے بھی لکھا ہے کہ صوفیاء سے اگر فائدہ حاصل نہ کر سکو تو ان کی برائی نہ کرو۔ ان پر ایمان لانا شرط نہیں ہے، ان کی برائی کرنے والے کافر تو نہیں ہوتے، فاسق ہوتے ہیں لیکن مرتے عموماً کفر پر ہی ہیں۔

ظاہری اور باطنی نظام کا توازن

قدرت نے ہر چیز کو ایک توازن پر رکھا ہوا ہے۔ اگر ظاہری اور مادی دنیا کا توازن ہے تو باطنی دنیا کا، روحانیت کا اور حقیقت کا بھی ایک توازن ہے۔ جتنا کفر وشرک بڑھتا ہے، اتنے وزن کے لوگ دوسرے پلڑے میں بھی ڈال دیئے جاتے ہیں تاکہ توازن رہے۔ جب کفر حد سے بڑھا تو انبیاءؑ مبعوث ہو گئے۔ اب ایک نبیؐ ساری انسانیت کے گناہوں پہ بھاری ہے، دنیا غرق ہونے سے، تباہ ہونے سے بچ گئی۔ اسی طرح قیامت

تک جہاں بے راہ روی کا، کفر وشرک کا سلسلہ جاری رہے گا وہاں آپ ﷺ کی برکات کی تقسیم بھی جاری رہے گی تاکہ ایک توازن رہے اور دنیا قائم رہے۔

مولانا احمد علی لاہوریؒ فرمایا تھے کہ لاہوریو! یہ جو تم بڑی بڑی اور کئی منزلہ عمارتوں میں آرام کی نیند سوتے ہو، اس کا سبب تمہاری عیاشی نہیں، اس کا سبب وہ شب بیدار لوگ ہیں جنہیں تم حقیر سمجھتے ہو۔ ان کی وجہ سے تمہارے یہ اعلیٰ مکان قائم ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو یہ تباہ ہو گئے ہوتے۔ یہ آپؒ اسی توازن کی بات کر رہے تھے کہ دوسری طرف اتنی نورانیت، برکاتِ نبوت ﷺ، اور نورِ نبوت ﷺ اللہ کریم تقسیم کرتے رہتے ہیں کہ دنیا کا نظام Balanced رہے۔

روح کی عظمت اور روح کی موت

حق یہ ہے کہ ہر مشاہدے کی سند حضور ﷺ کا ارشاد اور آپ ﷺ کا مشاہدہ ہے کیونکہ حضور ﷺ نے جو دیکھا، حق دیکھا اور اسے صحیح اور درست طور پہ سمجھا۔ دوسرے دیکھنے والوں کو دیکھنے میں غلطی بھی لگ سکتی ہے۔ اگر کسی صوفی کا مشاہدہ حضورِ اکرم ﷺ کے ارشادات سے ٹکرائے گا تو وہ ناقابلِ عمل، ناقابلِ یقین ٹھہرے گا جبکہ ہر وہ مشاہدہ قابلِ قبول اور درست ہوگا جو حضور ﷺ کے نقوشِ کفِ پا کے اندر اندر ہوگا۔

تو یہ ربِ جلیل کی ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ کسی کو اس عالم میں بیٹھ کر وہ بلند نگاہی، وہ دُور بینی اور وہ عالی ہمت عطا کر دے، اس کی نگاہ کو وہ روشنی عطا کر دے کہ اِس عالم میں رہتے ہوئے وہ اُس عالم میں بستا ہو، اُن نعمتوں کو دیکھتا ہو اور اُن عظمتوں کے راستے اس کی روح کیلئے اور کشادہ کر دیئے جائیں اور اِسی دنیا میں رہتے ہوئے اُس کی روح کو وہ رفعتیں نصیب ہوں جو دوسروں پہ میدانِ حشر میں پہنچ کر کھلیں گی کہ اس طرف بھی کوئی راستہ جاتا ہے اور لوگ کہہ اٹھیں گے کہ اے کاش! ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اِتباع

اور آپ ﷺ کی غلامی میں وہ راستہ اختیار کیا ہوتا جس پر حضور ﷺ کے نقوشِ کفِ پا تھے۔

جہاں یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے وہاں اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ آدمی جب اپنے آپ کو دیکھنے لگتا ہے تو نیچے گر جاتا ہے۔ جب تک اس کی نگاہ عظمتِ باری اور اتباعِ رسالت ﷺ پہ رہتی ہے اور اپنے کو لاشئے محض سمجھتا ہے اور اپنے کو حقیر جانتا ہے اور اللہ کا کرم سمجھتا ہے کہ وہ اسے کہاں تک پہنچا رہا ہے، تب تک اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ چھوٹی موٹی لغزشیں اللہ کریم معاف کر دیتا ہے لیکن جب اِن عظمتوں کو، اِن بلندیوں کو اپنا ذاتی کمال سمجھنے لگتا ہے کہ میں بھی کوئی شے ہوں تو وہ لمحہ اس کی روحانی موت کا ہوتا ہے اور اس زینے سے گرنے والا کبھی سلامت نہیں بچتا۔ یہ قاعدہ ہے کہ کوئی جتنی بلندی سے گرتا ہے اُسے اتنی ہی زیادہ چوٹیں آتی ہیں۔

دل والوں کی نگری عجیب ہے

بڑی عجیب بات ہے کہ ظاہری علوم کیلئے منتیں کرنا پڑتی ہیں، اساتذہ اور علماء کے قدم چھونا پڑتے ہیں کہ اس بچے کو آپ ضرور رکھیں، داخلہ دیں لیکن یہ دِل والوں کی نگری عجیب نگری ہے، یہ ایک ایک بندے کے پاس خود پھرا کرتے ہیں یعنی جن کے پاس حقیقی دولت ہے اور جن کے پاس ایسی نایاب دولت ہے کہ اگر اُس کا کوئی شمہ نصیب ہو جائے تو ظاہری علوم والے ساری زندگی جو دیتے رہتے ہیں، اُس سے کروڑوں گنا زیادہ ایک آن میں نصیب ہو جاتا ہے۔

ارے بھائی! سارے علوم کی انتہا تو یہ ہے کہ بندے کو اپنی حیثیت اور اللہ کی عظمت کا اندازہ ہو جائے۔ آپ کسی کی زبان سے وعظ سننا چاہیں، اس کا موڈ بنے گا تو وہ کرے گا۔ آپ اسے پتھر ماریں، تھپڑ ماریں، بے عزتی کریں، کہیں اب تقریر بھی سنا دو، وہ نہیں سنائے گا۔ دِل تو اس سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ جب آپ کسی کے دل سے کوئی چیز

لینا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو ایسا راستہ بنانا پڑتا ہے کہ اُس کا دِل اسے آپ کو دینے پہ مائل ہو جائے۔ پھر یہ ایک تار جڑ جاتی ہے۔ یہ قطرے قطرے سے دریا بن جاتا ہے، سمندر بن جاتا ہے۔ حسبِ ہمت، حسبِ توفیق، حسبِ عطائے الٰہی اسباب بنتے رہتے ہیں۔

ہم نے دو دریاؤں کو بنتے دیکھا۔ بلندیوں پر آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ ٹپکتے دیکھا، پھر اِس پر بڑھتے بڑھتے ندی بنی۔ پھر نالہ بنا پھر دریا بنا اور اسے ہم نے آکر بڑے دریاؤں میں گرتے بھی دیکھا۔ اِسی طرح اس معاملے میں بھی ایک ایک ریشہ جڑتا جاتا ہے، بندے کے ایک ایک ذکر کا، ایک ایک سجدے کا۔ ایک ایک کیفیت جو حضوری کی نصیب ہوتی ہے، کبھی دعا کرتے ہوئے نصیب ہوتی ہے، کبھی بات کرتے ہوئے نصیب ہو جاتی ہے، کبھی تنہا بیٹھے، کبھی سجدے میں، پھر جب آنکھ وا ہوتی ہے، جب دِل کی آنکھ کھلتی ہے تو دنیا کے علوم تو اُس کی راہ کی گرد بن جاتے ہیں اس لئے کہ وہ عالم بن جاتا ہے علومِ آخرت کا، علومِ الٰہیات کا، علومِ ملکوتی کا۔ جب وہ دنیا کی باتیں کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ سارا فلسفہ اس نے کیسے سیکھا؟ وہ سیکھتا نہیں ہے، وہ ان ساری چیزوں کو اُچک لیتا ہے، کتابوں سے پڑھے بغیر اُچک لیتا ہے، یہ قوت آجاتی ہے۔ اس میں اصل کرنے کا کام یہی ہے، باقی سارے کام اس مقصد کیلئے ہیں کہ یہ کام نصیب ہو جائے۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں اس طرح گھیر کر اگلوں نے یہ نعمت ہم تک پہنچائی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم پرائمری کے استادوں کے پیچھے پھرے، مڈل، ہائی سکول کے استادوں کے پیچھے پھرے، نوکری کیلئے لوگوں کے پیچھے پھرے، محنت مشقت کیلئے لوگوں کے پیچھے پھرے لیکن اس دولت کیلئے ہم نہیں گئے، انہوں نے پکڑ کر ہمیں عطا کی۔ جو سب سے قیمتی چیز تھی، اسے ڈھونڈنے ہم نہیں گئے، دینے والوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر، پکڑ پکڑ کر نوازا کہ تم بھی لے لو یار! کام آئے گی، تم بھی لے لو، تم بھی لے لو۔ میرے

بھائی! بڑی سادہ سی بات ہے، بڑی سیدھی سی بات ہے کہ اس کے بغیر انسان، انسان نہیں بنتا۔ یہ نصیب ہو جائے تو زندگی اور موت کا حقیقی تصور سامنے آتا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ اے بندے! اپنے دل کو، اپنے سینے کو میرے نام سے اِس طرح گرما کہ تیری رگ رگ میں میرا نام رقم ہو جائے۔ بال بال سے اللہ کی صدا آئے، خون کے قطرے قطرے سے اللہ ہو نکلے، ہڈی، جوڑ، ریشے، پٹھے سے اللہ کی صدا آئے۔

یہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں۔۔۔

صوفیوں کا حال عجیب تر ہوتا ہے۔ انہیں کوئی روٹین لائف میں بھی نہیں لیتا۔ لوگ ان کی تردید کرنے پر لگے رہتے ہیں، ان کا انکار کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں جھوٹی انا ہوتی ہے، اپنی بڑائی ہوتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص کو اللہ نے یہ نعمت عطا کی ہے تو شائد ہمیں اسے بڑا ماننا پڑے گا، محض اس ضد میں انکار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب ایسے لوگ چلے جاتے ہیں تو پھر انہیں احساس ہوتا ہے، صدیوں تک ان کی کہی باتوں کے حوالے دیتے رہتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے بزرگ جن کے نام آج آپ بڑے احترام سے سنتے ہیں، حضرت بایزید بسطامیؒ، ابوالحسن خرقانیؒ وغیرہ یہ سارے وہ لوگ ہیں جنہیں شہروں سے نکال دیا گیا اور ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ یہ کہا گیا کہ یہ زندیق ہے، یہ بے دین ہے، یہ مسلمان ہی نہیں، یہ نیا اسلام گھڑ رہے ہیں، انہیں شہر بدر کر دیا گیا، حکومتوں نے قانوناً اُن کا شہروں میں رہنا منع کر دیا اور عجیب بات ہے کہ وہ دنیا میں نہ رہے تو صدیاں بیت گئیں، لوگ ان کی قبروں پر بیٹھے ہیں۔

اہل اللہ نے ہجرتیں کیوں کیں؟

اصل بات یہ ہے کہ مقامی لوگ رہنے نہیں دیتے، فائدہ کم حاصل کرتے ہیں اور اعتراضات اور تنقید زیادہ کرتے ہیں۔ ساری زندگی کی خامیاں تلاش کرتے رہتے

ہیں حالانکہ کس انسان میں خامیاں یا کمزوریاں نہیں ہوتیں۔ اس لیے اہل اللہ ایسی جگہ جا کر رہتے ہیں جہاں ان کی ذات سے واقف لوگ نہیں رہتے، وہ وہاں زیادہ دینی کام کر سکتے ہیں اور لوگ ان سے استفادہ بھی زیادہ کرتے ہیں کیونکہ وہ معترض نہیں ہوتے لیکن مقامی لوگ ہر وقت اسی جستجو میں رہتے ہیں کہ کیا اعتراض کریں۔

ایک اعتراض مجھ پر بھی کیا جاتا ہے کہ میں باہر آ کر بیٹھ جاتا ہوں، جہاں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ معترض کو یہ اعتراض ہے کہ ان میں نیک و بد، چور بدمعاش، شیعہ سنی سب ہی آتے ہیں تو یہ کیا طریقہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میاں! جتنی دیر وہ میرے پاس بیٹھتے ہیں کم از کم اتنی دیر تو وہ چوری نہیں کرتے، کسی کی غیبت نہیں کرتے، کسی کو گالی نہیں دیتے، یہاں سے کچھ اچھی بات ہی سن لیتے ہیں تو تم کیا چاہتے ہو کسی بندے کی زندگی میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہ آئے کہ جب وہ گناہ نہ کر رہا ہو۔

انہی بیٹھنے والوں میں سے کوئی خوش بخت تائب ہو جاتا ہے، کسی خوش نصیب کو ذکر نصیب ہو جاتا ہے۔ کتنے ایسے آتے ہیں جو کبھی نماز نہیں پڑھتے تھے، یہاں آتے ہیں نماز کا وقت ہوتا ہے تو اٹھ کر نماز پڑھ آتے ہیں۔ کوئی ایک آدھ نماز ہی انہیں نصیب ہو جاتی ہے، کچھ پکے نمازی بن جاتے ہیں اور کچھ بھی نہ ہو تو جتنی دیر یہاں بیٹھتے ہیں، کم از کم اتنے وقت کیلئے تو برائی سے بچ جاتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ ساری اللہ کی مخلوق ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے ورنہ ہم کون سے فرشتے ہیں یا ہم کون سے فرشتے تھے۔ وہ بے نیاز ہے، اپنے دروازے سے رد کر دے تو شاید اس سے بھی بدتر ہو جائیں تو کسی انسان سے نفرت نہیں، برائی سے نفرت ہونی چاہیے۔

تاریخ تصوف میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مقام

تاریخ صوف میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ذکر بڑے زور و شور اور شد و مد سے ملتا

ہے لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو پہ بہت کم بحث کی جاتی ہے کہ وہ اُس زمانے میں درآمد برآمد کا کاروبار کیا کرتے تھے اور اُن کا تجارتی سامان بحری جہازوں پر آتا تھا۔ ''نیم روز'' (صوبے کا نام) کی ریاست بادشاہ نے تحفتہً دینے کی کوشش کی تو انہوں نے فرمایا تھا کہ میری سلطنت ''نیم شبی'' ہے جو تیری سلطنت ''نیم روز'' سے بہتر ہے۔ انہوں نے زندگی بھر غیر اسلامی روایات کے ساتھ اتنا مقابلہ کیا اور اللہ کے قریب جس قدر لوگوں کو لے کر وہ پہنچے، یہ اللہ کا احسان تھا اور انہی کا مقام ہے۔ آپ اِس ایک جملے سے اندازہ کر لیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر ساٹھ برس کی زندگی میں ساٹھ منٹ بیماری آجائے تو اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے اس کی مخلوق کے سامنے اس کے شکوے کیوں کرتے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی۔ اب اس مقام پر ایک آدمی کو لے کر جانا اور اسے اللہ کے اتنے قریب پہنچا کر چھوڑنا کہ اسے بات کرتے ہوئے رب سے حیا آجائے، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

حضرت جیؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ دنیا سے سفر کے بعد ان کی روح کو ملاء اعلیٰ میں شامل کر دیا گیا۔ وہ خصوصیات عطا کر دی گئیں جو حاملینِ عرش فرشتوں کی ہیں۔ عالمِ بشریت سے اس قدر تقدس سمیٹ کر جانا یہ انہی کا خاصہ ہے۔

اہل اللہ اور طلبِ دنیا

سب سے پہلے ہمیں اپنی طلب کا جائزہ لینا ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے مسلمان بھائیوں میں کثرت سے جو عقیدت مند ہیں ان میں اہل اللہ کے پاس اصلاح کیلئے جانے والے بہت کم ہیں اور 99% بلکہ 99.9% لوگ ایسے ہیں جو محض دنیوی حاجات کیلئے کسی معروف بزرگ کے پاس جاتے ہیں یعنی اُن کا جانا سرے سے دین کیلئے ہوتا ہی نہیں خواہ وہ داتا صاحبؒ جائیں یا شہباز قلندر کے مزار پر جائیں، جہاں بھی جائیں

گے ان کے جانے کا مقصد دین نہیں، دنیا ہوتا ہے۔

تو دنیا طلبی کیلئے جو لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے وہ منافق رہے تو ولی اللہ کی کیا بساط ہے کہ آپ دنیا کی طلب لے کر جائیں اور وہاں سے نیکی لے کر لوٹیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم جائیں گے ہی دنیوی کام کیلئے، کوئی مقدمہ لے کر جاتا ہے، کوئی اولاد کیلئے جاتا ہے، کوئی تجارت چمکانے جاتا ہے اور یہی شرط ہوتی ہے اُن کی کہ اگر یہ کام ہو جائے تو یہ ولی برحق ہے اور اگر نہیں ہوگا تو ولایت مشکوک ہو جائے گی۔

اب ہوتا یہ ہے کہ کام تو اپنے وقت پر ہو ہی جاتا ہے جو ولی کو نہیں مانتے ان کا بھی ہو جاتا ہے، جو اللہ کو نہیں مانتے اُن کا بھی چلتا رہتا ہے۔ کافر اور بت پرست سمجھتا ہے، اِس بت نے میرا کام کر دیا اور مسلمان سمجھتا ہے کہ اِس صاحبِ قبر نے میرا کام کر دیا حالانکہ اولیاء اللہ اس معاملے میں بڑے غیور ہوتے ہیں۔ ولی کی ولایت کیلئے یہ شرط نہیں ہے کہ ہمارے دنیوی کام کرے یا اس کے طفیل ہوں اور اس سے عجائبات کا ظہور ہو تب اس کی ولایت برحق ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس سے لوگوں کو ہدایت نصیب ہو اور اللہ کے قرب اور رضا کی طرف اس کے قدم بڑھیں، انسان کی سوچ بدل جائے، اس کا مزاج بدل جائے۔

سب طالبِ دنیا، طالبِ آخرت کوئی نہیں

اب تو دل ترس جاتا ہے کہ کوئی ایسا آدمی ملے جو آخرت کا طالب ہو۔ سب دنیا کے طالب آتے ہیں۔ فلاں کام رہ گیا، فلاں کام ہو گیا۔ سارا دن تعویذ لکھتے رہو۔ آنے والے دنیا کے طالب ہی آتے ہیں۔ آج دعویٰ اسلام رکھنے کے باوجود سُود کھائے جا رہے ہیں، حرام کاری کئے جا رہے ہیں، بے پناہ لوگوں کو قتل کئے جا رہے ہیں، دھماکے کئے جا رہے ہیں، مخلوقِ خدا کو تباہ کر رہے ہیں اور خود کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔ نہ خوفِ خدا، نہ

خوفِ آخرت، نہ سچائی کی طلب ہے نہ اس کی اہمیت کا احساس، نہ کوئی حق کا طالب ہے نہ حقیقت کا متلاشی۔ اے سامعین و حاضرین! اِس طوفان بدتمیزی میں اللہ جل شانہٗ کے احکام اور حضور ﷺ کی سنتِ مطہرہ کو حرزِ جان بنالو۔

میں سارا دن مصروف رہتا ہوں۔ یہاں بے شمار لوگ آتے ہیں، مرد بھی آتے ہیں، خواتین بھی آتی ہیں لیکن آنے والوں میں اکثریت ایسی ہوتی ہے جو دین کی طالب نہیں ہوتی۔ مجھے حسرت ہی رہتی ہے کہ کوئی اس نعمتِ عظیم کا طالب بھی آئے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے ہر بندے کے صرف دنیوی مسائل ہی ہوتے ہیں کہ بچہ بیمار ہے، مقدمہ بنا ہوا ہے، بس یہی مسائل ہی گھیرے رہتے ہیں۔ جب تک دنیا میں بیٹھے ہیں مسائل سے تو کسی کو مفر نہیں، ان کا حل البتہ اتباعِ نبوی ﷺ میں ہے لیکن کوئی حقیقی حل کا طالب بھی تو ہو!

میں باوضو منبر پر بیٹھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے اِس ملنے ملانے سے وحشت ہوگئی ہے، اِسی کے باعث ملنے کو دل نہیں چاہتا، کیا حاصل اس طرح کے ملنے ملانے کا؟ جب لوگ اس بندے کے شعبے کے بارے اس سے بات ہی نہ کریں۔ جس جنس کا کوئی بیوپاری ہو، اُس جنس کی خریداری کے بارے کوئی گفتگو ہی نہ ہو اور یہ بات ہر شعبے کے ماہر کے ساتھ ہے۔ آپ ایک لوہار کی مثال ہی لے لیں، آپ اس کے پاس بیٹھ کر سیاست پر بحث کرتے رہیں، امورِ سلطنت کی بات کرتے رہیں تو لوہار بیچارہ کیا کرے گا؟ بیٹھا آپ کی بات سنتا رہے گا لیکن اسے آپ کی یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ اگر آپ اُس سے لوہے کی قسموں کے بارے میں بات کریں، لوہے سے بننے والے اوزاروں کی بات کریں تو اسے دلچسپی ہوگی اور وہ آپ کا پورا ساتھ دے گا یعنی ہر شعبے کا بندہ اپنے شعبے کی بات ہی کرنا چاہتا ہے اور وہی سننا چاہتا ہے۔

ہمارا بھی ایک شعبہ ہے وہ ہے اللہ کی یاد، اللہ کا ذکر، اللہ سے تعلق، حضور ﷺ کی

بات، آپ ﷺ کا اتباع، آپ ﷺ کے اتباع میں جو کمی ہو رہی ہے، اسے کیسے دور کیا جائے؟ ہم انہی اُمور پر متوجہ ہوتے ہیں، ساری محنت انہی اُمور میں کرتے ہیں۔ تو اگر ہمارے پاس آنے والے اس موضوع کو چھوڑ کر وہ مسائل زیرِ بحث لائیں جن سے دنیا کا کوئی بندہ آزاد نہیں ہے تو پھر کیا فائدہ۔ ہم خود بھی بہت سے دنیوی اُمور میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ دنیا مصائب و مسائل کا گھر ہے۔ ہم بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں لیکن لوگوں کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس آکر شاید ان کی دنیا سنور جائے گی۔ میں لوگوں کے اس رویئے سے اتنا بیزار ہو جاتا ہوں کہ جو قیمتی نعمت یہاں اللہ نے لٹانے کیلئے ارزاں کر رکھی ہے، اس کی طلب لے کر نہیں آتے۔ کئی دفعہ دل چاہتا ہے کہ انہیں کہہ دوں کہ چلے جاؤ لیکن اللہ کریم سے حیا آتی ہے، خوف آتا ہے کہ یہ دنیا کے حصول کیلئے آتے ہیں تو میں اللہ کریم سے دعا و درخواست ہی کرتا ہوں۔ اگر میں نے انہیں بھگا دیا تو پھر یہ کسی بے دین کے ہتھے چڑھ جائیں گے، کسی عامل کے پاس جا کر مال و دولت بھی ضائع کروائیں گے اور ایمان بھی خراب کروائیں گے۔

فنا فی اللہ

مٹ جانا یا فنا ہو جانا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک قطرہ آسمان سے ٹپکتا ہے اور کسی صحرا کی ریت میں جذب ہو جاتا ہے، دوسرا قطرہ کسی سمندر میں گرتا ہے۔ جو صحرا میں گرتا ہے وہ بھی فنا ہو جاتا ہے جو سمندر میں گرتا ہے وہ بھی فنا ہو جاتا ہے لیکن دونوں کے فنا ہو جانے میں فرق ہے۔ سمندر میں گرنے والا شاید ابھرتی ہوئی ہر لہر میں ہو، شاید کسی سیپ کے منہ میں چلا جائے اور گوہرِ آبدار بن کر نکلے لیکن جو صحرا میں گرا وہ تو ضائع ہو گیا۔

فنا ہونے کے اپنے مقام ہیں۔ کوئی دنیا کی محبت میں مٹ جاتا ہے، کوئی اپنے آپ کو بڑا بنانے میں مٹ جاتا ہے اور کوئی محبتِ الٰہی میں مٹ جاتا ہے۔ کون کہاں مٹتا ہے

اور اس پر کیا کیفیت وارد ہوتی ہے یہ اسے تب سمجھ آتی ہے جب وہ کسی شے پر مرمٹتا ہے۔

فنافی الرسول ﷺ

فنافی الرسول ﷺ سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی اپنی پسند آقائے نامدار ﷺ کی پسند میں فنا ہو جائے۔ اس کی زندگی حضور ﷺ کی سُنّت کا نمونہ بن جائے۔ اس کا ظاہر و باطن، اس کا حلیہ اور لباس، اس کی گفت و شنید کا انداز، اس کا لین دین اور اُس کا سارا کاروبارِ حیات، اتباعِ رسالت ﷺ میں ڈھل جائے اور یہی ایمان کا تقاضا بھی ہے کہ جب کسی نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لیا تو اس کے پاس اپنی پسند ناپسند کا کوئی اختیار ہی نہیں رہتا۔

اللہ کریم چشمِ بصیرت دے تو بڑی بڑی عجیب باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مرنے والوں پر کیا کچھ بیتتی ہے، موت کی کتنی تلخی اور شدت ہوتی ہے، کیا حال ہوتا ہے، یہ سب جاننا آسان نہیں ہے لیکن اِس میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جن کا فنافی الرسول ﷺ راسخ ہے اور جن کی روح کو دربارِ نبوی ﷺ میں آنے جانے میں کوئی دِقت نہیں ہے، اتنی محنت، اتنا مجاہدہ، اتنا خلوص، اتنی وفا کہ روح بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر رہتی ہے۔ جب ان کی موت آتی ہے تو یہ دیکھا گیا ہے کہ روح بارگاہِ نبوی ﷺ میں موجود ہوتی ہے اور فرشتہ وہاں سے اُسے گرفتار کرنے نہیں جاتا بلکہ مادی زندگی کا جو تعلق بدن سے ہے وہ منقطع کر دیتا ہے۔ فنا فی الرسول ﷺ کی یہ نعمت اگر راسخ ہو جائے تو موت، موت نہیں رہتی۔

احدیت

حضرتؒ کے ارشادات میں سے ہے کہ اگر کسی کو کوئی شیخ مراقبۂ احدیت کرا دے تو پھر اس سے کسی اور کرامت کی طلب فضول ہے۔

دنیا میں وقت کا ایک پیمانہ ہے جسے ماہ و سال کہتے ہیں۔ روشنی ایک سال میں جتنا فاصلہ طے کرتی ہے وہ فاصلہ نوری سال کہلاتا ہے۔ (روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی

ہزار میل طے کرتی۔ روح اور فرشتے کے سفر کی رفتار کئی لاکھ نوری سال فی سیکنڈ سے بھی کہیں زیادہ ہے بلکہ روح کی رفتار کو پیمانوں میں ماپنا ممکن نہیں)۔

یاد رہے کہ روح عالمِ امر سے ہے اور فرشتے عالمِ خلق سے۔ لہٰذا روح کی رفتار فرشتے کی رفتار سے بہت زیادہ تیز ہے اور کوئی اللہ کا بندہ بیک نگاہ کسی روح کو احدیت پر کھڑا کر دے تو یہ بہت بڑی کرامت ہے۔ پھر جب کوئی اس سے آگے کے مراقبات کراتا ہوا سیرِ کعبہ سے ہوتا ہوا بارگاہِ رسالت ﷺ میں جا پہنچے اور اس کی عظمت کے بارے سوچے تو سوچیں بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہیں، انہیں ماپنے کا کوئی پیمانہ نہیں رہتا۔

میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے۔ الحمد اللہ! میرے مشاہدات میں ہے کہ موت کا وقت آیا تو اُن کی روح بارگاہِ رسالت ﷺ میں تھی، ملک الموت نے صرف روح و بدن کا جو دنیوی رشتہ تھا اسے منقطع کر دیا۔

تعدّدِ اَمثال یا کثرتِ اَمثال

اہل اللہ میں اللہ نے عجیب قسم کی استعداد رکھی ہوئی ہے۔ صوفیاء میں ایک درجہ ہوتا ہے کثرتِ امثال۔ وجودِ ذاتی کہیں ہو، وجودِ مثالی بے شمار جگہوں پہ موجود ہوتے ہیں اور خارج میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ دراصل یہ وجود نہیں ہوتے بلکہ ان (صوفیاء) کی توجہ، القاء اور انوارات قلب ہوتے ہیں اور اس آئینے میں جس طرح صورت نظر آتی ہے اسی طرح محسوس ہوتا ہے کہ شیخ پاس موجود ہے حالانکہ انوارات آ رہے ہوتے ہیں۔ اسے تصوف کی اصطلاح میں کثرتِ امثال کہا جاتا ہے۔

معجزہ اور کرامت

نبیؑ کا معجزہ فعل اللہ کا ہوتا ہے صادر نبیؑ کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ ولی کی کرامت فعل اللہ کا ہوتا ہے اور ولی کو باتباعِ نبی ﷺ نصیب ہوتی ہے۔ جس طرح نبیؑ کو براہِ راست

ذاتِ باری سے معجزہ نصیب ہوتا ہے، ولی کو براہ راست کوئی نعمت نہیں ملتی، ولی گلستانِ رسالت ﷺ کا خوشہ چین ہوتا ہے، ولی کو باتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ فعل اللہ کا ہوتا ہے اور کرامت ولی کی بن جاتی ہے۔

توجہ اور برکت

توجہ تصوف کی اصطلاح ہے۔ اردو لغت میں توجہ کا معنی ہوتا ہے کسی کی طرف متوجہ ہونا، کسی چیز کی طرف ارادتاً غور کرنا یا اُس کی طرف رُخ کرنا، اُس کے بارے میں سوچنا۔ جب شیخ ارادتاً اپنی وارداتِ قلبی کو کسی طالب کے قلب میں اتارنا چاہتا ہے تو اس کام کو اصطلاحِ تصوف میں توجہ کہتے ہیں۔ شیخ کے دل میں جو انوارات ہیں، کیفیات ہیں، انہیں جب وہ کسی طالب کے قلب پر ارادتاً القاء کرتا ہے کہ اسے فائدہ ہو یا اس کے دل میں یہ جاں گزیں ہوں تو اسے توجہ کہتے ہیں۔

توجہ کرنا ایک بات ہے اور قبولیت کی استعداد ہونا دوسری بات ہے۔ شیخ توجہ کرتا ہے، سو آدمی ہیں، پچاس آدمی ہیں، پانچ سو آدمی ہیں، وہ جب توجہ کرتا ہے تو اس میں تمیز نہیں کرتا کہ کسی پر زیادہ ہو اور کسی پر کم ہو، توجہ ایک سطح کی ہوتی ہے، شیخ کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے، اس کے مقام و مرتبہ یا جتنی طاقت اس کے قلب میں ہے یا جتنی کیفیات اس کے قلب میں ہیں، اس کے مطابق ہوتی ہے اور سب پر یکساں ہوتی ہے۔ فائدہ کسی کو زیادہ ہوتا ہے یا کم، یہ اس کے دل میں قبولیت کی استعداد پر ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم نے بارش کی مثال دی ہے کہ جب برستی ہے تو یکساں برستی ہے۔ جو زمین زرخیز ہوتی ہے اس میں پھول، پھل اور کھیتیاں اگتی ہیں اور جو گندگی سے اٹی ہوتی ہے اس کی سڑاند اور بڑھ جاتی ہے، کلر والی زمین پر بارش ہوتی ہے تو اور زیادہ کلر نکل آتا ہے۔ توجہ کا اثر بھی یہ نہیں ہوتا کہ وہ کلر کو مٹائے۔ جو کلر والی زمین ہے اس کا کلر، جس کی زمین

ہے اس نے مٹانا ہے۔ توبہ اسے مٹائے گی، رجوع الی اللہ اسے مٹائے گا۔ ہاں! توبہ کرنے میں، رجوع الی اللہ کرنے میں توجہ معاون بن جاتی ہے، محرک بن جاتی ہے۔ بندے کا دل چاہتا ہے کہ توبہ کرے، اپنی اصلاح کرے۔

سالک کے قلب کا جب شیخ کے قلب کے ساتھ ربط بن جائے تو شیخ ارادہ کرے یا نہ کرے، من جانب اللہ چیزیں قلب سے قلب کو سفر کرتی رہتی ہیں، کیفیات قلب سے قلب کو آتی جاتی رہتی ہیں۔ یہ توجہ نہیں ہوتی اسے آپ برکت کہہ سکتے ہیں اور برکات کو پہنچانا اللہ کریم کا کام ہے۔ جیسے سورج نکلتا ہے تو چیونٹی سے لے کر ہر چیز اس سے فائدہ حاصل کرتی ہے جبکہ سورج کو کوئی پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔

برکت من جانب اللہ ہوتی ہے جبکہ توجہ ارادتاً ہوتی ہے۔ تو یہ کہنا کہ آپ کی توجہ سے میرا یہ کام ہو گیا، یہ نہ صرف یہ کہ جائز نہیں بلکہ شرک ہے۔ کوئی کسی کے کام نہیں آسکتا، سب کے کام وہ مالک الملک کرتا ہے، ساری دنیا کا نظام وہ اکیلا چلا رہا ہے۔ کسی کی صحت، کسی کی بیماری، کسی کے مالدار، کسی کے غریب، کسی کے چھوٹا، کسی کے بڑا ہونے میں مخلوق میں سے کسی کو کوئی دخل نہیں۔ شیخ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کا شریک بن گیا۔ اللہ کی جگہ اس نے کاروبارِ جہاں سنبھال لیا ہے، یہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ نہ کہا جائے کہ شیخ کی توجہ سے میرے بیٹے کو صحت مل گئی، شیخ کی توجہ سے یہ ہو گیا وہ ہو گیا۔ یہ شرک ہے، بندہ ایمان سے جاتا رہتا ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں نیک بندے کی یا بزرگ کی برکت سے مجھے صحت ہو گئی۔ توجہ اور برکت میں فرق ہے۔ توجہ ارادتاً ہوتی ہے اور برکات من جانب اللہ ہوتی ہیں جس طرح سورج کو اپنی برکات کی خبر نہیں، جس طرح غیر ارادی طور پر کوئی شخص کسی شیخ کی مجلس میں بیٹھتا ہے تو اسے کوئی نیکی نصیب ہو جاتی ہے یا اس میں کوئی مثبت تبدیلی آجاتی ہے تو یہ توجہ نہیں، برکت ہے۔

سُکر، جذب اور مجذوب

جن لوگوں نے زندگی دنیا سے دامن بچا کر بسر کی ہے ان سب میں ایک بات آپ کو مشترک نظر آئے گی کہ وہ آپ کو نیم پاگل، مجنوں سے نظر آئیں گے۔ اس لئے کہ جس شخص میں قوتِ برداشت نہیں ہوتی اور تجلیاتِ باری جب منعکس ہوتی ہیں دل پر، دماغ پر، تو انسانی اعصاب اور اعضاء جواب دے جاتے ہیں اور اُن میں ایک طرح کی مدہوشی پیدا ہو جاتی ہے، جسے اصطلاحِ تصوف میں سُکر کہا جاتا ہے۔ سُکر دائمی نہیں ہوتا، یہ ایک کیفیت ہوتی ہے جو آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں موجودہ دور میں یہ بڑا کمال سمجھا جاتا ہے جبکہ حقیقتاً یہ کمال نہیں ہے۔ دراصل سُکر کمزوری کی دلیل ہوتا ہے۔ اگر یہ کمال ہوتا تو انبیاءؑ پر وارد ہوتا لیکن کسی نبیؑ، کسی رسولؑ پر سُکر غالب نہیں آیا حالانکہ وہ روبرو اللہ کریم سے تجلیاتِ باری بھی وصول کرتے رہے، جمالِ باری سے بھی سیراب ہوتے رہے اور کلامِ باری سے بھی۔

جذب، سُکر کی انتہائی صورت ہے کہ جب اس میں شدت آتی ہے تو جذب پیدا ہوتا ہے۔ جنہیں آپ مجذوب کہتے ہیں، انہیں بالکل ہوش ہی نہیں رہتی البتہ سُکر کسی نہ کسی لمحے ہر صوفی پر وارد ہوتا ہی ہے۔ جذب دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے

☆ جذب جب عدمِ کمال کے معنوں میں استعمال ہو تو اس سے مراد وہ کیفیت ہوتی ہے جو انسانی حواس کو ہمیشہ کیلئے بیکار کر دیتی ہے۔ اسے مجذوب یا مجذوب سالک کہتے ہیں یعنی وہ آدمی جو سلوک کا سفر کر رہا تھا لیکن اس کا وجود، ذہن، بدن اس کو برداشت نہ کر سکا۔ اگر واقعی راہِ طریقت کا مسافر مجذوب ہو تو اس کے انوارات بڑے قوی ہوتے ہیں۔ اگر اس سے کمزور درجے

کا صوفی اس کے قریب جائے گا تو اس کے انوارات بھی سلب ہو کر اُدھر چلے جائیں گے۔ اس لئے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ابتدائی اسباق والے صوفی طالب علم کو مجاذیب سے بچنا چاہئے۔

ہمارے یہاں جہالت کے باعث ہر پاگل شخص کو بھی مجذوب سمجھ کر اسے پیر فقیر کا درجہ دے دیا جاتا ہے حالانکہ مجذوب وہ ہوتا ہے جو قربِ الٰہی کے راستے پر، طالبِ الٰہی بن کر چلتا ہوا کسی مقام پر جا کر تجلیاتِ باری کی فراوانی و تیزی کو جذب نہ کر سکنے کے باعث حواس کھو بیٹھتا ہے اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

☆ جذب جب دوسرے معنوں میں استعمال ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو اپنے اندر سمو لینا یعنی اللہ کے نام کے نور اور ذکرِ الٰہی سے جو انوارات آتے ہیں انہیں اپنے اندر سمو لینا اور اپنے وجود میں ٹھکانہ بنا لینا۔

مجذوب ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مثلاً ایک آدمی احدیت تک پہنچا، حلال اور پاک رزق کھاتا رہا، مجاہدہ بھی کرتا رہا، انوارات کی حدت بڑھتی رہی لیکن روح اگر احدیت کے دائرے سے آگے نہ نکلے، اسے آگے چلانے والا کوئی راہبر نہ ملے تو اس ایک مقام پر مستقل قیام کے باعث جذب وارد ہو سکتا ہے اور جسمانی طور پر قویٰ مغلوب ہو جاتے ہیں اور بندہ شعور کھو بیٹھتا ہے۔ حضرتؒ، منصور حلاجؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ مراقبہ فناء بقاء میں تھے اور اُنہیں ایسا کوئی شخص نہ ملا جو انہیں اس سے آگے لے جاتا۔ چونکہ فناء بقاء کے دائرے میں، بقا باللہ میں، ہر چیز، ہر ذرے میں تجلیاتِ باری نظر آتی ہیں تو وہ اسی دائرے میں کھو گئے اور ہر ذرے میں تجلیاتِ باری کو دیکھ کر انہوں نے انا الحق کا نعرہ لگایا۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ اگر اُنہیں کوئی اللہ کا بندہ ملتا جو اُنہیں بقا باللہ سے سالک

المجذوبی کے راستے پر ڈال دیتا تو وہ یہ تعرہ نہ لگاتے۔ اسی میں وہ مجذوب ہو گئے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ مجذوب ہونا کمال نہیں بلکہ عدمِ کمال کی دلیل ہے۔ ہاں ان لوگوں پر جو برکات و کیفیات کے حامل ہوتے ہیں، ان بڑی بڑی ہستیوں پر بھی کبھی ایک لمحہ جذب کا وارد ہو جاتا ہے۔ صرف نبیؐ کی ذات ایک ایسی ہستی ہوتی ہے جس پر کبھی جذب وارد نہیں ہوتا کیونکہ اس لمحے حواس قائم نہیں رہتے۔ اگر نبیؐ پر جذب آ جائے تو پوری امت کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے کہ جذب میں وہ نہ جانے کیا فرما دے۔

غیر انبیاء میں امتِ مرحومہ میں ایک ہستی ہیں سیدنا ابو بکر صدیقؓ جن پر کبھی جذب وارد نہیں ہوا اور نہ سیدنا عمر فاروقؓ جیسے عظیم انسان پر بھی چند لمحوں کیلئے جذب وارد ہوا جب حضور اکرم ﷺ کا وصال ہوا۔

ادب و احترام اور خوشامد

احترام کرنا ایک الگ بات ہے اور ناروا خوشامد کرنا بالکل الگ بات ہے۔ ادب و احترام محبت کے باعث ہوتا ہے اور خوشامد ذاتی اغراض کیلئے ہوتی ہے۔ بظاہر دونوں ایک جیسی دکھائی دیتی ہیں لیکن دونوں میں بہت بڑا فاصلہ ہوتا ہے خوشامد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ برسوں کی محنت کے بعد بالآخر محروم اور تباہ ہو جاتا ہے۔

تجسس اور طلب

انسانی مزاج ہے کہ جب وہ کسی نئی بات یا چیز کے بارے میں سنتا ہے تو فطرتاً اس میں تجسس پیدا ہوتا ہے۔ وہ اسے سمجھنا چاہتا ہے جاننا چاہتا ہے، جب تک تجسس رہتا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جب تجسس ختم ہو جائے تو اس کی طرف توجہ بھی کم ہونے لگتی ہے۔ صرف ذکر میں ہی نہیں، دنیا کے باقی معاملات میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ تصوف اور ذکر کو بھی ایک عجیب بات سمجھ کر آتے ہیں کہ چلیں دیکھیں کہ یہ کیا

ہے؟ جب انہیں ایک حد تک اس سے آشنائی ہو جاتی ہے اور ان کے تجسس کی تشفی ہو جاتی ہے تو پھر اُن میں ذوقِ طلب نہیں رہتا۔ پھر ایک روٹین رہ جاتی ہے کہ جب ملے ذکر کر لیا، نہ ملے تو نہ سہی۔ جہاں تجسس ہو وہاں یہ صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ طلبِ الٰہی میں آتے ہیں، ان کی طلب زندہ رہتی ہے اس کی کوئی انتہا نہیں اور یہ کبھی ختم نہیں ہوتی لہٰذا اُن کے ذوقِ طلب میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ جتنی یہ نعمت نصیب ہوتی ہے اتنا ہی آگے جانے کا ذوق جوان رہتا ہے۔

بندے کو خود یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے دل میں طلبِ الٰہی ہے یا محض تجسس۔ جہاں تجسس ہو گا وہاں اس کا جواب مل جانے کے بعد شوق میں کمی آئے گی اور جہاں طلب پیدا ہو گی وہاں کمی نہیں آئے گی بلکہ جوں جوں سفر آگے بڑھے گا توں توں طلب بڑھتی جائے گی۔

استدراج

اپنے آپ کو بڑا بنانے کیلئے، لوگوں کو مسخر کرنے کیلئے، لوگوں سے پیسے بٹورنے کیلئے جن چیزوں کا عملیات سے، عجائبات سے ظہور کیا جاتا ہے تو اسے اصطلاحِ تصوف میں استدراج کہا جاتا ہے۔ استدراج وہ چیز ہوتی ہے جو عجائبات کی طرح سے ظہور پذیر ہوتی ہے لیکن اس میں شیطنت کو دخل ہوتا ہے اور اس میں حق کو ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ کسی بندے کی انا کی تسکین یا کسی کی ذاتی بڑائی کیلئے ہوتی ہے۔ مشاہدات من جانب اللہ ہوتے ہیں لیکن مشاہدات میں ایک بات یہ بھی ہے کہ صاحبِ مشاہدہ کے ساتھ شیطان بھی پوری محنت کرتا ہے اور اپنی طرف سے تصویریں بھی دکھاتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ کشف میں درست بات کیا ہے اور دھوکہ کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ دھوکا شیطان کی طرف سے ہوتا

ہے، اسے اصطلاح میں استدراج کہتے ہیں۔ اس کا پتہ ایسے چلتا ہے کہ اگر کشف من جانب اللہ ہو تو اس کے نتیجے میں بندے میں مزید عاجزی آئے گی، مزید خلوص پیدا ہوگا اور برائی سے مزید نفرت ہوگی، دین سے محبت ہوگی، نیکی کرنے کو دل چاہے گا، غلطی ہو جانے پر اس کی تلخی محسوس ہوگی، گناہ کڑوا لگے گا اور آدمی اپنی اصلاح کیلئے مزید مجاہدہ کرے گا۔

استدراج کی نشانی یہ ہے کہ انسان کو اپنی بڑائی کا احساس ہونے لگے گا کہ میں بہت بڑی چیز ہوں، میں بہت بڑا بزرگ بن گیا ہوں، اسے اپنے مقدس ہونے کا زعم ہو جائے گا۔ اگر ذکر سے کردار متاثر نہیں ہوتا، اعمال نہیں بدلتے، اخلاق صحیح نہیں ہوتے، سوچ صحیح نہیں ہوتی اور محض روشنیاں نظر آتی ہیں تو اسے استدراج کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارا نفس ہمیں روشنیاں دکھا رہا ہو۔ جس عجیب کام کے ساتھ کردار سازی نہ ہو اسے استدراج کہتے ہیں۔ استدراج کافر سے بھی ہوسکتا ہے۔ معجزے، کرامت اور استدراج میں فرق یہی ہوتا ہے کہ استدراج احقاقِ حق کیلئے نہیں ہوتا۔ اس کے نتیجے میں کسی کی ذاتی بڑائی غالب آتی ہے یا کسی کو مالی فائدہ پہنچتا ہے یا کسی کو بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ ذکر کرنے سے اور صحبتِ شیخ سے مشاہدات تو ہو جاتے ہیں لیکن اگر دل میں خلوص نہ ہو تو صرف پاس بیٹھنے سے مشاہدات کی وقتی استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اس سے آگے شیطان پکڑ لیتا ہے۔ پھر وہ شخص نہ صرف خود گمراہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

زندہ دل اور اس کے ثمرات

کتنے عجیب لوگ ہیں وہ جن کے طفیل برکاتِ نبوی ﷺ نصیب ہوتی ہیں اور دلوں کو حیات ملتی ہے۔ اس عالمِ رنگ و بو سے اگر کوئی دلِ زندہ لے گیا تو اس نے سارا کچھ پالیا اور اگر وہ صرف دولتیں جمع کرتا رہا تو وہ چھوڑ کر چلا جائے گا، اس کی جواب طلبی الگ ہو گی لیکن اس کا کردار اس کے ساتھ جائے گا۔ یہاں کمانے کی دولت دلِ زندہ ہے جو اللہ کے

نور سے روشن ہو اور جب دل زندہ ہوتا ہے تو توفیقِ عمل نصیب ہوتی ہے، برائی سے نفرت ہو جاتی ہے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت اور محبت نصیب ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم کے تصورِ حیات کے مطابق جسے نورِ ایمان نصیب ہے، وہ زندہ ہے۔ جس میں نورِ ایمان نہیں، اس میں حیات نہیں ہے۔ اللہ کا انکار، اللہ کے ساتھ شرک، اللہ سے دُوری یہ تمام چیزیں حیات سے بیگانہ ہیں۔ ایسا شخص اللہ کی دی ہوئی زندگی تو گزارتا ہے لیکن وہ ایک چلتی پھرتی قبر ہوتا ہے۔ اس کے پاس جسمانی زندگی ہوتی ہے لیکن اس جسم میں اس کی روح زندہ نہیں ہوتی۔

دردِ دل

ذکر ڈوب کر کریں اس لئے کہ فقہی احکام بتانے والے مل جاتے ہیں، قرآن پڑھانے والے مل جاتے ہیں، ترجمہ بتانے والے مل جاتے ہیں لیکن دلوں میں درد بانٹنے والے بہت کم لوگ ملتے ہیں۔ یہ محض اللہ کا احسان ہوتا ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ بھی بنا دے، کوئی ایسا دل بھی دے دے، کوئی ایسا بندہ ملا دے جو دردِ دل سے آشنا کر دے۔ بہت بڑا عظیم احسان ہے اس کا۔ اس میں نہ میرا کمال ہے نہ آپ کا کمال ہے، ہم تو وہی ذرۂ بے مقدار ہیں۔

اس درد کو چندے کی طرح نہ جمع کرو کہ مل گیا تو مل گیا نہ ملا تو نہ سہی۔ نہیں یہ چندہ نہیں دردِ دل ہے اور یہ نایاب دولت ہے۔ ہر عہد میں، ہر دور میں کمیاب رہی ہے۔ وہ مبارک زمانہ تھا محمد رسول اللہ ﷺ کا کہ جو آپ ﷺ کے سامنے آیا اس کا دل روشن ہو گیا۔ وہ صحابہؓ کا زمانہ تھا کہ جو اُن کی صحبت میں پہنچا تابعیؒ بن گیا۔ وہ تابعینؒ کا زمانہ تھا کہ جو اُن کی صحبت میں پہنچا تبع تابعیؒ ہو گیا۔ اِس کے بعد یہ دولت خال خال ملتی ہے۔ بہت مہنگی چیز ہے، بہت کمیاب ہے، اس لئے ذکر کرو اور پورے درد سے کرو۔ دل کھول کر رکھ دو اس کے

سامنے اور اسے کہو بارالٰہا! اس میں اپنا پیار، اپنی چاہت بھر دے۔

بندے کی اصلاح کے درجے

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (البقرہ:257)

ولایتِ الٰہی کا اثر یہ ہے کہ بندے کا سفر تاریکی سے روشنی اور ظلمت سے نور کی طرف ہونے لگ جاتا ہے۔ بندے کی اصلاح کے درجے بھی مختلف ہوتے ہیں۔

1۔ کوئی پل بھر میں سو فیصد بدل جاتا ہے۔

2۔ بعض برائی کرنا نہیں چاہتے لیکن ان سے برائی سرزد ہو جاتی ہے۔

3۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فطرتاً، مزاجاً برائی کو پسند نہیں کرتے۔

4۔ کچھ کے مزاج میں برائی داخل ہو چکی ہوتی ہے، پھر ان کی اصلاح رفتہ رفتہ ہوتی ہے۔

اپنے آپ کو جانچنے کا آسان ٹسٹ

جب تک سانس کی ڈوری چل رہی ہے کوئی قدم بھی غلط اُٹھ سکتا ہے، کہیں بھی لغزش ہو سکتی ہے، کوئی بھی کوتاہی ہو سکتی ہے۔ تو ان ساری لغزشوں، ان ساری کوتاہیوں، ان سارے خطرات سے آگاہ رہنے کیلئے بندہ اپنا محاسبہ اس انداز سے کرتا رہے کہ عبادات میں کتنا جی لگتا ہے اور اللہ اللہ کرنے سے اکتاہٹ تو نہیں ہو رہی۔ فرائض سے، واجبات سے، نوافل سے، تلاوت سے کہیں اکتاہٹ تو نہیں ہو رہی کہ جی لوگ حرام حلال کھائے جا رہے ہیں اور ہم خواہ مخواہ پرہیز کرتے رہیں۔ لوگ تو کروڑ پتی ہو گئے اور ہم بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس طرح کے خیالات آتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یہ اللہ کریم کی ناراضگی کے سبب ہے اور اگر مزاج نیکی کی طرف مائل ہے اور برائی سے بچنا چاہتا ہے تو یہ اللہ کی رضا کا مظہر ہے۔ یعنی جتنی جتنی نیکی کی توفیق ارزاں ہوتی جائے، اس میں دل لگتا

جائے، سمجھ لیں ترقی درجات ہو رہی ہے۔ جتنی جتنی برائی سے نفرت ہوتی جائے، یہ اللہ کی رحمت ہے۔ اور اگر گناہ کی رغبت بڑھنے لگے، اپنی بڑائی کا خیال آنے لگے تو سمجھ لیں اللہ کریم راضی نہیں ہیں۔ بڑا خوب صورت سا، آسان سا، سیدھا سا معیار ہے۔

خود احتسابی

دوسرے کا حساب لینا بندے کا منصب نہیں۔ یہ صرف ایک ذات کو سزاوار ہے جو سب کا مالک و خالق ہے، جو ہمہ وقت ہر چیز سے باخبر ہے اور جس کے سامنے ہر ایک کا عمل ہے۔ بندہ اگر اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگ جائے کہ فلاں بدکار ہے، فلاں ظالم ہے، فلاں کافر ہے لیکن پھر بھی دنیا میں عیش کر رہا ہے تو وہ اپنے حال سے غافل ہو جائے گا۔ پھر وہ انہی بحثوں میں الجھتا رہے گا۔ لوگوں کی گمراہی کا ایک سبب یہ سوچ ہے۔ سوچ کا یہ انداز ہے کہ بندہ یہ سوچتا ہے کہ اس کے اردگرد لوگ سود کھا رہیں تو وہ کیوں سود نہ لے؟ اتنے لوگ ناپ تول میں خرابی کر رہے ہیں،، دھوکہ دے کر دولت کما رہے ہیں، جھوٹ بول کر عیش و عشرت کا سامان اکٹھا کر رہے ہیں تو اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ دیانتداری کے راستے پر چلے؟ اتنے لوگ نماز نہیں پڑھتے، عبادت سے دور رہتے ہیں تو اس کے لیے ہی ضروری ہے کہ وہ سجدے کرتا رہے؟ جو اس سوچ میں پڑ گیا وہ برباد ہو گیا۔ اس لئے کہ سارے بندوں کے اعمال کی ذمہ داری اُس پر نہیں، اسے تو صرف اپنی ذات کا حساب دینا ہے، اسے اپنی کامیابی کیلئے اپنا معاملہ اللہ سے درست رکھنا چاہیے۔

بندہ کچھ بھی نہیں ہے لیکن بندہ اپنی نیکیاں گنتا رہتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنی خطائیں بھی گنا کرے اور بزرگوں کا طریقہ بھی یہی ہے کہ بندہ نیکیاں نہ گنے کیونکہ نیکیوں کے قبول ہونے کی رسید ہمارے پاس نہیں ہے، امیدِ کرم ہی ہے البتہ خطائیں ضرور گنے کہ خطاؤں کی سند ہمارے پاس موجود ہوتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ بندہ یہ دیکھے کہ چوبیس گھنٹوں میں کتنا وقت ذکرِ الٰہی نصیب ہوا، کتنا وقت مراقبات کیے، قرآن حکیم کی تلاوت اور اس کو سمجھنے کیلئے کتنا وقت دیا، کتنی کوشش کی، روزانہ کی زندگی میں کتابِ الٰہی کو کتنا دخل ہے، حدیثِ رسول اللہ ﷺ سے کتنی رہنمائی لی جارہی ہے۔ اس طرح عملی زندگی کا محاسبہ کریں۔

ہمارا مقصد تو بندوں کو اللہ کی طرف لانا ہے۔ اس کیلئے اللہ اللہ کرنا سکھایا جاتا ہے، توجہ دی جاتی ہے، اس کے ساتھ محنت کی جاتی ہے اور اس سب کے بعد یہ بھی غنیمت ہے کہ اگر کچھ حاصل نہ کر سکے تو کم از کم اس کے عقائد ہی درست ہو جائیں۔ چونکہ یہ زمانہ تو ایسا ہے کہ کوئی صحیح عقیدے پر فوت ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ولی اللہ ہے۔ اعمال تو کجا، اب تو عقائد خرافات کی زد میں ہیں۔ اب وہ زمانہ گیا جب لوگ نیکی کرتے اور نیک کہلاتے تھے، اب جو برائی نہیں کرتا ہم اسے نیک سمجھتے ہیں کہ کم از کم مخلوق اس کے شر سے محفوظ ہے۔

ہمیں خود کو جانچنا چاہیے کہ جب ہم ابتداء میں محنت کرتے تھے اور اب محنت کرتے ہیں تو اطاعتِ حق میں کتنا خلوص بڑھا، کردار میں کتنی تبدیلی آئی اور جیسے جیسے ذکر اذکار کی محنت میں وقت گزرا، مراقبات کی نعمت نصیب ہوئی تو ہمارے کردار و عمل میں کتنا کھرا پن آیا؟ اتباعِ رسالت ﷺ میں کتنا اضافہ ہوا، کیا مزاج میں نیکی کی طلب آئی، محبتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو در آئی؟

لوگوں کا معاملہ اُسی پر رہنے دو جو لوگوں کا مالک ہے۔ صرف اپنے آپ کو اپنے سامنے رکھو، اپنی عدالت لگاؤ اور اس میں خود کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اپنا محاسبہ کرو۔ اپنے آپ سے پوچھو کہ آج تک تُو کیا کرتا رہا؟ وہ کیسا کریم ہے کہ تو خطا کرتا ہے اور وہ تیری بخشش کے اسباب مہیا فرماتا رہتا ہے۔ تو دُور بھاگتا ہے اور وہ تیرے سامنے منزل لا کر رکھ دیتا ہے۔ تو اس کی بارگاہ سے بھاگتا ہے اور وہ تجھے اٹھا کر اپنے حضور لانا چاہتا

ہے۔ تجزیہ ہمیں اپنا کرنا ہے کہ میں مشتِ غبار ہوں، کہیں سنگلاخ چٹان تو نہیں بن گیا۔ اس بات پہ نہ رہو کہ میں تو بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہو گیا۔ اللہ خود بڑا ہے اور اس کے سامنے کوئی بڑا نہیں ہے۔ جب محاسبے کا وقت آئے گا تو پتہ تب چلے گا کہ تم پیر صاحب تو بنے رہے، گھٹنوں کو ہاتھ لگواتے رہے اور ہاتھوں کو بوسے دلواتے رہے، لیکن کیا کیا ہے؟ کتنوں کے بگڑے ہوئے دل سنوارے، کتنوں کے سینے منور کیے، کتنوں کو برائی سے ہٹا کر نیکی پر لگایا؟ مجھ سے بھی سوال ہو گا، یہ سوال آپ پر بھی ہو گا۔ یہ محض جذباتی باتیں نہیں ہیں یہ عملی باتیں ہیں۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم دوسرے کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ اس نے یہ کہا اس نے وہ کیا، اپنے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں کہ میں نے دن بھر کیا کہا اور میں نے دن بھر کیا کیا۔

ذکرِ الٰہی

ذکرِ الٰہی کا حکم قرآن میں

قرآن میں آٹھ سو بار بالواسطہ ذکرِ الٰہی کا حکم دیا گیا ہے اور چھتیس (۳۶) بار براہِ راست حکم آیا ہے۔ جو حکم براہِ راست آیتِ قرآن سے دیا جائے اسے منصوص کہتے ہیں یعنی نصِ قرآنی سے ثابت شدہ حکم۔ اور جو حکم قرآن کی آیت سے براہِ راست دیا جائے وہ فرض اور واجب کے درجے میں آتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اگر ۸۳۶ بار دہرایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ انتہائی ضروری حکم ہے۔

ذکر کی کئی صورتیں ہیں:

ذکرِ لسانی: زبان سے اللہ کو یاد کرنا ذکرِ لسانی کہلاتا ہے۔ تلاوت، تسبیح، وعظ و نصیحت، تعلیمِ کتاب و سنت، نیکی کی ترغیب کی باتیں کرنا، یہ سب ذکرِ لسانی کی صورتیں ہیں۔ درود شریف پڑھنا اعلیٰ ترین ذکرِ لسانی ہے۔

عملی ذکر: کاروبار میں دیانتداری، امورِ دنیا شریعت کے مطابق انجام دینا عملی ذکر ہے۔

قلبی ذکر: ذکرِ لسانی سارا دن بھی کیا جائے تو جب بھی نیند آئے گی یا کسی اور کام کیلئے زبان استعمال ہوگی تو ذکر منقطع ہو جائے گا۔ یہی حال عملی ذکر کا بھی ہے، جب بھی عمل ختم ہوگا اس میں انقطاع آجائے گا تو عملاً ذکرِ دوام نہ رہا۔ اس لئے اللہ کریم اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اللہ کو اپنے دل میں یاد کرو۔

سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ اپنے رب کو یاد کیجیے اپنے دل کے اندر، اس لئے کہ صرف دل ہے جو شکمِ مادر سے دھڑکنا شروع کرتا ہے اور قبر کے کنارے تک دھڑکتا رہتا ہے تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً نہایت عاجزی سے،

عظمتِ الٰہی سے لرزاں و ترساں، اپنی عاجزی کا احساس لئے ہوئے کہ میں تو ایک انسان ہوں، میرا وجود غلاظتوں کا پلندہ ہے، مجھے کانٹا چبھ جائے اور خون نکل کر بہہ جائے تو وضو توڑ دیتا ہے۔ یہ تو تیری مہربانی ہے کہ میری اس حیثیت کے باوجود تو نے اپنا نام لینے کی توفیق دے دی۔ فرمایا: عاجزی کی اس کیفیت کے ساتھ کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں اور تیرا نام لینے کی یہ میری جرأتِ رندانہ تیری عطا ہے۔ وَ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بغیر آواز بلند کئے بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ صبح شام، انگریزی میں اس کے معنی ہیں round the clock یعنی ہر وقت ذکر جاری رہے وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (الاعراف: 205) اس کام میں غفلت نہ آنے پائے۔ غفلت تو برسوں کی بھی ہوتی ہے اور غفلت لمحوں کی بھی ہوتی ہے۔ نتائج دونوں کے خطرناک ہوتے ہیں

خواہم کہ خار از پا کشم — محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم — صد سالہ راہم دور شد

ایک لمحے کی غفلت نے مجھے صدیوں پیچھے پھینک دیا۔ میں رکا کہ پاؤں سے کانٹا نکال دوں اتنی دیر میں محبوب کی سواری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور میں محبوب سے دور ہو گیا۔

مطلق ذکر کا حکم ہے

قرآنِ حکیم نے سب سے زیادہ بار جس کام کا حکم دیا ہے وہ ذکرِ الٰہی ہے۔ قرآن حکیم کے بعد ہم تعاملِ نبوی ﷺ کو دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے بارے کسی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا کہ آپ ﷺ ذکر کیسے کرتے تھے؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ہر حال میں ذکر کرتے تھے علی کل احیانہ کے الفاظ آتے ہیں۔

اب غلط تاویلوں اور بہانوں سے ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے فضلاء سے بحث ہوتی ہے کہ جی نماز پڑھتے ہیں اور ذکر کیا ہے؟ نماز ذکر ہے اللہ کا لیکن اس کے علاوہ جب ذکر کا حکم الگ سے موجود ہے تو آپ اس سارے کو نماز میں شامل کیوں کرتے ہیں؟ نماز بھی ذکر ہے لیکن نماز ہی کو ذکر کہنا درست نہیں ہے۔ صرف نماز نہیں بلکہ ہر وہ کام جو شریعت کے مطابق کیا جائے وہ عملاً ذکرِ الٰہی ہے۔ وہ کام چھوٹا ہو یا بڑا لیکن وہ اللہ کا ذکر ہے، اس میں اللہ کی یاد شامل ہے۔ اللہ کی رضا کیلئے کیا جاتا ہے، ذکر ہے۔ مگر قرآن حکیم کا مطالبہ اس سے الگ ہے۔

ذکرِ الٰہی اور نماز: فرمایا فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ ... نماز ختم ہوگئی، زمین پر پھیل جائیں، روزی تلاش کریں، اپنی مزدوری کریں، کام کریں وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا ...(الجمعہ: 10) اور اللہ کا ذکر کثرت سے کریں۔ تو نماز کے ساتھ ذکر compensate تو نہیں ہوگیا۔ نماز تو ختم ہوگئی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں نماز سے تو فارغ ہو گئے لیکن ذکر سے فارغ نہیں ہوئے۔ دکان پر ہو، مکان پر ہو، مزدوری کر رہے ہو، کہیں بھی ہو، بازار میں ہو، ذکر کثرت سے کرتے رہو۔

ذکرِ الٰہی اور جہاد: جہاد اسلام میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جہاد خود بہت بڑا ذکر ہے لیکن اسے ذکر کا متبادل اللہ نے قرار نہیں دیا ہے۔ فرمایا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا .. کسی جماعت سے، کسی کافر طاقت سے مقابلہ آجائے، جم کر لڑو وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا ...(الانفال: 45) اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ وہاں بھی الگ سے حکم ہے۔ قرآن میں ہے، لڑ رہے ہو، جہاد کر رہے ہو، گولی برس رہی ہے، آگ برس رہی ہے لیکن ذکر کرتے رہو۔

ذکرِ الٰہی اور تبلیغ: اس امت سے پہلے تبلیغ انبیاءؑ کرتے تھے۔ جب کمی واقع ہوتی، اللہ کریم نبی مبعوث فرما دیتا۔ اس امت کو اللہ نے اعزاز دیا کہ ہر مسلمان کو مبلغ بنا دیا۔ سب سے بڑے مبلغ آنحضرت ﷺ ہیں۔ خود انہیں حکم ہے وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ ... اپنے پروردگار کے نام کی تکرار کیا کیجئے یعنی ذکر کی یہ تعیین بھی فرما دی کہ میرے ذاتی نام کو دہرائیں۔ رب کا نام تو اللہ ہے، اسم ذات تو صرف اللہ ہے۔ تاکید کر دی کہ لفظ اللہ کو دہرائیں۔ کتنی دیر دہرائیں وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا (المزمل:8) میرے حبیب ﷺ اتنی بار دہرائیں کہ ذہن میں، دل میں، دماغ میں، نگاہ میں اللہ ہی اللہ رہ جائے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ کچھ ساتھی اگر تبلیغ کرتے ہیں تو ذکر چھوڑ دیتے ہیں اس لئے کہ ہم تبلیغ کرتے ہیں۔ نمازی بہانہ بنا لیتے ہیں کہ بھئی یہ بھی ذکر ہے۔

ذکرِ اسمِ ذات

سورۃ مزمل ان سورتوں میں سے ہے جو ابتدائے وحی کے زمانے میں نازل ہوئی اور اس کے مخاطب خود حضور ﷺ ہیں اور فرمایا جا رہا ہے واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلاً (المزمل:8) اپنے پروردگار کے اسمِ ذات کا ذکر کریں اور اتنی کثرت سے کریں کہ صرف مذکور (اللہ) کی یاد رہ جائے، باقی کائنات دنیا و مافیہا دل سے محو ہو جائے۔ اللہ کریم کو دیکھا نہیں جا سکتا، اللہ کریم کو کسی مثال سے جانا نہیں جا سکتا۔ صرف ایک راستہ ہے کہ اس کے ذاتی نام 'اللہ' کا ذکر کثرت سے کیا جائے تو وہ کیفیات در آئیں گی کہ بندہ جس ذات کو دیکھ نہیں سکتا، اسے سمجھ رہا ہوگا۔ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو زندہ رکھے گا، اس کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھے گا، اس سے پوچھ پوچھ کر زندگی گزارے گا۔

آپ انبیاءؑ کی زندگیوں پر اگر غور فرمائیں تو ایک چیز آپ کو تمام نبیوںؑ اور رسولوںؑ میں ملے گی کہ جب نزولِ کلام کا وقت آیا تو وہ دنیا سے الگ ہو کے چلہ کشی کی صورت میں یا تنہائی کی صورت میں ذکر اذکار کیلئے بیٹھتے رہے۔

ذکرِ قلبی ہی کیوں؟

آپ سے جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ذکرِ قلبی کیوں کرتے ہو تو انہیں کہیے کہ سورۃ الاعراف کی آیت 205 کا کوئی عملی نمونہ بنا کر دکھائیں کہ دل میں اللہ کی یاد رہے اور لب سے آواز نہ نکلے، عجز و تضرع اور زاری کی کیفیت ہو اور بھول کا کوئی لمحہ نہ آئے۔ نیند اور بے ہوشی، قلب سے یادِ الٰہی کا تسلسل ختم نہ کر سکے۔ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کیا یہ پاسِ انفاس کا طریقہ عہدِ نبوی ﷺ میں تھا؟ بھئی! طریقہ کرتو مقصود ہی نہیں، مقصود تو ذکرِ الٰہی ہے۔ چونکہ کوئی طریقہ مقرر نہیں فرمایا گیا اس لیے ہر وہ طریقہ جس میں شرعی قباحت نہ ہو جو شرعاً منع نہ ہو، جائز ہے۔

ذکر کا حکم قرآن میں موجود ہے، قرآن نے مطلق ذکر کا حکم دیا ہے اس میں قید نہیں لگائی کہ کھڑے ہو کر کرو یا بیٹھ کر۔ اس میں جو شرائط رکھی ہیں وہ صرف یہ ہیں:

- واذکر ربک فی نفسک پہلی شرط یہ ہے کہ ذکر دل میں ہو۔
- تضرعاً و خیفۃ دوسری شرط یہ ہے کہ نہایت عاجزی، نہایت مسکنت سے، ضرورت مند بن کر ہو۔
- ودون الجھر من القول تیسری شرط یہ ہے کہ اس میں زبان کی آواز شامل نہ ہو، کھپ نہ ڈالو، دوسروں کو پریشان نہ کرو۔ ایسا ذکر کرو کہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ہو۔
- بالغدو والاصال چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ ہمہ وقت ہو، اس میں انقطاع نہ آئے round the clock ہو۔ اردو میں اسے کہتے ہیں صبح و شام۔
- ولا تکن من الغافلین پانچویں شرط یہ ہے کہ کوئی لمحہ غفلت کا نہ آئے۔ قلبی ذکر کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں کہ غفلت سے بچا جائے۔ سونے میں،

بے ہوشی میں بھی قلب چلتا رہتا ہے۔ جب تک موت نہیں آتی یہ چلتا رہتا ہے۔ یہ پرزہ انسان کے بدن میں ایسا ہے جو کبھی نہیں رکتا، اسے قلب کہتے ہیں۔ فرمایا: اپنے دل کی گہرائیوں سے مجھے یاد کرنا کہ غفلت نہ آئے۔ دل نے تو اپنا کام کرتے رہنا ہے۔ وجود کسی بھی کام میں مصروف ہو، سفر میں ہو، حضر میں ہو، جاگ رہا ہو، سو رہا ہو، بندہ بیمار ہو یا صحت مند، ہو یا بات کر رہا ہو، یہ دھڑکتا رہتا ہے، اس کی دھڑکن نہیں رکتی۔ جس دن رکے گی وہ دن اس بندے کا آخری دن ہوگا۔ اس لئے فرمایا کہ نہ رکنے والے عضو میں اللہ کی یاد کو بسا لو۔

یہ شرائط تو مقرر کی ہیں کوئی طریقہ مخصوص نہیں کیا گیا کہ بیٹھ کر کر رہے ہو، لیٹ کر کر رہے ہو، کس طرح کر رہے ہو۔ طریقہ مقصد نہیں ہے، ذکر مقصد ہے۔ اس لئے کوئی بھی طریقہ جس میں شرعی قباحت نہ ہو، اس طریقے سے ذکر کرنا جائز ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہر حکم کے، ہر عمل کے اصول دیئے ہیں۔ کچھ عبادات کی جزئیات تک متعین فرما دی ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ لیکن جب ذکر اللہ کا حکم دیا تو صرف اصول دیئے، شرائط بتائیں۔ جو حکم نصِ قرآنی سے منصوص ہو وہ فرضِ عین ہوتا ہے جیسے فرمایا گیا اقیموا الصلوٰۃ نماز فرضِ عین ہو گئی، روزے کا حکم آیا تو روزہ فرضِ عین ہو گیا، حج کا حکم آیا تو اپنی شرائط کے ساتھ وہ فرضِ عین ہو گیا، جہاد اپنی شرائط کے ساتھ فرضِ عین ہے اور ذکر اللہ کا حکم جو آٹھ سو بار سے زائد آیا کیا وہ فرض نہیں ہوا؟ اس لئے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیرِ مظہری میں ہر مرد و عورت پر ذکر واجب لکھا ہے۔ یہ منصوص حکم ہے، اس کے بغیر بات بنتی ہی نہیں۔ انسان کا اللہ سے رشتہ ہی یاد کا ہے۔ بندہ اپنے مالک کا شکر بھی تب ہی ادا کر سکتا ہے جب اس کی یاد اس کے دل میں ہو۔ بہر حال ذکرِ قلبی معمولی دولت نہیں۔

☆ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے بغیر قرآنِ حکیم کے احکام کی کما حقہ تعمیل ہوتی ہی نہیں۔

☆ دوسری بات یہ ہے کہ یہ اتنا اہم حکم ہے کہ 836 بار اسے دہرایا گیا ہے۔

☆ تیسری بات یہ ہے کہ یہ ہر جگہ نہیں ملتا۔

اسے حاصل کرنے میں لوگوں نے عمریں لگا دیں۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑا، اللہ کے ایک بندے نے گھر بیٹھے اس پر لگا دیا۔ بزرگوں نے دنیا میں سیاحت کر کے اسے پایا اور سیاحت کر کے اسے بانٹا۔ سید علی ہجویریؒ ہوں یا معین الدین چشتیؒ ہوں، یہ کہاں پیدا ہوئے، کہاں سے سیکھا، کہاں تک سفر کر کے اسے لوگوں تک پہنچایا۔

ذکرِ قلبی۔۔۔ ہر حال میں اللہ کا ذکر

ذکرِ قلبی وہ دولت ہے جو لَب عطا کرتی ہے یعنی ایک خاص شعور پیدا کرتی ہے، ایک خاص درجے کی فکر عطا کرتی ہے جو عملی زندگی کو متاثر کر کے اسے اللہ کی ناراضگی سے دُور اور اللہ کی رضامندی کے قریب کرتی چلی جاتی۔ ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ خشوع الی اللہ نصیب ہو، اللہ جل شانہ کے ساتھ ایک ایسی لگن، نظر نہ آنے والا، بیان نہ کیا جا سکنے والا ایک ایسا غیبی اور اندرونی تعلق قائم ہو جائے کہ آدمی جہاں بھی ہو جس حال میں بھی ہو، اپنے رب کو واقعی اپنے قریب تر محسوس کرے۔

اللہ کی مکلّف مخلوق میں کوئی فرد ایسا نہیں جو اس کے ذکر سے مستغنی ہو اسی لئے اللہ کریم نے ذکر سے محروم لوگوں کو غیر عقل مندوں میں شامل کیا ہے اور عقل مند اور دانا (اولی الالباب) انہی کو کہا جاتا ہے جو ہر حال میں اس کا ذکر کرتے ہیں تو گویا جو ذاکر نہیں ہیں وہ عقلمند نہیں ہیں۔

اللہ نے طریقۂ ذکر پر پابندی نہیں لگائی۔ دیکھو! کتنی کھلی بات ہے اَلَّذِیْنَ

یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (آل عمران: 191) ایسے لوگ جو کھڑے ہوں بیٹھے ہوں یا لیٹے ہوں، ان کا کوئی حال ذکرِ الٰہی سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ جو اللہ نے انسان کی تین حالتیں بیان فرمائی ہیں یہ ایسی ہیں کہ ہر لمحے انسان ان تینوں میں سے کسی ایک حال میں ہوتا ہے۔

☆ بیٹھا ہے۔

☆ کھڑا ہے، کام کر رہا ہے، چل رہا ہے۔

☆ لیٹا ہے، آرام کر رہا ہے۔

بیمار ہو یا صحت مند جب تک وہ زندہ ہے، ان تینوں حالتوں میں سے ایک حال میں ضرور ہوتا ہے۔ ربِ جلیل نے فرمایا کہ ''وہ ہر حال میں ذکر کرتے ہیں''۔ اس حوالے سے محققین فرماتے ہیں کہ زبانی ذکر یا ذکرِ لسانی اس کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ چونکہ زبان صرف ذکر نہیں کرے گی بلکہ زبان انسان کی ساری ضروریات کی ترجمان ہے۔ پھر اگر کوئی ایسا کرے کہ بغیر ذکرِ الٰہی کے کوئی بات بھی نہ کرے تو بھی جب وہ سو جائے گا تو زبان خاموش ہو جائے گی۔ تو کوئی ایسی چیز جو اللہ کریم کے ذکر کو دوام اور ہمیشگی بخشتی ہو فرمایا وہ قلب ہے۔ ذکرِ قلبی ہی اس کا جواب ہو سکتا ہے۔

طریقۂ ذکر پر اعتراض اور اس طریقے کی عظمت

جنہیں طریقۂ ذکر پر اعتراض ہے، وہ ہمیں کوئی جواب دیں کہ ہم کیا کریں کہ اس آیت کا مفہوم پورا ہو۔ یہ طریقہ ہم نے تو ایجاد نہیں کیا۔

☆ صحابہ کرامؓ کو تو حضور ﷺ کی نگاہِ مبارک نے سورہ الاعراف کی آیت 205 کا مصداق بنا دیا، انہیں یہ پکا پکایا پھل ملا۔

☆ انہوں نے اسے ایسے ہی تابعینؒ اور تابعینؒ نے ایسے ہی تبع تابعینؒ کو منتقل

کر دیا۔

☆ تبع تابعینؒ کے بعد لوگوں کو بیج ملا اور انہوں نے اسے زمینِ دل میں بویا، مختیں کیں، زندگیاں اسی کام میں صرف کر دیں، پھر جا کر اس پر پھل لگا۔

وہ بیج ہم تک پہنچا۔ ہمیں اسے اپنے قلب کی زمین میں بونا ہے، اسے یادِ الٰہی کا پانی دینا ہے۔ ہمیں مجاہدہ کر کے اسے تناور درخت بنانا ہے۔ اسے شیطانی اعمال سے تحفظ دینا ہے، یادِ الٰہی کی باڑ لگانی ہے۔ ہمیں غفلت سے بچنا ہے تا کہ یہ دل میں پھلے پھولے، اس پر خوشبودار پھول آئیں، پھل لگیں اور آنے والے دلوں کو شاید ہم اس کا بیج دے کر جائیں۔

ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے، مشائخ کے تجربے ہیں، اسی لئے سلاسلِ تصوف میں ذکر کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ سب طریقے درست ہیں، کسی پر شرعی گرفت نہیں۔ طریقۂ ذکر مقصود بھی نہیں، ذکر مقصود ہے۔ ہمارے پاس نسبتِ اویسیہ کا طریقۂ ذکر ہے۔ اس میں اور باقی طریقۂ ہائے ذکر میں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ باقی طریقہ ہائے ذکر دیسی دواؤں کی طرح ہیں۔ ان میں اعلیٰ قیمتی جڑی بوٹیوں کو کوٹ چھان کر معمولی معمولی خوراکوں سے شروع کروایا جاتا ہے، یہ مسلسل اور طویل طریقۂ علاج ہے جبکہ نسبتِ اویسیہ انجکشن ہے، ایک ٹیکہ لگے تو سارے وجود میں اثر پھیل جاتا ہے۔ ہم ایک نگاہ کرتے ہیں، سارا وجود ذاکر ہو جاتا ہے۔

لذتِ ایں مے بخدا ناشناسی تا نہ چشی

جس نے چکھا ہی نہیں، وہ اعتراض کرتا ہے۔ اس کے اعتراض کی حیثیت ہی کیا ہے؟

اس طریقۂ ذکر کی عظمت کا اندازہ کریں کہ ایک دن کسی نے مجھے ایک صوفی کا قول پیش کیا کہ "مجھے اس کی وضاحت کر دیں، سمجھ نہیں آئی"۔ وہ یہ تھا کہ "میں ایک مرتبہ

سانس لیتا ہوں، دل ایک بار دھڑکتا ہے اور پانچ بار اللہ اللہ کہہ لیتا ہوں" سوال یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے کہا ان کی اپنی کیفیت ہے، اللہ انہیں نصیب کرے۔ ہمارے ہاں تو ہر ذرۂ وجود، بدن کا ہر سیل ذاکر ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی وجود کے سیل گن سکتا ہے؟ نسبتِ اویسیہ کے طریقۂ ذکر میں ایک لمحے میں وجود کے سارے ذرات ذکر کرتے ہیں، ہر سیل "اللہ ہو" کہتا ہے۔

ذکرِ پاسِ انفاس پر اعتراض

بعض لوگ نہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ذکر سانس سے یا ناک سے کیوں کیا جائے؟ اصل بات یہ ہے کہ ناک سے ذکر کیا ہی نہیں جاتا۔ آپ اسے بڑی توجہ سے سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ہم سانس صرف تیزی سے لیتے ہیں، ذکر قلب سے کرتے ہیں۔ سانس تو ویسے بھی لیا جا رہا ہے، آرام سے بھی آدمی لے لیتا ہے، تیزی سے بھی لیا جاتا ہے تو سانس لینا ایک الگ عمل ہے لیکن ذکر قلب سے کیا جاتا ہے سانس سے نہیں۔ تو ذکر جب قلب سے کیا جاتا ہے تو سانس تیزی سے لینے کی کیا تک ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناک کے ذریعے جب زور زور سے سانس لی جاتی ہے تو اس سے انسان کے وجود کے اندر ایک حدت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مادی وجود کے اندر انوارات کو قبول کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ جب بدن میں حدت اور حرارت نہ رہے تو وہ انوارات جذب نہیں کرتا۔ اسی لئے آپ کسی میت پر لاکھ توجہ دیں، اس کے سارے ذراتِ بدن کو منور کر دیں تو جب آپ توجہ ہٹائیں گے تو وہ بدن پھر خالی ہو گا اس لئے کہ اس میں وہ قوتِ جاذبہ نہیں رہی، قبول کرنے کی استعداد نہیں رہی۔ زندگی میں یہی حال بدن کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں حرارت تو موجود ہے لیکن ان انوارات کو جذب کرنے اور قبول کرنے کیلئے اس حرارت کا ایک خاص درجہ چاہیے۔

جس طرح لوہے کو لوہے کے ساتھ جوڑنے کیلئے گرم کرتے ہیں، جس طرح سونے کو ٹانکہ لگانے کیلئے گرم کرتے ہیں، جس طرح چیزوں کو گرم کر کے یکجان کیا جاتا ہے اسی طرح خون کی حدت، انوارات بالا کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ چونکہ یہ روح کی خصوصیات ہیں اور بدن روح کا مسکن ہے، یہ بدن جب تک از خود منور نہ ہو، روح کو بھی وہ نورانیت نصیب نہیں ہوتی اور روح منور ہو تو بدن بھی منور ہوتا ہے، بدن منور ہو تو روح بھی روشن ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں الگ الگ سمتوں میں نہیں جا سکتے کہ ایک کیلئے نور نازل ہو رہا ہو اور دوسرا ظلمت میں جا رہا ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ جتنی جتنی ان میں یکسوئی ہوتی جائے گی قوتِ جاذبہ اتنی زیادہ ہوتی جائے گی، اتنے انوارات مزید آتے چلے جائیں گے۔

اگر آپ طبعی طور پر آرام سے سانس لیتے رہیں اور اللہ اللہ کرتے رہیں تو ایک لطیفے کو منور کرنے کیلئے کئی برس لگیں گے یعنی وہ حدت جو اس لطیفے کے انوارات کو جزو بدن بنانے کیلئے ضروری ہے، اس پر کئی برس لگ جائیں گے اور اس کے ساتھ شرط یہ ہوگی کہ جو آپ کو توجہ دے رہا ہے، جو ذکر کرا رہا ہے، اس میں بھی یہ استعداد ہو کہ وہ آپ کا لطیفہ منور کر سکے۔ جس کنوئیں سے آپ پانی لینا چاہتے ہیں اس میں اتنا پانی ہونا چاہیے کہ جو کیاری آپ سیراب کرنا چاہتے ہیں اس تک اس کا پانی پہنچ سکے۔

نبی کریم ﷺ پر جب کلام کا نزول ہوتا تھا تو ساتھ تجلیاتِ باری ہوتی تھیں۔ تجلیاتِ باری جب قلبِ اطہر ﷺ پر آتی تھیں تو خون میں حدت پیدا ہو جاتی تھی، قلبِ اطہر ﷺ کا عمل تیز ہو جاتا تھا اور وہ تیزی آپ ﷺ کے عملِ تنفس سے ظاہر ہوتی تھی، سانس مبارک تیز ہو جاتی تھی۔ تو اس قاعدے کو اساتذہ نے الٹایا کہ عمداً سانس تیزی سے لو۔ سانس تیزی سے لینے سے دل (قلب) تیزی سے حرکت کرے گا، تیزی سے دھڑکے گا، جب تیزی سے حرکت کرے گا تو خون میں حدت پیدا ہوگی اور خون کی حدت

اُن انوارات کے ساتھ رابطہ پیدا کرے گی جو شیخ کی توجہ سے قلب پر آ رہے ہیں اور قلب انہیں زیادہ سے زیادہ جذب کرے گا۔

ذکرِ پاس انفاس اور نسبتِ اویسیہ

نسبتِ اویسیہ نبی کریم ﷺ کی براہِ راست اور قریب ترین نسبت ہے۔ اس میں آمد کا کوئی حساب نہیں ہے۔ اس کنوئیں میں پیچھے سے آنے والے پانی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مشائخِ کرام نے سیراب ہونے والی کھیتی کے لیے یا سیراب ہونے والے دل کیلئے یہ طریقہ تجویز فرمایا کہ نہایت تیزی سے، نہایت قوت سے سانس لیا جائے اور جتنی ہو سکے، اتنی خون میں حدت اور حرارت پیدا کی جائے تاکہ ایک ہی ذکر میں، صرف ایک نہیں، سارے لطائف منور ہو جائیں۔ تو سانس اس غرض سے تیز لی جاتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ وجود کی حرکت کا ایک تسلسل بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ عقل، شعور اور ذہن کی توجہ اس طرف ہو جاتی ہے کہ سانس میں لفظ اللہ اندر جا رہا ہے اور لفظ ھو باہر آ رہا ہے۔ اسی طرح سے تین چیزیں یعنی

- وجود (Body) کی حرکت
- سانس (Breathing) کی آمد و رفت
- انسان کی سوچ اور فکر کا ارتکاز (Concentration)

مل کر ایک مضبوط توجہ پیدا کر دیتے ہیں۔ تو یہ بودے بودے اعتراض جو جواب کے قابل بھی نہیں ہیں یہ ساری فضول باتیں ہیں۔ کسی بھی فن کو سمجھنے کیلئے اُس پر اعتراض کرنے یا اُس کا جواب پانے کیلئے اس فن کا حصول ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ معترض اس فن سے واقف نہیں ہوتے تو انہیں نہ سوال کرنے کا سلیقہ ہوتا ہے اور جواب دیتے رہو تو وہ بھی ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے۔

مطالبہ ذکرِ کثیر کا ہے

ہر وہ کام جو شریعت کے مطابق، سنت کے مطابق کیا جائے، وہ ذکر ہے، عملاً وہ ذکرِ الٰہی ہے لیکن مطالبہ ذکرِ کثیر کا ہے۔ بندہ سارا دن سجدے کرتا رہے، تلاوت کرتا رہے، تسبیحات پڑھتا رہے، جائز کاروبار کرتا رہے، اطاعتِ الٰہی کرتا رہے، والدین کی خدمت کرے، اولاد کی پرورش کرے، یہ سب ذکرِ الٰہی ہے لیکن کبھی تو یہ منقطع ہو جائے گا۔ انسان سو جائے گا تو یہ ذکر منقطع ہو جائے گا۔ پھر ذکرِ کثیر تو نہ ہوا۔ کثیر تو وہ کام ہے جو سب سے زیادہ کیا جائے تو ہم ذکرِ الٰہی کو ذکرِ کثیر بنانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کریں!

تو سنیے! دل انسان کے وجود کا وہ حصہ ہے جو ماں کے پیٹ سے دھڑکنا شروع کرتا ہے اور لبِ گور تک دھڑکتا رہتا ہے، ساری زندگی بند نہیں ہوتا۔ انسان سو گیا دل دھڑک رہا ہے، بے ہوش ہو گیا، دل دھڑک رہا ہے۔ جب تک موت نہ آ جائے، شکمِ مادر سے لے کر آخری سانس تک دل دھڑکتا رہتا ہے۔

تو اگر قلب ذاکر ہو جائے تو ذکرِ دوام تو نصیب ہو گیا لیکن ذکرِ کثیر پھر بھی نہیں ہوا۔ لطائف روشن ہوتے چلے جائیں اور ساتواں لطیفہ روشن ہو جائے، سلطان الاذکار نصیب ہو جائے تو دس ہزار کھرب سیل (نئی سائنسی تحقیق کے مطابق ایک وجود میں دس (10) ہزار کھرب سیل ہوتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ کسی سیل کی زندگی چھ مہینے سے زیادہ نہیں ہے، یہ تو وجود کی بات ہے، دل کا تو جہان ہی اور ہے) ذاکر ہو جاتے ہیں۔ اسے ایک حد تک ذکرِ کثیر کہا جا سکتا ہے۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ ایک لمحے میں کسی وجود سے ایک ہزار کھرب بار اللہ کا نام نکلے تو کرنے کا کام تو پھر یہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "بہترین ذکر، ذکرِ خفی ہے" اور "ذکرِ خفی، ذکرِ لسانی سے ستر گنا افضل ہے"۔

تصوف میں ذکرِ الٰہی

یاد رکھو! تصوف میں ذکرِ الٰہی آکسیجن سے زیادہ قیمتی ہے۔ آکسیجن کے بغیر تو چند لمحے گزر جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد بندہ مرتا ہے لیکن ذکر کے بغیر چند لمحے بھی نہیں جی سکتا۔ صوفی کیلئے یا طالب کیلئے ذکر میں سستی کا تصور ایسے ہی ہے جیسے اس نے آکسیجن لینی چھوڑ دی۔

یہ ذکرِ الٰہی کی دلیلیں، بیانات، باتیں اپنی جگہ، پتہ تب چلتا ہے جب خود پہ کچھ وارد ہو، جب خود ذکرِ الٰہی کیا جائے، جب اس کیلئے خود محنت کی جائے۔ خود کو کوئی ذرہ نصیب ہو تو پھر پتہ چلتا ہے کہ اس کی کیفیات کیا ہیں۔ چونکہ سنے سنائے دلائل تو دیئے جا سکتے ہیں، احکامِ الٰہی سنائے جا سکتے ہیں، سنتِ رسولِ مقبول ﷺ کا ذکرِ خیر کیا جا سکتا ہے، طریقہ بتایا جا سکتا ہے، تلقین کی جا سکتی ہے لیکن محسوس تو نہیں کیا جا سکتا۔ جب کیفیت دل میں آئے گی تو پتہ چلے گا۔

ذکرِ دوام اور وجودِ انبیاءؑ

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں حضور اکرم ﷺ ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے "عَلٰی کُلِّ احیانہٖ" سے مراد ذکرِ قلبی ہی ہو سکتا ہے۔ ذکر دراصل نام ہی قلبی کیفیات کا ہے۔ ایمان کے ساتھ زبانی اقرار اور زبانی اقرار کے ساتھ تصدیقِ قلبی ضروری ہے۔ نہاں خانۂ دل میں جب تک عظمتِ الٰہی جاگزین نہ ہو، بات نہیں بنتی، زبانی اقرار رہ جاتا ہے۔ تصدیقِ قلبی کے بغیر ہر عمل رسم و رواج بن جاتا ہے۔ نبیؐ کے وجود کا ذرہ ذرہ ذاکر ہوتا ہے، نبیؐ یہ کیفیاتِ ذکر امت کو تقسیم کرتا ہے، یہاں تک کہ جو لباس، پاپوش، جو چیز بھی نبیؐ کے زیرِ استعمال ہوتی ہے، وہ اپنی حیثیت میں ذاکر ہو جاتی ہے۔ جس جگہ نبیؐ کا قدم مبارک پڑ جاتا ہے، اُس زمین کے وہ ذرات تا قیامت ذکر کرتے رہتے ہیں، اس لئے جو

کوئی اللہ کے نبیؐ کے جوتے کی توہین کرے وہ بھی کفر ہے۔ یعنی جس چیز کو اللہ کے نبیؐ سے نسبت ہو جائے، اس کی توہین کفر ہے۔

بغیر برکاتِ نبوی ﷺ کے ذکرِ دوام ممکن نہیں۔ اگر برکاتِ نبوت ﷺ نصیب نہ ہوں، کوئی ایسی ہستی نہ ملے جو برکاتِ نبوت ﷺ کی امین ہو، جو توجہ دے کر القاء کرنے کا ہنر جانتی ہو اور دلوں کو برکاتِ نبوت ﷺ سے روشنی نہ ملے تو ذکرِ دوام نصیب نہیں ہوتا۔ برکاتِ نبوت ﷺ ہی وہ دولت ہے جو ذکرِ دوام عطا کرتی ہے۔ اگر برکاتِ نبوت ﷺ نصیب ہوں تو اتباعِ سنتِ نبوی ﷺ کی بڑی ذمہ داری آجاتی ہے۔ ہر خلاف ورزی میں یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ یہ دولت چھن نہ جائے۔ اللہ کریم سب سے زیادہ غیور ہیں اور غیرتِ الٰہی یہ گوارا نہیں کرتی کہ ایک شخص جان بوجھ کر سنت کا تارک ہو، وہ سنت کی خلاف ورزی بھی کرے اور اس کا دل بھی روشن رہے۔

ذکرِ الٰہی کی یہ خصوصیت ہے کہ بندے کو عظمتِ باری کا ادراک ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ امور اللہ نے اس کی ذات سے وابستہ کر دیئے ہیں اور اس کے سبب سے اس کے ذریعے وہ کام ہوتے ہیں تو وہ سمجھتا ہے کہ اس میں اس کا کمال نہیں، یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ان کاموں کے ہونے کا سبب اسے بنا دیا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ تو کاریگر کی مرضی ہے کہ اس نے ایک اینٹ دروازے کے اوپر لگا دی اور لوگ اس کے نیچے سے گزر رہے ہیں۔ ایک اینٹ دروازے کے نیچے لگا دی جس کے اوپر سے لوگ پھلانگ رہے ہیں۔ یہ تو کاریگر کی مرضی ہے کہ کس وجود سے کیا کام لے رہا ہے۔ اس میں کسی کی ذاتی بڑائی کا عنصر شامل نہیں۔

مساجد اور ذکر اللہ

آج ہماری مساجد سے لوگوں کی اصلاح کیوں نہیں ہو رہی حالانکہ مساجد میں

اذان، باجماعت نماز، اشراق، چاشت نوافل پڑھے جاتے ہیں، روزوں میں اعتکاف بیٹھتے ہیں۔ پھر سمجھ آتی ہے کہ اب مساجد میں بھی ایک چیز چھوٹ رہی ہے جو مساجد کی خصوصیت تھی یعنی یُذْکَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ کَثِیْرًا (الحج:40) یہ ہے وہ واحد راستہ جس کے ذریعے بندے اور اللہ کے درمیان رشتہ قائم ہوتا ہے اور مساجد و معابد اسی لئے ہوتے ہیں کہ ان میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہو لیکن آج بے شمار مساجد بن گئی ہیں اور ان کا ماحصل تو کچھ بھی نہیں۔ آج مساجد میں سارے کام ہو رہے ہیں لیکن ذکرِ اسمِ ذات چھوٹ گیا ہے۔ جب ذکرِ اسمِ ذات چھوٹتا ہے تو عبادتیں رسم بن جاتی ہیں، ان میں وہ روح نہیں رہتی۔

آج سے اگر پچاس ساٹھ سال پہلے، ایک صدی پہلے تک کے مدارس اور مساجد کو دیکھیں اور ان کی کارکردگی اور اس کے نتائج دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے علماء جب تعلیم سے فارغ ہوتے تو کسی نہ کسی خانقاہ میں فروکش ہوتے۔ اللہ کی خدمت میں وقت لگاتے، محبتِ الٰہی اور عشقِ رسول اللہ ﷺ کی دولت سے سرفراز ہوتے اور پھر مدارس و مساجد کی مسندِ درس و تدریس سنبھالتے۔ اہل اللہ کا نصاب شروع ہی ذکرِ الٰہی سے ہوتا ہے۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ دینی علوم کی تکمیل کر کے افراد اپنا تزکیۂ باطن کرتے ہیں نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں بلکہ ذکرِ اسمِ ذات، تصفیۂ باطن کی، تزکیے کی، تصوف کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ اس رویے کی ابتداء اس شعبے کی اہمیت کو نہ ماننے سے ہوئی اور اب اس کی تردید تک بات آ پہنچی ہے۔ تو جب اس کا رد ہی کر دیا جائے گا تو اس کا اہتمام کب ہوگا؟ جب سے بحیثیتِ قوم امت سے ذکرِ اسمِ ذات کا اہتمام چھوٹا ہے، تب سے وہ برکات بھی ہمیں مسجد سے نصیب نہیں ہو رہیں۔

دل کے ذاکر ہونے کی پہچان

جب دل روشن ہوتا ہے تو گناہ کڑوے لگتے ہیں۔ جب دل روشن ہوتا ہے تو اللہ کا ذکر، اللہ کی اطاعت یا اللہ کے سجدے پسند آنے لگتے ہیں، میٹھے لگتے ہیں، نیکی میٹھی لگتی ہے اور اس کی لذت محسوس ہوتی ہے اور مزید نیکی کرنے کو دل چاہتا ہے اور غلطی ہو جائے تو اس کی کڑواہٹ محسوس ہوتی ہے، بندہ توبہ کرتا ہے اور اس سے بچنے کو جی چاہتا ہے۔

دل کے ذاکر ہونے کی پہچان کشف نہیں، کردار ہے۔ اگر ذکر سے کردار میں مثبت تبدیلی آرہی ہے تو وہ کرنے کا کام ہے، اسے اور زور و شور سے کرو کہ کردار مکمل طور پر تبدیل ہو جائے۔

دل کو دل سے راہ

کسی سے آپ دل سے محبت نہیں کرتے، اس کی خوشامد بھی کریں تو بھی وہ آپ سے محبت نہیں کرے گا، نفرت ہی کرے گا۔ اس کے برعکس جس سے محبت کرتے ہیں، اس سے آپ لڑ بھی پڑیں تو وہ پھر بھی آپ سے محبت کرے گا۔ ماں بیٹے کو تھپڑ بھی مار دے، چیز نہ دے، اس کے ہاتھ سے چیز چھین لے، بیٹا پھر بھی اس سے نفرت نہیں کرتا۔ اسے پتہ ہے کہ ماں اس سے محبت کرتی ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد:28)

ہم نے سمجھا کہ بہت سی دولت مل جائے تو اطمینان ہو جائے گا، ہم اس پہ لگ گئے۔ جائز و ناجائز ذرائع سے دولت جمع کی۔ لیکن جب دولت مند ہو گئے تو سمجھ آئی کہ یہ تو میری دوست نہیں، دشمن ہے۔ اس کی پریشانیاں تو الگ ہی ہیں بلکہ اولاد تک دشمن ہو جاتی ہے۔ لوگ موت کی دعائیں کرنے لگتے ہیں کہ اللہ اب اس بابے کو اٹھا بھی لے کہ ہر چیز پر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔ پکڑ کر دھکے دے کر نکال بھی دیتے ہیں۔ پھر سمجھ آتی ہے کہ یار! ساری

زندگی ہم جو جمع کرتے رہے کہ اس سے کیا اطمینان ہو گا اس نے تو پریشانیاں پیدا کر دی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اقتدار و اختیار میں اطمینان ہے لیکن جب اقتدار و اختیار ملتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا تو ہماری دشمن ہو گئی ہے۔ ہر کوئی ہماری ٹانگ کھینچ رہا ہے۔ دنیا کے کسی شعبے کو آپ لے لیں، اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس طرف چلا جاؤں گا تو مطمئن ہو جاؤں گا۔ یہ اس کی سراسر غلطی ہے۔ چونکہ جب ساری عمر خرچ کر کے وہاں پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں کی پریشانیاں وہ ہیں جو میں نے سوچی بھی نہ تھیں۔ اللہ کریم نے اس کا جو علاج بتایا ہے، وہ بڑا سیدھا سا ہے اور سادہ سا ہے۔ فرمایا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یہ جو سکونِ قلب ہے، اطمینانِ قلب ہے، اس کو حاصل کرنے کا دنیا میں صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے اللہ کا ذکر۔ فرمایا: خوب اچھی طرح سن لو! یہ بڑی واضح، روشن اور پکی بات ہے کہ اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پکڑتا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ:152)

فرمایا! تم میرا ذکر کرو، تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ نہیں کہا کہ تم میری نماز پڑھو، میں تمہاری نماز پڑھوں گا، تم میرے لئے روزہ رکھو! میں تمہارے لئے روزہ رکھوں گا۔ یہ ضرور فرمایا کہ تم میرا ذکر کرو، تم مجھے یاد کرو، تمہاری یاد نیازمندی کیلئے ہو گی، میں تمہیں یاد کروں گا تو میری یاد عطا کیلئے ہو گی۔ تمہارا یاد کرنا لینے کیلئے ہو گا، میرا یاد کرنا دینے کیلئے ہو گا۔ قرآن کریم میں ذکرِ الٰہی کے صلہ میں ایک ایسی نعمت کا وعدہ کیا گیا ہے جس سے بڑی نعمت مومن کیلئے اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ یہ وعدہ صرف ذکرِ الٰہی کے ساتھ مختص ہے اور ظاہر ہے جسے اللہ تعالیٰ یاد کرے اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے۔

لکل شیء صقالة وصقالة القلوب ذکر اللہ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر چیز کو زنگ لگتا ہے، دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے اور ہر چیز کا زنگ اتارنے کیلئے کوئی نہ کوئی علاج ہوتا ہے۔ دلوں کا زنگ اتارنے کیلئے ایک ہی دوا ہے اور وہ ذکر اللہ ہے۔ ذکرِ الٰہی دل کی دوا بھی ہے، غذا بھی ہے اور حیات بھی۔ ہر عبادت کا اپنا مقام ہے اور ذکر اللہ ہر عبادت کی روح ہے۔ ذکر اللہ ہر عبادت میں اخلاص پیدا کرتا ہے، اسے قبولیت کے قابل بناتا ہے۔

الا وھی القلب

ذکرِ الٰہی جب دل کی دھڑکن بنتا ہے، خون کا حصہ بنتا ہے تو سارا بدن خود بخود اصلاح کی طرف چل پڑتا ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے واذا فسدت، فسدت جسد کلہ بگڑ جائے تو سارے بدن کو بگاڑ دیتا ہے واذا صلحت، صلحت جسد کلہ اور جب یہ سدھر جائے تو سارے جسم کو سدھار دیتا ہے الا وھی القلب غور سے سن لو، یہ قلب ہے۔

ذکرِ الٰہی اصلاحِ قلب کی بنیاد ہے، یہ تخم ہے، یہ بیج ہے۔ جب تک دل میں بویا نہ جائے، میں تو سمجھتا ہوں عبادات بھی محض ایک ورزش سی بنی رہتی ہیں۔ آدمی کو عبادت میں وہ لذت نصیب نہیں ہوتی کہ میں اللہ کو روبرو دیکھ رہا ہوں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ ہماری بیشتر عبادات ہمیں برائیوں سے روکنے سے معذور ہو چکی ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے لوگوں کو تلاش کریں جن کے دل روشن ہوں، سینے منور ہوں، خون کی گردش، دل کی ہر دھڑکن سے اللہ کا نام نکلتا ہو اور یہ ہیں برکاتِ محمد رسول اللہ ﷺ۔ جب دل میں اللہ اللہ کا پودا پنپتا ہے تو عجیب بات ہے کہ اخلاقیات، ایمانیات، اعتقادات، اعمال، غرض ہر چیز سدھرنا شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے

اس کا یہاں تک تجربہ کیا ہے کہ مغرب میں، یورپ میں، امریکہ میں، اس سے بھی دور سویڈن میں، ناروے میں، وہاں کے لوگوں کو جو مجھ سے مل سکے، میں نے کہہ دیا یار! تم کچھ نہ کرو، تم رہنے دو اسلام کو، اللہ کا نام لینا شروع کر دو اور چھوڑو نہیں۔ اللہ کی شان ہے، جس کافر نے ذکرِ قلبی کرنا شروع کر دیا، وہ مسلمان ہو گیا۔ اسے اسلام کی نعمت نصیب ہو گئی۔

میں پچھلی دفعہ امریکہ گیا۔ دنیا کی ساری بے حیائی جمع کریں تو امریکہ کی نسبت کم ہے اور امریکہ کی ساری بے حیائی ایک نیویارک کے مقابلے میں کم ہے، پھر نیویارک میں ایک علاقہ ہے مین ہٹن، جہاں سے برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں وہاں شیطان بھی گھبرا جاتا ہو گا کہ اتنی برائی اس کے تصور میں بھی نہیں ہو گی۔ وہاں ہم سے ایک خاتون ملی، تو میں نے اسے تلقین کی کہ تم تحقیق کو چھوڑو، نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہے، نہ یہاں انگریزی میں اسلام پر اتنا لٹریچر دستیاب ہے اور نہ تم سمجھ سکو گی۔ تم صرف اللہ اللہ کرنا شروع کر دو، دل پر خیال کر کے اللہ اللہ کرتی رہو۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے خط ملا کہ بحمد للہ میں مسلمان ہو چکی ہوں، میں نے صدقِ دل سے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس نے بڑے دکھ سے لکھا کہ بہت مزہ آیا دین قبول کر کے اور بڑی پرسکون زندگی ہے اور بہت اللہ کا شکر ہے لیکن ایک پریشانی ہے۔ خاتون ہونے کی وجہ سے جو مہینے میں کچھ دن نماز چھوڑنا پڑتی ہے، تو بڑی کوفت ہوتی ہے، بڑے بے مزہ دن گزرتے ہیں۔ میں نے اس کا خط پڑھا تو میں لرز گیا کہ خدایا! کتنی قوت ہے تیرے نام میں۔ آپ ذکر کی برکات دیکھیں کہ بندے کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ یہ اللہ کے نام کی برکت ہے۔

ذکرِ الٰہی اور تسخیرِ قلب

میں نے جب حضرتؒ سے عرض کیا تھا کہ حضرت! مجھے اپنے خادموں میں شامل فرمالیں تو حضرتؒ نے فرمایا اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ

اَهۡلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفۡعَلُوۡنَ (النمل:34) ''فاتح اور حکمران جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں اور بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کو رسوا کر دیتے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ عشقِ الٰہی سب سے بڑا فاتح ہے اور سب سے بڑا سلطان ہے۔ جب یہ دل میں آتا ہے تو زندگی کی تہوں تک کو اکھیڑ کر الٹ دیتا ہے اور جن چیزوں کو تم باعثِ عزت، باعثِ فخر اور بڑی اعلیٰ سمجھتے ہو، ان کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ تم بڑی آسانی سے کہہ رہے ہو لیکن یہ بہت مشکل کام ہے۔ تم اور ہم ایک ہی طرح کے بندے ہو یہ اور طرح کی بات ہے۔ جن باتوں کو تم باعثِ فخر سمجھتے ہو، اُن پر ہمیں شرم شروع ہو جائے گی اور جن چیزوں کو تم اہمیت نہیں دیتے وہ تمہارے لئے اہم ہو جائیں گی۔

ذکر کی برکت سے اندر کی تبدیلی

بندہ بدلتا ہے تو برکاتِ نبوت ﷺ سے بدلتا ہے۔ بدلتا ہے تو نورِ باری سے بدلتا ہے۔ صوفی کی کردار سازی نہیں کرنا پڑتی۔ ہم صرف ایک بات کہتے ہیں کہ اللہ کو مانا ہے تو اس یقین کو دل میں اتارنے کیلئے وہ برکات حاصل کرو جو قلبِ اطہر ﷺ سے آرہی ہیں۔ جب وہ دل میں آجاتی ہیں تو بندہ خود فیصلے کرتا ہے اور اپنا آپ بدلتا ہے اور خود کو اُس رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تو ہم نے کبھی کسی پر تنقید نہیں کی۔ یہاں جتنے چہرے سنتِ رسول ﷺ سے مزین نظر آتے ہیں، ان سے کسی نے نہیں کہا کہ داڑھی منڈوانا چھوڑ دو۔ آج بھی جو بغیر داڑھی کے ہیں، انہیں یہاں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ رب کا نام اور نبی ﷺ کی برکات جب اندر جاتی ہیں تو ان کا اپنا دل چاہتا ہے کہ ہم ویسا حلیہ بنائیں جیسا محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ یہاں کسی فرقے کا کوئی بندہ آتا ہے، اپنی نماز پڑھتا ہے، ہم نہیں پوچھتے۔ شیعہ آتے ہیں، سنی آتے ہیں، بریلوی آتے ہیں، دیوبندی آتے ہیں، اہلحدیث آتے ہیں، مقلد آتے ہیں، غیر مقلد آتے ہیں کبھی کسی کو کسی نے نہیں ٹوکا۔

میں تنقید کرنے والے کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ ہمارے پاس چاہے نہ آؤ یار! کبھی اللہ اللہ کرنا شروع کر دو۔ چوبیس گھنٹوں میں کوئی آدھا گھنٹہ، پندرہ منٹ نکال کر روزانہ ذکر کرنا شروع کر دو۔ اگر ذکر نے آپ کو بھی نہ بدل دیا تو مجھے کہنا کہ تم غلط کہتے ہو۔ جو لوگ نہیں جانتے کم از کم انہیں یہ احتیاط ضرور کرنی چاہئے کہ جس بات کو جانتے نہیں، اس پر زورِ بیان صرف نہ کیا کریں، ان باتوں پہ اپنا زور لگائیں جن کو وہ جانتے ہیں۔

ذکرِ الٰہی کی طلب دل میں کیسے پیدا ہو؟

ذکرِ الٰہی کی بنیاد ہی ایمان و یقین پر ہے، اگر کامل درجے کا ایمان نصیب ہو تو بغیر ذکرِ الٰہی کئے بندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کے وجود میں ذکرِ الٰہی کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایمان کا ثمر ہے اور جو پھل ہوتا ہے وہ بیج بھی ہوتا ہے۔ یہ بیج کسی غیر مسلم کے دل میں بھی بو دیا جائے تو وہ رفتہ رفتہ ایمان قبول کر لیتا ہے اور یہ تجربہ ہم نے کئی مرتبہ کیا ہے۔

حضرتؒ کے زمانے سے لے کر اب تک کسی آنے والے سے کوئی سوال نہیں کیا جاتا۔ یہاں مختلف الخیال لوگ آتے ہیں، بریلوی، دیوبندی اہلحدیث اور مختلف مسالک کے لوگ یہاں آتے ہیں، ہم کسی سے اس کے مسلک پر بات ہی نہیں کرتے، ساری توجہ ذکرِ الٰہی پر رکھتے ہیں۔ ذکرِ الٰہی خود اس کے دل میں ایک آرزو پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے خیالات و نظریات کیا ہیں اور اسے کہاں اپنی اصلاح کرنی ہے۔ پھر وہ خود اپنی اصلاح کرنے لگ جاتا ہے اور سب ہی فرقہ پرستی چھوڑ کر سیدھے سادے مسلمان ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ اسلام تو سیدھا اور آسان مذہب ہے، فرقہ بندیاں تو بعد میں ہوئیں۔

ذکرِ الٰہی اور شیطان

ذکرِ الٰہی اسلحہ ہے لیکن اسلحہ کا ہونا شیطان کو اس کی شیطنت سے نہیں روک سکتا۔ اگر بہترین اسلحہ پاس ہو تو اس کا مطلب ہے دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب

ہرگز نہیں کہ ایک فریق کے پاس اسلحہ ہے لہٰذا دوسرا فریق اس کا مقابلہ ہی نہیں کرے گا۔ اگر شیطان خیال ہی نہ ڈالے تو آپ مقابلہ کس کا کریں گے؟ پھر آپ کو اسلحہ کی ضرورت کیوں ہوگی؟ تو یہ سمجھنا دراصل سمجھ کا فتور ہے کہ ذکرِ الٰہی سے شیطان خیال ڈالنا چھوڑ دے گا بلکہ حق یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی سے شیطان کا مقابلہ کرنے کی قوت آئے گی۔

کوئی شخص کسی بھی مقام پر پہنچ جائے۔ شیطان اپنی دشمنی سے باز نہیں آتا۔ اس کا تو یہ حال ہے کہ وہ انبیاءؑ کی مخالفت میں بھی اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا لیتا ہے حالانکہ انبیاءؑ معصوم ہوتے ہیں۔ وہ ان پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوسکتا لیکن کسی نہ کسی کو ان کی مخالفت پر ابھارتا ہے، کفار کو اعتراضات سکھاتا ہے۔ ہمیں یہ شکایت رہتی ہے کہ جی شیطان ہمیں پریشان کرتا ہے اور مجھے یہ امید رہتی ہے کہ یہ لوگ جو یہاں سے ذکرِ الٰہی سیکھ کر جاتے ہیں، ان شاء اللہ یہ شیطان کو پریشان کریں گے۔ توقع یہ ہوتی ہے، امید یہ ہوتی ہے کہ جن ارواح کی رسائی بالائے عرش تک ہوگئی، اب یہ ان شاء اللہ شیطان کو پریشان کریں گے۔ آپ کو شیطان سے پریشان ہونا نہیں ہے، آپ نے شیطان کو پریشان کرنا ہے۔

ذکرِ الٰہی۔۔۔ڈھال

انسان میں بھلائی کا مادہ بھی ہے اور برائی کا مادہ بھی موجود ہے۔ ذکر اذکار بھلائی کے مادے کو ابھارتے ہیں اور برائی کے عنصر کو کمزور کرتے ہیں اور کوئی انسان بھی فرشتہ نہیں بن سکتا۔ ہر انسان میں نیکی کرنے کی فطری استعداد اور اس کے ساتھ ساتھ نفس کی بات ماننے سے برائی کرنے کی قوت موجود رہتی ہے۔ چونکہ انسانی نفس مادی اجزاء کے ملنے سے بنتا ہے اور آگ، ہوا، مٹی اور پانی جب ملتے ہیں تو نفس پیدا ہوتا ہے جو مادی اجزاء کا حاصل ہے تو وہ مادی خواہشات اور دنیوی مفادات پر ہی فریفتہ رہتا ہے اور انسان کو اس طرف کھینچتا رہتا ہے تو ان دونوں سے بچنے کا طریقہ بندے کے پاس اللہ کی پناہ کے علاوہ اور کوئی

نہیں۔ ذکرِ الٰہی قلب کے ان فاسد مادوں کو مٹاتا ہے اور نیکی کے خیالات کو جلا بخشتا ہے۔

جو لوگ ساری زندگی اللہ کی یاد دل میں بسائے رکھتے ہیں وہ دل ایسا آباد ہو جاتا ہے کہ اسے موت بھی ویران نہیں کرسکتی۔ موت بھی انہی دلوں کو ویران کرتی ہے جو زندگی میں ویران ہوتے ہیں۔ ایسے دل جو زندگی میں یادِ الٰہی سے محروم ہوتے ہیں، انہیں موت اس طرح ویران کرتی ہے کہ زندگی میں حیاتِ روحانی کا رشتہ کاٹ دیتی ہے۔ جو دل زندگی میں یادِ الٰہی اپنے اندر سمو لیتے ہیں انہیں زندگی میں حضورِ حق نصیب رہتا ہے۔ موت ان سے یہ حضورِ حق نہیں چھین سکتی۔ موت انہیں اللہ کی یاد، اللہ کے ذکر سے جدا نہیں کرسکتی۔

ذکرِ الٰہی۔۔۔ایک عجیب دوا

ذکرِ الٰہی ایک عجیب دوا ہے۔ ہر عبادت کیلئے خلوص شرط ہے، منافقت سے یا بے دلی سے کی جائے تو اس پر پھل نہیں آتا۔ خلوص نہیں ہوگا تو عبادت رد ہو جائیگی۔ ذکرِ الٰہی ایک ایسی عبادت ہے کہ دکھاوے کیلئے بھی اگر کوئی شروع کرے، خلوص، خشوع و خضوع نہ بھی ہو اور مسلسل ذکر کرتا رہے تو یہ خود خلوص پیدا کر دیتا ہے۔ ذکر نہ چھوڑے، اللہ اللہ کرتا رہے تو یہ عجیب بات ہے کہ اس کی وجہ سے اس میں خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے جیسے آپ میلے کپڑے کو توجہ سے، خلوص سے صابن نہ لگائیں، بے توجہی سے ہی کپڑے پر گھساتے رہیں تو زیادہ خرچ ہوگا، وقت زیادہ لگے گا لیکن میل تو کاٹے گا، کپڑا صاف ہو جائے گا۔ دھیان سے نہ بھی کریں، کچھ نہ کچھ میل کاٹتا ہی چلا جائے گا۔ اس لئے ذکر اللہ کا بیج دل میں بویا جاتا ہے۔ اللہ اللہ کرے تو دل کو ایسی جلا ملتی ہے کہ وہ اچھائیاں چن لیتا ہے اور خرافات کو چھوڑ دیتا ہے۔ دل میں ایک تجسس پیدا ہو جاتا ہے اور بندہ خود صحیح چیزیں تلاش کر کے ان کو اپنا لیتا ہے۔

عمل کی توفیق تب ہی ہوتی ہے جب دل حقیقت سے آشنا ہو۔ صوفیاء کا یہ طریقہ

ہے کہ یہ کسی کو نہیں کہتے کہ نماز پڑھا کرو۔ کیسی عجیب بات ہے کیسے عجیب لوگ ہیں کسی سے نہیں کہتے کہ داڑھی رکھا کرو، کسی سے نہیں کہتے کہ جھوٹ نہ بولا کرو، کسی سے نہیں کہتے کہ جواء کھیلنا چھوڑ دو، کچھ بھی نہیں کہتے۔ بس بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کرو، اللہ اللہ کرو۔ جب دل میں روشنی آتی ہے تو وہ یہ سارے کام خود کروالیتا ہے۔

ذکرِ الٰہی کی ٹھنڈی چھاؤں

اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ سے فرمایا، فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُکَ وَ کُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ (الاعراف:144) اے موسیٰ! جو میں دیتا ہوں وہ لیتا جا اور شکر ادا کرتا رہ۔ تو ہمیشہ کیلئے روحانیت کی دنیا کا اصول بن گیا کہ جب آؤ، تو طلبِ صادق لے کر آؤ۔ جب آؤ، دل کو خالی کر کے لاؤ۔ اس آیۂ کریمہ میں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ ان چیزوں کو شمار نہ کرو کہ مجھے کیا ملا یہ تمہارا کمال نہیں ہے۔ شمار اس بات کو کرو کہ تمہاری طلب کتنی سچی اور کتنی کھری ہے فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُکَ جو کچھ میں تمہیں عطا کرتا ہوں اُسے سنبھال کر رکھو وَ کُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ اور کبھی اپنی بڑائی، اپنی محنت اور اپنے کام کی طرف نہ سوچو بلکہ ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتے رہو۔

دنیا میں کون ایسا ہے جس کو فکریں نہیں ہیں، دنیا میں کون ایسا ہے جس کے مسائل نہیں ہیں، دنیا میں کون ایسا ہے جس کی ضرورتیں نہیں ہیں۔ میں اور آپ کون ہوتے ہیں، ہماری حیثیت کیا ہے، اس گئے گزرے دور میں کہ جس میں رزقِ حلال خیالِ محال، جس میں محبت نام کی جنس ناپید ہے، جو دشمنوں سے اٹا پڑا ہے، جو تکلیفوں کا گھر، دُکھوں کا جہاں بن گیا ہے، جہاں ہر سجدہ سکّے پہ ہو رہا ہے، جہاں دولت کی پوجا ہو رہی ہے، جہاں برسوں کے سجدے چند سکّوں پہ بک رہے ہیں، اس عالمِ افراتفری میں، اس تپتے ہوئے بے آب و گیاہ صحرا میں ذکرِ الٰہی کی ٹھنڈی چھاؤں مل جائے تو اور کیا چاہیے!

یادِ الٰہی کا چشمہ بَا صفا مل جائے تو اور کیا چاہیے! معیتِ باری کا نخلستان مل جائے تو اور کیا چاہیے۔ پھر یہاں بیٹھ کر اس کا شکر ادا کرتے رہو، اس کا ذکر کرتے رہو، اس کی یاد سے رِدائیں روئیں کو آباد کر لو۔

یہ بات بھول جاؤ کہ قربِ الٰہی ایک بڑا ہموار راستہ ہے، جس پہ بندہ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ نہیں! بندہ خود اپنا دشمن ہے، اس کے اندر نفس موجود ہے، پھر اس کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے، اس لئے اپنی ذات کو محض اس کی طلب کیلئے مختص کر لو۔

اَنپڑھوں کے فتوے اور سوالوں کی بوچھاڑ

کتنی عجیب بات ہے کہ جواری جواء کھیلے، کوئی اس سے سوال نہ کرے۔ شرابی شراب پیے، تو کوئی اُس سے نہ پوچھے۔ چور چوری کرے، قاتل اور ڈاکو قتل اور راہزنی کریں، کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا۔ اور ظالمو! کسی کو اللہ اللہ کرنے کی توفیق ہو جائے تو اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے۔ یہی اتنا بُرا کام ہے کہ اسی کے متعلق تمہیں شک ہو جاتا ہے، اسی میں تجسس پیدا ہو جاتا ہے؟ ہمارا یہی ایمان ہے جو ہمیں یہود و نصاریٰ کا غلام بنا گیا!

ہمارے زمانے کی مصیبت یہ ہے کہ اگر مقدمے کی بات ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں وکیل سے مشورہ کرو۔ گھر بنانا ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں آرکیٹیکٹ (architect) یا نقشہ نویس سے بات کرو۔ بیمار ہوں تو حکیم یا ڈاکٹر کی رائے لیتے ہیں لیکن جب بات ذکر اذکار کی آتی ہے، کیفیاتِ قلبی کی آتی ہے تو پڑھے لکھے اور اَن پڑھ، مفتی بن جاتے ہیں۔ بھلا ایک چیز تمہارے پاس نہیں ہے تو کیا اس کا مطلب ہے کہ وہ ہوتی بھی نہیں۔ اب ایسا دور آ گیا ہے کہ عالم تو عالم، اَن پڑھ بھی فتوے دے رہے ہیں کہ اس کی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی انہیں بادام کا چھلکا چاہئے اس میں مغز ہو نہ ہو۔

ذکر اذکار کی ساری محنت کا حاصل یہ ہے کہ بندہ اللہ کریم کو خود جاننے لگ جائے، سنی سنائی خبر تک محدود نہ رہے۔ تزکیہ یا تصوف کے بغیر بندہ ربِ کریم کو ذاتی طور پر نہیں جانتا، سن کر جانتا ہے۔ سنی ہوئی بات اپنی جگہ لیکن ذاکر کا اپنا دل کہتا ہے کہ اس کا رب اس کے پاس ہے اور وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ کریم اس کی بات سن رہے ہیں، اللہ کریم اس سے راضی ہیں۔ اگر کوتاہی ہو جائے تو دکھ لگتا ہے کہ اللہ کریم کی نافرمانی ہو گئی، روتا ہے، اللہ کریم کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کیفیت اس کی عطا ہے چاہے تو ایک لمحے میں عطا کر دے۔ دراصل لوگ ذکر تو کر لیتے ہیں لیکن عملی زندگی میں تبدیلی نہیں لاتے۔ وہ اسے ایک عجیب چیز سمجھ کر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کشفِ قبور کا شوق ہوتا ہے تو کسی کو مشاہدات وغیرہ کا۔ اس کے اصل ثمرات لینے کے لیے طلبِ صادق کا ہونا ضروری ہے۔

ذکر کا مقصد یہ نہیں کہ انوارات نظر آ جائیں کیونکہ انوارات ہر کسی کو نظر نہیں آتے۔ اگر دل میں یہ خوف پیدا ہو جائے کہ میں گناہ نہ کروں تو ذکر کا مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن اگر کردار متاثر نہیں ہوتا، اعمال نہیں بدلتے، اخلاق صحیح نہیں ہوتے، سوچ صحیح نہیں ہوتی اور محض روشنیاں نظر آتی ہیں تو اسے اِستدراج کہتے ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا نفس ہمیں مختلف روشنیاں دکھا رہا ہو۔ یاد رکھیے! جس عجیب کام کے ساتھ کردار سازی نہ ہو، اسے اِستدراج کہتے ہیں۔

ایک مرتبہ میرے ڈیرے پر حضرتؒ تشریف فرما تھے۔ ایک شخص آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ حضرتؒ سے عرض کریں کہ مجھے بھی اپنے حلقے میں شامل کر لیں۔ میں نے اس سے پوچھا، تم حلقے میں کیوں شامل ہونا چاہتے ہو؟ کہنے لگا، جن تنگ کرتے ہیں، ان سے بچنا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا، جن کیسے تنگ کرتے ہیں؟ کہنے لگا رات بھر سونے نہیں

دیتے۔ میں نے کہا یہ تکلیف تو یہاں بھی برابر ہے۔ رات کو یہ بھی سونے نہیں دیتے، تو تمہاری تکلیف تو یہاں بھی ٹھیک نہیں ہو گی۔ اُدھر تمہیں جن جگائے رکھتے ہیں، اِدھر یہ لوگ جگائے رکھیں گے۔ پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ ہم علاج کر دیں گے، نقش دے دیں گے، حلقۂ ذکر میں نہیں لیں گے کیونکہ یہ مقصدِ ذکر نہیں ہے کہ بندہ اس لئے ذکر کرے کہ جن اسے چھوڑ دیں۔ یہ جو اللہ اللہ ہم کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ نہیں ہے کہ ہم دوسروں سے بڑے مقدس انسان بن جائیں۔ اس کا یہ بھی حاصل نہیں ہے کہ ہم بہت بڑے پیر بن جائیں یا صاحبِ کرامت ولی بن جائیں۔ اس سارے کا سارا حاصل یہ ہے کہ بندے میں اتنی استعداد، اتنا حوصلہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے مفروضہ جہان سے نکل کر رب العالمین کے جہان میں جا بسے۔ اس کے بعد اس کے پاس پریشانی نہیں آتی۔

ذکرِ الٰہی کا حاصل

منازل کی ترقی کا تعلق عملی دنیا سے ہے۔ ترقی کا سبب یہ ہے کہ کوئی کتنا اتباعِ شریعت کرتا ہے، شریعت اسے کتنی عزیز ہے، اعمال کیسے کرتا ہے، اس کا کردار کیا ہے؟ نتائج اعمال پہ ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ اس لئے کی جاتی ہے، ذکر کا حاصل یہ ہے کہ اعمال میں خلوص اور گہرائی پیدا ہو جائے تاکہ ان پر نتائج مرتب ہو سکیں۔ کردار میں دورنگی نہ رہے، منافقت نہ رہے، خلوص آ جائے، گہرائی آ جائے۔ ہم نے یہ فلسفہ بنا لیا کہ جو صوفی ہوتا ہے، اسے کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں حالانکہ حقیقی صوفی دوسروں کی نسبت زیادہ کام کرتا ہے، زیادہ جفاکش، زیادہ محنتی ہوتا ہے۔

شرح صدر

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ

(الزمر:22) جیسے نیکی کے لیے کسی کا شرح صدر ہوتا ہے اور اس کی سوچ، فکر درست ہو جاتی ہے۔ اسے نیک خیالات آنے لگتے ہیں، اس کا کردار نیک ہو جاتا ہے، اس کا سینہ کھل جاتا ہے اور وہ نیکی کیلئے کوشاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کفر کیلئے بھی شرح صدر ہو جاتا ہے۔ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا (النحل:106) فرمایا: ان کے دل میں کفر اس طرح دھنس گیا ہے کہ ان کی سوچ، فکر اور کردار پر اس کی چھاپ لگ گئی۔ ان کا شرح صدر کفر کیلئے ہو گیا۔ تو اس طرح کفر کیلئے بھی شرح صدر ہو جاتا ہے، برائی کیلئے بھی سینہ کھل جاتا ہے۔ ایسا شخص برائی کے نت نئے طریقے سوچتا ہے، برائی پھیلانے کی نئی نئی تجویزیں سوچتا ہے اور اللہ کی نافرمانی کے امور میں بہت ترقی کر جاتا ہے فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (النحل:106) پھر وہ غضب الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا ہر ہر فعل اور ہر ہر عمل غضب الٰہی کو دعوت دیتا ہے۔

چمن کی بہار صوفیوں کے دم سے ہے:

خوب جان لینا چاہیے کہ اس چمن کی بہار صوفیوں کے دم سے ہے۔ یہ راتوں کو خراٹے لینے والوں کے دم سے نہیں ہے۔ یہ اچھے کھانے کھا کر راتوں کو کروٹیں لینے والوں کے دم سے نہیں ہے۔ یہ ان فاقہ کشوں کے دم سے ہے جو اگر امیر ہیں تو بھی اللہ کی بارگاہ میں فقیر ہیں۔ جو آپ کی نگاہ میں سو رہے ہوتے ہیں لیکن اللہ کی بارگاہ میں جاگ رہے ہوتے ہیں۔ نیکی کرتے ہیں اور روتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں۔ جو مخلوق کا بھلا چاہتے ہیں، لوگ انہیں ایذا دیتے ہیں اور وہ ان کو دعا دیتے ہیں۔

ہم نے اپنی زندگیوں میں زندہ لوگوں کو محفل سے محروم اٹھتے دیکھا ہے اور قبروں میں پڑے ہوئے لوگوں کو مراقبات کرتے دیکھا ہے۔ میں پھر دہرا دوں، زندہ مکلف لوگوں کو محفل میں بیٹھ کر، برسوں لگانے کے بعد محروم ہو کر اٹھتے دیکھا ہے اور ایسے لوگوں کو دیکھا

ہے جو صدیوں پہلے دفن ہو گئے لیکن صاحب حال حضرات وہاں سے گزرے تو سوچا چلو یار! اسے بھی فنا فی الرسول ﷺ کرا دو۔

اہل اللہ کو صاحب حال کیوں کہتے ہیں؟

اہل اللہ کو اس لئے صاحب حال کہتے ہیں کہ وہ حالات پر حاوی ہوتے ہیں۔ ایک میزانیہ ہوتا ہے ان کے پاس۔ اہمیت کی ایک فہرست ہوتی ہے، ایک Priority list ہوتی ہے کہ کون سا کام ہے جو اس کے بعد زیادہ ضروری ہے۔ اب رزق حلال حاصل کرنا اور اس کیلئے کسب کرنا فرض عین ہے لیکن ایک فرض دوسرے فرض کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ (النور:37)

ذکر الٰہی زندگی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ذکر کرنے والے کی مثال زندہ کی سی ہے اور نہ کرنے والے کی مثال مردہ کی سی ہے۔ زندہ ہو گا تو تجارت کرے گا، مُردوں کا کاروبار سے کیا کام۔ ذاکرین کا کام، ان کی تجارت، ان کی مزدوری انہیں ذکر الٰہی سے نہیں روک سکتی۔ اللہ کی عبادات میں رکاوٹ نہیں بنتی کہ ان کی نمازیں، روزے چھوٹ جائیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں دولت کی محبت رکاوٹ نہیں بنتی، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں مال کی محبت رکاوٹ نہیں بنتی۔ مزدوری کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں، پیسہ کماتے ہیں اور جب دوسرے غافل ہوتے ہیں تو یہ اللہ کو یاد کر رہے ہوتے ہیں۔ جب دوسرے محروم ہوتے ہیں تو یہ اللہ کو سجدہ کر رہے ہوتے ہیں۔ جب دوسرے سو دکھانے میں مصروف ہوتے ہیں تو یہ زکوٰۃ ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو صاحب حال کہا جاتا ہے۔

توفیق ذکر لطائف کے منور ہونے کی دلیل ہے

جب بندے کو اللہ کا ذکر کرنے کی توفیق ارزاں ہو جاتی ہے، اللہ نیک صحبت میں بیٹھنے کی توفیق دے دیتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے لطائف منور ہیں۔ اگر

لطائف میں نورانیت نہ ہوتی تو ذکر قائم رکھنا آسان نہ ہوتا، یہ ختم ہو جاتا۔ بندہ دو چار دن محنت کرتا پھر چھوڑ بیٹھتا۔ لطائف تو ایک نگاہ میں روشن ہو جاتے ہیں البتہ یہ الگ بات ہے کہ کتنے روشن ہوئے۔

مولانا تھانویؒ سے بھی کسی نے یہی سوال کیا تو انہوں نے فرمایا! صحن میں ایک نل ہے۔ اس میں سے قطرہ قطرہ پانی رستا رہتا ہے۔ فرش پر پانی کے گرنے سے ایک گڑھا بن جاتا ہے، کیا یہ گڑھا پہلے گرنے والے قطرات کا اثر ہے یا بعد والے قطرات کا؟ لوگوں نے عرض کیا، یہ اثر تو ہر قطرے میں ہے لیکن پتہ نہیں چلتا، تو فرمایا! جب نل سے پہلا قطرہ گرا تو اس نے اس گڑھے کی بنیاد رکھ دی لیکن یہ گڑھا نظر اس وقت آیا، جب لاکھوں قطرے گر کر اپنا کام کر گئے، کام ہر قطرے کا برابر ہے لیکن مسلسل پانی گرنے سے یہ نظر آنے لگ گیا۔ یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے قطرے نے کام نہیں کیا۔

توفیقِ ذکر کا ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی رضا سے کام ہو رہا ہے، لطائف منور ہو رہے ہیں، گاڑی چل رہی ہے۔ لطائف منور ہونا اور لطائف کا منور دیکھنا یہ دو الگ باتیں ہیں۔ اللہ کریم کسی کو مشاہدہ کرا دے، کسی کو نہ کرائے اس کے بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جمع ضدین ناممکن ہے:

یہ ایک اصول ہے کہ کوئی چیز اور اس کی ضد بیک وقت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ آپ کسی بھی جگہ کو ہر چیز سے خالی کر دیں، وہ ہوا سے بھر جائے گی۔ کوئی نہ کوئی چیز اس میں سما جائے گی۔ اگر ایک جگہ سے نیکی اٹھ جائے گی وہاں برائی آ جائے گی، ایک جگہ سے حیا اٹھ جائے گی وہاں بے حیائی آ جائے گی، اگر ایک جگہ سے علم اٹھ جائے گا وہاں جہالت آ جائے گی، اگر ایک جگہ سے عدل اٹھ جائے گا وہاں ظلم آ جائے گا، اگر عدل آئے گا

ظلم چلا جائے گا، اگر روشنی آئے گی تاریکی چلی جائے گی۔ اصول یہ ہے کہ جمع ضدین ہے۔

اگر ذکرِ الٰہی نہیں ہوگا، اللہ اللہ دل میں نہیں رہے گی تو کیا ہوگا؟ اس میں خواہشات آ جائیں گی۔ جو دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو جائے میرے بھائی دوست! اس میں کیا ہوگا؟ وہ خالی تو نہیں رہے گا، اللہ کے ذکر کی جو ضد ہے، وہ وہاں آئے گی اور ضد ہے خواہشاتِ نفس۔ ایک ہے اللہ کا حکم، اس کے مقابلے میں ہمارے پسند، ناپسند ہے۔ جہاں ہم اللہ کا حکم چھوڑ دیتے ہیں، وہاں اپنے نفس کے حکم کی تعمیل ہیں خواہ ہم اس بات کو سمجھ رہے ہوں یا نہ سمجھ رہے ہوں۔ اور جس دل میں خواہشات آ جاتی ہیں وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکھف:28) اس کے سارے کام بگڑ جاتے ہیں، اعتدال سے باہر ہو جاتے ہیں، حد و حساب سے باہر ہو جاتے ہیں۔

ثواب سے زیادہ جمالِ باری کی تمنا:

یاد رکھیں! ثواب ہونا ایک الگ بات ہے اور کیفیات کو نقد حاصل کرنا ایک بات۔ ایک آدمی نماز ادا کرتا ہے، اس نے خواہ بے دلی سے ادا کر لی، زبردستی کر لی وقت پر شرائط کے ساتھ ادا کر لی تو ثواب کا مستحق ہے۔ اس نے وہ حکم پورا کر دیا جو ہے لیکن اسی نماز میں ان کیفیات کو جو اللہ کی تجلیات کے منعکس ہونے سے چاہئیں، نقد وصول کرنا ایک الگ بات ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ اُس کا ہر سجدہ اُسے کیفیت دے، اُس کا ہر قیام اسے ایک لذت دے، اُس کی ہر تسبیح کا اسے بدلہ کیلئے ایک خاص توجہ، ایک خاص محنت، ایک خاص مجاہدے کی ضرورت پڑے گی۔

یہی حال ذکرِ قلبی کا ہے۔ اس کا ہم صرف ثواب نہیں، ثواب سے بہت تمنا رکھتے ہیں۔ جمالِ باری کی تمنا رکھتے ہیں، وصولِ الٰہی کی توقع رکھتے ہیں اور ان

اوران لمحات کی توقع رکھتے ہیں جو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ان تعبد اللہ کانک تراہ اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا تم بچشمِ خود اُس کے جمال کا مشاہدہ کر رہے ہو۔ تو اس لمحے کو، اس کیفیت کو پانے کی تمنا رکھی جاتی ہے، اس کیلئے یہ زائد محنت کی جاتی ہے۔ جو یہ تمنا نہیں رکھتا وہ زائد محنت نہ کرے۔ جو یہ طلب رکھتا ہے اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کیوں محنت کرتا ہے۔ ایک آدمی دال روٹی پر گزارا کرتا ہے، اور مائم نہیں لگاتا تو اس کی اپنی مرضی۔

پودے کا بیج ہی اس کا پھل ہوتا ہے

پوری انسانی زندگی اگر ایک درخت تصور کی جائے تو ہر درخت پر شاخیں، پتے، پھول اور پھل لگتے ہیں اور پھل کا حاصل ایک بیج ہی ہوتا ہے، وہ ذکرِ الٰہی ہے۔ قرآنِ حکیم نے کثرتِ ذکر کا حکم بھی اسی لئے دیا ہے کہ کثرتِ ذکر اعمال و کردار کی اصلاح کا سبب بنتی ہے۔ اعمال و کردار کے درست ہونے کا نتیجہ پھر ذکرِ الٰہی کی مزید توفیق ہوتا ہے اور ذکرِ الٰہی نصیب ہو تو اعمال و کردار مزید سدھر جاتے ہیں۔

اصلاح کیلئے نسخۂ کیمیا

ایک بزرگ نے کسی کو اصلاح کا یہ طریقہ تعلیم فرمایا کہ ایک دن اپنے معمول کے کام جاری رکھتے ہوئے ایک کاپی پر اپنی گفتگو کو لکھتے جاؤ، شام کو یہ ڈائری خود پڑھنا۔ اگر اپنی باتوں پر شرمندگی محسوس ہو تو وہ کام چھوڑ دو۔ جن کاموں سے، جن باتوں سے آج خود شرمندہ ہو رہے ہو، کل ان کاموں کو ان باتوں کو اللہ کی بارگاہ میں کیسے پیش کرو گے؟ اگر آج ہم بھی ایک دن کی اپنی ڈائری لکھیں لیں تو شام کو سمجھ آجائے گی کہ میں کون سا رجسٹر لے کر اللہ کی بارگاہ میں جاؤں گا۔

آپ نماز پڑھیں نہ پڑھیں یہ آپ کا اور آپ کے رب کا معاملہ ہے۔ آپ روزہ

رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے، یہ آپ جانیں اور آپ کا رب جانے۔ آپ نیکی کرتے یا نہیں کرتے، یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔ میں یہ مشورہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ اپنے چوبیس گھنٹوں میں، چوبیس منٹ روزانہ نکالیں جس میں آپ صرف اللہ کا نام لیں، چوبیس منٹ نہیں نکال سکتے تو چوبیس گھنٹوں میں بارہ منٹ ہی نکال لیں جس میں دنیا و مافیہا سے یکسو ہو کر، ایک جگہ بیٹھ کر، ساری باتوں کو بھول کر صرف اللہ اللہ کریں اور دل پر متوجہ ہو کر اللہ کا نام لیں۔ پھر دیکھیں اللہ کیسے کیسے ذرائع پیدا فرماتا ہے وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (الشوریٰ: 13) وہ ضرور ایسی مجالس، ایسی محافل، ایسے لوگوں سے ملا دیتا ہے جہاں سے اصلاح کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے۔

عقیدہ اور ایمان بچانے کا ذریعہ

الحمدللہ! اللہ کا احسان ہے کہ تین چوتھائی زندگی ذکرِ الٰہی میں گزری ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ اب اس عہد میں ذکر کے علاوہ عقیدہ اور ایمان بچا لے جانے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ کبھی تو لوگ ذکر کر کے صاحبِ کرامت ولی بن جاتے تھے، آج تو جو بندہ اس دور میں اللہ اللہ کر کے ایمان بچا کر لے جائے، میں سمجھتا ہوں وہ ولی اللہ ہے۔ آج کی ولایت یہ ہے کہ اس طوفانِ بدتمیزی میں کم از کم عقیدہ تو بچا کر لے جائے۔

آج کے لوگوں کے پاس عقائد بھی نہیں رہے۔ نظریات بدل گئے ہیں اور لوگ بت پرست ہو گئے ہیں، مخلوق کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کی رضا کو چھوڑ کر مخلوق کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ دنیا کے لالچ میں، ذرائع اور اسباب کے لالچ میں، مخلوق کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ تو اس سب بیماری کا علاج ذکر اللہ ہے۔ خطا ہو جائے تو اس کا علاج اور دوا بھی ذکر اللہ ہے۔ یہ غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے، زخم لگ جائے تو مرہم بھی ہے۔ اسے پوری محنت اور پورے خلوص سے کیجیے۔ یہ میلے روز روز نہیں لگتے، بڑے کم لوگ ہوتے ہیں اور کم

زمانوں میں ہوتے ہیں، پھر بعد میں لوگ قصے کہانیاں اور اپنی اپنی نظر میں عجیب عجیب کرامات لکھتے رہ جاتے ہیں۔ لیکن پھر اس سب کا فائدہ؟

صحبت کا اثر

صحبتِ صالحین

مولانا سعدیؒ فرماتے ہیں

گِلے خوشبوئے درحمام روزے رسید از دستِ محبوبے بدستم

ایک زمانے میں یہ صابن وغیرہ نہیں ہوتے تھے، ایک خاص قسم کی مٹی ہوتی تھی، لوگ اس سے غسل کرتے تھے، میرے پاس رکھی ہے تھوڑی سی نمونے کے طور پر، یہاں ہمارے پہاڑوں میں بھی ملتی تھی۔ تو مولانا سعدیؒ فرماتے ہیں، حمام میں میرے ایک دوست نے مجھے وہ نہانے کی مٹی دی، بڑی خوشبودار تھی تو میں اس کی خوشبو سے بڑا حیران ہوا

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوئے دل آویزے تو مستم

تو میں نے اس مٹی سے کہا کہ تو مشک ہے، کستوری ہے یا تجھ میں عنبر ملا ہوا ہے کہ تیری خوشبو نے تو مجھے مست کر دیا۔

بہ گفتا من گلِ ناچیز بودم ولیکن مدتے با گل نشستم

اس نے کہا کہ میں ایک بے مصرف سی، ناچیز سی مٹی ہوں لیکن کچھ عرصے کیلئے انہوں نے مجھے پھولوں میں رکھ دیا۔

جمال ہم نشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

یہ جو خوشبوئیں آ رہی ہیں یہ اُس ہمنشین پھول کی خوشبو ہے۔ میں تو کچھ عرصہ اس پھول کے پاس بیٹھی رہی ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں جو پہلے دن تھی۔

تو بندہ وہی مشتِ غبار ہے، اس کا کوئی کمال نہیں ہے۔ اللہ نے اسے کسی

صاحبِ کمال کی صحبت میں پہنچا دیا اور کوئی رنگ اس پر بھی آ گیا تو وہ اس کا کمال نہیں یہ اللہ کی دین ہے، اسے اپنی حیثیت یاد رکھنی چاہیے۔ یہ خیال احساسِ نیاز مندی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ خیال ہو کہ میں بڑا صاحبِ کمال اور کامل ہو گیا ہوں تو پھر بات نہیں بنتی۔

کسی نے فارسی شعر میں یوں ڈھالا "صحبتِ صالح ترا صالح کنند" کہ اچھے لوگوں کی مجلس تمہارے اندر بھی اچھائی پیدا کر دیتی ہے اور "صحبتِ طالع ترا طالع کنند" اور بدکاروں کی صحبت میں آدمی بدکار ہو جاتا ہے۔ برا ساتھی، برے لوگوں کی دوستی، بدکاروں سے دوستی دراصل شیطان سے دوستی ہے۔ جو لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے اتباع سے محروم ہو جاتے ہیں وہ شیطان کا اتباع کر رہے ہوتے ہیں۔ ہر بندہ دونوں گروہوں میں سے ایک طرف ضرور ہوتا ہے۔

صحبت اور متکلم کے کلام کا اثر

جو شخص بات کرتا ہے، اس بات میں بات کرنے والے کا، کلام کرنے والے کا یعنی متکلم کا پرتو اور اثر ہوتا ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ آپ کسی بندے کو جواری کے پاس بٹھا دیں، وہ صرف ان کی گپ شپ ہی سنتا رہے تو اسے جوئے سے رغبت پیدا ہو جائے گی۔ آپ کسی بندے کا شکاریوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا کر دیں تو چند دن ان کی باتیں سن کر اس میں اُسی طرح کا ذوق پیدا ہو جائے گا۔ کسی بندے کو اہل اللہ کے پاس بیٹھنا نصیب ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کی طبیعت نیکی کی طرف مائل ہونا شروع ہو جائے گی۔ کلام کرنے والے یعنی متکلم کا ایک عکس، ایک پرتو اس کے کلام میں ہوتا ہے۔

قرآن کی اصل کیفیت یہ ہے کہ صاحبِ کلام کے جمال کا پرتو قلوب میں اترے اور لذتِ آشنائی پیدا کرتا چلا جائے۔ اگر پرتوِ جمال کو قلوب میں نہ اتارا جائے تو وہ فوائد مرتب نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔

ماحول کے اثرات۔۔اصول

یہ ٹھیک ہے کہ ماحول اور معاشرہ انسان کو متاثر کرتا ہے اور اس کا ایک بہت بڑا اثر ہوتا ہے لیکن معاشرہ بھی زبردستی پکڑ کر کچھ نہیں کراتا بلکہ ایک ترغیب دیتا ہے کہ بہت سے لوگ ایک کام کر رہے ہوتے ہیں تو ایک ماحول ایک فضا اُس جیسی بن جاتی ہے۔ اس لئے علماءِ حق نے لکھا ہے کہ جہاں کفر غالب ہو یا بے حیائی غالب ہو تو وہاں جانے سے اجتناب کرنا چاہئے بلکہ جس بندے کو اندیشہ ہو کہ وہاں جا کر برائی کا شکار ہو جاؤں گا، تو اس کا وہاں جانا حرام ہے اور اس بندے کا جسے یہ اعتماد ہو کہ میں وہاں جا کر نہیں بدلوں گا بلکہ وہاں کے کسی فرد کو بدل سکوں گا تو اس کا وہاں جانا فرض ہے۔

بعض لوگ بدکاروں کے پاس بیٹھ بھی جائیں تو خود برائی میں ملوث نہیں ہوتے بلکہ انہیں نیکی کی طرف مائل کر لیتے ہیں یا کم از کم یہ اثر ہوتا ہے کہ جتنی دیر وہ ان کے پاس رہیں وہ کوئی برائی نہیں کرتے۔ اگر وہ پوری طرح نیکی کی طرف نہ بھی آئیں تو جتنی دیر وہ شخص ان کے پاس رہے گا، وہ برائی سے باز رہیں گے، یہ بھی تو فائدہ ہو گیا۔

بندے دو قسم کے ہیں، ایک وہ ہے کہ جو غلط ماحول میں جائے گا تو resist نہیں کر سکے گا، اپنا دفاع نہیں کر سکے گا بلکہ اس کا شکار ہو جائے گا تو اُس کا اُس ماحول میں جانا حرام ہے۔ ایک بندہ ایسا ہوتا ہے جسے اللہ نے یہ قوت دی ہے، اس کی قلبی کیفیات ایسی ہیں کہ وہ وہاں جا کر کسی کو برائی سے بچانے کا سبب بنے گا، تو ایسے لوگوں کا وہاں جانا فرض ہے۔

یہ دونوں باتیں بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہیں

☆ اگر غذا میں فرق آئے تو عبادت میں فوراً بے ذوقی آ جاتی ہے اور

☆ اگر نا اہل کی صحبت میں جانے سے اس کے حال سے مغلوب ہو گیا تو سارا اثر

عبادت پر پڑتا ہے، پھر اُس کا ذکر میں جی نہیں لگتا، اُس طرف توجہ نہیں ہوتی، اُس طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

اچھی اور بری صحبت کے اثرات

انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا قول و فعل اتنا متاثر کن ہے کہ وہ نہ صرف اس کی اپنی ذات کو متاثر کرتا ہے بلکہ پورے ماحول اور معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اگر کوئی نیک بات کہتا ہے، نیک عمل کرتا ہے، اتباعِ سنت میں کوشاں ہے اور وہ یہ سب کام خلوص سے کرتا ہے تو اس کے پرخلوص قول و فعل کے انوارات و برکات، دنیا کی بھی آبادی کا سبب بنتے ہیں۔ دنیا میں انسانوں کے مسائل حل ہوتے ہیں اور انہی اقوال و افعال کے اثرات انسانوں کو عذابِ الٰہی سے بچانے کا بھی سبب بنتے ہیں اور اُن کا اخروی اجر بھی یقینی ہے جو انہیں ابدالآباد کی زندگی میں نصیب ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کوئی برائی کرتا ہے تو وہ تنہا اس کی ذات کیلئے ہی تباہ کن نہیں ہوتی، اس کا اپنا ضمیر، مزاج، اس کی روح اور اس کا کردار ہی خراب نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہر قول و فعل سے اثر پھیل کر پورے ماحول کو آلودہ کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں روئے زمین پر فسادات بپا ہوتے ہیں۔ ایک انسان اگر رات بھر اللہ اللہ کرتا ہے اور چند لمحے نااہلوں کی صحبت میں گزار دے تو تعمیر کی نسبت تخریب آسان ہوتی ہے۔ رات بھر اس نے جو تعمیر کی ہے اسے اُن کی ایک بات ضائع کرنے کیلئے کافی ہوگی۔

جب انجن میں خرابی ہو تو وہ ماحول کو آلودہ کرتا ہے بالکل اسی طرح فرد کی ذات میں برائی ہو تو اس کا اثر پورے ماحول تک جاتا ہے۔ مادی ماحول، فضاء کی آلودگی کی طرف تو آج کے انسان کی نگاہ جاتی ہے لیکن کردار کی آلودگی سے خشکی و تری میں جو فساد پھیلتا ہے، اس کی طرف توجہ کیوں نہیں جاتی؟ اس لئے کہ جب دین نہ ہو، روح زندہ نہ ہو،

حضور نبی کریم ﷺ سے تعلق استوار نہ ہو تو نگاہ محدود ہو جاتی ہے، مادی اشیاء سے آگے تک کی سوچ ہی نہیں آتی۔

یہ بھی اللہ کریم کا کرم ہے کہ نیکی پر زندگی گزارنا آسان ہے۔ عمومی زندگی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کفر کرنا، برائی کرنا، شرک کرنا آسان کام نہیں ہے اور توحیدِ الٰہی پر، سنتِ نبوی ﷺ پر قائم رہنا گناہ کرنے کی نسبت ہزاروں درجہ آسان ہے۔ مزدوری کرنا چوری کرنے سے آسان ہے کہ ہر جرم، ہر گناہ کے ساتھ بیشمار دنیوی تکالیف اور خوف و ہراس وابستہ ہیں۔

برائی اپنے اندر ہوتی ہے

اللہ کی اطاعت کرنے کا موقع تو معاشرے میں رہتے ہوئے ہی ملتا ہے، پھر یہ شکوہ کہ معاشرہ بہت برا ہے، بے جا ہے۔ بھئی! معاشرہ برا ہے، مگر اپنے اندر جو برائی ہوتی ہے، اپنے اندر جو کمزوریاں ہوتی ہیں، اپنی خواہشات جب غالب آتی ہیں تو ہی بندہ برائی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لیکن جس کے اپنے اندر اللہ کا نور، اللہ کا ذکر، اللہ کی روشنی اور اللہ کا یقین اور اعتماد ہو تو کوئی برائی اس کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ اللہ توفیق دے تو بندے میں یہ جرأتِ رندانہ ہونی چاہئے کہ بجائے اس کے کہ برے لوگ اسے برائی پہ آمادہ کریں، وہ جہاں ہو، وہاں برے لوگوں کو بھی نیکی پہ آمادہ کرے، لوگوں کو برائی سے بچانے کا سبب بنے۔ کیونکہ قلوب ایک دوسرے سے اثر لیتے ہیں۔ آپ دیکھئے میں آپ سے بات کر رہا ہوں، آپ میری بات سن رہے ہیں، دونوں پر اثر ہوگا۔ جو کیفیات آپ کے قلوب میں ہیں مجھے متاثر کریں گی اور جو کچھ میرے دل میں ہے وہ آپ کو متاثر کرے گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ دونوں اثر پذیری سے خالی ہوں۔ دونوں پر اثر ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ وہ منفی ہوتا ہے یا مثبت۔ اگر میرے دل میں مثبت کیفیات ہیں آپ پر مثبت اثر پڑے گا، اگر میرے

دل میں معاذ اللہ منفی کیفیات ہیں تو آپ پر منفی اثر ہوگا۔ آپ گھنٹہ بھر تقریر سنتے رہیں گے اور بے لطف ہو کر اٹھ جائیں گے، کہیں گے یار! ایک گھنٹہ ضائع کر دیا۔

اب سرِ بازار جلسہ ہوتا ہے، ہم تقریر کرتے ہیں، پبلک جلسے میں دین بھی بیان کیا جائے تو ایک جلسے کے تین تین، چار چار دن بعد تک بعض اوقات ہفتہ ہفتہ مشاہدات بند رہتے ہیں، اس قدر قلب پر ظلمت آجاتی ہے۔ وہ ساری انسانی قلوب کی ہوتی ہے چونکہ اس کیفیت کو اس بات سے غرض نہیں کہ آپ دین بیان کر رہے ہیں۔ دل دل کے روبرو ہوں گے تو وہ ایک دوسرے سے متاثر تو ہوں گے۔

برائی کے جراثیم کیسے فعال ہوتے ہیں؟

برائی کی خواہش انسان کے اندر ہوتی ہے، لوٹ مار کرنے اور طمع کا مادہ اندر ہوتا ہے، جب برائی کے مواقع آئیں، برائی کا ماحول میسر آجائے تو وہ ماحول اس کو متحرک کر دیتا ہے۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے، ہم میں سے ہر ایک کے اندر یہ جراثیم ہیں، ماحول سے متاثر ہو کر یہ متحرک ہو جاتے ہیں۔

حضور ﷺ کی بعثت کی رحمتیں بھی اسی طرح عام ہیں، ہر ایک کیلئے یہ در رحمت وا ہے۔ ہم اپنے لئے رحمتیں سمیٹ کر اپنے اندر نیکی کا نور انڈیل سکتے ہیں۔ جب اندر نیکی آئے گی تو ماحول سے غلط اثر لینے کی بجائے ماحول کو نیکی کے اثر سے پُرنور کر دے گی۔

پرہیز علاج سے بہتر ہے

اہل اللہ جب لوگوں کو اللہ اللہ سکھاتے ہیں تو انہیں سخت پرہیز بھی کرواتے ہیں تاکہ یہ نہ ہو کہ وہ جو کچھ حاصل کریں، ساتھ ساتھ ضائع کرتے جائیں اور پھر ویسے ہی ہو جائیں جیسے تھے۔ پرہیز یہی ہے کہ جہاں برائی کا تذکرہ ہو، فحاشی ہو وہاں نہ جائیں۔ ایسے ماحول سے اتفاقاً گزرنا پڑے تو متانت و وقار کے ساتھ گزر جائیں۔

ہمیں جب حضرتؒ نے شاگردی میں قبول کیا تب اس طرح کی پابندیاں ہم پر بھی تھیں۔ بازاری اشیاء خواہ حلال ہوں، کھانے سے منع فرماتے تھے کہ پاکی اور ناپاکی کا خیال رکھے بغیر تیار کی جاتی ہیں۔ دوسرا مفلوک الحال لوگوں کی حسرت زدہ نگاہوں کے پڑنے سے وہ کھانے کے قابل نہیں رہتیں۔ شروع شروع میں ہمیں تاکید تھی کہ نماز باجماعت مسجد میں پڑھنا بے حد ضروری ہے لیکن صرف فرض پڑھ کر واپس آجاؤ اور سنتیں اور نوافل گھر آکر پڑھو۔ اگر مسجد میں ہی پڑھنا ہے تو نمازیوں سے ہٹ کر ذرا فاصلے پر پڑھو ورنہ لطائف اور ان پر کی جانے والی محنت ضائع ہو سکتی ہے یعنی اس طرح کا پرہیز ان لوگوں سے کرایا جاتا تھا جو نمازی تو تھے، ذاکر نہیں تھے تو پھر بے نماز یا بدکار کی سنگت، صحبت سے کیا ہوتا ہوگا؟

صحبت۔۔۔ زندگی موت کا ساتھ

موت ان کے ساتھ ہی آئے گی جن کے ساتھ آدمی زندگی گزارتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ زندگی مے خانہ میں بسر ہو اور موت کعبے میں آئے۔ انسان جن لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہوگا، موت بھی ویسے ہی لوگوں کے ساتھ آئے گی۔ سیدنا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ فرمایا کرتے تھے "لوگ زندگی تو فرعون کی جینا چاہتے ہیں اور موت حضرت موسیٰؑ کی چاہتے ہیں"۔

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد

مرشدنا حضرت خواجہ اللہ دین مدنیؒ

میری سمجھ کے مطابق قدرت نے مرشدنا حضرت خواجہ اللہ دین مدنیؒ صدیوں پہلے مدینہ منورہ سے کوچ کا حکم دے کر اس ویرانے میں بھیج دیا تا کہ انوارات باری کا ظہور ہو اور دنیا کو تباہی سے بچانے کا سبب بنے۔ یہ انتظام قدرت باری نے صدیوں پہلے کر دیا ورنہ مدینہ منورہ بھی کوئی چھوڑنے کی جگہ ہے۔ صوفی کو مدینہ منورہ میں جگہ ملے تو وہاں سے کیوں آئے سوائے منشاء باری کے، سوائے تعمیلِ ارشاد کے، سوائے دینی خدمت کے۔

الحمدللہ! بیت اللہ شریف کی، مدینہ طیبہ کی حاضری بہت مرتبہ نصیب ہوئی، مجھے جرأت نہیں ہوئی کہ وہاں سے ایک کنکری بھی لاتا کہ ایک کنکر کو بھی اس ارضِ عظیم سے جدا کر دیا جائے تو اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ لوگوں نے مجھے تبرکات تحفتاً دیئے، وہ میرے پاس ہیں۔ خود مجھے یہ ہمت نہیں ہوئی کہ گنبدِ خضریٰ کے پہلو میں پڑا کوئی ریزہ اٹھالاؤں۔ ایک صوفی تو ایک ریزے کو بھی وہاں سے جدا نہیں کر سکتا، پھر اللہ کا بندہ جو اتنا صاحبِ حال ہو، اس کی نظر اتنی وسیع ہو، وہ خود تو وہاں سے نہیں آیا ہوگا۔ حضرت خواجہ اللہ دین مدنیؒ کا ارشاد ہے کہ خود انہیں اس بات کی سمجھ اس وقت آئی جب حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کو شاگرد بنایا۔ فرماتے ہیں انہیں اس وقت پتہ چلا کہ مدینہ منورہ سے انہیں اس علاقے میں کس کام کے لئے بھیجا گیا تھا۔

میرے مرشد، میرے شیخ

الحمدللہ! ربع صدی حضرتؒ کی خدمت میں حاضری نصیب رہی۔ حضرتؒ کے

ساتھ ملاقات عین جوانی کے ایام میں ہوئی۔ جوانی کا زمانہ مستقل فیصلوں کا وقت نہیں ہوتا اور عرصہ گزرنے کے ساتھ ساتھ، وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ مزاج بدلتا رہتا ہے، سوچیں بدلتی رہتی ہیں لیکن وہ چوٹ جو پہلی ملاقات میں دل پر پڑی تھی، اللہ کریم کے احسان سے وہ آج بھی زندہ ہے۔ جب کبھی حضرتؒ سے ملے ایک ہفتہ گزر جاتا تو طبیعت پریشان ہو جاتی تھی۔ جس طرح بھوک یا پیاس لگتی ہے اسی طرح سے، ملاقات کو دل چاہتا تھا اور جب ملاقات ہو جاتی، خدمت میں حاضر ہو جاتے تو یوں لگتا جیسے کسی بھوکے کو کھانا مل جائے یا کسی پیاسے کو پانی مل جائے، طبیعت یوں سیر ہو جاتی تھی۔ آنے کے بعد بمشکل ہفتہ نہیں گزرتا تھا کہ پھر چل پڑتے تھے۔ حالانکہ اُس وقت آج کل کی سواریاں نہیں ہوتی تھیں، نہ ہی ہمارے پاس اپنی گاڑیاں تھیں۔ پہنچنے میں تقریباً سارا دن گزر جاتا تھا۔ اللہ کریم نے ذکر بھی نصیب فرمایا، مراقبات بھی عطا فرمائے لیکن ملاقات کی طلب، پاس بیٹھنے کی کیفیات کا لطف بڑھتا ہی رہا۔

حضرتؒ کے مقامی طور پر دشمن بھی بہت تھے اور جو رشتہ دار تھے، دوسروں کی نسبت وہ زیادہ دشمنی کرتے تھے۔ مخالفت بھی کرتے تھے اور پروپیگنڈہ بھی کرتے تھے۔ زندگی میں ایک بار ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا کہ جنہوں نے مجھ پر بھی سوال کیا کہ کیوں آتے ہو اس بندے کے پاس؟ یہ ایسا ہے، ویسا ہے، یہ ہے، وہ ہے۔ ان لوگوں کا طلاق کا کوئی جھگڑا تھا جس میں اعلیٰ حضرتؒ نے ان کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ میں ان کی آزمائش یا ان کا کردار جانچنے کے لئے نہیں آتا، میں آتا ہوں کہ وہ مجھے قلبی کیفیات عطا کرتے ہیں، تم دے سکتے ہو؟ کہنے لگے ہم تو جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ بس تمہارا میرا کوئی جھگڑا ہی نہیں، مجھے جس چیز کی ضرورت ہے، وہ مجھے ان سے ملتی ہے، تمہیں اس کی خبر ہی نہیں۔ اب وہ کیسا بندہ ہے اس سے میرا کوئی تعلق

نہیں، یہ وہ جانے اس کا رب جانے۔ یہ میرا کام نہیں کہ اس کا محاسبہ کروں۔ میرا کام یہ ہے کہ جو مجھے چاہیے وہ مجھے مل رہا ہے، اللہ اللہ خیر صلا۔ میں نے کہا، جب میں آتا ہوں میرے دل کی دنیا بدل جاتی ہے اور میں سات آٹھ دن سے زیادہ ان سے الگ نہیں رہ سکتا، مجھے پھر بھوک لگتی ہے جس طرح کھانے کی بھوک لگتی ہے، جس طرح تپتے صحرا میں پیاس لگتی ہے، میں بیقرار ہو کر پھر چل پڑتا ہوں، آپ مجھے کیسے روکیں گے؟

جو گھونٹ ہی نہیں بھرتا، اسے کیا پتہ یہ کڑوا ہے یا میٹھا۔ جو دریا میں اترتا ہی نہیں، اسے کیا پتہ طوفان کیا ہوتے ہیں؟ لوگ کتنے دریاؤں میں جاتے ہیں، ان کا کوئی جہاز راں، ان کا کوئی ملاح انہیں آرام سے پار اتار دیتا ہے۔ پتہ اسے ہوتا ہے جو طوفانوں سے لڑتا ہے، سواریاں تو آرام سے اتر گئیں لیکن جس نے انہیں پار اتارا، جو طوفانوں کے سینے چیر کر لے کر گیا، اس نے کتنی محنت کی ہوگی؟ جہاز میں سب مسافر تو شاید سو رہے ہوں گے لیکن جہاز راں کو تو کھانے پینے کی بھی فرصت نہیں ہوگی۔

تو جب تک چیزوں کا احساس وادراک نہ ہو، اُن کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا اور بندہ شکر نہیں کر سکتا، یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ ہر بال میں اگر الگ سے روح آجائے اور ہر روح اس پر نچھاور کر دی جائے تو بھی شکر ادا نہیں ہوتا۔ اس لئے سلطان باہوؒ نے کہا تھا

لوں لوں دے مُڈھ، لکھ لکھا کھیاں تے مرشد دیکھے نہ رَجاں ہو

یعنی ایک ایک بال میں، ایک ایک لاکھ آنکھیں ہوں اور میں مرشد کو دیکھتا رہوں تو بھی میرا دل نہیں بھرتا۔ ہم کیا ہیں؟ ہم تو ملازم ہیں۔ مالک اب بھی مشائخ ہی ہیں، مالک اب بھی حضرتؒ ہی ہیں، سلسلہ انہی کا ہے۔ ہم تو اجیر ہیں، خادم ہیں، غلام ہیں، جو حکم ہوگا وہ کریں گے۔ اللہ اس کی توفیق دے اور کرتے رہیں۔ آمین ثمہ آمین

میں ہمیشہ ایک تاریخی حقیقت بیان کرتا ہوں کہ طریق نبوت ﷺ کا یہ خاصہ تھا

کہ جو بھی بارگاہِ رسالت ﷺ میں آیا وہ صحابیؓ ہو گیا۔ یہی سنت عہدِ صحابہؓ میں زندہ رہی۔ ہر صاحبِ ایمان صحابیؓ کی صحبت پا کر تابعیؒ ہو گیا اور اسی طرح جو بھی حالتِ ایمان میں تابعینؒ کے ہاں پہنچا، تبع تابعیؒ کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ خیر القرون کے عہدِ زریں کے بعد یہ سنت جاری نہ رہی۔ بڑے بڑے اہل اللہ کے نام ملتے ہیں جن کے علمی مقام، ورع تقویٰ، منازل ومناصب نہایت عالی شان ہیں، ہم ان کی جوتیوں کی خاک کے برابر بھی نہیں، لیکن ہر آنے والے کو کیفیاتِ قلبی عطا کر دیں، یہ سنت وہاں بھی نہیں ملتی۔ انہوں نے دو، چار، پندرہ، بیس، پچاس بندوں کو ذکرِ قلبی اور کیفیاتِ قلبی کا حصول سکھایا اور باقی سب کو ظاہری شریعت کی ہی تعلیم دی اور وظائف بتائے لیکن کیفیاتِ قلبی پانے والے شائد انگلیوں پر ہی گنے گئے۔

وہ سنت کہ ہر آنے والا کیفیاتِ قلبی بھی پائے، چودہ صدیوں کی پوری تاریخ میں تبع تابعینؒ کے بعد نظر نہیں آتی۔ پھر ایک کھدر پوش دہقان، دُور دراز ایک غیر معروف علاقے کا عام کاشتکار، تصوف وسلوک کے اُفق پر ابھرتا ہے اور یہ سنت تازہ کرتا ہے اور تبع تابعینؒ کے بعد یہ سنت حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کے زمانے میں ملتی ہے کہ جو آپؒ کے پاس بیٹھا، کیفیاتِ قلبی لے کر اٹھا۔ بعض لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا کہ تم یہ سب اپنے شیخ کی عقیدت میں کہتے ہو، میں نے جواباً تاریخ سامنے رکھی کہ آپ خیر القرون کے بعد کسی ایک اہل اللہ کا اسمِ گرامی بتا دیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا ہر طالب صاحبِ حال ہو گیا ہو لیکن میں نے حضرتؒ کی مسجد میں پانی بھرنے والے کو بھی فنافی الرسول ﷺ دیکھا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے۔ میری اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت اپنی جگہ ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مجھے اپنے شیخ سے وہ عقیدت ہے جو کسی انسان سے ممکن ہو سکتی ہے۔ مجھے حضرتؒ سے ملے نصف صدی بیت گئی، میں ربع صدی آپؒ کے ساتھ رہا۔ جس

دن پہلی ملاقات ہوئی، اُس دن سے لے کر آج تک الحمدللہ میرے دل میں شیخ کے خلاف کبھی وسوسہ بھی نہیں آیا اور میں نے پوری زندگی کو شیخ کے اشاروں پر تج دیا۔ اُن کے سامنے اپنی رائے کو ختم کر دیا اور اللہ کبھی ایسا وقت نہ لائے کہ مجھے وسوسہ آئے۔

باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں مگر کبھی کبھی کہی جاتی ہیں میں نے ابلیس سے کہا تھا "اس بات پر وقت ضائع نہ کرو کہ شیخ کے بارے میرے دل میں کوئی خیال پیدا کر سکو، میرے ساتھ کسی اور بات پر محنت کرو، اس معاملے میں نہ میرا وقت برباد کرو نہ اپنا"۔ اس دن کے بعد اس نے مجھے اس معاملے میں چھوڑ دیا۔

حضرت جیؒ کا مجاہدہ:

حضرتؒ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو تصوف کے قائلین میں سے نہ تھے بلکہ اس کی تردید فرمایا کرتے تھے لیکن جب اپنے شیخ سے ملاقات ہوئی تو اس کے قائل ہو گئے اور سمجھ آئی تو پھر سولہ برس وہاں سے نہیں اٹھے۔ سولہ برس حضرتؒ کے معمولات یہ تھے کہ تہجد کو اٹھتے، فجر تک لطائف کرتے، فجر پڑھ کر اشراق تک لطائف کرتے، چاشت کے بعد کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام فرماتے، پھر ظہر تک لطائف کرتے، پھر ظہر سے عصر تک، عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک لطائف کرتے اور پھر کھانا کھا کر سو جاتے۔ سولہ برس اسی طرح گزار دیئے اور تب وہاں سے اٹھے جب شیخ نے فرمایا کہ اب یہ نعمت لوگوں میں تقسیم کرو۔ منازل بھی ہوتے رہیں گے، اب اسے اللہ کی مخلوق تک پہنچاؤ۔

حضرتؒ کا ایک عجیب رنگ:

صوفیاء کرام کا عمومی طور پر یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ تعمیری پہلو اور مثبت پہلو پر تو سارا زور لگاتے ہیں تنقیدی پہلو کی طرف کم ہی توجہ فرماتے ہیں۔ صوفیاء میں یہ بھی ایک قدر مشترک ہے کہ عموماً اُن کی نگاہ ناقدانہ نہیں ہوا کرتی کہ وہ تنقید کرنا پسند نہیں کرتے۔

احقاقِ حق تو اُن کا مشن ہوتا ہے، ابطالِ باطل کی طرف کم ہی توجہ فرماتے ہیں۔ البتہ حضرتؒ کی عادتِ مبارک مختلف تھی۔ فرقۂ باطلہ کو ساری عمر آپؒ نے چیلنج کیا اور میدانِ مناظرہ میں ہمیشہ فاتح اور کامیاب رہے۔ آپ کے مطالعے کا اور آپ کے حافظے کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات ایک گھنٹے، سوا گھنٹے کی محفل میں ستر پچھتر، اسی اسی کتابوں کے حوالے ارشاد فرما دیا کرتے تھے۔ فرقۂ باطلہ کو چیلنج کرنے کیلئے نہ صرف اپنے عقائد، اپنے مسلک سے واقف ہونا ضروری ہے بلکہ جس کا رد آپ کرنا چاہتے ہیں، اس مذہب اور اس مذہب کی کمزوریوں سے کما حقہٗ واقفیت ضروری ہوتی ہے اور اس کیلئے بڑا وسیع مطالعہ اور بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت جیؒ سے رب جلیل نے یہ دو کام بیک وقت لئے اور بڑے عجیب کام ہیں کہ مناظر بھی ہو اور صوفی بھی۔

حضرت جیؒ کا مقام

اگر اللہ چشمِ بصیرت وا کر دے اور مشاہدہ نصیب ہو تو مسجدِ نبوی ﷺ کی مجلس میں خلفاءِ راشدینؓ جلوہ افروز ہوتے ہیں، ان کے پیچھے چار سیٹیں اور ہوتی ہیں جن پر خیر القرون کے بعد سے قیامت تک آنے والے لوگوں میں سے چار ایسے منتخب افراد ہوں گے، جو ان کرسیوں پر بیٹھے ہوں گے، کوئی پانچواں ان کا ہمسر نہیں ہوگا، حضرتؒ ان چار میں سے ایک تھے۔

حضرت جیؒ تصوف کا روشن مینار

اللہ کریم نے حضرتؒ کو تصوف کے وہ منازل اور مقامات عطا فرمائے جو تاریخِ تصوف میں پہلے کبھی سننے میں نہیں آئے تھے۔ ان منازل کا ملنا تو درکنار، ان کا پہلے کسی نے تذکرہ ہی نہیں کیا۔ یہ انہی بلندیوں کا صدقہ ہے، یہ وہی قوت ہے کہ میں یا

صاحب مجاز کسی کو توجہ دیتا ہے تو اس کے لطائف روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ کمال ہمارا نہیں، ہمارے وجود میں یہ برقِ تپاں، یہ بجلی کہیں اور سے آرہی ہے۔ وہ تار جو بلب روشن کرتی ہے، اس میں بجلی پیدا نہیں ہوتی، وہ بجلی گھر سے ہی آتی ہے، البتہ وہ تار ہی بلب تک بجلی کی قوت پہنچانے کا واحد سبب ہوتی ہے۔ تار کا کمال صرف اتنا ہے کہ اس کا دوسرا سرا کسی پاور ہاؤس سے جڑا ہوا ہے اور تار روشنی پھیلانے کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا اس پر مجھے یا کسی صاحب مجاز کو اکڑنا نہیں چاہئے کہ یہ روشنی ہماری وجہ سے ہو رہی ہے۔ یہ اُس کا احسان ہے، وہ کسی کو بھی اس کا سبب بنا سکتا تھا، اس نے ہمیں بنا دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم پہلوں سے زیادہ بڑے عالم ہیں یا ہم نے اُن سے زیادہ نیک ہیں یا اُن سے زیادہ قربانیاں دی ہیں ایسا کچھ بھی نہیں۔ یہ اس عہد کی ضرورت ہے، اس دور میں ظلمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اللہ نے دوسری طرف روشنیاں بڑھا دی ہیں۔

حضرت جیؒ شہبازِ طریقت:

حضرتؒ نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک، سارے کے سارے اسی (۸۰) برس راہِ حق میں گزارے اور لوگوں کو، ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر حق پہ چلانے کی کوشش فرمائی۔ اُس زمانے کے ساتھی موجود ہیں، انہیں یاد ہوگا کہ کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ وہاں یہ کہہ دے کہ جی مجھے یہ تکلیف ہے، وہ تعویذ دے دو، یہ کام کر دو۔ بلکہ ہم ترسا کرتے تھے کہ حضرتؒ کی زیارت نصیب ہو جائے یا چند لمحے ساتھ بیٹھنا نصیب ہو جائے، دنیا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ شہنشاہِ طریقت تھے، دنیا سے پردہ فرما گئے اور بات نااہلوں کے ہاتھ میں آگئی، میرے جیسے لوگ ان کے جانشین بن گئے۔ شائد مجھ میں ہی کوئی کمی ہو کہ جو بھی آتا ہے، سب کے ساتھ دنیا کی آلائشیں لگی ہوئی ہیں۔ میری بچی بیمار ہے، تعویذ دے دو۔ میرا بیٹا بیمار ہے، تعویذ دے دو۔ میرا فلاں کام رک گیا ہے۔ یار! سارا

سال تو تعویذ ہی لیتے رہتے ہو، ایک دن تو کبھی اللہ کے لئے بھی آجاؤ۔

ربع صدی کا تجربہ

الحمدللہ! مجھے ربع صدی تک حضرتؒ کی رفاقت نصیب رہی۔ میرا ربع صدی کا یہ تجربہ ہے کہ زندگی آزمائش ہے، آزمائشوں کا نام ہے۔ صحت بیماری، مالی تنگی و فراخی، خاندانی مصائب، ان سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔ حالات کبھی ایسے ہو جاتے کہ حضرتؒ سے گزارش کرنا پڑتی کہ حضرت جی! یہ مصیبت تو بہت بڑھ گئی ہے، دعا کر دیجیے۔ تو ربع صدی میں کبھی حضرتؒ نے بات سن کر جواب نہیں دیا، نہ کوئی دعائیہ جملہ، نہ کوئی استفہامیہ جملہ، نہ یہ پوچھا مزید بات کیا ہے۔ بات سن کر خاموش ہو جاتے تھے۔ خاموشی سے سنتے تھے اور خاموش ہی رہتے تھے۔ چھوٹا سا جملہ ہے، بندہ کہہ دیتا ہے کہ اللہ خیر کرے گا، ٹھیک ہو جائے گا، شفا ہو جائے گی، دعا کریں گے، کچھ بھی نہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد وہ تکلیف نہیں رہا کرتی تھی اور وہ کام ہو جاتا تھا جو اس وقت حضرتؒ کے گوش گزار کیا جاتا تھا۔

ایک اور عجیب بات ہے، یہ بھی میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب تک اس مصیبت میں مبتلا رکھنا اللہ کو منظور ہوتا تھا، موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ حضرتؒ سے بات کریں، خیال ہی نہیں آتا تھا کہ خط ہی لکھ دیں۔ یہ تو اس کا اپنا نظام ہے اور جب اسے ختم کرنا مقصود ہوتا تھا تو توفیق دے دیتا تھا، خط لکھنے کی یا بات کرنے کی۔ یہ دو باتیں بڑی عجیب ہیں اور یقینی۔ اگر یہ عالم ایک ولی اللہ کا ہے تو بارگاہِ رسالت پناہ ﷺ کا کیا عالم ہوگا؟

لیکن اگر خدانخواستہ تکلیف باقی بھی رہتی تو بھی حضرتؒ کا دامن تھامنے کی شرط یہ تو نہیں تھی کہ تکلیفیں دور ہوں گی۔ شرط صرف یہ تھی کہ جو کرمِ الٰہی کا اور برکاتِ نبوی ﷺ کا ایک ناپیدا کنار سمندر اُن کے دل میں ٹھاٹیں مار رہا ہے، کوئی قطرہ اس سے ہمیں بھی نصیب

ہو جائے۔ رفاقت کا مقصد بھی یہ ہوتا تھا اور اب بھی یہی ہے۔ اب بھی جو برکات آپ تک پہنچتی ہیں، مجھ تک پہنچتی ہیں، ہمیں ان ہی کے قلبِ منور سے نصیب ہوتی ہیں۔

حضرتؒ کی کرامت:

جنہیں ہیرے چاہیے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ سنگریزے چنتے ہیں، انہی میں سے کوئی ہیرا نکل آتا ہے۔ ہیرے راستے میں پڑے ہوئے نہیں ملتے۔ میری تو دعا ہے کہ ربِ جلیل ہر ساتھی کو ہیرا بنائے جو حضرتؒ چاہتے تھے۔

یاد رکھیں! یہ کسی کی قربانیاں ہیں جن کے طفیل آپ کو اللہ اللہ نصیب ہے۔ کسی کی محنت ہے جس کے سہارے پر آپ جاگ رہے ہیں۔ یہ کسی کی دی ہوئی طلب ہے جس کے سہارے آپ مانگ رہے ہیں۔ یہ کسی نے آپ کو دامن عطا کر دیا ہے جسے آپ پھیلائے ہوئے ہیں۔ نہ مجھ میں یہ طلب تھی، نہ آپ میں یہ آرزو تھی۔ میں تو شائد سب سے گیا گزرا آدمی تھا، مجھے تو اس راستے کی خبر ہی نہیں تھی بلکہ میرا تو اس طرف آنا، میرے جاننے والے لوگ حضرتؒ کی بہت بڑی کرامت سمجھتے تھے کہ اِس شخص کو بھی اللہ اللہ پر لگا دیا۔

یہ مجھ پر اللہ کا بڑا احسان ہے، میں ایک نہایت خودسر، بے راہ رو اور فرعون صفت شخص تھا، وہ مجھے اپنی راہ پر لے آیا۔ یہ اُس کا احسان ہے کہ اُس نے مجھے ایسا شیخ عطا کیا جس نے مجھے فرعونیت کے خول سے نکال دیا۔ شائد میں نیک نہ ہو سکا، پارسا نہ بن سکا، عالم نہ بن سکا لیکن مجھے اپنے بارے کوئی غلط فہمی نہ رہی کہ میں بھی کچھ ہوں۔

اگر کوئی ذاکر بھی ہے، اگر کوئی ولی اللہ بھی ہے، اگر کوئی صاحبِ کشف بھی ہے تو بڑے کم خوش نصیب ہوں گے جو اپنی بڑائی کے جال سے نکل جائیں۔ بعض اوقات کثرتِ عبادت اپنی بڑائی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ چور، ڈاکو تو ہوتا ہی خدائی کا دعویدار ہے، بدکار کو تو اپنی ذات پر فخر ہوتا ہی ہے، حسرت اُن لوگوں پر آتی ہے جنہیں عبادت بھی کبریائی

کا سبق دے کہ "تو بہت بڑا آدمی ہے"۔

اس بندے کا کمال دیکھو جو مجھے مسجد میں لے آیا:

کیسے کیسے عجیب لوگ تھے، میں نہیں سمجھتا کہ مجھ سے بھی زیادہ کوئی بندہ اِس زمانے میں دین سے دُور رہا ہوگا۔ میں بالکل دوسری صف کا آدمی تھا، جس کے پاس سے بھی دین نہیں گزرا تھا۔ کتنے عجیب لوگ تھے کہ میرے جیسے بندے کو پکڑ کر یہاں بٹھا دیا اور اِس قابل بنا دیا کہ میں لوگوں کو دین سکھاتا پھروں۔ ایک ایسا بندہ جسے دین سے مَس ہی نہیں، دین سے چڑ ہو۔ ایک ایسا بندہ جس کی ساری توانائیاں دین کے خلاف صرف ہوتی ہوں۔ اس میں وہ شعور، وہ استعداد پیدا کر دی کہ وہ ایک جہان کو دین سکھائے اور جاپان سے افریقہ تک لوگ اللہ اللہ کرنا شروع کر دیں۔ کیا یہ آسان کام ہے؟ میں کسی کی بات نہیں کرتا، میرا اپنا وجود زندہ مثال ہے۔ میں خود کو جانتا ہوں، آپ نہیں جانتے۔ آپ لوگوں نے مجھے اللہ اللہ کرتے دیکھا، آپ لوگوں کو کیا خبر، میں کون تھا۔ آپ لوگوں کی ملاقات تو میرے ساتھ محراب و منبر پر ہوئی، یہ تو وہ لوگ جانتے ہیں جو مسجد سے باہر مجھے جانتے تھے۔ آپ نے تو مجھے مسجد میں دیکھا لیکن اُس بندے کا کمال دیکھو جو مجھے مسجد میں لے آیا۔

جس نے ہمیں تراشا اس نے بہت مشکل کام کیا

ہماری کوئی حیثیت نہیں، ہمارے پاس سب کچھ مستعار ہے، سب کچھ مانگا ہوا ہے۔ ہم کیا ہیں؟ میں تو اس شعبے کا آدمی نہیں تھا۔ میرا باپ مولوی، نہ دادا مولوی۔ باپ پیر، نہ دادا پیر۔ نہ ہم نے کبھی پیری مریدی کا تماشا دیکھا۔ ہم تو کاشتکار لوگ ہیں، کسی سے دوستی ہوئی تو اس پر نچھاور ہو گئے، کسی سے بگڑ گئے تو اس کا سر پھوڑ دیا۔ ہمیں تو اس بات کا کوئی شعور ہی نہیں تھا، ہم تو جانتے بھی نہیں تھے کہ محبت کیا ہوتی ہے، وفا کسے کہتے ہیں؟ ہم جس ماحول کا حصہ تھے، اِس میں فرعون تو بنتے ہیں، موسیٰؑ نہیں ملتا۔ جس معاشرے کا اور

معاشرے کے جس طبقے کا حصہ میں ہوں، یہ الگ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ نرم مزاج لوگ نہیں ہوتے، ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے، یہ محبتوں سے، الفتوں سے، وفاؤں سے آشنا نہیں ہوتے۔

ہماری آنکھوں میں پانی لانے والا کون تھا، ہمارے دِل کو درد آشنا کس نے کیا؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس نے ہمیں تراشا، اس نے بہت مشکل کام کیا۔ کہاں منبر رسالت ﷺ، کہاں محراب و مسجد، کہاں اللہ کی کتاب، کہاں برکاتِ محمد رسول اللہ ﷺ اور کہاں ہم جیسے جاہل، گنوار!

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی　　مرا با جانِ جان ہمراز کردی

ہمیں تو کسی نے پہاڑوں سے اٹھا کر، جنگلوں سے اٹھا کر، ویرانوں سے اٹھا کر اس بارگاہ میں پہنچا دیا، جہاں فرشتے بھی جھجک کر جاتے ہیں۔ اب ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟..... یہی کہ ہم اُس بارگاہ سے کتنی وفا کرتے ہیں۔

اللہ کرے اس قید سے کبھی آزادی نہ ملے!

میں نے پہلی دفعہ جب بات سنی تو بڑی حیرت ہوئی۔ حضرتؒ کمال عجیب آدمی تھے، حیرت کی بات تھی، منبر پر بیٹھ کر تقریر فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں، یار! اگر کسی کو بارگاہِ نبوی ﷺ کی حاضری کا شوق ہو تو میرے پاس آجائے، پیٹ بھر کے کھائے، آرام کرے، بیشک موج کرے لیکن میں اللہ اللہ کراؤں گا، وہ کرتا رہے، یہ میرا کام ہے کہ میں اسے نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرادوں۔

حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ کھدر پوش دیہاتی، ایک سادہ سا آدمی، پورے سے قد کاٹھ کا، گندمی رنگ کا، عام دیہات کا رہنے والا۔ بڑی سے بڑی بات ہے مولوی ہوگا، عالم ہوگا، بہت بڑی بات ہے مناظر ہوگا، لیکن یہ کیا کہہ رہا ہے؟ لیکن دل

نے گواہی دی کہ جو کہہ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے۔ کوئی شخص اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ایسی دعوت جھوٹی دی ہی نہیں جاسکتی۔ یہ جھوٹ بولا جاسکتا ہے کہ آؤ میں تمہیں وزیر بنوادوں گا، یہ جھوٹ بولا جاسکتا ہے کہ میں تمہیں وزیر اعظم بنوادوں گا، یہ جھوٹ بولا جاسکتا ہے کہ میں تمہیں بہت عالی شان مکان دے دوں گا لیکن یہ جھوٹ نہیں بولا جاسکتا کہ میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا دوں گا۔ یہ آسان بات نہیں ہے۔ حضرتؒ نے ایسے فرمائی جیسے عام روٹین کا جملہ ہوتا ہے۔ اس بیان کی، اس جملے کی جو سادگی تھی، اس میں جو صداقت تھی، اس نے مجھے اسیر کیا اور اللہ کا احسان ہے کہ عمر اسی قید میں بسر ہوئی۔ یہ اس کا کرم ہے، ہم کہاں اس قابل تھے۔

میں تو مولویوں کو سننے جایا ہی نہیں کرتا تھا۔ میرا مزاج ایسا تھا کہ میں مولوی کی بات سننے نہیں جاتا تھا۔ وہاں بھی اس لئے گئے کہ وہاں مناظرے کا ایک رنگ بنا ہوا تھا، شیعہ سنّی فساد تھا، سُنّیوں کی حمایت میں چلے گئے۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ سنّی کیا ہوتے ہیں، شیعہ کیا ہوتے ہیں؟ یہ پتہ تھا کہ ہماری پارٹی سنیوں کے ساتھ ہے، بس ڈنڈے لے کر جاؤ، کوئی شیعہ شرارت کرے تو سر پھوڑ دیں گے، اس کے علاوہ تو ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔

لیکن اس ایک جملے نے ایسا قید کیا کہ عمر بیت گئی اور اگر اللہ اس عمر کو لاکھوں گنا بڑھادے تو اللہ کرے اس قید سے کبھی آزاد نہ ہوں اور انہی کے قدموں سے اللہ حشر کے دن اٹھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ہم ایسے لوگ کب تھے؟

میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں ایک عام دیہاتی ہوں، ہمارے خاندان میں کوئی پیر نہیں تھا۔ میرے والد فوجی تھے، میرے دادا فوجی تھے، میرے چچا فوجی تھے، میرے نانا فوجی تھے۔ ہمارے دو ہی کام تھے، کاشتکاری، زمینداری، بھیڑ بکریاں پالتے یا فوج میں

ملازم ہو جاتے۔ کوئی پیری فقیری سے ہمیں تعلق نہیں تھا اور پیری لینے حضرتؒ کی خدمت میں آئے بھی نہیں تھے۔ حضرتؒ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایک دو سالوں، مہینوں میں کچھ لوگوں نے حضرت جیؒ کو بڑا پریشان کیا کہ ہمیں جاں نشین بنا دیں یا ایک دوسرے کی سفارشیں کرتے تھے تو ایک دن حضرتؒ دولت کدے سے سرحد کی طرف جا رہے تھے، میں گاڑی چلا رہا تھا اور وہ ساتھ بیٹھے تھے تو مجھے کہنے لگے، ان فوجیوں نے بڑا تنگ کر رکھا ہے کہ مجھے خلیفہ بنا دو، اس کو بنا دو، تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا، حضرت! میں خطا کار آدمی ہوں۔ بنیادی طور پر کاشتکار ہوں، پھر فوج میں گیا، کاروبار میں لگ گیا، کول مائننگ (coal mining) میں لگ گیا۔ اللہ کا احسان ہے، کاشتکاری بھی ہے، بزنس بھی ہے۔ آپ کی خدمت میں آیا تھا اپنی اصلاح کے لئے۔ وہ ہوئی یا نہیں ہوئی، یہ الگ بات ہے، یہ تسلی ہے کہ آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ کی بارگاہ سے بہت ملا اور پچیس برس بیت گئے آپ کی خدمت میں۔ میں پیر بننے کے لئے حاضر نہیں ہوا تھا اور نہ خلافت کے لئے۔ آپ جس کو بھی خلیفہ بنائیں گے، میں جس طرح آپ کی خدمت کرتا رہا ہوں، اسی طرح احباب کی، سلسلے کی، آپ کے نامزد کردہ جان نشین کی خدمت کرتا رہوں گا، اس سے زیادہ مجھے کچھ پتہ نہیں، آپ نے جس کسی کو بھی بنائیں، از کم میرے گلے میں یہ مصیبت نہ ڈالیے گا۔

بات ختم ہو گئی۔ کچھ مہینوں بعد لنگر مخدوم کا اجتماع ہوا حضرت جیؒ نے سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا۔ مجھے نہیں پتہ، میں اس کا اہل ہوں بھی کہ نہیں لیکن مجھے یہ پتہ ہے کہ میرے لئے اس خدمت کو بجالانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، میری مجبوری ہے۔ میں اس میں پھنس گیا ہوں، اب مجھے یہ کرنا ہے۔

ہم زمیندار لوگ مزاجاً فرعون ہوتے ہیں، ویسے تو ہر بندے کے اندر ایک چھوٹا

موٹا فرعون بیٹھا ہے لیکن زمینداروں کے اندر ایک بڑا تگڑا فرعون ہوتا ہے۔ مجھے پتہ ہے، ہم مزارع یا غریب کی خلافِ مزاج بات بھی سننا نہیں چاہتے، اگر وہ وضاحت بھی کرنا چاہے تو ہم خفا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہہ دے کہ یہ کام اس طرح کرنا ہے تو اس پر بھی اسے مار پڑتی ہے۔ ایک بڑا تگڑا فرعون ہوتا ہے زمینداروں میں اور اللہ اسے چار پیسے بھی دے دے، اس کے پاس دولت بھی ہو تو یہ خدا بن جاتے ہیں۔ آپ دیکھ لیں پورے ملک میں، انہی لوگوں نے مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ کارخانہ داروں نے اور زمینداروں نے پورے بیس کروڑ لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ مجھے اس مصیبت سے نکال کر اللہ نے اپنی یاد کی توفیق بخشی، اپنے بندوں کے ساتھ بیٹھنے کی توفیق بخشی اور عجز و نیاز عطا فرمایا ایک عام آدمی بھی آجائے تو آؤ بھگت کرتے ہیں۔ بھائی آئے ہو، تشریف رکھو، پانی پیو، چائے پیو"۔ ہم ایسے لوگ کب تھے، ہم تو کسی کو گھسنے نہیں دیتے تھے۔ یہ اس کا احسان ہے اور یہ مجبوری ہے کہ ہم سے اس کے بارے پوچھا جائے گا۔

مشائخ سے اجازت:

میں نے حضرتؒ سے گزارش کی تھی کہ مجھے آپ، جیسا میں ہوں ویسا رہنے دیں، مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ ڈالیں، جن کو شوق ہے انہیں دیں لیکن یہ اللہ کریم کی مرضی، مشائخ بالا کی مرضی، انہوں نے سلسلے کی ساری ذمہ داری میرے سر ڈال دی۔ لیکن کوئی ایک معمول، کوئی ایک ذکر ایسا نہیں ہے، جو میں نے حضرتؒ کی اجازت کے بغیر کرایا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ذمہ دار میں ہوں، الحمدللہ! سلسلے کی ساری ذمہ داری، ساری اجازت مجھے دے دی گئی ہے لیکن اس کے باوجود آج تک کوئی ایک ذکر الحمدللہ ایسا نہیں ہے جس میں پہلے حضرتؒ سے اجازت نہ لی ہو اور حاضری نہ دی ہو۔ اس کی کیا ضرورت ہے، یہ دوسرا بندہ نہیں سمجھ سکتا۔ ایک تعلق یا محبت جسے کہتے ہیں، اس کا ایک اپنا مطالبہ، ایک اپنا تقاضا ہوتا ہے۔ تو

محبت بندے کو نہ ہونے کے برابر کر دیتی ہے اور بندہ محبوب کے اشاروں پر ناچتا رہتا ہے۔

اللہ کریم کا احسان:

یہ اللہ کریم کا بہت احسان ہے، اس کا کرم ہے کہ اس نے حضرت جیؒ کی جوتیوں میں پہنچا دیا، ورنہ ہم نہ معلوم کس ویرانے میں تباہ ہو گئے ہوتے۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں کوئی خوبی نہ تھی، اگر سلیکشن ہوتی اور اچھے لوگوں کو چنا جاتا تو اس میں میں نہیں آتا تھا لیکن اس کی رحمت ہماری سوچ سے وسیع تر ہے۔ جب اللہ کا اتنا بڑا احسان ہوا ہے تو پھر ہماری بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اس نعمت کو آگے پہنچائیں۔ الحمدللہ! اس نے ایک بات کی توفیق دی ہوئی ہے کہ ہم یکسو ہو کر اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے، یہ اللہ کے دست قدرت میں ہے اور توفیقِ عمل بھی اسی کے پاس ہے۔

دنیا میں بعض باتیں عجیب ہوتی ہیں۔ بالکل ان پڑھ لوگ ہوں تو ان میں سے کسی کو پہلا قاعدہ بھی آتا ہو تو وہ عالم بنا ہوا ہوتا ہے، اندھوں میں کانا راجہ ہوتا ہے۔ اس عہد کی برائی اور بدکاری نے ہمیں بھی نیک بنا دیا، ہم بھی نیک نظر آتے ہیں۔ اگر نیکوں کی صف میں کھڑا کیا جائے تو شاید ہماری جگہ بدکاروں میں بھی نہ آئے لیکن یہ اللہ کریم کا احسان ہے، اس نے توازن قائم کرنے کے لئے اس نعمت کو عام کرنا تھا۔

ہم سے زیادہ پڑھے لکھے، ہم سے زیادہ خوب صورت، ہم سے زیادہ دانا، ہم سے زیادہ پرہیزگار لوگ اس دنیا میں موجود ہیں۔ اللہ کے انتخاب کا اپنا طریقہ ہے، اس نے ہم پر کرم فرمایا اور ہمیں یہ نعمت عطا کر دی۔ تو اگر چھ (۶) ارب کی آبادی میں اس نے گنتی کے لوگوں کو یہ دولت بخشی ہے اور اس میں اتنی برکات رکھی ہیں کہ وہ ان دونوں پلڑوں کو برابر رکھے ہوئے ہے تو پھر اس پر کتنا شکر ادا کیا جائے۔ یہ میرا اور آپ کا کمال نہیں، اس کا اپنا نظام ہے، یہ اس کی اپنی عطا ہے، وہ جسے چاہے اس جگہ پہ لگا دے۔ معمار کے لئے تو

ساری اینٹیں ایک جیسی ہوتی ہیں، کسی کو توڑ کے لگاتا ہے، کسی کو کاٹ چھانٹ کر لگاتا ہے، کسی کو کھانے کے کمرے میں لگاتا ہے اور کسی کو باتھ روم میں لگا دیتا ہے، یہ اس کی اپنی تقسیم ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم کسی پر احسان نہیں کرتے، ہماری مجبوری ہے، ہماری نوکری ہے، ہم نے کرنی ہے۔ جو آئے گا اسے بتانا بھی ہے، سمجھانا بھی ہے، توجہ بھی دینی ہے اور ہمیشہ اس کیلئے دعا بھی کرنی ہے۔ اب وہ کیا کرتا ہے، اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، معاملہ ہر ایک کا اللہ کے ساتھ ہے۔ بات اچھے برے کی نہیں ہے، بات اس نعمت کی ہے جو اللہ نے اپنے کرم سے، اپنے نیک بندوں کے طفیل، میری ذمہ داری بنا دی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں، الحمدللہ، پاکستان نہیں، برصغیر انڈو پاک میں کہیں کوئی شخص سات لطائف کرا سکتا ہو تو مجھے بھی بتائیے گا، میں اس شخص کی زیارت کرنا باعث ثواب سمجھوں گا، اس عہد میں یہ چیز عنقا ہو گئی ہے۔

مجھ پر اللہ کریم کا احسان ہے کہ زندگی کے پچیس سال حضرتؒ کی خدمت میں گزار دیئے اور پچیس سالوں میں کبھی یہ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی کہ حضور! آپ کہاں جا رہے ہیں؟۔ فرمایا، چلو بھئی! چلنا ہے۔ "چلیے جی چلتے ہیں"۔ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہاں کتنے دن رہنا ہے؟ الحمدللہ زندگی میں کسی مجبوری نے روکنے کی جرأت نہیں کی، میں بھی سرکاری ملازم تھا اور انہوں نے مجھے معطل کر دیا۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں، ادھر سے معطل نہیں ہونا چاہئے، تم کر دو تو تمہارے ساتھ مقدمہ لڑ لوں گا، دیکھ لیں گے، کیا ہوتا ہے؟ کاروبار شروع کر دیا۔ ۱۹۶۴ء میں سکول کی ملازمت چھوڑ دی۔ ملازمت میں نے اس لئے چھوڑ دی کہ الحمدللہ حضرت جیؒ کی صحبت اور شفقت کی وجہ سے میں نے سمجھا کہ بزنس، کول مائننگ اور کاشتکاری کی مصروفیات کی وجہ سے ملازمت کا کام دیانتداری سے

نہیں کرسکتا۔ دوستوں نے کہا، پنشن ملے گی، یہ ہوگا۔ میں نے کہا، پنشن تو جو زندہ رہے گا، اسے ملے گی، میرے پاس تو گارنٹی نہیں ہے کہ پنشن کھانے کے لئے زندہ رہوں گا۔ میں تو بزنس کروں گا، اللہ مجھے یہیں سے روزی دیتا رہے گا، مجھے ملازمت قید نہیں کر سکتی۔ ملازمت میں گنتی کی تنخواہ ملتی تھی، اس کے بعد اللہ نے بے شمار، بے حساب دیا۔ مگر یہ مزاج کی، خلوص کی، دل کی باتیں ہوتی ہیں۔ الحمدللہ، اللہ نے مجھے اتنا دیا کہ میں ان دنوں سے آج تک حکومت کا انکم ٹیکس ادا کرنے والا شخص ہوں۔ میرے ساتھ جن لوگوں کے کاروبار تھے ان کے دو دو کروڑ کے اسلام آباد میں گھر ہیں۔ میں نے بھی بے حساب کمایا، مجھ پر اللہ کا اتنا بڑا احسان ہے لیکن میں نے تب سے آج تک الحمدللہ اپنا پیسہ بھی جماعت کا ہی سمجھا، الگ نہیں۔

حضرتؒ جہاں تشریف لے جاتے، مجھے یہ شرف حاصل تھا کہ میں ہی ہم رکاب ہوتا۔ میری ہی گاڑی ہوتی، میں ہی ڈرائیور ہوتا، میرا ہی اسلحہ ہوتا اور میں ہی گارڈ ہوتا۔ میرے گھر والے جماعت کے لئے خود کھانا بناتے، میں نوکروں سے نہیں اٹھوایا کرتا تھا۔ خود بڑے سے ٹوکرے میں ڈال کر درمیان میں دیگچہ یا ہنڈیا رکھ کر سر پہ اٹھا کر لاتا تھا۔ اس وقت کے کئی ساتھی اب بھی موجود ہیں۔ پھر دارالعرفان کی بنیاد پڑی تو یہ بھی اللہ نے مجھے سعادت بخشی۔ یہ ساری زمین میری تھی، میں نے اللہ کی راہ میں دارالعرفان کو دی اور اس پر الحمدللہ کوئی پیسہ نہیں لیا۔

اللہ کا مجھ پر احسان ہے، بے شمار لوگوں سے زیادہ آسودہ حال ہوں۔ پہلے میں اکیلا کماتا تھا، اب میرے ساتھ پانچ بیٹے بھی شامل ہیں۔ میں اپنا کام آج بھی اتنا ہی کرتا ہوں جتنا پہلے کرتا تھا حالانکہ بچے مجھے منع کرتے ہیں لیکن نہیں، جب تک میں زندہ ہوں، زندہ آدمی مُردے کی طرح کیسے بن سکتا ہے؟ کما کر کھانے کی لذت ہی اور

ہے، لطف ہی اور ہے اور کما کر کھلانے کا مزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کما کے مخلوق کھائے۔ میرے پاس اللہ کی ایک مخلوق پلتی ہے، کوئی ٹریکٹروں پر ملازم ہے، کوئی جانوروں کو پالنے کے لئے ملازم ہے، کوئی زمینوں پر، تو کوئی کانوں پر۔

عزیزانِ من! مجھے اپنے لئے کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ نہ آپ مجھے کچھ دے سکتے ہیں، نہ میں آپ کو کچھ دے سکتا ہوں اس لئے کہ ہم سب محتاج ہیں، ہم سب مانگنے والے ہیں، دینے والا صرف وہ ہے۔ ملنے کی امید بھی ہمیں صرف اسی سے رکھنی چاہئے۔ مجھے اس نے جو دیا ہے، میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے مجھے بری طلب سے بے پناہ زیادہ دیا ہے۔ اس نے کچھ بھی مانگنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس نے اتنا دیا ہے، اتنا دیا ہے کہ اپنے حال پہ شرمندگی ہوتی ہے کہ میں اس قابل نہ تھا، مزید کیا مانگا جائے۔

دولت دنیا بھی مل گئی:

حضرتؒ مجھ پہ اعتماد فرمایا کرتے تھے، ان کا یہ بہت کرم تھا مجھ پر۔ ایک دفعہ حضرتؒ کو کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی۔ آپؒ نے مجھے لکھ دیا۔ اچھا بھلا بزنس تھا، میرے پاس پیسے ہوتے تھے لیکن کاروبار میں یہ ہوتا ہے کہ آپ ایک دفعہ لگا دیتے ہیں، اگلے دن آپ مقروض ہیں۔ کہیں دو لاکھ کی payment کرنی ہے تو پاس ڈیڑھ لاکھ ہے تو اور کہیں سے ایک لاکھ ادھار لے کر کرنی پڑتی ہے۔ تو یہ کاروبار اسی طرح چلتا ہے۔

حسنِ اتفاق یہ کہ جب میرے پاس خط آیا میرے پاس اس وقت پیسے نہیں تھے بلکہ میں ضرورت میں تھا، بھئی اب کیا کیا جائے، ہاں تو ضرورت ہے۔ میں نے اپنا ڈرائیور اور اپنی گاڑی پنڈی کسی شوروم پر بھجوائی کہ جو بھی قیمت دیں، اس کو بیچ دینا، پیسے نقد ملنے چاہئیں۔ ڈرائیور سے کہا، جو پیسے ملیں وہ حضرت جیؒ کو دے آنا۔ اب حضرتؒ نے یہ نہیں لکھا تھا کہ کتنے پیسے مجھے چاہئیں، پوچھنے کی جرأت میں نے نہیں کی۔ میرا خیال ہے اس

زمانے میں وہ گاڑی چھبیس ہزار کی بکی، حالانکہ تیس بتیس ہزار کی ہوگی۔ ڈرائیور نے پیسے لئے اور حضرتؒ کی خدمت میں چلا گیا۔ حضرتؒ کا مزاج تھا، خوش ہوئے، پیسے اس سے لئے، چائے وائے پلائی۔ اسے کہا کہ بھئی گاڑی کہیں دھوپ میں تو نہیں کھڑی کر دی؟ اب اسے بتانا پڑا کہ جی گاڑی بیچ کر پیسے لایا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ سن کر حضرتؒ خاموش ہو گئے۔ مجھے چٹھی لکھی کہ مجھے تو اتنے پیسے نہیں چاہیں تھے۔ مجھے تو دس بارہ ہزار روپے کی ضرورت تھی، نہیں تھے تو مجھے بتا دیتے، میں یہیں کہیں سے انتظام کر لیتا، تم نے گاڑی کیوں بیچی؟" "نہ میں نے کہا دعا فرمایئے، نہ حضرتؒ نے فرمایا "اور ملیں گی"۔ اس دن سے لے کر آج تک میرے پاس اگر کم گاڑیاں بھی ہوں تو تین چار ضرور ہوتی ہیں، اس کے بعد سے میرے پاس کبھی ایک گاڑی نہیں رہی، میرے پاس گاڑیوں کا فلیٹ (fleet) ہوتا ہے، کوئی چلاؤں، نہ چلاؤں گھر پہ کھڑی رہتی ہیں۔

میں یہ بڑائی کے لئے نہیں کہہ رہا، سمجھانے کے لئے کہہ رہا ہوں کہ ان معاملات میں ضروریات اور خواہشات آڑے آئیں تو کام نہیں ہوتا۔ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو پہلے اپنی ضروریات اور خواہشات کو فتح کر لیتے ہیں۔

اللہ خدمت قبول کرے:

اللہ کریم کا ہم پر احسان ہے۔ ہم حکومت سے مانگتے ہیں نہ ہی عام لوگوں سے چندہ مانگتے ہیں۔ الحمدللہ کبھی جماعت نے نہ چندہ کیا ہے نہ مانگا ہے اور نہ ان شاء اللہ مانگیں گے۔ ہم اپنی محنت سے کماتے ہیں اور اللہ جو توفیق دیتا ہے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ کریم کرم کرتا ہے، ساری ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ الحمدللہ! کسی حکومت سے آج تک کوئی گرانٹ اور کوئی پیسہ، اللہ کا شکر ہے، نہیں لیا اور نہ آئندہ لینے کا اللہ موقع لائے۔ یہ سب احباب کی قربانیاں ہیں اور وہ اپنے رزقِ حلال سے بتوفیقِ الٰہی دیتے رہتے

ہیں۔

معمولات کی ابتداء

میں جب لطائف کرتا تو دو گھنٹے شام کو اور چار گھنٹے سحری کو باقاعدہ کرتا تھا اور لطائف کے مقامات پر ایسے لگتا تھا جیسے سینے میں کسی نے سلاخیں گاڑ دی ہوں، نیچے جھک کر کوئی چیز اٹھانا ممکن نہیں ہوتا تھا، درد ہوتا تھا، پتہ لگتا تھا جیسے کوئی نیزے کا پھل ہے اندر۔ عام معمول جو تھا اس میں، میں نے گھڑی سے منٹوں کی سوئی نکال دی تھی کہ ہم گھنٹوں کا حساب کیا کریں، گھنٹے گنیں گے۔ فجر کا معمول کم از کم چار گھنٹے ہوتا تھا، تہجد سے لے کر فجر تک چار گھنٹے صرف لطائف ہوتے تھے، مراقبات تو اس وقت تھے نہیں۔ سردیوں کی راتوں میں سونے سے پہلے گڑ کا شربت پیا کرتے تھے، رات کی روٹی، گڑ کا شربت بنا کر اس سے کھاتے تھے۔ لطائف کی حدت سے پیٹ سے خون آنے لگتا اور منہ اندر سے اُبل جاتا، منہ میں چھالے ہو جاتے تھے، زخم بن جاتے تھے اور ہمیشہ اپنے ساتھ پھٹکری رکھتے تھے اور پانی میں پھٹکری گھول کر اس سے غرارے کرتے تھے، اسپغول پھانک کر گڑ کا شربت پیا کرتے تھے تاکہ معدے کو تقویت رہے۔ یہ سب لطائف کی مشقت کے باعث تھا۔ تو یہ دیوانوں کا کام ہے، پاگلوں کا کام ہے اس راہ پر لگے تو لگ گئے اور لگے رہے لیکن اس سب کی قیمت شیخ کی ایک نگاہ کے سامنے رائی برابر بھی نہ تھی، شیخ کی ایک نگاہ ہمارے لئے زیادہ قیمتی ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ آپ کو بتانے کا مقصد یہ نہیں کہ میں کوئی اہم انسان ہوں بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ کام بہت اہم ہے۔

حضرتؒ نے میرے سامنے بار بار فرمایا کہ دیکھو یہ میرے اختیار میں نہیں، اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس کو (یعنی مجھے) سب سے پہلے مراقبات کرواتا۔ میں اس کے ساتھ سارا زور لگاتا ہوں، یہ لطائف سے آگے ہی نہیں جاتا۔ اور لوگ جو آتے

ہیں جنہیں میں ضروری نہیں فریضہ سمجھ کر توجہ دوں، انہیں فنا بقاء تک مراقبات ہو جاتے ہیں۔ شائد وہ جو برسوں لطائف پہ لگے، انہوں نے ایک ایسی بنیاد رکھ دی کہ اس پہ اتنی عمارت کھڑی ہوگئی لیکن یہ بات تو اب سمجھ آتی ہے۔ وہ جنہیں ہفتوں میں نصیب ہوا، وہ اسے سوچ بھی نہیں سکتے، جو کچھ مجھے نصیب ہوا۔ یہ اس کی اپنی تقسیم ہے۔

آؤ تمہارے دلوں میں چراغاں کردوں!

زندگی کا ٹیڑھا میڑھا راستہ پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ نشیب و فراز سے پُر اور سینکڑوں خطرناک موڑوں والا راستہ۔ اللہ! کتنا تھکا دینے والا راستہ، حیرت ہے ہم کیسے گزر گئے؟۔ کتنے دوستوں نے، کتنے عزیزوں نے ہمارے ساتھ سفرِ حیات اختیار کیا مگر اب وہ ہمارے اردگرد نہیں ہیں، راستے کے پیچ وخم میں کھو گئے۔ یہ جانے والے کیا ہوئے؟ کتنے پیارے، کتنے محبوب تھے ہمیں۔ اب اُن کی مٹی کیوں ہماری آہٹ کو ترس گئی ہے؟ اُن کی قبریں ہماری بے رخی پر خاک بسر کیوں ہیں، آخر کیوں؟ کبھی سوچا آپ نے!۔ یہ موت، یہ بے چارگی کی موت، یہ بیکسی کی موت، اللہ کریم ایسی موت سے پناہ میں رکھے، آمین۔ میں یہ موت نہیں مرنا چاہتا، اسی لئے تو آپ کو آواز دے رہا ہوں۔ میرے پاس ایک دولت ہے، ایک نعمت ہے، بہت ہی کمیاب، اگر نایاب کہہ لو تو بھی حرج نہیں، ایک ایسی دولت جو قابلِ انتقال ہے اور نا قابلِ فراموش بھی۔

میں نے ایک سورج کو سرِ مقتل پایا تھا۔ اس کی گرمی، اس کا رقصِ بسمل اسی راہ پر، ہاں یقیناً اسی راستے پر جس کی تاریکی اور سخت موڑوں نے ہجومِ خلق کو تھکا دیا ہے، راہِ حیات کی ایک طویل مسافت بھی، ربع صدی کا یہ سارا راستہ ان کی گردِ پا میں کٹا۔ کمال ہے گرد میں تو اندھیرا ہوتا ہے، دُھندلا پن ہوتا ہے، مگر یہ تو روشن روشن تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور میٹھی میٹھی روشنی۔ راستہ روشن، آنکھیں روشن، دل روشن اور ماحول روشن۔ ایک کسک، ایک

میٹھا میٹھا درد لئے ہوئے، ایک سوز اور تپش جس میں جلنا مزہ دے رہا ہے۔ ایک ایسا منبعِ انوار جس نے روشنی اور گرمی ہی نہیں دی، سوزِ عشق بانٹا ہے، محبت لٹائی ہے اور جذبوں کے دریا بہا دیئے، حسین اور قیمتی جذبے۔ میں بھی ایک ڈھیر تھا مٹی کا، سرِ راہ پڑا تھا، مرورِ زمانہ کا روندا ہوا، کچلا ہوا کہ ایک مسافر کا گزر ہوا، اُس کا پاؤں مجھ پر پڑا اور پھر۔۔۔۔ چھوٹ نہ سکا۔ ایک لذت، ایک لطف، ایک رنگ، ایک حسن تھا جو اُس کے پاؤں کی گرد بننے میں ملا اور ہم اسی راہ کا غبار ہو گئے۔

آنے والو! ہم تو جانے کی تیاری میں ہیں، اگر فرصت پاؤ تو آؤ تمہیں بھی سرِ مقتل لیے چلیں، قتلِ خورشید کا نظارہ کرلو۔ تمہیں ڈھنگ سکھا دیں تو اس کی کرنیں سمیٹ لو۔ میٹھا میٹھا درد، خوبصورت سی کسک اور ایک پر لطف بے چینی نہ دے دوں تمہیں!!! کہ یہ امانت ہے میرے پاس۔ موت کی تاریکی مجھے نگل نہ سکے گی ان شاء اللہ، اسی راستے میں، روشنی کی ایک لکیر ہی سہی، مگر رہیں گے ضرور تا اَبد۔

ربع صدی تو میں نے خورشید کی تپش جھیلی تب جا کر ایک چراغ سا بنا، پتہ نہیں تم کچھ بن بھی پاؤ گے یا نہیں۔ آؤ! تمہارے دِل میں چراغاں کردوں، تمہارے دل میں جلوس نکلیں جذبوں کے، محبتوں کے، عشق کے۔ چھوڑو یار! نقل کو چھوڑو، آؤ! سچ مچ کی روشنیاں جلائیں اور اس منبعِ انوار کی طرف بڑھیں، جہاں سے سورج کا ایک جہان سے طلوع ہوتا ہے۔

لُوٹ سیل:

میرے بھائی! اللہ کا احسان ہے، پچاس برس بیت گئے اس دشت میں بھاگتے دوڑتے، چلتے پھرتے، جھانکتے عمر گزر گئی، بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ رب جلیل نے اس بندے کو کیا کچھ دیا تھا۔ مزے کی بات ہے کہ ایک دیا سلائی جو اس شخص نے ہاتھ میں تھمائی

تھی، اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں اس بندے پر، ہم نے اسے جاپان سے لے کر کے مغربی ساحلوں تک جلایا۔ مزے کی بات ہے اس تپش میں مزید تیزی آتی گئی، اس میں کہیں کوئی کمی نہیں آئی۔ اب وہ شعلۂ تپاں جس کی ایک تار ہمارے ہاتھ میں ہے۔ جو پاور generate ہو رہی ہے، وہ تو پاور ہاؤس میں ہے۔ ہمارے ہاتھ میں تو اس کی ایک تار ہے کہ ہم نے آپ کو بھی لگا دی، اس کو بھی لگا دی، اس کے بھی لگا دی، اس کے بھی لگا دی۔

میں نے چین سے افریقہ تک کا سفر کیا، میں نے جاپان سے امریکہ کے مغربی ساحلوں تک جہاں دنیا اُس طرف بھی ختم ہو جاتی ہے، دنیا اُس طرف بھی ختم ہو جاتی ہے، ساری دنیا گھومی اور دنیا کا جو بندہ سامنے آیا، اس کا قد کاٹھ، رنگ، شکل، علم، عقل کچھ نہیں پوچھا۔ صرف یہ پوچھا، یار! تمہیں بھی یہ نعمت دے دیں۔ جس نے ہاں کر دی، ہم نے دے دی۔ مزے کی بات ہے، وہیں نورِ نبوت ﷺ کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ بھئی! کسی کا رنگ دیکھتے، کسی کا قد دیکھتے، کسی کا خشوع خضوع دیکھتے، کسی کا علم دیکھتے، کسی کا ورع تقویٰ دیکھتے، کچھ بھی نہیں دیکھا۔ جو سامنے آ گیا۔۔۔ ''بھئی چاہئے''؟ لے لو!۔۔۔ جس نے ہاں کر دی، اس کی جھولی بھر دی۔ اب اللہ جانے، پیچھے کتنی طاقت ہے، اللہ کے اس بندے کو، اللہ کے حبیب ﷺ کا کتنا قرب میسر ہے یا اُسے لٹانے کے لئے اللہ نے کتنا دیا، یا اسے کتنا بڑا دل گردہ دیا، کوئی بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی اور نہ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ جتنا ہو سکتا ہے، یہاں سے لوٹو۔ اس کے ضابطے، اس کے آداب، اس کے قواعد یہ ہیں کہ دونوں ہاتھوں پہ نظر رکھو، دامن چھٹنے نہ پائے، دامن پھٹنے بھی نہ پائے اور دامن ہٹنے بھی نہ پائے۔ یہ سوچوں کے دائرے، بے شمار شکلوں میں شیطانی تفکرات، آخر ایک اس بات پر ہی کیوں زور دیتے ہیں کہ ایسا نہ کرو۔ ہم دنیا میں کتنا

کچھ کرتے ہیں، کوئی نہیں روکتا، بزنس کرتے ہیں، کاشتکاری کرتے ہیں، نوکری کرتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ یار! اس کی مرضی، کرنے دو۔ لیکن جب اِس طرف آتے ہیں تو بڑے ناصح پیدا ہو جاتے ہیں۔ اصل میں یہ خود مخالف نہیں ہوتے، اصل تکلیف شیطان کو ہوتی ہے کہ کسی کے دل میں وہ نورِ نبوت ﷺ نہ آ جائے۔ جو بھی شیطان کی بات سنتا ہے، شیطان اس کے پیچھے لگا تار رہتا ہے، تم روکو، تم روکو، تم منع کرو۔ کسی کے بھائی کو، کسی کی بیوی کو، کسی کے دوست کو، کسی کے پیچھے کسی بزعمِ خود دانش ور کو، کسی کے پیچھے واعظ کو، جو قابو آتا جائے وہ پیچھے لگا دیتا ہے۔

یار! سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسی ملا، اسی واعظ، اسی بیوی، اسی بھائی کے سامنے ہم کیا کیا کرتے رہتے ہیں، تو یہ کہتا ہے، خیر ہے یار، گزارا کرو، جیسا کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔ تو پھر آخر اللہ اللہ کرنے سے کیا مصیبت آ گئی، کیا برائی ہو گئی کہ اتنے ناصح اکٹھے ہو گئے سمجھانے کے لئے۔ اس مخالفت سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بڑی ہی قیمتی شے ہے۔ کتنا جلاپا پیدا کر دیتی ہے کفر کے ماحول میں اور پوری شیطنت کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ میں آپ سے جنت کی حوروں کا وعدہ نہیں کرتا لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس حربے سے شیطان چوں چوں کرتا رہے گا، کم از کم اسے تو بھگائے پھرو یار!

تحفے تحائف

تمام احباب سے درخواست ہے کہ جن لوگوں کو ذکر کرانے کی اجازت دی جاتی ہے یا امیر بنا دیا جاتا ہے یا صاحبِ مجاز بنا دیا جاتا ہے، ان کو تحفوں کی مارمت دیں۔ انہیں خلوص کے ساتھ اپنا کام کرنے دیں۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، اللہ کریم نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ میں محنت کر کے بہت سے لوگوں سے زیادہ کماتا ہوں۔ سارا دن مزدوری کرتا ہوں،

الحمدللہ۔ اللہ کریم نے مجھے مضبوط مالی وسائل دے رکھے ہیں۔ میرے پاس اللہ کی دی ہوئی وسیع زمین ہے، کوئلے کی کانیں ہیں، پٹرول پمپ ہیں، اچھی گاڑیاں ہیں، اچھے مکان ہیں، تو بجائے مجھے تحفے دینے کے دارالعرفان کو فنڈز دیں۔ جب سے لوڈ شیڈنگ شروع ہوئی ہے، جنریٹر کے چلنے پر کم وبیش نوے ہزار سے زیادہ ڈیزل کا خرچ ماہانہ ہے۔ کبھی کسی نے شکایت سنی، بجلی کے بل اس کے علاوہ ہیں۔ میری اپنی ذاتی کوشش ہوتی ہے کہ احباب جتنا سلسلے پر خرچ کرتے ہیں، اللہ توفیق دے تو اس سے زیادہ میں اپنا خرچ کروں۔ سارا سال جانور ہم اس لئے رکھتے ہیں کہ جب اجتماع ہوگا تو اس میں ذبح کریں گے، اس طرح غلہ رکھ دیتے ہیں، بیچتے نہیں کہ احباب آئیں گے تو اجتماع پہ خرچ ہو جائے گا۔ ان سب اخراجات کی توفیق اللہ نے دے رکھی ہے اور اللہ کریم کام چلا رہا ہے تو چل رہا ہے۔

توجہ دینے سے خود شیخ پر اثرات

اُس وقت ہم چار، پانچ ساتھی ہوتے تھے، جماعت کی ابتداء ہو رہی تھی۔ حضرتؒ کے ساتھ مغرب سے عشاء تک ذکر ہوا۔ عشاء کی نماز میں تھوڑا وقت تھا۔ حضرتؒ فرمانے لگے یار! آج بہت بوجھ پڑا اور بہت تکلیف ہوئی، پتہ نہیں کیا مصیبت تھی، آج ذکر کرایا تو سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ بات ہوئی، ختم ہوگئی۔ حضرتؒ نے نماز پڑھائی۔ آپؒ اندر تشریف لے گئے تو ساتھی کہنے لگے آج ہماری ایک مقدمے میں پیشی تھی اور شہر گئے ہوئے تھے، آج دوپہر کا کھانا ہوٹلوں سے کھایا اس لئے حضرت شکایت کر رہے ہیں کہ آج بہت بوجھ پڑا، آج بہت تکلیف ہوئی۔ نحوست اُن پر تھی، ہوٹلوں کا کھانا انہوں نے کھایا، عدالتوں میں وہ پھرتے رہے اور صفائی کرتے وقت بوجھ شیخ پر پڑ رہا تھا اور بندے تین چار تھے۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر روئے زمین پر ذاکرین کو ذکر کرایا جائے تو بندے کا کیا حشر ہوتا ہوگا۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے کہ آدمی کی سمجھ میں آجائے۔ یوں تو

نسبت اویسیہ میں کوئی جہاں بھی ہو، اُسے توجہ نصیب ہو جاتی ہے لیکن اب اللہ نے ظاہری اسباب (Internet کے) بھی بنا دیئے ہیں کہ اُن سے بات بھی ہو جائے، لطائف بھی تبدیل کرائے جائیں، مراقبات بھی کرائے جائیں۔ جو لوگ، دس، پندرہ، بیس بندوں کو ذکر کراتے ہیں ان کو پتہ ہوگا کہ بدن کی حالت کیا ہوتی ہے اور کتنا بوجھ پڑتا ہے۔ اور جو شخص روزانہ دو بار بین الاقوامی سطح پر (انٹرنیٹ کے ذریعے) ذکر کرائے، اس کا حال کیا ہوتا ہوگا؟ بظاہر بندہ سلامت رہتا ہے لیکن اس کی ہڈیوں کا چُورا بن جاتا ہے، وجود کے پرخچے اڑ جاتے ہیں، اعصاب تباہ ہو جاتے ہیں، ایک ایک پٹھہ سارنگی کے تار کی طرح بجتا ہے۔ وجود تو وہی خاکی ہی ہے ناں، وہی رگ وریشہ ہے اس میں بھی۔

بھلے زمانے میں بھی مشائخ مرید کو گوشہ نشین کر کے توجہ دیتے تھے کہ اس کا دل صاف رہے، باہر کی نحوست اس پر نہ آئے، کسی سے ملے نہیں، کسی سے بات نہ کرے۔ لیکن یہاں اللہ کا احسان ہے کہ احباب سے کہا جاتا ہے کہ عین سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق اپنی نارمل زندگی بھرپور طریقے سے گزاریں۔ کاروبار کریں، اپنا کام کریں، معاشرے میں رہیں، اپنا گھر سنبھالیں، ساری نارمل لائف گزاریں اور اس کے ساتھ اللہ اللہ بھی کریں۔

ان سب حالات میں توجہ دینا اتنا آسان کام نہیں۔ شیخ بھی انسان ہوتا ہے، اسے بھی گھر سے پیار ہوتا ہے، بیوی بچوں سے پیار ہوتا ہے۔ اس کی ضروریات بھی ہوتی ہیں، لوگوں کی شادیوں میں، دکھوں، غموں، خوشیوں میں اسے بھی شریک ہونا پڑتا ہے، لیکن جب وہ اس جگہ پر آتا ہے تو جیسے مر چکا ہوتا ہے۔ لوگ تو الگ رہ گئے، بچوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کی فرصت نہیں ملتی۔ میں نے اپنی بچیوں کی شادیاں کیں اور ولیمے میں نہیں جا سکا، اس لئے کہ اپنے لئے وقت بچتا ہی نہیں۔ قریبی عزیز فوت ہو جاتے ہیں اور بچے فاتحہ پڑھ آتے ہیں، میرے پاس فرصت نہیں ہوتی۔ چوبیس گھنٹوں میں اپنے لئے چوبیس منٹ

نہیں بچتے۔ بچوں سے ملاقات تب ہوتی ہے جب وہ یہاں آتے ہیں۔ کیا یہ آسان کام ہے؟ آپ چند دن نکال کر آتے ہیں تو کتنے کام آگے پیچھے کرنے پڑتے ہیں۔ آخر میں بھی تو ایک مشت غبار ہوں، عمر کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ بیشک میں جتنی ہمت بھی کرتا رہوں لیکن عمر کے اعتبار سے وجود میں قوتِ برداشت، اس کی استعداد، اس کی طاقت آہستہ آہستہ پہلے ہی نہیں رہتی۔ الحمد للہ! نصف صدی بیت گئی، یہ سلسلہ جاری ہے اور جب تک دَم میں دَم ہے، اللہ اسے جاری رکھے، بلکہ یہ سلسلے موت کے بعد بھی مرتے نہیں ان شاء اللہ ابد الآباد جاری رہتے ہیں۔ اللہ کریم حق پر خاتمہ کرے اور ایمان کے ساتھ رخصت کرے۔ آمین ثم آمین۔

میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ نعمت نصیب فرمائی اور وہ دولت عطا فرمائی جس کا وہ مطالبہ کرتا ہے "موتو قبل انت موتو" موت سے پہلے مر کر دکھاؤ۔ یہ اللہ کا احسان ہے مجھ پر کہ میں برزخ میں جانے سے پہلے برزخ کی زندگی جی رہا ہوں اور یہ سب آپ لوگوں کے لئے اور صرف آپ لوگوں کے لئے ہے۔ اب یہ آپ کی ہمت ہے کہ اس سے آپ کتنا استفادہ کرتے ہیں، کتنی برکات حاصل کرتے ہیں، کتنا ورد حاصل کرتے ہیں۔ آپ کو کتنی محبتیں ملتی ہیں، کتنی کیفیات نصیب ہوتی ہیں؟

راہِ سلوک میں ہمارے پاس بھی ساری دولت حضرتؒ سے وفا کی ہے اور آپ کے پاس بھی ساری دولت اپنے شیخ سے وفا کی ہے۔ یہ بہت سمجھنے کی بات ہے اور اسے جاننا صوفی کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس میں میری ذات کی کوئی اہمیت نہیں، اہمیت ان کیفیات اور برکات کی ہے جو بارگاہِ رسالت ﷺ سے نصیب ہوتی ہیں اور ان ذرائع کی حفاظت ان کے حصول کے لئے ضروری ہے۔

ذکر کی برکت سے استعدادِ کار بڑھ جاتی ہے

جتنا کام صوفی اور ذاکر کرتا ہے، غیر ذاکر اتنا کام نہیں کر سکتا، ذکر سے استعدادِ کار بڑھ جاتی ہے۔ الحمد للہ! میں نے پچیس برس تصوف سیکھا اور پچیس برس مجھے سکھاتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی دیہاتی کاشتکار نے میرے مقابلے میں کاشتکاری کر لی ہو، آج بھی میرے جتنی محنت عام آدمی نہیں کر سکتا۔ میں نے ۱۹۴۷ء میں گاڑی چلانا سیکھی، آج بھی اپنی گاڑی خود چلا رہا ہوں۔ مشکل ترین راستوں سے گزرا ہوں، میں آج بھی ٹریکٹر چلاتا ہوں، آج بھی اپنے کھلیان پہ ہاتھوں سے فصل صاف کرتا ہوں، کول مائننگ کا کام کرتا ہوں، آج بھی ٹی وی سے لے کر اخبارات تک بیانات کرتا اور لکھتا ہوں۔ میری تصنیفات بیشمار ہیں اور آج تک الحمد للہ کسی تقریر، کسی تحریر، کسی کتاب پر ایک پیسہ نہیں لیا، کوئی رائلٹی نہیں ہے۔ میری کیسٹ، سی ڈی کی رائلٹی کا مجھے کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الشعراء:180) میرا معاوضہ میرے رب کے پاس ہے۔ یہ تصوف ہے کہ محنت انسانیت کے لئے، اللہ کی مخلوق کے لئے کرے اور اجر کی امید اللہ سے رکھے۔ ہم امریکہ سے نہیں، اللہ سے لیتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ صوفی بیکار لوگ ہوتے ہیں، ایک دن میرے ساتھ گزار کر دیکھ لیں، میں دیکھوں کہ ان میں کتنی استعدادِ کار ہے۔ تصوف یہی ہے کہ فرد کی استعدادِ کار بڑھ جاتی ہے۔

میں کوئی رواجی پیر نہیں ہوں

میرے بھائی! یہ کوئی رسم نہیں ہے۔ میں کوئی رواجی پیر نہیں ہوں، کوئی رسمی پیر نہیں ہوں، آپ سے بڑا نہیں ہوں، کوئی مافوق الفطرت انسان نہیں ہوں۔ بارگاہِ عالی ﷺ کا ایک غلام ہوں۔ جس ہستی نے مجھے کوئی ذرہ درد کا دیا تھا، اس نے بانٹنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیلِ ارشاد میں لگا ہوا ہوں، اس سے زیادہ میرا کسی کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

بارگاہ نبوی ﷺ میں حضوری

الحمدللہ! مجھے کم وبیش نصف صدی سے بارگاہِ نبوی ﷺ کی حاضری نصیب ہے۔ اللہ نے مجھے ہزاروں لوگوں کا وسیلہ بنایا اور ہزاروں لوگوں کو فنافی الرسول ﷺ اور روحانی بیعت نصیب ہوئی۔ اس نصف صدی کے بعد اس اجتماع کے آخر میں جس انداز سے میں نے جمالِ نبوی ﷺ کو دیکھا، یہ مجھ پر اب منکشف ہوا۔ معلوم نہیں کتنا ہزارواں جلوہ ہو گا، شائد قیامت تک زندگی نصیب ہو جائے تو نصف صدیوں، صدیوں کے بعد ایک ایک کر کے نئے سے نیا پہلو سامنے آتا جائے گا۔ روضہ اطہر ﷺ میں حضوری کو کم وبیش نصف صدی ہونے کو ہے لیکن جو جمال اب سمجھ میں آیا، نصف صدی میں وہ سمجھ نہیں آیا۔ بے شمار سمجھا لیکن پھر کسی گوشے سے تھوڑا سا نقاب اور سرکا دیا، اس کی کوئی انتہا نہیں ہے، کوئی حد نہیں ہے اور یہ نصیب ہو تو پتہ چلتا ہے۔

میں منبر پر بیٹھا ہوں، میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تفصیلات اگر میں آپ کو بتاؤں تو آپ کہیں گے، یہ پاگل ہو گیا ہے۔ عقلِ انسانی اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

عجیب مشاہدہ:

الحمدللہ! حضرتؒ کی جوتیوں میں عمر گزر گئی اور آپؒ کی رفاقت میں، مشاہدات اور مکاشفات اور برزخ کے اتنے واقعات سامنے آئے، اتنے واقعات سنے، اتنے واقعات کا تجربہ ہوا کہ میں خود گننا چاہوں تو بھی گنے نہیں جا سکتے۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو دلوں میں، دماغ میں ثبت ہو جاتے ہیں اور بڑے عجیب عجیب واقعات، اچھے درجات والے لوگوں کے بھی اور عذاب میں مبتلا لوگوں کے بھی دیکھے۔ برزخ میں عذاب میں مبتلا لوگوں کی نجات ہوتے بھی دیکھی اور برزخ میں لوگوں کو مراقبات اور فنافی الرسول ﷺ نصیب ہوتے بھی دیکھا۔ زندگی ایک عجائبات کا مجموعہ ہے۔ زندگی میں، میں نے ایک بات جو

دیکھی، کبھی نہیں دیکھی۔

ایک بہت بڑے معروف پیر صاحب فوت ہوئے۔ مجھے کوئی اُن سے غرض نہیں تھی اور نہ کوئی اس بات کی فکر تھی کہ وہ کیا ہیں کیا نہیں ہیں، بس نام سنا ہوا تھا۔ ان کی ایک تصنیف کسی نے مجھے دی جو تصوف پہ تھی، میں نے جستہ جستہ دیکھی۔ کچھ باتیں انہوں نے صحیح نہیں لکھیں۔ تو مجھے کھٹکا جیسے شاید وہ صاحب تصوف سے آشنا ہی نہ ہوں۔ تو یہاں ذکر سے فارغ ہو کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ان سے پوچھ لیا جائے۔ میری بھی ساری عمر اسی دشت میں گزری ہے، میں نے زندگی میں ایسا عذاب کسی پر نہیں دیکھا۔ ایک عجیب کیفیت دیکھی کہ ان کی برزخ میں جو رہائش گاہ ہے، اس میں ایک طرف پورا شیشہ لگا ہوا ہے سخت قسم کا، بہت چمک دار آئینہ ہے اور دوزخ سے آگ کی جو لو آتی ہے وہ اس آئینے پر پڑتی ہے اور اس سے منعکس ہو کر اس شخص پر پڑتی ہے۔ آپ پر سورج کی تپش پڑ رہی ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن آپ محدب شیشہ لے کر اسے ہاتھ پر رکھ کر اس طرح دیکھیں تو آگ لگ جائے گی۔ یہ آگ کا شعلہ تو پہلے ہی دوزخ سے آ رہا ہے، پھر وہ اس شیشے پر پڑتا ہے اور مرتکز ہو کر آتا ہے، اِس طرح اُس شخص پر پڑتا ہے۔ اُس نے روپ ولی اللہ کا بنایا، صوفی بنا، لوگوں کو تصوف کی دعوت دے کر گمراہ کرتا رہا۔ لیکن ابھی کہاں، ابھی تو برزخ میں ہے، یہ تو آگے جائے گا تو پتہ چلے گا۔

یاد رکھیں! نیکی کے لبادے میں برائی کرنے کا عذاب بہت ہی زیادہ سخت ہے۔

بارگاہِ رسالت ﷺ کا ادنیٰ خادم اور چپڑاسی:

یہ نہ سمجھو کہ میں جوشِ میں کہے جا رہا ہوں۔ مجھے خطابت کا شوق ہے نہ یہ محض خطابت کا جوش ہے۔ مجھے اپنی حیثیت کا سارا پتہ ہے کہ میں کیا ہوں اور میری حیثیت کیا ہے! میں جو بات کرتا ہوں، اس کی حیثیت یہ ہے کہ میں اُس بارگاہ کا ایک ادنیٰ خادم اور

چپڑاسی ہوں اور جس طرح چپڑاسی اندر کی بات باہر پہنچا دیتا ہے، اسی طرح آپ تک بات پہنچا دیتا ہوں۔ باقی معاملہ آپ کا، آپ کے رب کا اور آپ کے رسول ﷺ کا ہے۔ ہمارا کیا ہے، جو آئے تشریف لائے، کھانا کھائے، بیٹھے، اللہ اللہ کرے، چلا جائے لیکن فائدہ اُسی کو ہوگا جو اپنی ذات بنانے کے لئے نہیں، اپنے آپ کو اُن ﷺ پر لٹانے کیلئے آئے گا۔ میں چاہوں بھی تو میں کسی کو فائدہ نہیں دے سکتا اور سارا زور لگالوں تو کسی کا فائدہ روک نہیں سکتا جب تک وہ اپنا دامن خود نہ جھٹک دے۔

ہر لمحے کا حساب:

اس یقین سے زندہ رہو کہ تمہیں حشر میں ہر لمحے کا حساب دینا ہے اور اللہ کریم کے روبرو کھڑے ہو کر دینا ہے۔ یہ یقین ہو جائے تو یہ پیریاں فقیریاں بھی بے لذت ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ آپ کو اپنا اور اپنے ساتھ ایک اور بندے کا حساب دینا پڑے گا۔ میں جو یہاں منبر پر آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں، جتنے لوگ میرے ساتھ واسطہ اختیار کریں گے، جب تک سب کا حساب نہیں ہو جائے گا، میرا حساب نہیں ہوگا۔ مجھے وہیں کھڑا رہنا پڑے گا، مجھے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ میں نے ان کی تربیت میں کوتاہی نہیں کی، میں نے ان کو توجہ دینے میں کمی نہیں کی، میں نے ان کو ناجائز رقم لانے کا نہیں کہا، میں نے ان سے کوئی سرمایہ نہیں لوٹا، میں نے انہیں اپنی ذات کے لئے استعمال نہیں کیا۔ یہ ساری باتیں اس بارگاہ میں کھڑے ہو کر ایک ایک فرد کے ساتھ پیر صاحب کو ثابت کرنا ہوں گی۔ یہ یقین حاصل ہو جائے تو پھر پیری بے لذت ہو جاتی ہے اور یہ جو دھڑا دھڑ لوگ گھیر کر اور دھوکے سے بیعت میں پھنساتے ہیں اور ان سے شیرینیاں لے کر مزے اڑاتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں اس لمحے کا یقین نہیں ہے۔

ہم تو چاہتے ہیں کہ اللہ کرے نجات ہو جائے، عذابِ الٰہی سے بچ جائیں۔ اِس

زمانے میں زندہ رہ کر، آج کی غذا کھا کر، آج کے دور کے کاروبار کر کے، اِس عہد کے معاملات میں ملوث ہو کر، نجات پا جانے والے کو میں ولی اللہ سمجھتا ہوں۔ آج جو بندہ عمل کو چھوڑ دے، اس کا عمل اس کا رب جانے لیکن جو صحیح عقیدہ لے کر دنیا سے اُٹھ جائے، میں سمجھتا ہوں وہ ولی اللہ ہے۔

ہم عصر عموماً تنقید کرتے رہتے ہیں:

ایک عادت ہے زمانے اور زمانے والوں کی، دنیا اور دنیاداروں کی کہ جب کوئی عظیم ہستی اس دنیا سے اپنا کام ختم کر کے اللہ کے جوارِ رحمت میں چلی جاتی ہے تو پھر یہ آہستہ آہستہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جب پچاس، ساٹھ، سو سال گزر جائیں تو پھر اتنا شور ہوتا ہے، اتنے زور کی نعرہ بازی ہوتی ہے اور بے شمار لوگ اس کی تاریخ اور اس کے حالات اور اس کے واقعات لکھتے ہیں۔ عرس ہوتے ہیں، جلسے ہوتے ہیں اور اس ہستی کو بے پناہ شہرت کی بلندی پہ لے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں فائدہ حاصل کرنا نصیب نہیں ہوتا۔ کیا فائدہ ہوتا ہے اس سب میں بعد میں قائل ہونے کا کیا فائدہ؟ لیکن یہ انتظار کرتے ہیں کہ بندہ زیرِ زمین دفن ہو جائے، پھر اس پر لمبے لمبے مضمون لکھیں۔

حضرتؒ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ جتنے بھی نامور صوفی ہوئے ہیں جن کے نام کے لوگ آج وظیفے پڑھتے ہیں، جب وہ دنیا میں تھے تو انہیں شہروں سے نکال دیا گیا اور اُن کے لیے زندگی دوبھر کر دی گئی۔ حکمرانوں اور بادشاہوں سے شکایتیں کر کر کے انہیں شہر بدر کرا دیا جاتا تھا اور ان کے ملنے پر پابندیاں لگا دی جاتی تھیں۔ اُن کی بات تک سننے نہیں دی جاتی تھی۔

قربِ الٰہی کے راستے کی مشکلات

علماءِ حق فرماتے ہیں کہ قربِ الٰہی کے راستے میں مصیبتیں ہیں، مشکلات

ہیں، تکلیفیں ہیں۔ شیطان دشمن ہے، شیطان کے سارے چیلے دشمن ہو جاتے ہیں، جان کا خطرہ ہے۔ جسمانی ایذا، بدنامیوں کی گھاٹی، بیماریوں کے حملے، لیکن سب سے مشکل منزل وہ ہے جب لوگ اُن کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور تہمتیں لگاتے ہیں، الزام لگاتے ہیں۔ لیکن اللہ کے بندے جنہیں جمالِ الٰہی سامنے نظر آ رہا ہوتا ہے، وہ بھلا ان چیزوں کی کب پرواہ کرتے ہیں لیکن یہ باتیں صرف وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے دل درد آشنا ہوں۔

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ مراقبات میں آدمی ایسی جگہ چلا جاتا ہے، جہاں تکالیف اور مصیبت کا آنا اس کا ضروری حصہ ہوتا ہے جیسے شہید کیلئے قتل ہونا ضروری ہے شہادت ایک مقام ہے اس کو پانے کیلئے قتل ہونا ضروری ہے۔ اس طرح اہل اللہ کے بعض مراقبات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ یہ چیزیں وابستہ ہوتی ہیں، وہاں سے گزرنا ہوتا ہے، کسی میں صحت خراب ہوگی، کسی میں بیماری آئے گی، کسی میں دنیوی تکلیف آئے گی۔

اب بھلا جنہیں بارگاہِ نبوی ﷺ کی حضوری نصیب ہو، اُن پر کوئی طعن کرے، انہیں بدنام کرے، اُن پر الزام لگائے تو کیا وہ باز آ جائیں گے؟ انہیں کوئی روک لے گا؟ یہ تو اس راستے کی شرط ہے۔ مگر مسافر کو راستے کی کٹھنائیوں سے یا خاردار جھاڑیوں سے مطلب نہیں ہوتا، وہ اپنا دامن بچاتا ہوا جائے، دامن پھاڑتا ہوا جائے یا گلا کٹاتا ہوا، نظر محبوب کی بارگاہ پہ رکھتا ہے کہ میری منزل وہاں ہے۔

تفسیرِ قرآن۔ اسرار التنزیل:

اللہ کریم نے مجھ پر بڑا احسان فرمایا، مجھ پر بڑا کرم فرمایا، میں نے قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھی۔ حیران ہوتا ہوں، میں سوچ نہیں سکتا، میری سمجھ میں نہیں آتا میں نے کیسے لکھی۔ میں نے نہیں لکھی، مجھے میرے شیخ نے حکم دیا، تم لکھو، میں لکھنے لگ گیا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا میں نے شروع کر دی، رمضان ختم ہوا میں نے چھوڑ دی۔ شیخ کا وصال ہو

گیا، زمانہ بدل گیا، دنیا بدل گئی، رمضان المبارک آتا رہا میں لکھتا رہا۔ ہر جلد میں نے صرف رمضان شریف میں لکھی ہے۔ گیارہ مہینے میں تفسیر بیان کرتا، رمضان شریف آتا میں لکھنے بیٹھ جاتا۔ نہ مجھے کوئی حوالے دیکھنے پڑتے، نہ مجھے کوئی مطالعہ کرنا پڑتا، نہ کسی سے مشورہ کرتا، بس تفسیر لکھتا جاتا۔ کوئی عبارت میں نے کاٹ کر نہیں لکھی، کوئی مسودہ میں نے دوبارہ نہیں پڑھا۔ دنیا میں کوئی ایسی تحریر نہیں ملتی جس کی دوبارہ درستگی نہ کی جائے، ایک رمضان میں تفسیر نہ لکھی جا سکی، رمضان گزر گیا، میں نے سوچا، ایک جلد رہتی ہے، غیر رمضان میں لکھ لیتے ہیں۔ میں نے سارا زور لگایا، تفسیریں نکالیں، لائبریری کھنگال ماری، مطالعہ کیا، کوششیں کیں، صرف ایک صفحہ لکھ سکا۔ جب رمضان آیا، میں کاغذ لے کر لکھنے بیٹھا اور میں نے بیس دنوں میں تین سپاروں کی تفسیر لکھ لی۔

یقین تو مجھے پہلے بھی تھا لیکن پھر مزید پتہ چل گیا کہ میں نے نہیں لکھی، مجھے آلہ بنایا گیا۔ اللہ نے یہ کام لینا تھا، ہم تو ایک بہانہ بن گئے۔ نہ عالم تھے، نہ مفسر، مبلغ بھی نہیں، جمالِ ہم نشین ہے۔ اللہ یہ توفیق دے کہ اسے ہم سنبھالے رکھیں۔

میں کسی سے ناراض نہیں

کچھ دوستوں کا خیال ہوتا ہے کہ میں ان سے ناراض ہوں۔ وہ مجھے خط اور e.mail کے ذریعے پوچھتے رہتے ہیں۔ ایک بات یاد رکھیے! میں کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتا، اس لئے کہ ناراضگی کا مطلب ہے، کسی کیلئے دل میں کدورت کا آ جانا۔ جس طرح ایک استاد جماعت کو پڑھاتے ہوئے کسی کو کھڑا کر دیتا ہے، کسی کو بٹھا دیتا ہے، کسی کو کہتا ہے کہ دس مرتبہ لکھو، تو کیا یہ سب اس کی ناراضگی کے سبب ہوتا ہے؟ یہ ناراضگی نہیں، اس کی ذمہ داری ہے کہ جہاں جہاں ضروری سمجھے، اصلاح کرے۔ کہیں ڈانٹ کر، کہیں جھڑک کر، کہیں پیار سے، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ استاد کی فلاں سے دشمنی ہوگئی ہے۔

شیخ کے دل میں طالب کے لئے محبت نہ ہو تو طالب کو کچھ حاصل بھی نہیں ہو سکتا کہ محبت ہی وہ جذبہ ہے جو قلبی کیفیات کو دوسرے کے قلب تک پہنچاتا ہے۔ لہٰذا مخصوص حالات میں شیخ کو جھڑکنا پڑتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ ناراضگی نہیں ہوتی بلکہ میرے خیال میں اگر بندہ مخلص ہو اور ایک ڈانٹ پڑ جائے تو زندگی بھر کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

دوستوں کا شکوہ

میرے بھائی! اگر کوئی اس خیال سے محنت کرتا رہے کہ اللہ اللہ کرنے اور یہاں آنے سے اور ان لوگوں کے ملنے سے، میرے دنیا کے فلاں کام بھی ہو جائیں گے تو وہ شخص اس عظیم نعمت کی قدر کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ دوستوں کو شکوہ تو ہوگا کہ شائد میں ان کی دنیوی ضرورتوں کی باتیں نہیں سنتا، وہ یہ نہیں جانتے کہ میں آپ سب سے زیادہ ضرورت مند اور محتاج انسان ہوں اور میری ذاتی احتیاجات اتنی ہیں، شاید آپ میں سے کسی کی بھی نہ ہوں تو جو خود محتاج ہوگا وہ دوسروں کو کیا دے گا۔

اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے سارے دُکھ اس ذاتِ کریم کے سامنے بیان کریں جو سب کی سنتا ہے، سب کو دیتا ہے، اگر اس سلوک و تصوف کی آڑ میں کسی نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ تمہاری ضرورتوں کی کفالت کرنے والا میں ہوں، تو اس شخص میں اور فرعون و نمرود میں کوئی فرق نہیں۔ ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ میں، آپ اور ہم سب انسان برابر ہیں، اللہ کریم کے سامنے محتاج ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں آپ کے چندے پر اپنے بچوں کا پیٹ پالوں، مجھے اپنی مزدوری بھی کرنا ہوتی ہے اور میں اس سے دستکش نہیں ہو سکتا۔ جس دن میں مزدوری کے قابل نہ رہا، اس دن شاید میں آپ لوگوں سے ملنا چھوڑ دوں گا۔ اسی بات پر زندہ رہنا کہ مخلوق کے دینے سے انسان کا پیٹ بھرے، اس سے مر جانا بہتر ہے۔ آپ اپنی دنیوی ضروریات کے

لئے میری طرف رخ نہ کیا کریں بلکہ ساری حاجات کو رب العالمین کے سامنے پیش کریں۔ آپ اُسی سے بات کریں، ضرورت پوری ہو نہ ہو، اللہ سے بات کرنے کا مزہ آ جاتا ہے۔

ہمارا کام، ہماری ذمہ داری

ہر محقق اپنی تحقیق بتاتا ہے، ہر دانشور اپنی رائے دیتا ہے، ہر حکمران اپنی بات سوچتا ہے۔ ہم نہ محققین میں ہیں، نہ دانشوروں میں، نہ حکمرانوں میں، ہم تو اُس بارگاہ کے چوکیدار ہیں اور ہمارا چھوٹا سا کام ہے، محض اتنا سا کام ہے کہ عطاء وہاں سے ہوتی ہے، جو خواہش مند آئے اس تک وہ بات، وہ چیز، وہ کیفیت پہنچا دیں۔

تصوف تو دین کا عطر ہے۔ دین کی جان ہے، روح ہے جبکہ آپ لوگوں کی ہر بات دنیا کی ہوتی ہے، ہر جھگڑا دنیا کا ہی ہوتا ہے، کوئی دین کی بات ہی نہیں کرتا۔ کسی کی ساس بری ہے، کسی کا میاں بدمعاش ہے، کسی کی سسرال بُرا ہے، کسی کا صحت خراب، کسی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، کسی کی روزی کسی نے بند کر دی ہے، اب میں سوچ رہا ہوں کروں کیا؟ آپ سے ملنا چھوڑ دوں، میں نے پہلے ہی چھوڑ رکھا ہے۔ اس لئے نہیں ملتا کہ یہ میری پوجا نہ شروع کر دیں، مجھے نہ لے ڈوبیں، اس لئے نہیں ملتا کہ ان کا رخ میری طرف نہ ہو جائے۔

بھئی! ہم تو اس بارگاہ کے ایک نوکر ہیں اور ہماری ذمہ داری ہے کہ آپ کو ذکر کا طریقہ سکھائیں، بات کریں، بات سمجھائیں، آپ سے مٹھیاں بھروانا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ کی بارگاہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کی بارگاہ چھڑا کر آپ کو اپنا غلام بنانا، یہ تو گستاخی ہے، اس لئے میں آپ لوگوں سے الگ رہتا ہوں۔

میاں! اپنے آپ کو بدلو، کچھ نہیں رکھا اپنی بڑائی میں۔ نصف صدی بیت گئی مجھے

اِس راستے پر کبھی مجھ سے آپ نے کشف کی بات سنی؟ جن کو ایک توجہ دیتا ہوں، انہیں ہو جاتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے مجھے کشف نہیں ہوتا؟ میں نے تو کبھی مشاہدات بیان نہیں کیے، نہ لوگوں پر رعب ڈالنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ میں اپنے کشف بیان کروں اور لوگوں پر بڑا رعب پڑے گا کہ میں بڑا ہوں حالانکہ بعض انکشافات ایسے ہیں اور اتنے اہم ہیں اور اتنے ضروری ہیں جو آنے والے لوگوں کی رہنمائی کا سبب ہیں، میں وہ بھی بیان نہیں کرتا، لوگوں کی کمزوری کے ڈر سے، لکھ کر رکھ دیتا ہوں، میرے بعد کام آئیں گے۔ جبکہ آپ کو کبھی کوئی خاکہ نظر آ جائے تو اس پر ہی آپ بڑے آدمی بن جاتے ہیں، کتنے دلیر ہیں آپ۔

کام میں چھٹی نہیں:

الحمد للہ! ہمیں تو برسوں بیت گئے کام کرتے ہوئے، چھٹی کا تو ہمارے ہاں کوئی تصور ہی نہیں، روٹین ورک ہے۔ کام تو کرنے ہی ہیں اور سب کام کرنے ہیں۔ جب ہم کھانے کا ناغہ نہیں کرتے، سونے کا ناغہ نہیں کرتے، تو پھر کام چھوڑ کر چھٹی کا کیا تصور ہے؟ زندگی کا وقت ایسے ہی گزر جاتا ہے، بڑھاپا انسان کو بہت محدود کر دیتا ہے۔ فقط درمیانی عرصہ بچتا ہے، اس میں سے بھی آدھا وقت نیند کی نظر ہو جاتا ہے۔ پھر کام کا وقت بھی چھٹیوں میں ضائع کر دیا جائے تو بچے گا کیا؟

توازن

قدرت نے ہر چیز کو ایک توازن پر رکھا ہوا ہے۔ اگر ظاہری اور مادی دنیا کا ایک توازن ہے، تو باطنی دنیا کا، روحانیت کا اور حقیقت کا بھی ایک توازن ہے۔ توازن تو قدرت نے خود قائم رکھنا ہے۔ ہمارا اس میں کوئی کمال نہیں، یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں بھی اس میں شامل کر لیا۔ دونوں پلڑوں کا وزن تو اللہ نے خود برابر کرنا ہے، وہاں سونے کے

باٹ رکھ کر پورا کرے یا پھر سنگریزے پلڑے میں رکھ کر وزن پورا کرے تاکہ تباہی کی نوبت نہ آئے، تو اللہ کریم نے ہم پر احسان کیا اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم جیسے سنگریزوں کو اٹھا کر ایک پلڑے میں رکھ دیا۔ تو اللہ کے اس احسان کا احساس بندے کو بھی ہونا چاہیے اور اس کے عمل سے اس احساس کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔

میری آرزو، اپنے خالی دامن بھر لو!

میرے بھائی! میری گذارش یہ ہے کہ ان اجتماعات کو رسمی نہ سمجھو، وہ بات گئی جو حضرتؒ کے ساتھ تھی، کبھی شائد یہ بھی نہ رہے گی جو آج ہمارے ساتھ ہے۔ قانونِ فطرت ہے کہ دریا جوں جوں آگے چلتے ہیں تو اُس میں کمی آتی جاتی ہے، پھر جب کبھی اللہ کریم چاہتے ہیں کوئی نیا چشمہ نکال دیتے ہیں۔ اب وہ بات تو نہیں مل سکتی جو حضرتؒ کے عہد میں تھی۔ بہر حال اللہ کا احسان ہے کہ کچھ ہے۔ پھر ایک وقت آئے گا، یہ کچھ بھی نہیں ہوگا، اس سے کم ہوگا۔

یار! اجتماع مہینے میں ایک دن ہوتا ہے، اسے صرف یادِ الٰہی کے لئے کھرا کر کے لاؤ۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آ کے معتکف ہو جاؤ، معتکف بلا ضرورت کوئی جملہ نہیں کہتا، بلا ضرورت باہر قدم نہیں رکھتا۔ پورے مہینے میں سے یہ چوبیس گھنٹے لاتے ہو، معتکف ہو جاؤ۔ فون بند کر دو، خط پڑھنے بند کر دو، باتیں کرنا چھوڑ دو، یکسو ہو کے بیٹھ جاؤ، پھر دیکھو کیا ملتا ہے اور اگر بندے کا دامن ہی کٹا پھٹا ہو تو وہ کیا سمیٹے گا؟ یہ میں پورے خلوص سے آپ کی بھلائی کے لئے کہہ رہا ہوں۔ بندہ جس کام کو جائے اور وہ غرض پوری نہ ہو تو اس سفر کا کیا فائدہ؟

جائز اور حلال وسائل بھرپور طریقے سے اختیار کریں۔ محتاج مسلمان بن کر نہ رہیں، خود کو دوسروں کی مدد کرنے والا ثابت کریں۔ اس قابل بنیں کہ دوسروں کی مدد کر

سکیں۔ چندے جمع کر کے زندہ رہنا،، مانگ کر زندہ رہنا یہ اسلام نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

زندگی کی چند سانسیں۔ عجیب سودا

میرے بھائی! بظاہر تو زندگی چند سانسوں کا نام ہے۔ لیکن یہ چند سانسیں کتنا عجیب سودا ہے کہ عمل کرنے کے لئے تھوڑا سا وقت ہے اور اجر پانے کے لئے بے حساب زندگی ہے اور کتنا بد بخت ہے وہ بندہ کہ جو اِن چند سانسوں کو نافرمانی میں بسر کر کے ایک ابدی زندگی کو تباہ کر لے۔ اس میں کوئی ضرورت نہیں کسی پیر فقیر کی، کسی مولوی عالم کی، کسی بڑے چھوٹے کی، بس ایک اللہ کو پکارو، اپنے رب کو اپنا بنا لو، اللہ سے دعا کرو، وہ تمہیں محمد الرسول اللہ ﷺ کی ہر ادا سکھا دے گا۔ وہ اس پر عمل کرنے کی توفیق دے دے گا، علم کے ذرائع بتا دے گا، نیک لوگوں کی محفل میں پہنچا دے گا، اپنی یاد کی توفیق دے دے گا لیکن کوئی مانگے تو سہی، کوئی چاہے تو سہی يَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (الشوریٰ:13)

دو باتیں میری پلے باندھ لو:

۱۔ اگر دین کا کام کرنا ہے تو اس میں اپنی ضروریات اور خواہشات کو چھوڑ دو، جہاں حکم ملے، وہاں کام کرو اور پورے خلوص سے کرو۔ مشروط کام اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ یہ اللہ کا کام ہے، بارگاہِ نبوی ﷺ کا کام ہے اور انہیں کسی مشروط ملازم کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ محتاج نہیں ہے۔ شرائط اس وقت طے کی جاتی ہیں جب معاملہ آپس میں برابر والے کے ساتھ ہو۔

منت منہ کہ خدمت سلطان می کنی
منت ازو بداں کہ بخدمت گزاشتت

بادشاہ کی خدمت کر کے بادشاہ پر احسان نہ کر، احسان اس کا ہے کہ اس نے تجھے

اپنا نوکر قبول کیا ہے۔ بادشاہوں پہ احسان نہیں ہوتے، احسان بادشاہ کا ہوتا ہے کہ اپنی خدمت کے لئے کسی کو قبول کر لیا ہے۔

۲۔ دوسری بات یاد رکھ لو کبھی اپنی نیکی، بڑائی، اپنی بزرگی کے گھمنڈ میں مت آنا۔ یہ وہ دلدل ہے جس سے کسی کو سلامت باہر نکلتے ہم نے تو نہیں دیکھا۔ یہ سارے قاعدے یہاں آ کر الٹ جاتے ہیں۔ میرے بھائی! یہ بات پلے باندھ لو کہ دین کرشمہ سازی نہیں ہے۔ دین عملی زندگی کا نام ہے، عمل کرنے کا نام ہے۔ رزق حلال طریقے سے کمانے کا نام ہے، دوسروں کی خیرات پر پلنے کی بجائے محتاجوں کی مدد کرنے کا نام ہے۔

عملی زندگی میں تعلیم حاصل کرو، فنون حاصل کرو، سائنس سمجھو، ٹیکنالوجی سمجھو، بہتر سے بہتر شعبے کی تعلیم حاصل کرو۔ اللہ کی اطاعت کے لئے تمہارا سائنس پڑھنا بھی دین ہوگا اور اپنی بڑائی کیلئے پڑھو گے تو قرآن پڑھنا بھی منافقت ہوگا۔

اپنا محاسبہ ضرور کرو:

میری آپ سے گزارش ہے کہ ضرور اپنا محاسبہ کیجیے کہ یہاں آ کر کیا کھویا، کیا پایا۔ میں کیا تھا، مجھ میں کتنی تبدیلی آئی، آنی کتنی چاہئے تھی، توقع کیا تھی اور کتنی تبدیلی نصیب ہوئی؟ اگر کمی رہ گئی ہے تو پھر آؤ، پھر آؤ لیکن یاد رکھو! اس نعمت کو حاصل بھی کرو اور اس کو آگے بھی پہنچاؤ، اسے بانٹو بھی۔ دل ویران ہو چکے ہیں، دلوں میں سانپ لیٹے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کو کاٹ لینے کو جی چاہتا ہے اور یہ اس عہد کا افضل ترین جہاد ہے کہ مسلمانوں کو ان کی کھوئی ہوئی دولت نہ صرف یاد دلاؤ، بلکہ وہ دولت ان کے گھروں تک پہنچاؤ۔ جب یہ برکاتِ نبوت ﷺ عام ہوں گی، یہ دلوں کو سیراب کریں گی، دلوں میں محبت پیدا ہو گی تو جور و ستم مٹے گا، ظلمت مٹے گی اور روشنی آئے گی۔ اس بات پہ نہ رہو کہ میں تو بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہوں، اللہ خود بڑا ہے اور اس کے سامنے کوئی بڑا نہیں۔

میرے بھائی! اپنے کام میں باقاعدگی پیدا کرو، اپنے معمولات میں باقاعدگی پیدا کرو، اپنے اذکار میں باقاعدگی پیدا کرو، اپنے رزق کو حرام سے بچاؤ، زبان کو جھوٹ سے بچاؤ۔ فرائض سے تو مفر ہی نہیں، فرائض کے ساتھ نفلی عبادات کا اہتمام کرو اور کوئی دن تلاوتِ قرآن سے خالی نہیں ہونا چاہئے خواہ چند آیتیں پڑھو لیکن قرآنِ حکیم کو ضرور پڑھا جائے۔ زبان کو درود شریف سے تر رکھو، دنیا اور آخرت کے لئے اس سے بڑا کوئی وظیفہ نہیں اور اس سے بڑی کوئی دعا نہیں۔ جب بھی یاد آئے، جہاں بھی یاد آئے، درود شریف پڑھتے رہو۔

یہ یاد رکھو! انقلاب کو آنا ہے اور وہ آئے گا۔ سیلاب اور انقلاب راستے تلاش نہیں کرتے، راستے بنایا کرتے ہیں۔ اِس سرزمین پر حق و باطل کا معرکہ ہوگا اور نہ صرف پاکستان بلکہ پورا برصغیر اسلامی ریاست بنے گا، مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔

اعلیٰ حضرتؒ کا لگایا ہوا پودا

اعلیٰ حضرتؒ نے ایک چھوٹا سا پودا لگا دیا تھا، اب روئے زمین پر پھیل رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر صبح و شام ذکر ہوتا ہے، دنیا بھر کے لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ کر اللہ اللہ کر رہے ہوتے ہیں، یہ اُسی کی عطا ہے۔ یہ اہتمام وہ خود کر رہا ہے، قلوب اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں، انہیں خود سے آشنا کرتا جا رہا ہے۔ ہمارے ذمے اپنے حصے کی محنت ہے، جو اس کی توفیق سے کرنا ضروری ہے۔ اس لئے اپنے اوقات میں دین کو اولیت دیں اور اخوت کو نہ بھولیں۔ اسبابِ ظاہری اختیار کرنا لازم ہے، کبھی ترکِ سبب نہ کریں۔

میری ایک بات یاد رکھئے گا، الحمد اللہ! ہم پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ ہم موروثی طور پر مسلمان ہیں لیکن اس کا ایک نقصان بھی ہے۔ نقصان یہ ہے کہ ہم نے ہر عمل رسمی طور پر اپنا لیا ہے۔ ہم باپ دادا سے مسلمان ہیں۔ عمل میں وہ خلوص اور اس کی وہ اہمیت

جو ہونی چاہیے، وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ جن باتوں کی سمجھ نہیں ہے، جاننے والوں سے، اللہ اللہ کرنے والوں سے، اہلِ علم سے پوچھتے رہو۔ آپ ﷺ کی ایک ایک ادا کو پوچھو کہ حضور ﷺ کون سا کام کس طرح کرتے تھے، میں بھی وہ کام اس طرح سے کروں، بے قراری سے پوچھو۔ طلب بڑھ جائے کہ حضور ﷺ کی ادائیں اپنا لوں، کسی ایک سنت کی نقل تو ہو بہو ہو جائے، شاید وہی ایک عمل پسند آ جائے اور میں اس بارگاہ میں سرخرو ہو جاؤں۔

علم، علماء اور ابلاغ

علم کا مفہوم اور مقصد

حضور ﷺ نے فرمایا مکمل علم وہ ہے جس کے دو حصے ہیں۔

☆ ایک علم الادیان۔۔عقائد، نظریات و کردار یعنی Normative science کا علم اور

☆ دوسرا علم الابدان۔۔مادی اشیاء یعنی Physical science کا علم

جب یہ دونوں حصے مکمل ہوں گے تو پھر پورا علم ہوگا جسے حضور ﷺ نے العلم فرمایا ہے۔

اگر ایک شخص نیک ہے، باکردار بھی ہے، دین کا علم پڑھتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ مادی اشیاء کو کیسے استعمال کرنا ہے تو اس کا علم آدھا ہے اور دوسرا شخص مادی علوم میں مہارت رکھتا ہے، سائنس میں محقق کا درجہ رکھتا ہے لیکن دینی علوم میں بے بہرہ ہے تو اس کے پاس بھی آدھا علم ہے۔

ہمارا آج کا قومی مسئلہ ہی یہی ہے کہ قوم دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک حصہ ان لوگوں کا ہے جو نیک، باکردار اور پاکیزہ صفت ہیں لیکن معاملات کو سلجھانے، سمجھنے اور بہتر رخ دینے کیلئے ان کے پاس معلومات نہیں ہیں، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے پاس مادی علوم تو بہت ہیں لیکن وہ دین کے بنیادی عقائد سے بھی واقف نہیں بلکہ ایک حد تک دین سے ڈرے، سہمے ہوئے ہیں کہ نہ جانے دیندار ہونا کتنی پابندیوں، قدغنوں کا نام ہے۔

علم اور خبر:

جب علم کی ہیئت کی بات کی جائے تو اس کے دو شعبے بن جاتے ہیں۔

☆ ایک ہے خبر، معلومات کا حاصل ہو جانا یعنی کسی نے بہت کتابیں پڑھ لیں، بے شمار مطالعہ کر لیا لیکن توفیقِ عمل نہ ہوئی۔ نہ دل میں وہ کیفیات آئیں، نہ دل چاہا، نہ مزاج بدلا تو ان تمام معلومات کو خبر کہیں گے، علم نہیں۔ علم تب ہوگا جب توفیقِ عمل ہوگی۔ یعنی جو کچھ درست عقائد کے بارے پڑھا، ویسا ہی اس کا عقیدہ بھی ہو جائے اور اعمال کرنے کے بارے جو کچھ پڑھا، ویسا عمل بھی نصیب ہو جائے اور یہ نصیب ہوتا ہے ان برکاتِ نبوت ﷺ سے جو قلبِ اطہر ﷺ سے تقسیم ہوئیں۔

کوئی بندہ دنیا بھر کے علوم پڑھ جائے اور اس کے دل پر کوئی کیفیت مرتب نہ ہو، اس کا حال تبدیل نہ ہو، تو ان علوم کو آپ معلومات کا ذخیرہ کہہ سکتے ہیں۔ اُس کے پاس اخبار ہیں، خبریں ہیں، علم نہیں۔ علم وہ ہوتا ہے جو حال کو تبدیل کر دے، جو دل پر ایک کیفیت پیدا کر دے۔ یہ قوت صرف اُس علم میں ہے جو اللہ کی طرف سے، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے۔ کیفیات پیدا کر دینا، فکر کو تبدیل کر دینا، سوچوں کا رخ بدل دینا، خلوص اور درد پیدا کر دینا، بندے کو کائنات کے حوالے سے رب العالمین سے آشنا کر دینا۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو بھی اگر کسی نے زبان پر ہی رکھا، دماغ میں ہی رکھا، دل میں نہ اُتارا تو بھی عالم نہ بن سکے گا۔

علمِ لدنی:

علم ایک ایسی چیز ہے جس میں توارث ہے۔ جو کسی سے حاصل کیا جاتا ہے، جو تجربات سے حاصل ہوتا ہے، کسی کے سکھانے سے حاصل ہوتا ہے، کسی کے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔ زندگی خود، زمانہ خود ایک بہت بڑا اُستاد ہے۔ بہت سی چیزیں خود زمانہ اور

وقت سکھا دیتا ہے، بہت سی باتیں دنیا کے حادثات اور واقعات سکھا دیتے ہیں اور بہت سی باتیں ان لوگوں سے سیکھنا پڑتی ہیں جو جانتے ہیں۔

علم کا ایک اور ذریعہ جس کا ذکر صرف قرآن نے بیان کیا ہے اور جس کا ذکر کسی مذہب میں، کسی تاریخ میں، کسی کتاب میں نہیں ملتا وہ یہ ہے فرمایا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکھف:65) ہم نے اسے اپنی طرف سے علم دے دیا، اسے علم لدنی کہتے ہیں۔ ایسا علم جس میں کوئی کتاب درمیان میں نہیں ہے، جس میں کوئی استاد ضروری نہیں ہے، جس میں کسی سے سیکھنا ضروری نہیں ہے، جس میں کسی تجربے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ براہِ راست اللہ کی طرف سے بندے کے دل پہ القاء ہو جاتا ہے۔

ایسے بندے بہت کم ہوتے ہیں، بہت ہی کم جنہیں کتاب کی ضرورت نہ ہو، جنہیں استاد کی ضرورت نہ ہو، کسی سے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہ ہو لیکن جب آپ سوال کریں، جو بات آپ پوچھیں وہ ان کے علم میں ہو، وہ علم ان کے پاس کہاں سے آیا؟ انہوں نے کیسے اور کہاں سے سیکھا؟ وعلمنٰہ من لدنا علماً جیسے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر کے واقعے میں تفصیل ملتی ہے۔

بہت سی کتابیں پڑھنا ہی علم نہیں ہے۔ بہت باتیں کرنا ہی علم نہیں ہے۔ علم کی اساس ہے عظمتِ الٰہی کی پہچان کا ہونا۔ علم کی بنیاد ہے محمد رسول اللہ ﷺ سے تعلق کا قائم ہونا اور یہ ہو جائے تو اِسی زندگی کو، اِسی جہان کو جنت بنا دیتا ہے۔ دنیا داروں کی نظر میں ان پر دنیوی مصائب کے پہاڑ گزر جاتے ہیں لیکن اللہ کے بندوں سے پوچھو تو انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

علمِ ظاہر اور علمِ باطن

حضور ﷺ کا ارشاد ہے علم بہت بڑی نعمت ہے۔ نور ہی نور ہے، بہت قیمتی ہیں

وہ الفاظ جو محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلے۔ علماءِ حق نے ان کی حفاظت اور انہیں آگے پہنچانے کا حق ادا کر دیا، عمریں لگا دیں اور رات دن محنت کی، سب کچھ چھوڑ کر ایک ایک لفظ پر جانیں لٹا دیں اور کوئی بندہ سوچ بھی نہیں سکتا، جتنا کام انہوں نے عملاً کر دکھایا اور آج تک بحمد للہ کر رہے ہیں۔ چودہ صدیاں بیت گئیں لیکن علماءِ حق ہر طرف اس قدر مستعد پہرے دار ہیں کہ کوئی زیر زبر ہلاتا ہے تو شور اٹھتا ہے کہ یہ غلط ہو رہا ہے اور یہ ایسے نہیں، ایسے ہے۔

اگر علمِ ظاہر پہنچ جائے اور اس پر خلوص سے عمل نصیب ہو جائے تو یہی مقصود ہے۔ خلوص کے حصول کا ایک الگ شعبہ ہے۔ یہ الفاظ و حروف میں تو ہوتا نہیں، یہ تو ایک کیفیت ہے۔ جہاں سے الفاظ و حروف کے انوارات کی بارش ہوتی ہے، وہیں سے خلوص کے خزانے بھی لٹائے جاتے ہیں۔ جس طرح علماءِ ظواہر نے تعلیماتِ نبوی ﷺ پہنچانے اور سنبھالنے پر زندگیاں وقف کیں، علماءِ ربانیین اُن سے کئی گنا زیادہ محنت کر کے وہ کیفیات بانٹتے رہے جو حضورِ اکرم ﷺ نے بانٹی تھیں۔ بات تب بنتی ہے جب وہ کیفیت بھی آئے اور علمِ ظاہر بھی ہو۔

علمِ ظاہری حلیہ بدلتا ہے لیکن یہ کیفیات دل بدل دیتی ہیں، طلب بدل دیتی ہیں، آرزو بدل دیتی ہیں۔ علمِ ظاہر بندہ مرنے کے بعد نہیں پڑھا سکتا لیکن اِس فن کے اساتذہ قبروں میں بھی بیٹھے پڑھائے جا رہے ہیں، سکھائے جا رہے ہیں، یہ شعبہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ارے کبھی عشق کی بھی انتہا ہوتی ہے، محبتوں کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، کیفیات کی بھی کوئی limits ہوتی ہیں.....؟ دنیا سے گزر گئے، جنازے ادا ہوئے، زیرِ زمین دفن ہو گئے، صدیاں بیت گئیں لیکن کیفیات بانٹے جا رہے ہیں۔ ہے ناں عجیب شعبہ۔ فارغ نہیں ہوئے، اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، پھر ہم اس چند روزہ زندگی میں کیسے فارغ ہو

گئے؟ محبت سے کوئی فارغ نہیں ہوا کرتا اور جو آتش بجھ جائے وہ آتشِ عشق نہیں ہوا کرتی۔ اس درد کو سمیٹیے، اس درد کو بانٹیے۔

یہ سورج کے ماہ و سال، یہ گردشِ زمانہ، یہ مرورِ زمانہ، یہ اپنے اثرات رکھتی ہے، یہ چکی کے پاٹ ہیں، یہ پیس کے رکھ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی مشین ہے جو دوستوں کو دوستوں سے دُور پھینک دیتی ہے، ماؤں سے بیٹے چھین لیتی ہے، بیٹوں سے باپ چھین لیتی ہے، بھائیوں سے بھائی جدا کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی کھڑا ہو سکتا ہے تو وہ صرف عشقِ الٰہی ہے جو اس کی گردشوں کو پلٹ دیتا ہے، اس کے اثرات کو لوٹا دیتا ہے۔ زمانے فنا ہو جائیں گے، عشاق فنا نہیں ہوں گے۔ موت آ کر گزر جاتی ہے لیکن ان کی دکانیں بند نہیں ہوتیں، مزارات سے بھی ان کی برکات اور انوارات برس رہے ہیں۔ نسبتِ اویسیہ تو حاصل ہی مشائخ سے روحانی طور پر ہو رہی ہے۔ بہر حال یہ عمر کم اور قصہ طویل ہے، اسے یہیں پہ بس کرتے ہیں۔

علماء ظاہر اور علماء ربانی

علماء دو طرح کے ہیں۔

☆ ایک ہیں علمائے ظاہر یعنی وہ علماء جن کے پاس نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ظاہری ہیں، وہ انہیں لوگوں کو منتقل کرتے ہیں۔ وہ عالم تو ہیں لیکن صاحبِ حال نہیں، وہ خبر دیتے ہیں علم نہیں۔

☆ دوسرے علمائے ربانی ہیں۔ عالم ربانی وہ ہو گا جس کے پاس محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہوں گی اور جس کے قلب میں وہ کیفیات بھی ہوں گی جو قلبِ اطہر محمد رسول اللہ ﷺ سے جاری ہیں۔ جو شخص عالمِ ربانی کی خدمت میں جائے گا، اس کی زندگی بدلنا شروع ہو جائے گی، اس کا کردار سدھرنا شروع ہو جائے گا۔

علم جاننے کا نام ہے، صرف لکھنے پڑھنے کا نام نہیں

لکھنا جانے ہوئے کو محفوظ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پڑھنا اس محفوظ شدہ بات کو دوبارہ سمجھنے کا ذریعہ ہے لیکن علم جاننے کا نام ہے صرف لکھنے پڑھنے کا نہیں۔ اگر لکھنے پڑھنے کا نام علم ہوتا تو صحابہ کرامؓ میں جو زیادہ سے زیادہ تعداد کاتبینِ وحی کی ملتی ہے وہ انیس ہے۔ بنیادی طور پر سات کاتبانِ وحیٔ الٰہی تھے اور بارہ حضرات وہ ہیں جنہیں کبھی کبھار یہ سعادت ملی جبکہ نبی اکرم ﷺ کے وصال کے وقت صحابہ کرامؓ کی تعداد کم و بیش ڈیڑھ لاکھ تھی۔ ڈیڑھ لاکھ میں معدودے چند آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آج دنیا کے کسی موضوع پر کوئی بڑے سے بڑا عالم، مفکر بات کرے تو کیا وہ صحابہ کرامؓ کی بات سے آگے بڑھ سکتا ہے؟ آخر کوئی محدث، کوئی مفسر، کوئی فقیہہ، کوئی سائنس دان، کوئی سیاست دان کسی موضوع پر اُن کے ارشادات سے بڑھ کر رہنمائی کیوں نہیں کر سکتا ہے؟ جب کسی صحابیؓ کا نام نامی آتا ہے تو بڑے بڑے علماء کی زبان گنگ ہو جاتی ہے کیونکہ اُن کے پاس علم تھا۔ کسی کو لکھنا آتا تھا یا نہیں، پڑھنا آتا تھا یا نہیں لیکن علم تھا۔ وہ جانتے تھے، وہ علم کے سمندر تھے۔ سارا علم ذاتِ باری سے قلبِ اطہرِ محمد رسول اللہ ﷺ میں موجزن ہوتا تھا اور قلبِ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرامؓ کے دلوں تک۔ آج دنیا میں جہاں کہیں کوئی ذرہ علم کا نظر آتا ہے، یہ انہی چشموں سے سیراب ہونے والے لوگ ہیں۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ ایک شعبے کا بندہ دوسرے شعبے کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، دوسرے شعبے کا بندہ ہے تیسرے شعبے میں سوجھ بوجھ پیدا کرنا چاہتا ہے اور سب نے اگر منہ پھیر لیا ہے تو صرف دین سے، ذکرِ الٰہی سے، اللہ کی یاد سے اور آخرت سے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ادارے جن میں کوئی حفظ کرا رہا ہے، کوئی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی دے رہا ہے، یہ جو دینی اور دنیوی علوم کو کمبائنڈ کر رہے ہیں یہ اسلام

کے چھوٹے چھوٹے اسلحہ خانے ہیں۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ سارے بچے حفظ کر کے امام مسجد نہیں بنیں گے، اب یہ سکولوں کالجوں کی زینت بن کر کل اعلیٰ سرکاری عہدوں پہ بھی بیٹھیں گے اور یہ کرنے کا کام ہے۔ نماز تو کوئی نمازی آگے کھڑا ہو جائے پڑھا سکتا ہے لیکن وہ ادارے جو پورے ملک کو نکیل ڈال کر رکھتے ہیں، وہاں آپ کے کتنے نمائندے ہیں جو دین بھی جانتے ہوں، قرآن بھی جانتے ہوں اور ان کے پاس جدید تعلیم بھی ہو؟ کوئی نہیں۔ بات one side ہو گئی ہے، دین والے مساجد کے ہو کر رہ گئے ہیں اور جو لوگ حکمران ہیں اور سرکاری دفاتر میں ہیں، انہیں دین کسی نے بتایا ہی نہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دونوں طبقات کے درمیان پل تعمیر کیے جائیں۔

دُنیوی علوم کے ساتھ دینی علوم بھی

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہم بچپن میں ہوش سنبھالنے سے پہلے سکول چلے جاتے ہیں اور مرنے تک کورسز کرتے رہتے ہیں، سیکھتے رہتے ہیں، پڑھتے رہتے ہیں اور مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اس سارے طویل مطالعے میں ہم کبھی یہ فکر ہی نہ کریں کہ جو بات اللہ کریم نے ہم سے کی ہے، اسے بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔

ہم بچوں کو دُور دُور تک پڑھنے کیلئے بھیجتے ہیں۔ یہاں میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اچھی بات ہے لیکن یہ بات اچھی نہیں ہے کہ سب کچھ پڑھا جائے لیکن نہ پڑھا جائے تو اللہ کا دین۔ اتنی محنت کرنے والے لوگ اگر ساری زندگی قرآن کا ترجمہ نہیں پڑھتے، نماز کا ترجمہ نہیں سیکھتے، دین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تو ہے کوئی جواز ہمارے پاس اس غفلت کا؟ جب ہم دین کو نہیں سیکھتے تو عظمتِ الٰہی کو کیسے جان سکتے ہیں؟ اور مومن کا حق ہے کہ دنیوی علوم کافر سے زیادہ سیکھے، زیادہ حاصل کرے اور مومن کر سکتا ہے، مومن میں استعداد زیادہ ہوتی ہے لیکن تمام علوم کی بنیاد معرفتِ الٰہی اور دینی علوم ہونے چاہئیں۔ خود

کو مسلمان بنانے کے بعد ڈاکٹر بنائے، خود کو مسلمان کاروباری بنائے، اگر اسلام ہی کو چھوڑ دیا تو جانا ہی کیا؟ اور اسلام کا دامن معرفتِ الٰہی کی کمی کی وجہ سے چھوٹتا ہے۔

دین اور دنیا کا امتزاج

اگر کوئی یہ سمجھے کہ دینی مدارس کو کوئی بند کر دے گا تو یہ اس کا وہم ہے۔ قال اللہ وقال الرسول ﷺ میں بڑی قوت ہے۔ اللہ نے قرآن کو باقی رکھنا ہے تو قرآن پڑھانے والوں کی حفاظت بھی ضرور کرے گا۔ اگر قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا تو قرآن پڑھانے والوں کی حفاظت بھی اس میں آ گئی۔ قرآن کی حفاظت تب ہی ہو گی جب قرآن پڑھانے والے بھی محفوظ ہوں گے۔ یہ دینی مدارس تو اللہ کی حفاظت میں ہیں۔ دین کی وجہ سے کوئی رسوا نہیں ہوتا۔ دین عزت کا سبب ہے، رسوائی کا سبب نہیں لیکن دیندار کہلانے والوں میں بھی جب دنیا کی طلب آتی ہے تو انہیں رسوا کر دیتی ہے۔

میری گذارش ہے کہ ہر دینی ادارہ اپنے بچوں کو حصولِ رزق کیلئے ضرور کوئی ہنر سکھائے تا کہ حصولِ رزق کیلئے انہیں دین کا سہارا نہ لینا پڑے کیونکہ دوسروں کی نسبت عالمِ دین کو کام زیادہ کرنا چاہئے اور یہ عالمِ دین کی توہین ہے کہ کوئی یہ کہے کہ یہ میری مدد کا محتاج ہے۔

انگریز اور نظامِ تعلیم

انگریز نے آ کر یہاں کے نظامِ تعلیم پر کاری ضرب لگائی۔ یہاں سے پہلی رپورٹ یہ گئی کہ مسلمانوں کے ہاں شرح خواندگی 80 فیصد ہے، آپ ایسی قوم کو غلام نہیں بنا سکتے۔ طریقہ یہ نکالا گیا کہ انہیں علم اور ماخذِ علم سے محروم کیا جائے اور دینی علم کو محدود دائرے میں بند کر کے فیلڈ سے دور کر دیا جائے اور جو لوگ فیلڈ میں آنا چاہیں، انہیں دینی علم سے دور کر دیا جائے۔

انگریز نے جو نظامِ تعلیم جاری کیا وہ دین سے بالکل الگ خالصتاً مادہ پرستانہ تھا۔اس نے دینداروں کو ایک ایسے گوشے میں دھکیل دیا جہاں ان کی تذلیل کی گئی اور دینی علم حاصل کرنے والوں کو کوئی منصب نہ دیا گیا۔انگریزوں نے دینی اداروں سے زمینیں واپس لے لیں۔انگریز نواز جاگیرداروں کو جو سینکڑوں مربع زمین الاٹ ہوئی،اس میں اسی فیصد زمین دینی اداروں سے چھینی گئی تھی۔اسی طرح سے انہوں نے غنڈے پالے اور دینی اداروں کو بند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔اس عہد کے علماء کا یہ بہت بڑا جہاد تھا،انہوں نے زکوٰۃ جمع کی،خیرات مانگی لیکن اس دینی تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا۔اتنے وسائل انہیں میسر ہی نہ آئے کہ وہ جامعات کی طرح دین و دنیا کو متوازی چلا سکیں۔یہ جو عذابِ الٰہی کا سو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ جو انگریز کی غلامی کا تھا،اس میں ایسے لوگ جن کے پاؤں پھولوں پر ہونے چاہئیں تھے،وہ بوریئے پر سوئے اور مٹی کے دیئے کی لو میں،چھوٹے چھوٹے حجروں میں زندگی بسر کر گئے۔اللہ نے انہیں مجھ تک سبب بنا دیا،آپ تک یہ نعمت پہنچی ورنہ ہم بھی 'گردوا ہگرد' کر رہے ہوتے۔

لیکن جب ملک مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا،علماء کو بھی چاہئے تھا تقاضا کرتے،حکمرانوں کو بھی چاہئے تھا حیا کرتے اور دینی اداروں کو پھر وہی مرتبہ ملتا جو انگریز کے قبضے سے پہلے تھا۔لیکن ہماری بدقسمتی کہ حکمرانوں کے کھربوں کے بجٹ میں دین کیلئے ایک پائی نہیں ہوتی۔یعنی دین کے لیے کوئی تبدیلی نہیں آئی خواہ حاکم انگریز ہو یا مسلمان۔ انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ ظالمانہ اقتدار میں علماء حق نے علم کی شمع روشن رکھنے کیلئے زکوٰۃ و صدقات مجبوراً لئے لیکن جب مسلمانوں کو اپنا ملک مل گیا تو کیا پھر بھی دین کی ترویج زکوٰۃ کی مد سے ہونی چاہئے تھی؟ آزادی کے بعد مدارس کو نہیں چاہیے تھا کہ وہ زکوٰۃ و صدقات لیتے۔پھر تو اُن کا حکومت سے مطالبہ ہونا چاہئے تھا کہ ملکی بجٹ میں تعلیم کے ضمن میں ان کا

حصہ مقرر کیا جائے۔جس ملک کے بجٹ میں صحت و صفائی کے ضمن میں مچھر مار دوائی کیلئے بجٹ میں گنجائش موجود ہو،وہاں دین سکھانے کیلئے بجٹ میں کوئی گنجائش نہیں!اس کیلئے زکوٰۃ مانگی جائے اور چندے کئے جائیں؟

اگر دینی مدارس کو جامعات بنایا جاتا تو مدارس کے طلبہ ڈاکٹر،انجینئر،جرنیل، مورخ،موجد،جغرافیہ دان،حساب دان اور سائنس دان ہوتے،قدامت پسند،رجعت پسند اور دہشت گرد نہ کہلاتے۔آج اپنے سارے ورع تقویٰ کے باوجود عبادت گزار انسان دہشت گرد کہلاتا ہے اسلئے کہ ہم نے اسے چھوڑ دیا ہے جسے حضور ﷺ نے آدھا علم قرار دیا تھا۔اس سے قبل دینی مدارس صرف مولوی نہیں پیدا کرتے تھے،وہ زندگی کے مختلف شعبوں اور پیشوں کیلئے ماہرین بھی پیدا کرتے تھے۔دینی مدرسہ ہی طبیب بناتا تھا،دینی مدرسہ ہی استاد،سولجر،وزیر،مشیر پیدا کرتا تھا۔انگریز نے اسے صرف مولوی سازی پہ لگا دیا،فیلڈ سے انہیں بالکل الگ کر دیا گیا۔ہم اسلام کی ہر تعبیر مولانا سے لیتے ہیں اور مولانا کو ہم نے فیلڈ سے دور رکھا ہوا ہے۔جب دین کی تعلیم انتہائی محدود اور عملی میدان سے دور ہو گئی تو باصلاحیت اور ذہین لوگوں نے ادھر جانا چھوڑ دیا۔اعلیٰ ذہانت کا رخ جدید نظامِ تعلیم کی طرف مڑ گیا۔

دین پڑھنے کا مطلب ہے اللہ کا بہتر بندہ اور اچھا انسان بننا۔کیا یہ ضروری ہے کہ دینی مدرسے سے نکلنے والا صرف اذان دے،صرف امامت کرائے؟ وہ کیوں نہ فیلڈ کا علم حاصل کرے۔وہ دین پڑھا ہوا ہو اور ڈاکٹر بنے،انجینئر بنے،کمشنر بنے۔اس نے تو خود اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ایک عالمِ دین جب جرنیل بنے گا تو اس کا انداز ہی اور ہوگا۔

آج کے تکلیف دہ حالات اور علامہ مرحومؒ

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغامِ خدا دادند مارا

ولے تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبریل و مصطفٰے را

کہ میں ملا اور صوفی کا احسان مند ہوں کہ اس نے اللہ کا پیغام مجھ تک پہنچایا لیکن جب اس نے اس کی تعبیر، اس کی تفسیر، اس کے مفاہیم بیان کئے تو اللہ بھی حیران ہے، لانے والا فرشتہ بھی حیران ہے اور اللہ کا نبی ﷺ، پہنچانے والی ہستی بھی حیران ہے کہ بات کیا تھی اور اس نے لوگوں کو بتائی کیا؟

آج ہم مساجد میں جائیں اور آج کل کے نو آموز مبلغوں کے قابو آجائیں تو یوں لگتا ہے جیسے یہ اللہ کی، اللہ کی رحمت کی کوئی خبر نہیں رکھتے بلکہ جو قابو میں آتا ہے، اسے دوزخ میں پھینکے جاتے ہیں۔ یہ بھی کافر، وہ بھی بدکار وہ بھی دوزخی، وہ بھی جہنمی اور اب تو ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر بات آگے چلی گئی ہے کہ یہ جہنمی ہے اسے گولی مار دو، اِن کی مسجد میں بم پھینک دو۔ اُن کی مسجد ہی گرادو۔

ہر شعبے کے افراد الگ ہوتے ہیں

علمِ دین اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور علماء بڑے ہی خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جن کے سینوں میں قرآن رقم ہوتا ہے، جن کے سینوں میں احادیثِ رسول اللہ ﷺ رقم ہوتی ہیں، جن کی عمریں قال اللہ وقال الرسول ﷺ میں بسر ہو جاتی ہیں۔ بہت خوش نصیب اور قابلِ احترام لوگ ہوتے ہیں لیکن علمِ دین میں ایک خطرہ بھی ہوتا ہے، علمِ دین میں ایک خطرناک موڑ یہ آتا ہے کہ جس بندے کو دین کا علم حاصل ہو جائے وہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ ہے حالانکہ ہر شعبے کے افراد الگ الگ ہوتے ہیں۔

آپ بڑی باتوں کو چھوڑ دیں اس سادہ سی مثال سے بات سمجھیں کہ بھیڑوں کے دو ریوڑ ہیں اور کسی بڑے سے بڑے عالم سے کہیے کہ ان دونوں کو الگ الگ کر دیجیے، کوئی نہیں کر سکتا۔ پھر اُس اَن پڑھ چرواہے سے کہیں تو وہ دونوں الگ الگ کر دے گا۔ وہ ایک ایک بھیڑ کو پہچانتا ہے جبکہ ہمیں سب ایک سی نظر آتی ہیں۔ اب اس میں عالم کا قصور نہیں ہے، دراصل وہ اس کا شعبہ نہیں ہے، گڈریئے کا کمال نہیں کہ اس کا تو وہ شعبہ ہے۔ تو علماء کو بھی یہاں بڑی ٹھوکر لگتی ہے کہ ہم نے بہت پڑھ لیا ہے، اس لئے ہم دل (تصوف وسلوک) کو بھی جانتے ہیں حالانکہ وہ الگ موضوع ہے۔

دل مہبطِ برکاتِ نبوت ﷺ ہے۔ دل کو پڑھنے کیلئے کتابوں کی ضرورت نہیں ہوتی، دل کو پڑھنے کیلئے ایک نسبت، ایک تعلق چاہئے ہوتا ہے اور اگر وہ بارگاہِ نبوت ﷺ سے استوار ہو جائے تو ساری زندگی کتابیں پڑھنے سے ان علوم کا ایک شمہ نصیب نہیں ہوتا جو اس نسبت کے طفیل دل کو نصیب ہوتا ہے۔

مشائخ اور آزمائش

اس راستے میں بھی دو بھنور بے حد خطرناک ہیں۔ ایک تو لوگوں سے حصولِ زر کی امید پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر آنے والا مجھے کچھ دے۔ یہ بڑا خطرناک ہے۔ آدمی اللہ کو بھول جاتا ہے، اُس کی امید مخلوق سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ امیدوں کا مہبط تو اللہ کی ذات ہے، مرکز تو اللہ کی ذات ہے، امیدیں اس سے لگانی چاہئیں۔ اگر لوگوں سے لگ گئیں، کون آیا، کیا لایا، تو بات ختم ہو گئی۔ پھر حشر میں اپنا اجر بھی مخلوق سے طلب کرے۔ جس سے امیدیں ہیں اسی کے پاس جائے۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ بندہ اپنی اہمیت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں کوئی بڑی ہستی بن گیا ہوں حالانکہ جیسے بھی کمالات اللہ کریم عطا کریں تو یہ اُس کی عطا ہے۔ بندہ تو وہی ہے جو

تھا، بندہ وہی مشتِ غبار ہے، اس کا کوئی کمال نہیں۔ اللہ نے اسے اگر کسی صاحب کمال کے پاس پہنچا دیا اور کوئی رنگ اس پر بھی آ گیا تو وہ اس کا کمال نہیں، اللہ کی دین ہے۔ اسے اپنی حیثیت یاد رکھنی چاہئے کہ یہ احساس، نیازمندی پیدا کرتا ہے اور پھر جب یہ خیال ہو کہ میں بڑا صاحبِ کمال اور کامل ہو گیا ہوں تو پھر بات نہیں بنتی۔ یہ اس راہ کے دو بڑے خطرناک مقامات ہیں۔

فردعی مسائل میں الجھاؤ زیادہ

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہماری عمریں بیت جاتی ہیں اور ہم وضو کا درست طریقہ نہیں سیکھتے، غسل کے مسائل نہیں سیکھتے۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ دہراتے ہیں اور یہ تکلف نہیں کرتے کہ سورۃ فاتحہ کی سات چھوٹی چھوٹی آیات کا مفہوم سمجھ لیں۔

اس سے بھی عجیب طرزِ عمل مساجد کے خطیبوں کا ہے۔ ایسے ایسے مسائل پر بات کریں گے کہ علم غیب کس کے پاس ہے، کس کے پاس نہیں۔ کون کیا کر سکتا ہے اور کون کیا نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ خود ایسے گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور لوگوں کو بھی پھنسانا چاہتے ہیں لیکن روزمرہ کے معمولاتِ زندگی ادا کرنے کے حضور ﷺ نے کیا طریقے سکھائے ہیں؟ شریعتِ مطہرہ میں زندگی گزارنے کیلئے کیا ہدایات آئی ہیں، حلال و حرام، جائز و ناجائز اُمور کیا ہیں؟ ان اُمور پر ہماری توجہ ہی نہیں ہے۔

سب سے زیادہ خطرہ۔۔ پیشہ ور علماء سوء

نبی کریم ﷺ کے ارشاداتِ پاک کا مفہوم ہے کہ آپ ﷺ کو دین کے لیے سب سے زیادہ خطرہ امت کے اُن علماء سے ہے جو دنیا کی خاطر دین کو بیچ دیتے ہیں۔ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے اور خطرات بھی ہیں مثلاً بیشمار لوگ ظالم ہیں، چور اور ڈاکو ہیں، قاتل اور دہشت گرد ہیں۔ خودکش حملہ آور ہیں جو خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو

بھی تباہ کرتے ہیں لیکن حضور ﷺ نے ان خطرات میں سے کسی خطرے کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا کہ اپنی امت کیلئے مجھے زیادہ خطرہ ان علماء سے ہے جو دنیا کے حصول کیلئے دین بیچ دیتے ہیں۔

مولانا تھانویؒ سے کسی نے عرض کیا کہ ''حضرت! مولوی چور ہو گئے ہیں'' تو انہوں نے فرمایا ''نہیں بات یہ نہیں بلکہ، بات یہ ہے کہ چوروں نے داڑھیاں بڑھا لی ہیں''۔ دینی شعبے میں بھی عالم ہمیشہ اللہ کی طرف بلاتا ہے لیکن داڑھیاں بڑھا کر جو پیشہ ور آ گئے ہیں انہوں نے ہمیں اللہ سے محروم کر کے جنت orientated کر دیا ہے۔ یہی یہود و نصاریٰ کے علماء نے کیا تھا، یہی آج ہمارے ساتھ ہمارا برائے نام مولوی کر رہا ہے۔ جس کا مقصد پیسہ کمانا، روزی کمانا اور لوگوں کی جیبیں ٹٹولنا ہے۔ حلیہ مولوی کا بنا لیا، لوگوں کو بتاتے رہے کہ سارا سال عمل کرنے کی ضرورت نہیں، ایک محفلِ نعت کرا دو، جنت تمہاری ہو گئی۔ اس پہ انہیں کھلاؤ پلاؤ، انہیں پیسے دے دو، عرس شریف کرا دو جنت تمہاری ہو گئی۔ ختم پڑھا دو جنت تمہاری ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ قاتل یا ڈاکو، جان اور مال کا نقصان کرتے ہیں لیکن اگر کوئی دین کے نام پر اپنے مفادات کی خاطر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے تو وہ سب سے بڑا ڈاکو ہے جو لوگوں کا ایمان چھین لیتا ہے۔ اب ایسا دور آ گیا ہے کہ دین کے نام پر فرقہ بندی اور گروہ بندی ہوتی ہے۔ ایسی جماعتوں کا مقصد صرف حصولِ زر ہے، ان میں سے کسی کا مقصد مخلوق کی بھلائی نہیں۔ بڑے بڑے خوبصورت نام رکھ کر لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کیا جا رہا ہے تو یہ عہد بہت احتیاط اور باریک بینی کا ہے۔

جعلی پیر خانے:

جب کاملین اٹھ گئے جو آخرت کماتے بھی تھے اور ملنے والوں کو آخرت بانٹتے بھی تھے اور ان کی جگہ ناقص لوگ آئے تو انہوں نے دوائے دل کی دکان کو دنیا کمانے کا اڈا بنا لیا

اور لوگ پیسے دے دے کر گمراہ ہونا شروع ہو گئے۔ ان ناقصین نے لوگوں کے ایمان ضائع کیے، لوگوں کے کردار ضائع کیے اور لوگوں کو گمراہی میں دھکیل دیا۔

آپ کو ایک بہت بڑا طبقہ اپنی قوم میں ایسا ملے گا جو فرض ادا نہیں کرتے، نماز نہیں پڑھتے۔ جنہیں رمضان کے روزوں کی فکر نہیں ہوتی۔ جو حلال و حرام کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ چوری کرنے جاتے ہیں اور اس میں پیر صاحب کی نذر مانتے ہیں کہ اتنا حصہ لنگر میں دوں گا۔ یعنی گمراہی کی حد یہ ہے کہ آپ برائی کو بھی نیک لوگوں کے نام سے منسوب کر دیں۔

یاد رکھیں! ہر ولی کے پاس جا کر صرف اللہ کی یاد ملے گی جو بہت بڑا خزانہ ہے جو اس در کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا۔ دنیا تو آپ کو کافر سے بھی مل سکتی ہے، پیسہ تو آپ کو کسی ڈاکو کے پاس بھی مل سکتا ہے لیکن اللہ کی رضا صرف اولیاء اللہ سے ملے گی۔

دین کو پیشہ نہ بناؤ

ہمیں دین کا بھی اتنا ہی پتہ ہے اور ہمارے برائے نام عالم بھی یہی بتاتے ہیں کہ عبادات کا اجر مرنے کے بعد ملے گا۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دین کو پیشہ بنا لیا ہے۔ کوئی بھی کام جب پیشہ بن جاتا ہے تو پیشے کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں جیسے کپڑے کا دوکاندار گاہک کو بیس پچیس تھان خوش دلی سے کھول کر دکھاتا ہے خواہ خریدار ایک بھی نہ خریدے لیکن وہ اس سے ناراض نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ اس کے پیشے کا تقاضا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کی دوکانداری نہیں چلے گی۔ دین بھی جب پیشہ بن جاتا ہے، معاش کا ذریعہ بن جاتا ہے تو اس کے تقاضے بدل جاتے ہیں۔ پھر اللہ کی رضا کی بجائے لوگوں کی خوشی مقصود ہو جاتی ہے کہ جن باتوں پہ لوگ راضی رہتے ہیں وہ، کرتے رہو۔

اسی ضمن میں ثواب کو ادھاری مزدوری قرار دے دیا گیا ہے کہ نیکی کا بدلہ آخرت

میں ملے گا۔ صلوٰۃ، روزہ، حج، زکوٰۃ کیے جاؤ، ثواب آخرت میں ملے گا۔ اس بات نے لوگوں کو اپنی عملی زندگی میں عبادات کا نتیجہ دیکھنے سے محروم کر دیا ہے۔ اللہ کریم تو ہر عبادت پر نقد بدلہ دیتے ہیں، اللہ نے بتایا ہے کہ نماز یقیناً برائیوں اور بے حیائیوں سے بچاتی ہے، ذکر سے اللہ کے ساتھ تعلق نصیب ہوتا ہے، روزہ سے تقویٰ نصیب ہوتا ہے یعنی ہر نیکی کردار پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ ہم اپنے کردار میں اس اثر کو دیکھنے کی بجائے محض عبادات کی ادا کاری پر خوش ہیں کہ آخرت میں اس کا ثواب ملے گا۔

یاد رکھو! آخرت اسی کی سنورے گی جس کی دنیا یہاں سنورے گی، جس کی دنیا سنورتی ہے اس کی آخرت خود بخود سنورتی ہے۔ دنیا سنورتی کا مطلب یہ ہے کہ زندگی پرسکون ہوتی ہے، تنگی بھی کاٹ لیتے ہیں، فراخی کیلئے محنت کرتے ہیں، شکر کرتے ہیں، تُو تُو، میں میں اور چخ چخ نہیں ہوتی۔

دینی کاموں کی اجرت:

دین کو مالِ تجارت بنانے والا، جو دین سے دنیا کمانا چاہتا ہے، بدترین انسان ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی جواہرات دے کر راکھ خرید رہا ہے بلکہ دنیا تو راکھ سے بھی زیادہ گئی گزری ہے۔ راکھ بھی کسی کام آ جاتی ہو گی لیکن دنیا کو تو چھوڑ جانا ہے۔

جو لوگ دین کا کام کرتے ہیں، انہیں جو تنخواہ یا اُجرت ملتی ہے وہ دینی کام کا معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے حضرات جو ہمہ وقتی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ کسی دوسرے کام کے قابل نہیں رہتے۔ اُن کے پاس وقت نہیں بچتا تو فقہاء کے نزدیک انہیں اُن کے اُس وقت کو صرف کرنے کی اجرت دی جاتی ہے۔ دینی کام کی اجرت تو اللہ ہی دے گا۔

تعلیم کا مقصد روزگار نہیں اچھی شخصیت کی تعمیر ہے:

جب سے ہم سے اسلامی نظامِ تعلیم چھین لیا گیا تب سے ہم اسی احساسِ کمتری

میں مبتلا ہیں کہ پڑھ لکھ کر اگر کسی کو ملازمت نہیں ملتی تو وہ کوئی معمولی کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ بے روزگار رہتا ہے، پریشان رہتا ہے، معذور ہو کر بیٹھ رہتا ہے۔ جب تک عہدہ نہ ملے چھوٹا موٹا کام کرنا عار سمجھتا ہے اس لئے کہ معاشرہ عار دلاتا ہے۔ تعلیم کا مقصد اچھی شخصیت بننا تھا جو کسی محنت کو عیب نہ سمجھے لیکن تعلیم کا مقصد روزگار بنا دیا گیا۔

جہالت مفلسی سے بدتر ہے

میرا یہ تجربہ ہے کہ ہم علم حاصل نہیں کرتے، ہم سرٹیفکیٹ چاہتے ہیں، ہم سندیں چاہتے ہیں۔ ہماری نظر اس بات پر ہوتی ہے کہ چلو یہاں ایک سال لگا لو، یہ سند مل جائے گی، اس سے ملازمت مل جائے گی۔ یہ اچھی بات ہے۔ طلبِ رزقِ حلال فرضِ عین ہے اور یہ ضروری ہے کہ روزی کیلئے ہم فکر کریں لیکن روزی کا ذریعہ علم نہیں ہے۔ کتنے ہی جاہل، ارب پتی ہیں۔ رب العالمین نے روزی کے اپنے ذرائع بنائے ہیں۔ ہاں جو پڑھا لکھا ہے وہ آسانی سے اور بہتر ذرائع اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن علم ذریعۂ رزق نہیں ہے بلکہ علم ذریعۂ معرفت ہے۔ علم کی اپنی ایک حیثیت ہے اور وہ رزق سے بڑھ کر ہے۔

آدمی مفلس رہ سکتا ہے لیکن جاہل رہ جائے تو اس کے دونوں جہاں برباد ہو جاتے ہیں۔ مفلس رہے تو دنیوی زندگی کی تنگی آتی ہے جبکہ جہالت دونوں جہان برباد کر دیتی ہے لہٰذا مفلسی سے بدتر ہے۔ حصولِ علم ردِ جہالت کیلئے ہے۔ ہم شمع جلاتے ہیں، بے شک اس سے تپش بھی آتی ہے، رات ٹھنڈی ہو تو گرمی بھی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اس کا مقصد ظلمت کو، اندھیرے کو اور تاریکی کو دور کرنا ہے۔ اس کا اصل کام ظلمت کو دور کرنا ہے اسی طرح علم کا کام جہالت کا رد ہے۔ ہم تو دستِ قدرت کے مہرے ہیں، ہماری تو صرف نیت اور ارادہ دیکھا جائے گا، ہوگا تو وہی جو وہ چاہتا ہے۔

ہم بتاتے ہیں چکھاتے نہیں

آپ خیر القرون کو دیکھیں۔ صحابہ کرامؓ کے کوئی لمبے خطبے، لمبی تقریریں، کوئی دینی جلسہ نہیں ملتا کہ دین کے نام پر فلاں جگہ جلسہ ہوا۔ اور وہ زمانہ بھی ایسا کہ جس میں کوئی ٹیلی فون، کوئی تار، کوئی ریڈیو ٹیپ، کوئی ٹی وی، کوئی ذرائع رسل و رسائل، کوئی موٹر، لاری، کار کچھ بھی نہیں تھا، بات صرف زبانوں سے کانوں تک کا سفر کرتی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ عہدِ صحابہ کرامؓ میں، خیر القرون میں، دنیا اور دین کوئی دو الگ چیزیں نہیں ملتیں۔ سیاست بھی دین ہے، جہاد بھی دین ہے، صلح بھی دین ہے، جنگ بھی دین ہے، خرید و فروخت بھی دین ہے، بازار میں بیٹھنا اور چیزیں بیچنا بھی دین ہے۔ ہر چیز دین کے نام پر ہو رہی ہے، کہیں دنیا نظر نہیں آتی۔

اسلام گھوڑے کی پیٹھ پر، اونٹوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر اتنی تیزی سے کس طرح پھیل گیا؟ بات یہ تھی کہ ہم بتاتے ہیں شکر میٹھی ہے، وہ چکھاتے تھے کہ یہ شکر ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے تقریریں، شور شرابہ تو سب ہو رہا ہے لیکن ان سب تقریروں، ان سب جلسوں، ان شور شرابوں کی وجہ سے کتنے لوگوں نے عملاً اسلام کو اپنایا؟ کوئی کیا اپنائے گا، خود مقررین کے دامن میں کچھ نہیں ہوتا۔ فرق وہی ہے کہ ہمارے پلے شکر نہیں ہوتی، ہم محض بتاتے رہتے ہیں کہ شکر میٹھی ہے، شکر میٹھی ہے اور وہ کھلاتے تھے۔ ایک چٹکی بھی جسے دی، ساری عمر ہاتھ چاٹتا رہا، اسے لذت ملتی رہی۔

عظمتِ رسالت ﷺ باتوں سے دل میں جاگزین نہیں ہوتی، یہ برکات سے ہوتی ہے۔ جیسے آپ کسی کو گنے کی کاشت سے لے کر اس کا رس نکالنے اور اس سے شکر بنانے تک کے سارے مراحل سمجھاتے اور اس کی مٹھاس تک کا سارا فلسفہ بتاتے رہیں، بات اثر نہیں کرے گی۔ ایک چٹکی شکر کھلا دیں، سمجھ آجائے گی۔ اسی طرح

انوارات و برکاتِ نبوی ﷺ اگر دل کو نصیب ہو جائیں تو نہ بدلنا اس کے بس میں نہیں رہتا۔ بدلے گا کیسے نہیں! لیکن اگر برکات نصیب ہی نہ ہوں تو الگ بات ہے۔

مذہبی اجارہ داری

آپ مذاہبِ عالم پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ مذہبی رہنماؤں یا پیشواؤں کی ان کے مذہب پر اجارہ داری ہے۔ اہلِ کتاب میں آپ دیکھ لیں، یہودیوں کا پیشوا عام یہودیوں کو دین نہیں سمجھاتا، عام یہودی اس کا محتاج ہے۔ عیسائی کو دیکھ لیں وہ پوپ کا محتاج ہے، ہندو کو دیکھ لیں وہ برہمن کا محتاج ہے۔ ان کے مذہبی علوم پر ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لیکن میرا محبوب ﷺ جس کے پاس حق و صداقت اور میرا کلام ہے وہ اس کلام پر اجارہ داری نہیں بناتا اور ہر آنے والے کو اس کی حیثیت کے مطابق کتاب و حکمت کی تعلیم فرماتا ہے۔ میرا نبی ﷺ کوڈ آف لائف (Code of Life) دیتا ہے، پوری زندگی کا نظام دیتا ہے اور اس پر خود یا کسی مخصوص طبقے کی اجارہ داری نہیں ہونے دیتا۔

صوفی اور غیر صوفی کی تبلیغ میں فرق

صوفیاء کی تبلیغ کا انداز علماء سے مختلف ہے۔ علماء نیکی کی نشاندہی کرتے ہیں اور صوفیاء مزاج کو نیکی میں ڈھال دیتے ہیں۔ علماء بتاتے ہیں اور صوفیا دل کے اندر اپنی اصلاح کا درد، اس کا احساس جگاتے ہیں۔ ذکرِ الٰہی ایسا بیج ہے جسے صوفیاء دل میں بوتے ہیں۔ جب وہ بیج اگتا ہے تو وہ ساری نیکیاں بندے کے مزاج میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ بندے کے اندر ذوق پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی اصلاح کرنی ہے۔ ذکرِ الٰہی سے اس کے اندر ایک تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ درست عقیدہ کیا ہے؟ پھر اس میں ایک درد پیدا ہوتا ہے کہ اسے اپنی شخصیت کو سنوارنا ہے، کردار کو سدھارنا ہے۔ ذکرِ الٰہی یہ سب احساس دل

کے اندر جگاتا ہے۔ علماء نے تعلیماتِ ظاہری حاصل کی ہوتی ہیں وہ تعلیمات کے ذریعے نیکی کے فوائد گنواتے ہیں اور صوفیاء ذکرِ الٰہی کے ذریعے نیکی کا ذائقہ چکھا دیتے ہیں۔

تبلیغ انانیت سے نہیں محبت سے

اگر تو بات اپنی ذات کی ہو، اپنی بڑائی منوانے کی ہو اور کوئی گستاخی کرے تو لڑائی ہوگی لیکن بات اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی ہو تو وہ پہنچانا ضروری ہے۔ آپ نے پہنچا دی، آپ کا حق ادا ہو گیا۔ اگر کوئی آپ کے ساتھ گستاخی کرتا ہے تو وہ جانے اور اس کا رب جانے۔ کیا بات پہنچانے میں کسی نے نبی کریم ﷺ سے گستاخی نہیں کی؟ تو جو گستاخی کرتے تھے ان کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ کیا تھا؟

مسنون طریقہ یہ ہے کہ آپ کی بات کوئی اچھے طریقے سے نہیں سنتا تو اس کیلئے دعا کریں۔ یہاں آپ کے اندر انانیت نہیں آنی چاہیے کہ میں نے کہا اور اس نے نہیں سنا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بعض اوقات ہم سے خطا ہو جاتی ہے، ہم اپنی نیت میں فرق نہیں کر پاتے کہ یہ اللہ کی رضا کیلئے کر رہے ہیں یا اپنا آپ منوانے کیلئے؟ یہ بڑا نازک سا فرق ہوتا ہے، بندے کو خود بھی پتہ نہیں چلتا۔ اسے یہ رنج ہوتا ہے کہ میں نے بات کی، اس نے میری بات نہیں سنی، میری توہین ہو گئی۔ حالانکہ اس کی توہین کیسے ہو گئی؟ نہ وہ اپنی ذات منوانا چاہتا تھا نہ ذاتی کام نکلوانا چاہ رہا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس پیغام کے پہنچانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انسان کے لب و لہجہ میں، بات کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اکثر ہم تبلیغ کے روپ میں اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں بہت نیک ہوں تو جب 'میں' والی بات آ گئی، پھر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بات تو نہ رہی۔ خلوصِ دل سے بھلائی چاہنا ہی تبلیغ کی بنیاد ہے۔

ہمارے ہاں تو یہ ہوتا ہے کہ جسے چار لفظ مل جاتے ہیں، جسے چند نمازوں کی سمجھ آجاتی ہے تو سب سے پہلے وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ وہ ہی واحد بندہ ہے جسے دین نصیب ہو گیا ہے، باقی ساری مخلوق تو بے دین ہے۔ یوں نفرت کی ایک دیوار خود کھڑی کر لیتا ہے۔ جب درمیان میں نفرت کا پردہ حائل ہو جائے تو پھر کوئی اچھی بات بھی کیوں سنے گا۔ دین کی بنیاد محبت ہے۔ نبی کریم ﷺ ہر فردِ انسانیت سے محبت فرماتے تھے، یہ محبت ہی آپ ﷺ کا پیغام دلوں تک لے جاتی تھی۔

قولوللناس علی قدر عقولھم

حدیثِ مبارکہ ہے کہ لوگوں سے ایسی بات کرو جو اُن کی عقل و فہم میں آجائے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ میری باتوں کو مت جھٹلاؤ یا میرے ارشادات کو مت جھٹلاؤ۔ اس کا اردو میں معنی یوں بنتا ہے کہ میری تکذیب نہ کرو، مجھے جھوٹا نہ کہو۔ اس کی وضاحت میں فرمایا کہ میری ایسی بات جو اپنے اندر ایک خاص عظمت رکھتی ہے، کسی ایسے شخص سے بیان کرو گے جس میں اسے سمجھنے کی استعداد نہیں ہوگی تو وہ کہہ دے گا، یہ بات غلط ہے۔ اور اس کا یہ کہہ دینا میری تکذیب کے مترادف ہے۔ کیونکہ بات تو میری تھی لیکن اس تکذیب کا سبب وہ شخص ہوگا جو اس بات کو کسی نااہل کے سامنے نقل کر رہا ہوگا۔

اس لئے مکاشفات اور مشاہدات کو اپنے ہم سبق لوگوں کے سامنے جو ان اسرار کو سمجھ سکیں، بیان کرنے میں حرج نہیں ہوگا لیکن ہر کس و ناکس کے سامنے بیان کرنے میں بہت زیادہ حرج ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں تو اس کے جرم میں اُس صاحب سے وہ کیفیات سلب کر لی جاتی ہیں۔ چونکہ یہ اسرارِ الٰہی خزینۂ رحمت کے بڑے قیمتی جواہرات ہیں، انہیں گلیوں میں پھینکنے کیلئے نہیں دیا جاتا۔

اس طرح کوئی کسی بھی عقیدے پر ہو، شیعہ ہو، مرزائی ہو، کوئی بھی ہو تو جب ہم

چھوٹتے ہی اسے کافر کہہ دیتے ہیں تو وہ ہم سے بھلائی کی توقع نہیں رکھتا۔ وہ ہم سے بےزار ہو جاتا ہے کہ اس نے تو مجھے کفر میں دھکیل دیا اب اس کی بات سننے کا کیا فائدہ۔ اس طرح ہم باطل فرقوں کو بلند آواز سے اور نعرہ بازی کر کے کافر اور مشرک کہہ دیتے ہیں تو جواباً وہ ہم سے اصلاح لینے اور ہم سے عقائدِ اسلامی سیکھنے کی بجائے ہمیں کافر کافر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی بنیادی ضروریات میں سے ہے کہ عظمتِ صحابہؓ کا اقرار کیا جائے، بجائے یہ کہنے کے کہ عظمتِ صحابہؓ کا منکر کافر ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے لیکن دوسرے کو کافر کہنے کے بجائے اگر دوسرے کی ضرورت بیان کر دیں تو ممکن ہے وہ آپ کی بات پر غور کرنے لگ جائے۔

تبلیغ کا قاعدہ

☆ تبلیغ کی اولین شرط یہ ہے کہ جسے آپ دین کی بات بتانا چاہتے ہیں، آپ کو اس سے محبت ہو اور آپ خلوصِ دل سے چاہتے ہوں کہ یہ کفر سے یا کفر پر خاتمے سے یا اللہ کے عذاب سے بچ جائے۔ اس کی خیر خواہی کا جذبہ دل میں ہو تو آپ کی یہ feelings اس کے دل میں ضرور جائیں گی۔ جب اس کے دل میں بھی جائیں گی تو وہ شاید آپ کی طرف توجہ کرے۔

☆ تبلیغ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آدمی صرف باتیں ہی نہ کرے بلکہ اس کا کردار اس حق بات کی گواہی دے جس کی وہ تبلیغ کر رہا ہے۔ اس کا لین دین، ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا اور اس کی ذاتی زندگی اس ڈگر پر ہو جس پر چلنے کی وہ دوسروں کو دعوت دیتا ہے۔

☆ جن کاموں کو روکنے کی تبلیغ کی جاتی ہے، ان سے خود پرہیز کرنا بے حد ضروری ہے۔ جس کام سے ہم دوسروں کو روکنے کی کوشش کریں گے، اس بات میں اثر

تب ہی پیدا ہوگا جب ہم خود غلط کاموں سے رکنے کی کوشش کریں گے۔

☆ جب تک ہم افراد کو یا جماعتوں کو تنقید کا نشانہ بناتے رہیں گے، تب تک تبلیغ نہیں ہوگی کیونکہ لوگ اسے اپنی ذات پر حملہ سمجھیں گے۔ حق بات پیچھے رہ جائے گی، ذات آگے آجائے گی۔ کسی کو بھی تنقید کا نشانہ بنائے بغیر ہمدردی و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ نیکی کی ترغیب دلانا تبلیغ ہے۔

☆ مبلغ کو اس اہم بات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ پیغام کا پہنچانا اور نہایت دل سوزی سے پہنچانا فرض ہے، کسی سے منوانا فرض نہیں۔ اپنی ذات کی اصلاح پر محنت کی جائے اور ساتھ ساتھ محبت کے ساتھ دوسروں کو دعوت دی جائے۔

☆ کامیابی کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے کہ ہمیں توفیقِ عمل نصیب ہے اور ہم اپنا کام ذمہ داری سے کر رہے ہیں۔ بس یہی کامیابی ہے۔ لوگ کس حد تک متاثر ہو رہے ہیں یہ اللہ کریم کے دستِ قدرت میں ہے۔

☆ دین کی دعوت دینے والے کیلئے یہ ضروری ہے کہ داعی کے پاس اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بات پہنچانے کی روحانی قوت بھی موجود ہو۔ اگر اس میں روحانی قوت نہ ہو تو پھر صرف باتیں ہی رہ جاتی ہیں، کردار و عمل میں سچ اور نیت میں کھرا پن نہیں آتا۔ دینی وعظ، حکایت بن کر رہ جاتا ہے۔ ساری تبلیغ خبر کے درجے میں ہی رہتی ہے کیونکہ جو علم عمل پر آمادہ نہ کرے، وہ علم نہیں ہوتا خبر ہوتی ہے اور جو خبر عمل پر آمادہ کردے، وہ علم بن جاتی ہے خبر نہیں رہتی۔

حقیقی تبلیغ

سب سے اچھی تبلیغ وہ ہوتی ہے جو عملاً کی جاتی ہے۔ کسی کے ساتھ ہم لین دین کرتے ہیں، اس میں کھرے ہیں۔ کسی کے ساتھ بات کرتے ہیں، احترام سے کرتے

ہیں۔ کسی سے معاملہ کرتے ہیں ایمانداری سے کرتے ہیں۔ یہ خاموش تبلیغ ہے اور صحابہ کرامؓ نے یہی تبلیغ کی۔

حقیقی تبلیغ وہی ہے جو ہم کردار سے کرتے ہیں۔ اگر زبان سے ہم کسی کو اللہ کا خوف دلاتے ہیں اور عملاً اس کا مال لوٹ کر کھا جاتے ہیں تو اثر اسی کا ہوگا جو ہم نے عمل کیا ہے، ہماری تقریر کا اثر نہیں ہوگا۔ اگر ہم نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے تو وہ یہی سمجھے گا، بڑی سے بڑی تقریر ہم کرتے رہیں وہ ہمیں نیک نہیں سمجھے گا۔ عملی تبلیغ زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

بلغو عنی و لو کان آیۃ

کیفیاتِ قلبی بہت بڑی دولت ہے۔ یہ جس کسی کو نصیب ہوئی ہیں، وہ اس کے پاس رسول اللہ ﷺ کی امانت ہیں۔ اسے دوسروں تک پہنچایئے۔ یہ وہ دولت ہے جو تقسیم کرنے سے بڑھتی ہے۔ سارے مجاہدوں میں سب سے بڑا مجاہدہ اس کو آگے پہنچانا ہے۔ لوگوں کو اس کی تبلیغ کرنا، انہیں درد سے آشنا کرنا ہے۔ کوشش کیجیے کہ اللہ کی مخلوق اس سے بہرہ ور ہو اور آپ لوگوں تک اسے پہنچانے کا سبب بنیں۔ آپ جس قدر یہ مجاہدہ کریں گے، اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کے انتظامات بہتر کرتا چلا جائے گا اور آپ کو نفس اور شیطان سے بچانے کے اسباب مہیا کرے گا۔

ہم درندگی اور بے حیائی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور ہم بھول جاتے ہیں کہ کافر تو کافر ہے، وہ تو جہنم جا رہا ہے۔ ننگا ہے تو بھی جا رہا ہے اور لباس پہن لے تو بھی نہیں بچے گا لیکن ہم سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان پر محنت کی؟ کیا انہیں دیکھ کر تمہارے دل پر وہ چوٹ لگی تھی جو انہیں دیکھ کر نبی کریم ﷺ کے دل پر لگا کرتی تھی؟ کیا کبھی ہم نے سوچا ہے جس کریم ﷺ کو کافر کو جہنم میں گرتے دیکھ کر اتنا دکھ ہوتا ہے، مسلمانوں کو گناہ کرتے دیکھ کر

اسے کتنی تکلیف ہوتی ہوگی؟

یاد رکھیں! یہ جو کچھ ہم دوسروں کو نیچا دکھانے کیلئے کرتے ہیں، یہ طریق محمدی ﷺ نہیں ہے۔ طریق محمدی ﷺ یہ ہے کہ کافر کیلئے بھی، اس کے کفر کیلئے بھی درد پیدا ہو اور دکھ لگے اور اس محبت سے آدمی کہے کہ اے کاش! یہ آدمی بھی گمراہی سے بچ جاتا۔ ہمیں اسے نیچا نہیں دکھانا، اسے سرفراز کرنا ہے۔ ہمیں اسے رسوا نہیں کرنا، اسے سربلند کرنا ہے۔ ہم نے اسے پریشان نہیں کرنا، اسے عطا کرنا ہے۔

اپنی ذات تک محدود نہ رہیں

یاد رکھیے! اسلام سلامتی کا پیغام ہے۔ مسلمان وہ ہے جو یہ سلامتی کائنات میں بانٹے۔ نبی کریم ﷺ کی برکات دوسروں تک پہنچائے۔ ظلم کو روکنے کی سعی کرے اور اللہ سے بچھڑے ہوئے بندوں کو، اللہ کی یاد سے محروم بندوں کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں لانے کا سبب بنے۔

اگر کسی نے زُہد و ریاضت سے اپنے طور جنت کا اہتمام کر بھی لیا ہے تو اللہ اسے مبارک کرے لیکن شبہ اس بات پہ رہ جاتا ہے کہ اتنے خودغرض انسانوں کو شائد جنت نصیب بھی ہو یا نہ ہو۔ یعنی پوری قوم کو فساد میں مبتلا چھوڑ کر، سب کے گھر جلتے ہوئے چھوڑ کر جو صرف اپنا گھر بچانا چاہے، شاید ایسے خودغرض کی عبادات اللہ کریم قبول بھی فرمائیں یا نہ فرمائیں۔ چونکہ یہ کوئی دیانتدارانہ عمل نہیں ہے، یہ کوئی دیانتدارانہ سوچ نہیں ہے کہ میں تو جنت پہنچ جاؤں باقی جائیں بھاڑ میں۔ دوسروں کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کرنے والے کو شاید اللہ دوسروں سے پہلے جنت میں پہنچا دے۔

بات کرنے میں جھجک کیوں

اصول یہ ہے کہ جب کوئی برتن بھر جاتا ہے تو چھلکتا ہے اور جب وہ چھلکتا ہے تو دوسروں کے حصے میں بھی پانی آتا ہے۔ جبکہ ادھورے برتن کو چھلکاتے رہیں، ایک شور تو ہوگا مگر چھلکے گا کچھ نہیں۔ ایمان سے دل لبریز ہو جائے تو زبان سے نکلنے والے الفاظ اگلے کو متاثر کرتے ہیں۔ اپنے دل میں شک ہو تو وعظ کرتے رہو۔ لوگ سنتے تو رہتے ہیں اور مسجد سے باہر نکلیں تو کہتے ہیں بڑے غضب کی تقریر تھی، پوچھو کیا کہا ہے؟ کہیں گے، یہ تو یاد نہیں پر تقریر بڑے غضب کی تھی۔

ہم اس لیے بات نہیں کر سکتے کہ ہم خود متذبذب ہیں۔ آدھا یقین ہے، آدھی بے یقینی ہے۔ جب یقین کامل ہو جائے تو منہ سے بلا تکلف بات نکلتی ہے۔ بندہ دوسروں کو بتانا چاہتا ہے۔ ہمیں کم از کم اتنا یقین تو ہو کہ اپنے ساتھ رہنے والوں، اپنے بیوی بچوں کو، اپنے بھائیوں کو سمجھا سکیں کہ یہ درست ہے، یہ غلط ہے۔ ہر عمل کسی یقین کا مظہر ہوتا ہے، جب یقین کامل ہوگا تو عمل بلا تکلف ہوگا اور باعمل شخص کو بات کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔ بھر جانے والی جھیلوں نے کبھی دریاؤں کے راستے ڈھونڈے ہیں جب بہتی ہیں تو رستے ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔ راستے بنتے چلے جاتے ہیں۔

اس زمانے میں انٹرنیشنل میڈیا پر مشرک اور کافر بڑے اعتماد سے بندروں، چوہوں اور جانوروں کی پرستش کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہودی اور عیسائی بیہودہ، فضول، باطل اور خودساختہ رسومات کو ڈنکے کی چوٹ پر بیان کر رہے ہیں اور مسلمان اور پھر صوفی، حق بیان کرنے کے لیے جھجک رہے ہیں؟ جھجک اور گھبراہٹ نقصان کا باعث ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بندے کے اپنے یقین میں کمی ہے۔ بندہ گھبراتا ہی تب ہے جب اسے خود یقین نہیں ہوتا، جب خود یقین ہو جائے تو بندہ بات کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔

میرے بھائی! جب تمہارا سینہ بھر جائے گا اور پھر اس میں مسلسل رحمتوں کا نزول ہو رہا ہوگا، تجلیات آ رہی ہوں گی تو تم لوگوں کو مکمل اعتماد سے بتاؤ گے۔ اپنے دل کو نورِ ایمان سے لبالب بھر لو، دوسروں کو بتانے سے پہلے خود یقین کی دولت سے مالا مال ہونا پڑتا ہے۔ جس بات کی حقانیت پر یقین ہو جائے، بندہ اسے بتانے سے نہیں رکتا۔ خواہ اگلے اس کا مذاق اُڑائیں، وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ ایمان کے انوارات و برکات کی آمد جاری رہے گی تو یہ چشمہ از خود ہی بہتا رہے گا۔ اس میں میری دعاؤں کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ حق بات کہنے سے تم رُک نہیں سکو گے۔ تم جہاں جاؤ گے، اللہ کی بات کرو گے۔ گپ لگانے بیٹھو گے، ساتھ دین کی بات بھی کرو گے۔ کوئی راستہ میں مل جائے گا، جہاں باقی خیر خیریت پوچھو گے وہاں ساتھ دین کی بات بھی کرو گے۔ اور اگر آپ کے دل کا برتن ابھی آدھا بھرا ہے تو میری دعا سے یہ دوسروں کو سیراب نہیں کرے گا۔ اپنے دل کو نورِ ایمان سے اتنا بھرو کہ اس میں شک کی گنجائش ہی نہ رہے۔ برکات کو منقطع نہ ہونے دو۔ پیچھے سے آتی جائیں اور آگے بہتی رہیں گی۔ خیر القرون سے یہی طریقہ جاری ہے کہ صحابہ کرامؓ نہ تقریریں کرتے تھے نہ ہی تب اخبار و رسائل چھپتے تھے، ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے پاس کیفیات کا سمندر تھا۔ جدھر جاتے تھے، دریا بہاتے جاتے۔ لوگ ایمان سے منور ہوتے چلے جائے اور سینے ایمان و یقین سے لبریز ہو جاتے تھے۔ بندے کو چاہیے کہ اپنے ایمان کو درجۂ یقین پر لے جائے، ایمان جتنا مضبوط ہوگا، کردار میں اتنی اصلاح ہوتی چلی جائے گی۔ اگر عملی زندگی میں اصلاح نہ ہو رہی ہو تو یہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے، یہ اس بات کا اظہار ہے کہ ہم صرف زبان سے کہہ رہے ہیں دل ساتھ نہیں دے رہا۔

ہمارے پاس وہ درد شاید نہیں رہا۔ ہم کہتے ہیں، سمجھاتے ہیں لیکن اپنے سامعین کو لا الٰہ الا اللہ کی وہ پختگی نہیں دیتے۔ نبی کریم ﷺ جب فرماتے ہیں "لا الٰہ"..... تو

ماننے والے کو بدن کا ہر باڈی سیل کہتا ہے کہ "لا الٰہ"..... یہ فرق ہے تبلیغ میں۔ نبیؐ صرف فلسفہ ہی نہیں دیتا، نبیؐ فلسفہ کے ساتھ feelings بھی دیتا ہے۔ نبیؐ کہتا ہے اللہ کو سجدہ کرو تو دل کو سجدہ کرنے کی بھوک لگتی ہے۔

ہمیں اس درد، اُس دوا کی ضرورت ہے۔ اللہ کو محض سجدہ نہیں، سجدے کی روح چاہیے۔ بے جان اور بے کیف سجدے اس گندے وجود کے، جس میں پاکی کم اور نجاست زیادہ ہے۔ جس کا گوشت حرام ہے، جس کا خون کپڑے کے ساتھ لگ جائے تو ناپاک ہو جاتا ہے تو باقی اس میں بچتا کیا ہے؟ یہ تو سارا ہی نجس ہو گیا۔ اس سارے وجود میں "لا الٰہ الا اللہ" ہی ہے جو اسے معزز کیے ہوئے ہے۔

دعوت دو، زبردستی نہ کرو:

دعوت دینی چاہئے، زبردستی نہیں کرنی چاہئے لیکن راغب کرنے کی کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ جب غلط کام کرنے والے دوسروں کو راغب کرنے کی محنت کرنے سے نہیں اکتاتے تو ہم حق کے اظہار کیلئے، سچ بتانے کیلئے کیوں لگاتار محنت نہیں کر سکتے؟ کوئی مانے یا نہ مانے، محنت کرتے رہنے سے ہمارا حق ادا ہو جائے گا۔ میدانِ حشر میں بعض ایسے انبیاء کرامؑ بھی تشریف لائیں گے جن کی زندگی بھر کی محنت کے بعد کسی ایک فرد نے بھی ان کی بات نہ مانی ہوگی۔ بلکہ بات ماننے کی بجائے انہیں ظلماً شہید کر دیا گیا ہوگا لیکن اس سے ان کی محنت میں کمی نہیں ہوئی ہوگی لہٰذا منوانا شرط نہیں ہے، بتانا شرط ہے اور خلوص سے بتایا جائے تو بہت کام ہو سکتا ہے۔ اس کی فضیلت یہ ہے کہ جتنا کوئی اس دولت کو تقسیم کرے گا، مزید کئی گنا اس کو پالے گا۔ آج ہمیں دعوتِ اخوت و محبت دیتے ہوئے لوگوں کی ناراضگی سے، لوگوں کے طعنوں سے، لوگوں کی باتوں سے ڈر لگتا ہے لیکن کون سا طعنہ، کون سی ایسی بات ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کو نہ کہی گئی ہو۔ کون سی ایسی ایذا ہے جو آپ ﷺ کے

راستے میں نہ لائی گئی ہو؟

کسی بھی چیز کا اشتہار ہو، خواہ ٹیلی فون سیٹ کا ہو یا فون کنکشن کا، دوا کا اشتہار ہو یا کپڑوں کا، ان اشتہارات میں موقع محل کے بغیر بے حیائی پھیلانے والے تو مستعد رہیں اور نیکی بتانے والے اس حجاب میں رہیں کہ یہ بات کہنے سے فلاں ناراض ہوگا یا یہ بات کہنے سے لوگ مجھے کیسا سمجھیں گے۔ گویا میں اور آپ بڑے اور اللہ کا دین معاذ اللہ کمتر ہے۔ برائی پھیلانے والے اتنی محنت کر رہے ہیں، پوری کوشش صرف کر رہے ہیں تو آپ لوگوں سے بھی سوال ہوگا کہ نیکی کی ترویج کیلئے کیا کیا؟

میڈیا کا جائز و ناجائز استعمال

مشین (کیمرہ) کے استعمال میں حرمت نہیں ہے، اس کا استعمال یا حلال ہے یا حرام۔ اگر لوگ اس سے بے حیائی پھیلا رہے ہیں تو آپ اس کے ذریعے حیاداری کا پیغام پھیلائیں اور اس میں جو تصویر ہے درحقیقت یہ تصویر بھی نہیں ہے، اس ٹی وی کو توڑ کر دیکھیں تو اس میں تصویر نہیں ہے، اس میں عکس ہے جو آپ بازار سے گزرتے ہیں تو آپ کو دوکانوں کے شیشوں میں اپنا نظر آتا ہے، آپ دریا سے گزرتے ہیں تو پل کے نیچے اپنا عکس نظر آتا ہے، آپ تالاب پہ، حوض پہ جاتے ہیں تو اس میں نظر آتا ہے، اس طرح یہ عکس ہے، اس میں مجسم تصویر نہیں ہے۔

مجھے وہ سارے زمانے یاد ہیں کہ شروع میں لاؤڈ سپیکر پر یہ پابندی تھی کہ اس پر نماز نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے مفتیوں نے یہ فتوے دیئے تھے۔ بعض احباب ابھی تک مکبر کھڑے کرتے ہیں۔ پھر ریڈیو آگیا تو مخالفت کا سارا زور ریڈیو پر لگ گیا۔ پھر ریڈیو کے ساتھ ٹیپ آگئی، پھر ٹی وی آگیا تو ریڈیو کا استعمال جائز سمجھا جانے لگا اور ہر مسجد میں، ہر سٹیج پر وہ ٹیپ چلی گئی اور اس کی اجازت ہوگئی۔ اب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی بھی مخالفت کی جارہی

ہے یعنی ہم پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں حالانکہ زمانہ آگے بڑھ کر کام کرنے سے کنٹرول ہوتا ہے، پیچھے رہ جانے سے نہیں ہوتا۔

ذرائع ابلاغ کا جائز استعمال:

پورے عالمِ اسلام میں گنتی کے چند چینلز ہیں جن پر قرآن و حدیث اور فقہی مسائل بیان ہوتے ہیں۔ باقی تمام مسلمان ممالک کے ٹی وی چینلز علی الصبح برکت کیلئے پندرہ منٹ قرآن اور اس کے ترجمے کیلئے رکھتے ہیں، اس کے بعد خرافات شروع ہو جاتی ہیں اور پھر چوبیس گھنٹے خرافات ہی نشر ہوتی رہتی ہیں۔ درمیان میں کہیں آدھ گھنٹہ، بیس منٹ دینی پروگرام کیلئے وقت دے دیا جاتا ہے، اس میں نعت کے نام پر موسیقی کے ساتھ نغمے گائے جاتے ہیں، قوالیاں ہوتی ہیں، یوں دین کے تقاضے پورے کئے جاتے ہیں۔

مقامِ حیرت ہے کہ ملک بھر کے سیاسی علماء نے کبھی ذرائع ابلاغ کو دینی تعلیم دینے کا ذریعہ کیوں نہیں بنایا، انہوں نے اس کیلئے کبھی حکومت سے مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ میرے پاس بھی کمپیوٹر ہے، صبح کا ذکر بھی کمپیوٹر، انٹرنیٹ پہ ہوتا ہے اور شام کا بھی اور روئے زمین سے افراد اس میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ تاریخِ اسلامی میں پہلی دفعہ ہو رہا ہے کہ ایک مرکز سے ذکر ہوتا ہے اور روئے زمین پر کوئی نہ کوئی اس ذکر میں ساتھ شامل ہوتا ہے۔ اس کمپیوٹر کو لاٹھیاں مار کر توڑیں گے تو کیا حاصل ہوگا؟ کیا روئے زمین پر دین کا پیغام پھیلانے کا کام کر سکیں گے ہم؟

مولوی صاحب بہت پیچھے رہ گئے، ٹی وی توڑتے پھرتے ہیں۔ اصل فحاشی تو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پر ہے، اس کی ابھی انہیں خبر نہیں۔ آج تک کمپیوٹر توڑنے کی خبر مجھ تک نہیں پہنچی، شائد اس کا انہیں پتہ نہیں چلا۔ اِس کمپیوٹر پر آپ لا الہ الا اللہ کا پیغام بھی پہنچا سکتے ہیں۔ بے شمار اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کے روزانہ مضامین اس انٹرنیٹ پر آتے

ہیں، دینی سوالات کے جوابات دیتے ہیں، دینی بیان ہوتے ہیں۔ یہی باتیں جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں یہ رات کے ذکر کے بعد روئے زمین کے لوگ سن سکیں گے۔ الحمدللہ! اللہ نے توفیق دی کہ اس جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کیا جائے اور لوگوں کے دلوں میں روشنی اور تزکیہ دور دراز کے ممالک میں بھی پہنچایا جائے جہاں سے وہ لوگ آ نہیں سکتے اور ہم جا نہیں سکتے۔

ذرائع ابلاغ کا ناجائز استعمال:

نبی کریم ﷺ کی پیشگوئیوں میں یہ موجود ہے کہ فتنوں کی بارش ہوگی۔ ہمارے ہاں جو ٹیلیویژن کا سسٹم ہے اور الیکٹرونک میڈیا میں اس طرح کے نیٹ ورک آ گئے ہیں کہ اُن سے، اس طرح ہر گھر پہ برائی کی تعلیمات، اخلاق سے گری ہوئی باتیں اور بے حیائی برسائی جا رہی ہے، جس طرح بارش برستی ہے اب ٹی وی سے بات آگے کمپیوٹر کے انٹرنیٹ پر چلی گئی ہے۔ انٹرنیٹ پر ایسی بے حیائی پھیلائی جا رہی ہے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ دنیا اب گلوبل ولیج بن گئی ہے۔

اب ایک طرف سے فتنوں کی بارش اس طرح برس رہی ہے لیکن دوسری طرف بارش سے بچنے کا جو سد باب کرنا تھا، جو خیمہ ہمارے پاس تھا وہ آدھا آدھا ہم نے بانٹ لیا ہے۔ آدھا قوم کے ایک حصے کے پاس ہے، آدھا دوسرے کے پاس ہے، دونوں اس بارش سے بچ نہیں پا رہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ دینی تعلیمات کو، اخلاقیات کو اور ایمانیات کو بھی میڈیا کے ذریعے عام کیا جاتا۔

کیا کریں؟

میرا مسلک یہ ہے کہ ٹی وی ہو یا اور ذرائع ابلاغ، ان کو بھی مسلمان کیا جائے اور اسلامی مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے۔ اس دور کی ساری ایجادات سے مثبت کام لیا

جائے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جتنا غیر مسلم بے حیائی کو پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے مسلمان انہی ذرائع کو استعمال میں لا کر ایمانیات کو، اخلاقیات کو، تعلیماتِ آقائے نامدار ﷺ کو اس سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں۔

عبادات

فرض عبادت کا مفہوم

کسی ہستی کی اطاعت اس ڈر سے کہ اُس کی اطاعت نہ کی تو نقصان ہو جائے گا یا نفع کی امید پر کہ اس کی اطاعت کی تو نفع پہنچائے گا، عبادت کہلاتا ہے۔ یعنی کسی سے بھی امیدیں وابستہ کر لی جائیں اور اس کی خوشنودی کے کام کیے جائیں۔ اُس کو راضی کرنے کیلئے کچھ اُمور انجام دیئے جائیں یا یہ خطرہ ہو کہ اگر یہ ہستی ناراض ہوگئی تو میرا بہت نقصان ہوگا، اس ہستی کی عبادت کہلائے گا۔ اللہ کریم نے جو عبادات فرض کی ہیں ان کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ اللہ کی رضامندی حاصل ہو اور اللہ کریم کے انعامات حاصل ہوں۔

عبادات انسان کی ضرورت ہیں جب ہی تو اللہ کریم نے فرائض عطا فرمائے ہیں۔ فرض کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو ایسی چیز عطا کر دی جائے جس کا وہ انتہائی ضرورت مند ہو۔ جس کے بغیر اس کی زندگی ممکن نہ ہو تو اس عطا کو فرض کہتے ہیں۔ سو فرائض کوئی بوجھ نہیں ہیں جو لادا گیا ہے بلکہ نوعِ انسانی ادائیگیِ فرائض کے بغیر بنی آدم تو ہے، انسان نہیں۔

عبادات کا حکم کیوں؟

عبادات کس لئے ہیں؟ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ سارے فرائض کس لئے ہیں؟ یہ ایک فرد کو سانچہ ایمان میں ڈھالنے کیلئے، پورا پورا فٹ (Fit) کرنے کیلئے ہیں۔ جتنے سجدے کیے جائیں وہ آپ کی ذات میں تبدیلی لائیں گے۔ تسبیحات پڑھتے جائیں، آپ کی ذات میں تبدیلی لائیں گی۔ جتنی تلاوت کرتے جائیں آپ کی ذات میں تبدیلی آئے گی۔ یہ ساری عبادات ایک فرد کیلئے ہیں، یہ عبادات فرد پر یہ اثر کریں گی کہ وہ اس سانچے میں ہو بہو ڈھلتا جائے گا جو ایمان کے فریم ورک کا تقاضا ہے۔

اب اس کے بعد اسلام شروع ہوتا ہے یعنی وہ سانچے میں ڈھلا ہوا شخص اور ایک ایسا شخص جسے ایمان نصیب نہیں دونوں بازار میں ملتے ہیں تو اُن میں کیا فرق ہے؟ دونوں کماتے ہیں تو اُن میں کیا فرق ہے؟ دونوں دوستی کرتے ہیں تو اُن میں کیا فرق ہے؟ ہر معاملے میں دونوں کے عمل کا فرق بتا دیتا ہے کہ اُن میں کون سا فری لانسر (Free Lancer) ہے اور کون سا ایک حد کے اندر محدود ہے۔ یہ اسلام ہے اور اس کے باہر کفر ہے۔ عبادات کا تعلق اس فرد کو سنوارنے سے ہے، اسلام کا تعلق پوری انسانی زندگی کو سدھارنے سے ہے۔

بندۂ مومن کی عظمت

ہر بندۂ مومن اتنا اہم، اتنا قیمتی ہے کہ اس کا نظام الاوقات (Time Table) اللہ رب العزت ترتیب دیتے ہیں۔ اسے کب سونا ہے، کب جاگنا ہے، کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا ہے؟ ہر مومن کی اتنی عظمت ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ اسے نظامِ حیات عطا فرماتے ہیں۔ اب اس کا احساس اسے ہو یا نہ ہو۔ پوری حیاتِ طیبہ میں دیکھ لیں۔ اسوۂ حسنہ میں امت کے لیے، ترتیب، نظامِ اوقات، ذمہ داریاں اور کام موجود ہے۔ جہاں افراد نے اپنے معمولات کی ترتیب خراب کی، وہاں سے امت کا زوال شروع ہوگیا اور جب کسی بندۂ حق نے اللہ کی توفیق سے یہ ترتیب قوم کو لوٹا دی، وہاں سے پھر اقبال مندی کی طرف چل پڑے۔

عبادات کا مقصد و حاصل

عبادات کا اصل مقصد یہ ہے کہ دل میں ایک کیفیت پیدا ہو جائے جو اللہ کی اطاعت کو آسان کر دے اور اس کے لیے جو چیزیں چھوڑنی پڑیں، ان کو چھوڑنے کی جرأت آجائے۔ جہاں سے اللہ کریم روک دیں، وہاں سے رکنے کی طاقت آجائے۔ جس طرف

اللہ کریم حکم دیں اُس طرف چلنے کی طاقت پیدا ہو جائے۔ ذکر، مراقبہ، تسبیحات، عبادت، یہ ساری محنت اور توجہ بھی اس لئے کی جاتی ہے کہ آدمی میں اتباعِ شریعت کی قوت پیدا ہو جائے اور وہ شریعت کو بوجھ نہ سمجھے بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھے۔ شریعت پر عمل کرنے میں کوفت نہیں بلکہ لذت آئے۔

عبادات کا حاصل ہی یہ ہے کہ بندے کو اپنے مالک کی عبدیت حاصل ہو جائے۔ اپنے بندہ ہونے کا تعلق اور شعور پختہ ہو جائے۔ اُسے حق الیقین ہو جائے۔ اُسے یہ احساس ہو کہ مجھے وہ کرنا ہے جو میرے پروردگار کو پسند ہے اور جس سے اس نے روک دیا ہے، اس سے رک جانا ہے۔ عبادات کا حاصل ہے کہ اللہ کریم کی پہچان اور معرفت نصیب ہو جائے، نورِ ایمان اور نورِ یقین نصیب ہو جائے۔ یہ احساس زندہ ہو جائے تو تھوڑا سا عمل بھی بلندیٔ درجات کیلئے کافی ہے۔ احساس نہ ہو تو سارے اعمال محض اداکاری بن کر رہ جاتے ہیں۔

عبادات سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ اللہ کی قدرتِ کاملہ پر یقین نصیب ہوتا ہے۔ اللہ سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اللہ کی ناراضگی کا ڈر محسوس ہوتا ہے اور یہ ساری چیزیں مل کر اس کی عملی زندگی کی اصلاح کا سبب بن جاتی ہیں۔ یہی عبادت کا معاوضہ ہے جو عملی زندگی میں ملتا ہے اور اس پر انعام آخرت میں ملے گا۔ ہم عبادات تو ساری کر لیتے ہیں، عبادات کے نتیجے سے پھر بھی محروم رہتے ہیں۔ کاروبار و ملازمت میں بددیانتی اور رشوت سے مال اکٹھا کر کے ہم عمرے پر چلے جاتے ہیں۔ عبادات کا حاصل فرد کی اصلاح تھا ہم نے اسے اپنے مسلمان ہونے کا اشتہار بنا لیا۔ اپنے اوپر اسلام کا ایک خول چڑھا لیا ہے، اندر سے بندہ وہی ہے، اس کی خواہشات وہی ہیں، اس کا کردار وہی ہے۔ اگر نمازیں اور ظاہرداری نہیں ہے اور برکاتِ نبوت ﷺ واقعی دل میں اتر رہی ہیں تو عملی زندگی میں

خوبصورت تبدیلی آنا شروع ہو جائے گی۔

عبادات میں یکسوئی و حضوری

اصولِ فطرت بھی یہی ہے کہ ایک وقت میں پوری توجہ سے ایک کام کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی میدانِ جنگ میں ہے تو اس کی پوری توجہ میدانِ جنگ پر مرتکز ہونی چاہئے کہ دشمن کہاں ہے، وہ خود کہاں ہے، دشمن کہاں سے حملہ کرے گا، اسے کیسے دفاع کرنا ہے، اور وہ اس حملے میں کامیابی کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ میدانِ جنگ میں بیٹھ کر یہ سوچتا رہے کہ اس کی کھیتی باڑی کا کیا ہوگا، اس کے بچے کیا کر رہے ہوں گے؟ تو پھر وہ مقابلہ نہیں کر سکے گا اور مارا جائے گا۔ مقصد کو متعین کرنا اور مقصد پر پوری طرح متوجہ ہو کر محنت کرنے کو صوفیاء کی اصطلاح میں توحیدِ مقصد کہتے ہیں۔

یہی اصول ہر کوئی دُنیوی کاموں میں بھی اپناتا ہے حالانکہ کسی کو دُنیوی کاموں میں یہ بات سمجھانا نہیں پڑتی البتہ جو چند منٹ، چند رکعاتِ صلوٰۃ ادا کرنے میں خرچ ہوتے ہیں، ان میں بھی ہزار بکھیڑے اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں اور قلب غافل رہتا ہے۔ ہم تو ایسے بدنصیب ہیں کہ ہمیں حضورِ حق کا احساس نمازوں میں بھی نہیں ہوتا، نماز بھی ایک عادت کے طور پر پڑھتے ہیں۔ وضو کیا، کھڑے ہو گئے، الفاظ زبان سے نکل گئے، انجامِ کار یہ بھی یاد نہیں ہوتا کہ تین رکعتیں پڑھیں یا چار۔ حضورِ حق کی بات تو دُور ہے خود نماز کا بھی خیال نہیں ہوتا کہ کم از کم رکعتیں تو یاد رکھیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دوکانداری، کھیتی باڑی، ملازمت یا کاروبار ہر شخص پورے انہماک سے کرتا ہے تاکہ اسے کچھ حاصل ہو، جب دین کی باری آتی ہے تو ہم سے ہر چیز خلط ملط ہو جاتی ہے، کیوں؟

عبادات میں کم از کم ذہنی طور پر اور قلبی طور پر یکسوئی اختیار کریں اور اپنی سوچوں اور اپنے عمل کو ایک مرکز پر مرتکز کریں تاکہ کچھ حاصل ہو۔ اگر اپنی سوچوں کو منتشر رکھیں گے تو

توجہ تقسیم ہو جائے گی، ذہن بٹ جائے گا تو قلبی یکسوئی نہ رہے گی۔

عبادات پہ گھمنڈ:

گناہ میں اور بے عملی میں ایک بات ہے، آدمی کے دل میں کسی حد تک کوئی عجز رہتا ہے کہ میں کام نہیں کر رہا یا میں غلط کر رہا ہوں۔ اگر ایمان ہی چلا جائے تو الگ بات ہے لیکن کچھ رمق ایمان کی ہو تو احساس رہتا ہے کہ میں اگر نماز نہیں پڑھتا تو میں اچھا نہیں کر رہا، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ کم از کم اپنے آپ کو گناہ گار، خطا کار اور کمزور سمجھتا رہتا ہے۔ بعض اوقات اس کا یہ احساس ہی بحیثیتِ توبہ قبول کر لیا جاتا ہے اور اسے نیکی کی توفیق عطا کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ جو عبادت پہ گھمنڈ آ جاتا ہے، اس سے آدمی توبہ نہیں کرتا، ایسے ہی مر جاتا ہے۔ یہ ایسا فتور ہے کہ اگر عبادت کرنے کے بعد اسے اپنی عبادت پہ غرور آ جائے کہ میں نے بڑا تیر مارا، میں بڑا پارسا ہوں، میں بڑا نیک ہوں، میں بڑا فاضل ہوں، مجھ جیسا جہاں میں کوئی نہیں تو اسی تکبر میں مارا جاتا ہے، پھر اسے واپسی کا راستہ بھی نہیں ملتا۔

دکھاوے کی عبادات:

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہماری عبادات بھی نمائش کا سبب بن گئیں، ہم عبادات کے ذریعے اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتے ہیں۔ ہم اوپر اسلام کا لیبل لگائے رکھنا چاہتے ہیں، اندر خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ ہمارے لئے لمحۂ فکریہ ہے کیونکہ قوموں کے زوال میں اس بات کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ شرابیوں، چوروں اور بددیانتوں کا حصہ تو ہوتا ہی ہے لیکن اگر حاجی اور نمازی بھی زوالِ امت کا سبب بن گئے تو پھر یہ قوم کیسے بچے گی؟ آج جبکہ نمازی اور بے نمازی کی عملی زندگی ایک جیسی ہے۔ ہمارے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو چھوڑ دیں اور ارشاداتِ پیغمبر ﷺ کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیں۔ ہم اپنی بڑائی کے گھمنڈ سے نکل آئیں اور اللہ کی بڑائی قبول کر لیں۔ بیک وقت دو ہستیاں بڑی نہیں ہو سکتیں

کہ ہم یہ تو کہیں کہ اللہ کو بڑا مانتے ہیں اور ساتھ اپنے آپ کو بھی بڑا سمجھیں۔ اگر اللہ بڑا ہے تو ہماری کوئی حقیقت نہیں اور اگر اپنی بڑائی میں مبتلا ہیں تو پھر عظمتِ الٰہی کو فراموش کر چکے ہیں۔

عبادات میں سستی اور لاپرواہی:

ہمارے دلوں میں دین کی اہمیت نہیں، ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات کی پروا نہیں، اسی لئے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو ہماری پروا نہیں۔ ہر بات تو حکومت پر جا کر نہیں ٹھہرتی، کچھ رویوں کے تو ہم خود بھی ذمہ دار ہیں۔ ایک عام آدمی کی زندگی سے مثال دیکھی جا سکتی ہے۔ غریب مزدور کے پاس بھی فرصت نہیں کہ وہ نماز ادا کرے۔ جو نمازی ہیں، ذرا زکام ہو جائے تو سب سے پہلے نماز چھوٹے گی باقی سارے کام خراب طبیعت کے ساتھ ہوں گے۔ کھانا کھا لیا، سو گئے، دوکانداری بھی کر لی، صرف چھوٹی تو نماز ہی! اور جو پڑھتے ہی نہیں، وہ بالکل ہی بادشاہ ہیں کہ انہیں اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ یہ اہمیت ہے دین کی، اسی لئے آوارہ گولیوں سے مارے جاتے ہیں۔ جب دین سے لاپرواہی ہو گی تو یہ نتائج یقیناً نکلیں گے۔

دنیوی استدراج اور شعبدے حاصل کرنے کیلئے کافر اور ہندو بھی کتنی کتنی محنت کرتے ہیں۔ کتنی کتنی لمبی چلہ کشیاں کرتے ہیں، سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں کہ کچھ شعبدہ بازی حاصل ہو جائے۔ یہاں ہمارا عالم یہ ہے کہ ذرا طبیعت خراب ہو تو سب سے پہلے چھوٹتا ہی ذکر ہے اور اس کے بعد اللہ کی عبادت اور نماز کی باری آتی ہے۔ یہ دفتری کام یا کاروباری کام یا دوکانداری تو تب چھوٹتی ہے جب بستر سے اٹھنے کے قابل نہ رہیں۔

آپ مساجد میں دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ نمازی کتنی جلدی میں ہوتے ہیں۔ بھاگنے کو تیار ہوتے ہیں۔ وضو کر رہے ہیں تو ٹم ٹم، کوئی جگہ خشک کوئی گیلی۔ رکوع

کرتے ہیں تو قومہ میں آتے ہی نہیں، نیچے دھڑام سے لگتے ہیں۔ سجدہ کرتے ہیں تو درمیان میں جلسہ نہیں کرتے، جس طرح مرغ چگتا ہے ویسی ہی دو ٹھونگیں لگائیں۔ یہ سب کیا ہے، کیا مصیبت ہے، کوئی بندوق والا پیچھے لگا ہوا ہے؟ مسجد سے نکلیں گے، گلی میں بیٹھ کر حقہ پینے لگ جائیں گے، گپیں لگانے لگ جائیں گے، سارا دن بیٹھے رہیں گے۔ اگر اتنے ہی فارغ ہیں تو نماز مزے سے کیوں نہیں پڑھی؟ اس لئے کہ نماز تھی ہی نہیں۔ رسمی اٹھک بیٹھک تھی۔ حلال کھایا نہیں، سچ بولا نہیں، دیانتداری کی نہیں، دین رہا نہیں تو گویا نماز ایک ایکسرسائز (exercise) ہے۔ مفت میں گلے پڑی ہوئی ایک مصیبت ہے۔ اس سے جان چھڑا کر بھاگنا ہے۔ اسلام بندے کا دین ہو تو مسجد میں جا کر وہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے مچھلی پانی میں پہنچ جاتی ہے۔ سکون آ جاتا ہے، مزہ آ جاتا ہے۔ دل کرتا ہے چند لمحے اور بیت جائیں جبکہ منافق مسجد میں آتا ہے تو اس کا عالم یہ ہوتا ہے جیسے پرندے کو پنجرے میں ڈال دو، پھڑ پھڑاتا ہے کہ کب یہاں سے نکلوں۔

عبادات کے بارے میں غلط فہمی:

ہم نے یہ سمجھ رکھا ہوتا ہے کہ جب آدمی ذکر کرتا ہے یا عبادت کرتا ہے یا نیکی کا کوئی کام کرتا ہے تو شاید اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ اس کے راستے میں کوئی مشکل ہی نہ آئے۔ اسے بیمار ہونا چاہئے، نہ افلاس و تنگ دستی آنی چاہئے، نہ ہی اس پر کوئی دنیوی پریشانی آنی چاہئے۔ یہ محض غلط فہمی ہے۔ اسی طرح ایک غلط فہمی اور بھی ہے کہ ہم اللہ اللہ کریں تو سارے لوگ ہماری تعریف کریں گے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ جو میری راہ پر چلتے ہیں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے، اس کا معنی یہ ہوا کہ نیکی کی راہ پر چلنے والوں کو لوگوں کے طعنے بھی سننا پڑتے ہیں۔

بے شمار لوگ یہ بات کرتے ہیں، خط بھی لکھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ میں

نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں، دو وقت ذکر بھی کرتا ہوں پھر بھی میرا بیٹا بیمار ہو گیا، میری دوکان میں نقصان ہو گیا۔ کبھی کوئی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ عبادات کی توفیق اللہ نے اپنی معرفت کیلئے دی ہے، دوکان چلانے کیلئے نہیں دی۔ عبادات کا ثمر، عبادات کا پھل یہ نہیں کہ آپ دوکانداری اچھی کر لیں۔ جو ایمان نہیں لاتے، جو کافر ہیں، ان میں بھی بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کی تجارت روئے زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ اگر ہم نے عبادت کر کے وہ حاصل کرنا ہے جو کافر کے پاس بھی ہے تو پھر عبادت کے تکلف کی کیا ضرورت ہے؟

ہاں! اگر کسی کے نزدیک نورِ یقین، نورِ ایمان، اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ پہلے درجے پر ہے اور اس کے بعد دنیا ہے تو منجانب اللہ وہ مسبب الاسباب، اسباب پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے اور دنیوی مسائل کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ کہیں ہمیں سمجھ آتی ہے، کہیں ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا اور کام ہوتے رہتے ہیں، مصیبتیں ٹلتی رہتی ہیں، مسائل حل ہوتے رہتے ہیں۔

دوسروں کو اپنا ماتحت نہ سمجھیں:

میں ایک دن آیا تو ایک ساتھی بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ ایک آدمی پانی ڈال رہا ہے، ایک ہاتھ دھو رہا ہے، ایک پاؤں دھو رہا ہے۔ میں کھڑا ہو گیا، میں نے پوچھا کیا ہو رہا ہے؟ فرمانے لگے میری ٹانگوں میں درد ہوتا ہے اور میں ہاتھ بھی نیچے نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا، اس کیلئے یہ پانچ بندے مکلف نہیں ہیں جو آپ کو وضو کرا رہے ہیں۔ آپ وضو نہیں کر سکتے تو آپ تیمم کر کے نماز پڑھ لیں۔ یہ بندے روزانہ کہاں سے آئیں گے آپ کو وضو کرانے؟ اگر آپ سلسلے میں نہ ہوتے۔ صاحبِ مجاز نہ ہوتے تو کیا یہ آپ کی بات مانتے؟

میری ساتھیوں سے گزارش ہے کہ لوگوں کو آزمائش میں نہ ڈالیں۔ خدا کیلئے اس انداز سے سوچو کہ اللہ نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ خدا کیلئے اس حقیقت کو سمجھو اور یہ

بھی میری گزارش ہے کہ شیطان بھی فارغ نہیں بیٹھا ہوا، وہ بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ معصوم صرف نبیؑ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو صاحب مجاز بنایا جاتا ہے یا منصب دیا جاتا ہے یا امیر بنایا جاتا ہے تو وہ یہ سمجھے کہ مجھ پہ ایک بھاری ذمہ داری آ گئی ہے، میں پھنس گیا۔ دوسروں کو اپنا ماتحت نہ سمجھیں۔

عبادات پر محنت اور اجر:

ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہم نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، دوسری عبادات بھی کرتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ عملی زندگی پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ دین کے ہر حکم، ہر عمل کا اجر نقد ملتا ہے۔ اگر نہیں ملتا تو اس کا مطلب ہے کہ دین پر عمل کرنے میں کہیں نیت میں کوتاہی ہے، کہیں خلوص میں کمی ہے یا عمل کرنے کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔

عبادات عملی زندگی کو صحیح راستے پر ڈالنے کا ذریعہ ہوتی ہیں اور اجر عملی زندگی پر ہی مرتب ہوتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے کا پہلا انعام ہے بے حیائی اور برائی سے بچ جانا۔ یہ تو نقد ہوا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (العنکبوت:45) بخار کے لیے ایک دوا ہے۔ آپ دوا کھاتے ہیں لیکن بخار پہ کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو آپ بد پرہیزی بہت زیادہ کرتے ہیں یا دوا کی مقدار کم ہے یا پھر وہ خالص نہیں نقلی ہے۔ اسی طرح جب ہم نماز، روزہ، عبادات کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ گناہ بھی جاری رکھتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ جو دوا ہم کھا رہے ہیں وہ خالص نہیں ہے، اس میں اثر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہر آدمی صرف خود کو بہتر جانچ سکتا ہے دوسرے کو نہیں۔ یہ بھی ایک رواج ہو گیا ہے کہ ہم دوسرے پر چیک رکھتے ہیں کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ حالانکہ ہم دوسرے کے بارے میں حتمی رائے نہیں دے سکتے۔ اپنی سمجھ

ضرور آتی ہے کہ میرے کردار میں کتنی کمی تھی اور جب مجھے اللہ نے عبادت کی توفیق دی تو کتنے گناہ کم ہوئے۔ ولذکر اللہ اکبر ذکر کی تو پھر بات ہی کیا، یہ تو بہت بڑی نعمت ہے۔ یعنی کسی دوائی کی آپ طاقت بڑھانا چاہتے ہیں تو اس میں مختلف دو تین دوائیں ملا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مختلف وٹامنز، اس کی طاقت بڑھانے کے لیے ایک ٹیبلیٹ میں جمع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا اگر کسی کو ذکرِ دوام نصیب ہو جائے تو اس سے بڑی کوئی بات ہی نہیں، اس سے بڑا تو کوئی علاج ہی نہیں۔

ہر تسبیح اپنے ساتھ ایک الگ کیفیت لاتی ہے، ہر کلمۂ حق، ہر نیک عمل اپنے ساتھ ایک الگ قسم کا لطف اور ایک الگ قسم کا درد اور ایک الگ قسم کی توجہ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہماری طرف سے کمی ہوتی ہے، پھر ہم شکوہ کرتے ہیں کہ کچھ ملتا ہی نہیں۔ اب کھوٹا روپیہ لے کر جائیں، کیا ملے گا؟ جب نیت میں خلوص نہیں ہوتا تو سکہ ہی کھوٹا ہوتا ہے، ملتا کچھ نہیں۔ محنت، کوشش، خلوص میں کمی کی وجہ سے بعض دفعہ عبادت کا صلہ کم ہوتا ہے، اتنا کم ملتا ہے کہ ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔ بعض اوقات بہت زیادہ بھی ملتا ہے۔ بعض اوقات ایک چھوٹا سا نیک عمل کسی بہت بڑی برائی سے بچانے کا سبب بن جاتا ہے تو جب اللہ کریم اسے ہمارے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ وہ مصیبت ہمارے سامنے نہیں آتی تو ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس چھوٹے سے عمل سے میں کتنی بڑی مصیبت سے بچ گیا ہوں۔ نیک عمل کا فوری اجر اصلاحِ احوال ہے، بندہ سدھر جاتا ہے۔

اگر مجاہدات کرنے سے ہم میں قربِ الٰہی حاصل کرنے کی مزید تڑپ پیدا ہوئی۔ عبادات میں یکسوئی اور خشوع بڑھا، عبادات کو بروقت اور صحیح طریقے سے کرنے کی توفیق ہوئی تو اس کا مطلب ہے نیکی کا فوری اجر مل گیا۔ اور اگر خدانخواستہ ہم مجاہدہ کریں اور ہماری عبادات میں کمی آتی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ ہماری مجاہدے کی صرف شکل ہے اس

میں خلوص کی کمی ہے یا نیت میں وہ راستی نہیں جو ہونی چاہئے۔

اللہ کریم نے دنیا کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ انسان کو اس میں محنت کرنا پڑتی ہے اور ہر ایک کو کرنا پڑتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ گداگر کچھ نہیں کرتا بس مانگ کر گزارا کر لیتا ہے لیکن مانگنے میں بھی محنت لگتی ہے۔ سارا دن ہاتھ پھیلائے، در در کے دھکے کھاتے گزر جاتا ہے، بے شمار نفرتیں اور ہتک آمیز کلمات سننا پڑتے ہیں۔

دنیا کو دنیا کہتے ہی اس لئے ہیں کہ یہاں فوری اجر مل جاتا ہے۔ دنیا کے معنی ہیں 'قریب تر چیز'، اس لئے جب بھی کوئی کام کیا جائے تو اس کا اچھا یا برا نتیجہ فوراً ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور دنیوی نتائج چونکہ مادی ہوتے ہیں اس لئے سامنے نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اخروی نتائج دیر سے ملتے ہیں۔ ملتے وہ بھی فوراً ہیں لیکن وہ چونکہ مادی نہیں ہوتے لہٰذا ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتے البتہ ان کا اثر بندے کی قلبی حالت پہ آتا ہے۔

عبادات اور معاملات:

عبادات سے زیادہ ضروری معاملات ہیں۔ معاملات میں اگر درستگی نہیں آئے گی تو عبادات کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ آپ بغیر گارے، مسالے کے اینٹیں جوڑتے رہیں، جتنی بھی اونچی دیوار لے جائیں۔ ایک دھکا دیں گے ساری گر جائے گی۔ ایک جھونکا آئے گا، ساری گر جائے گی، محض اینٹوں کا ڈھیر ہوگا۔ جو مسالہ اس میں لگانا ہے وہ روزمرہ کے معاملات ہیں۔

یہ نماز، روزہ، ذکر اذکار، تسبیحات اور تلاوت، یہ کیا ہیں؟ ان کا تعلق معاشرے سے نہیں، فرد کی ذات سے ہے کہ بندہ اپنے دل کو اتنا پالش کرے اور اس میں اللہ کی تجلیات اس طرح سمائے کہ حقوق العباد ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ جس دل میں ظلمت ہوتی ہے، جو دل خود تاریک ہوتا ہے، وہ دوسرے کے حقوق کی پروا نہیں کر سکتا۔ اسے احساس اور

ادراک ہی نہیں ہوتا۔ جس طرح اندھیرے یا تاریکی میں چیزیں بجھائی نہیں دیتیں، اسی طرح جب دل میں تاریکی آتی ہے تو حقوق کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔

اللہ کریم کے ساتھ رشتہ رکھنے کیلئے، ایمان کو شفاف رکھنے کیلئے، ایمان کو مضبوط رکھنے کیلئے، ایمان کی ترقی کیلئے، عبادات بہت ضروری ہیں لیکن حقوق العباد کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔

صوفیاء کی عبادات پر حیرت

امام ابو حنیفہؒ کی سوانح میں ایک واقعہ لکھا گیا ہے کہ سارا دن علمی بحث و تمحیص، فقہ کی تدوین، لوگوں کے فتووں کے جواب اور اس طرح کی مصروفیت میں گزرتا۔ تھوڑی دیر آپ استراحت فرماتے۔ تہجد کی نماز اتنی لمبی پڑھا کرتے تھے کہ رات اس میں بسر ہو جاتی تھی۔ ایک شخص جو کہ غلام احمد پرویز کا پیروکار تھا، میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یہ ممکن نہیں۔ لوگ ویسے ہی بزرگوں کے فضائل بڑھا چڑھا کر لکھتے رہتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ کہاں کے رہنے والے ہو؟ کہنے لگا میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ میں نے کہا کہ لاہور میں اگر تم گانے بجانے والے یا پیشہ ور عورتوں کے محلے میں جاؤ تو دیکھو گے کہ ان کی ساری عمر شام سے صبح تک گانے بجانے یا ناچنے یا پیشہ کرنے میں گزر جاتی ہے۔ انہیں نیند کیوں نہیں آتی؟ محض دولت سمیٹنے کیلئے یا محض شوق کی خاطر ان کی عمر بیت جاتی ہے شام کو صبح کرتے ہوئے۔ اگر چند ٹکوں کیلئے عزت بیچنے والی عورت ساری رات بیدار رہ سکتی ہے تو جس کی ہر تسبیح میں جمالِ الٰہی ہو، اس کے لئے تمہیں یہ ناممکن نظر آتا ہے! میں نے کہا کہ اگر اللہ تمہیں توبہ کی توفیق دے اور کوئی تمہیں اس لذت سے آشنا کر دے، تمہارے دل میں کوئی تجلی جمالِ الٰہی کی آ جائے تو پھر تم سمجھو گے کہ یہ مشکل نہیں بلکہ زندگی اسی میں ہے، لطف اسی میں ہے۔

عبادت کی قبولیت جانچنے کا طریقہ

قبولیتِ عبادت کی شرط صرف ایک ہے اور اسے جانچنے کا صرف ایک معیار ہے کہ کون سے سجدے نے مجھے اللہ کے کتنا قریب کر دیا؟ کون سے عمل نے میرے دل میں اللہ کی طلب پیدا کر دی؟ کون سے وظیفے نے میرے دل میں اللہ کی محبت بڑھا دی؟ عبادات کا اجرا اسلام میں قربِ الٰہی ہے لیکن ہماری بدنصیبی یہاں بھی آڑے آتی ہے کہ ہم اگر دو سجدے دے لیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نوکری لگ جانی چاہیے۔ روزے رکھتے ہیں ہماری صحت خراب نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ اللہ کرتے ہیں ہمارے کاروبار میں ترقی ہونی چاہیے۔ فلسفہ جو مذاہبِ باطلہ نے انسانی ذہنوں میں انجیکٹ (inject) کیا ہے، ہم اس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بیماری کے لیے صحت کی ضرورت، بھوک کے لیے پیٹ بھرنے کی ضرورت، دنیا میں رہنے کے لیے عزت و آبرو، روزگار کی ضرورت۔ یہ ساری ضرورتیں ہمیں اللہ کریم سے مانگنی ہیں لیکن ساری ضرورتوں کا پورا ہونا عبادت کی شرط قرار نہیں دیا جا سکتا۔

منافقت یہ ہے کہ دنیوی فائدے کیلئے دین کو اپنایا جائے اور دنیوی نقصان سامنے آئے تو دین سے کنی کترا لی جائے۔ یہ منافقت کی بہت بڑی پہچان ہے یعنی بندہ دین کیلئے دنیا کا کچھ قربان کرنے کو تیار نہ ہو۔

دنیا میں جنت دوزخ کا عکس

جنت، دوزخ ہمیشہ رہنے والی ہے، دنیا ایک عارضی جہان ہے۔ ایک عارضی شے ہے، ایک ظل، ایک سایہ ہے۔ جنت، دوزخ کا عکس یہاں پڑتا رہتا ہے۔

دنیا میں ایک انسان اگر جنتیوں والے کام کرتا ہے تو اس کے دل میں جنت ہوتی ہے۔ ہشاش بشاش زندگی گزارتا ہے، مطمئن زندگی گزارتا ہے اور مزے کی نیند سوتا

ہے، مزے سے جاگتا ہے۔ سوتا ہے تو اللہ کا نام لیتا ہے، جاگتا ہے تو اسے اللہ یاد آتا ہے۔ ہر ہر قدم پر اللہ کو یاد کرتا ہے۔ صحت و بیماری اس پر بھی آتی ہے لیکن اسے تنگی میں بھی سکون ملتا ہے، خوشحالی میں بھی اس کے دل میں سکون ہوتا ہے۔ قید ہو، جیل میں ہو، اس کی زندگی پر سکون ہوتی ہے۔ اس کی زندگی پر جنت کا عکس ہوتا ہے، پرتو ہوتا ہے۔ بدکار یا کافر کی زندگی پر جہنم کا عکس پڑتا رہتا ہے۔ اس زندگی میں بھی ایک ایک لمحہ وہ جہنم میں جیتا ہے، اسے فکریں کھائے رکھتی ہیں، ڈر کھائے رکھتے ہیں، اندیشے کھائے رکھتے ہیں۔ نیند کی گولیاں کھاتا ہے تب چند لمحے سوتا ہے، جاگتا ہے تو پھر ڈرنا شروع کر دیتا ہے۔ زندگی اندیشوں کی نذر ہو جاتی ہے، اس کے لیے زندگی کانٹوں کی سیج بن جاتی ہے۔

کتنا لطفِ عام ہے اللہ کریم کا کہ اپنے کردار کو، اپنے نظریات کو اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ میں ڈھال لو۔ پھر دنیا و آخرت دونوں میں سرخروئی ہے۔

الصلوٰۃ معراج المومنین

شبِ معراج کا سب سے بہترین تحفہ جو حضورِ اکرم ﷺ کو عطا ہوا وہ نمازِ پنجگانہ ہے۔ یہ حضرت محمد ﷺ کے طفیل پوری امت پر انعام ہوا ہر چھوٹا بڑا، خوبصورت بدصورت، امیر غریب جسے کلمہ حق نصیب ہے، اللہ کریم سے اپنی گذارشات ذاتی طور پر روبرو ہو کر پیش کرتا ہے۔ اب اس کا معیار بیان نہیں کیا جا سکتا چونکہ ہر ایک کا اپنا معیار ہے

بہت سی مخلوق ایسی بھی ہے جو نماز نہیں پڑھتی۔ جسے یہ احساس ہی نہیں ہے کہ اس کی عظمت کیا ہے۔ ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں جو نماز ادا تو کرتے ہیں لیکن نہ کرنے سے بھی بدتر۔ اس طرح کی حرکات اور ان کا اس طرح کا رویہ ہوتا ہے کہ شائد الٹا جرم کر کے جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو کھڑے ہوتے ہیں تو حضورِ حق میں محو ہو جاتے ہیں اور انہیں برکات نصیب ہوتی ہیں۔

ہر ایک کی معراج اپنی حیثیت کے مطابق ہوگی۔ بندہ مومن جب نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو تکبیرِ اولیٰ میں وہ تمام جہانوں سے کٹ جاتا ہے۔ ایک دفعہ اللہ اکبر کہہ کر ہر چیز سے الگ ہو جاتا ہے۔ بیوی بچے، کام کاج، دوست دشمن وہ سب کو چھوڑ کر صرف اللہ سے ہمکلام ہو جاتا ہے یعنی براہِ راست اللہ کریم سے بات کرتا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ عالی ہے کہ نمازی کے آگے سے نہ گزرو "فانہ یناجی ربہ" کہ وہ اپنے پروردگار سے سرگوشیوں میں اپنا دردِ دل بیان کر رہا ہے، اپنی بات کہہ رہا ہے، اس کی حمد و ثنا بیان کر رہا ہے۔ اب ہر بندے کی اپنی ذات پر ہے، اپنی اپنی کیفیت ہے کہ کون کتنا اس کیفیت میں ڈوب کر نماز ادا کرتا ہے، کس کو کتنا یہ احساس و ادراک ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے حضور ایستادہ ہے۔

نماز۔۔۔رب کے حضور مناجات

عجیب بات ہے نماز کا وقت ہوتا تو حضور ﷺ فرماتے اللہ کے حضور حاضری دینے کا وقت ہو گیا ہے، تُو بھی (اے مخاطب) میرے ساتھ برابر کھڑا ہو جا اور تُو بھی اپنی حاضری لگوا۔ میں اپنے دل کی بات کہتا ہوں، تو اپنے دل کی کہہ لے۔ نمازی کے آگے سے گزرنے سے جب حضور ﷺ نے منع فرمایا تو ساتھ دلیل یہ فرمائی فانہ یناجی ربہ اس کے سامنے سے نہ گزرو، وہ اپنے پروردگار سے سرگوشی میں بات کر رہا ہے، تم درمیان میں مت آؤ۔ اب ایک بندے کیلئے اس سے بڑا بھی کوئی مقام ہے کہ وہ سیدھا اللہ کریم سے گفتگو کرے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے ہر کلمہ گو کو یہ حیثیت بخش دی، وہ پڑھا لکھا ہے یا اَن پڑھ، وہ مرد ہے یا عورت، وہ امیر ہے یا فقیر، وہ صحت مند ہے یا بیمار، وہ طاقتور ہے یا کمزور۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ کی برکت یہ ہے جس کے دل میں اُتر گیا وہ دن میں پانچ مرتبہ اپنا سارا حال احوال اللہ کریم سے زیرِ بحث لا سکتا ہے۔ اپنی بات کر سکتا ہے، گزارشات کر سکتا ہے۔ ایک مشتِ غبار کو اللہ کے اتنا قریب کر دیا کہ یہ بے قیمت مٹی

اللہ کے عشق کی دعویدار بنتی ہے اور اللہ کی محبت کا دعویٰ لئے پھرتی ہے اور اللہ سے وصل کی طالب بنی پھرتی ہے۔

نماز سے دوری۔۔۔اللہ کی ناراضگی کا اظہار

نفسِ انسانی بڑی عجیب شے ہے، چار نمازیں اگر بروقت ادا کر لے تو اگلے دن اُسے خیال ہوتا ہے کہ اب کوئی مجھے دیکھے بھی کہ میں بڑی باقاعدگی سے نمازیں پڑھنے والا ہوں۔ بھئی! نماز پڑھ رہا ہے تو کون سا احسان کر رہا ہے؟ یہ تو اس کا احسان ہے کہ وہ تجھے سجدے کرنے کی توفیق دے رہا ہے۔ گھر تو اس کا ہے، دربار اس کا ہے، بارگاہ اس کی ہے، وہ نہ چاہے تو تجھے گھسنے نہ دے۔

بے نمازی سمجھتے ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھتے۔ میں سمجھتا ہوں وہ (اللہ) انہیں سر جھکانے نہیں دیتا۔ ناراض ہے، خفا ہے، اپنے گھر گھسنے نہیں دیتا۔ اپنی بارگاہ میں وہ انہیں رکوع کرنے نہیں دیتا۔ شائد اس سے توبہ کریں، معافی مانگیں تو وہ توفیق دے دے۔ لوگ نماز کہاں چھوڑتے ہیں، وہ پڑھنے ہی نہیں دیتا۔ ان کے کسی کردار سے، کسی کرتوت سے جب ناراض ہوتا ہے تو توفیق سلب کر لیتا ہے۔ آپ لوگ انسان ہیں، جس سے ناراض ہو جائیں، اُسے اپنے گھر میں آنے دیتے ہیں؟ پہلی دھمکی یہی دیتے ہیں کہ آئندہ میرے پاس، میرے گھر مت آنا۔ بیٹے سے بگڑ جائیں تو کہتے ہیں کہ میرا گھر چھوڑ دو، نکل جاؤ یہاں سے۔ لوگوں کی کیا جرأت ہے کہ نماز نہ پڑھیں۔ جو اُس کی منشا کے خلاف سانس نہیں لے سکتے، گھونٹ پانی کا منہ میں رکھ لیں وہ نیچے نہ اتارنے دے تو اسے آگے نہیں اتار سکتے، ایک لقمہ چبا نہیں سکتے۔ وہ روک دے تو اچھا بھلا بندہ کھانا نہیں کھا سکتا، پانی نہیں پی سکتا، غذا نہیں کھا سکتا، اٹھ نہیں سکتا، بیٹھ نہیں سکتا۔ شائد جب وہ خفا ہوتا ہے تو اپنے گھر سے، اپنے دَر سے اٹھا دیتا ہے۔ وہ اگر اپنے دَر پہ حاضری کی توفیق دیتا ہے تو یہ اس کا کرم

ہے، اس میں بندے کی بڑائی کہاں سے آگئی؟ لیکن نفسِ امارہ ایسا خبیث ہے کہ یہ اس پہ بھی بندے کو تباہ کرنے پہ تل جاتا ہے کہ تم بڑے پارسا ہو گئے ہو۔ اب تم کسی کو دکھاؤ بھی، بتاؤ بھی کہ تم باقاعدہ نمازیں پڑھتے ہو۔ کوئی ذرہ نصیب ہو جائے تو بندہ اسے پنسار کی دوکان سمجھ لیتا ہے۔ جب بھی، جو بھی اور جہاں بھی کوئی اپنی بڑائی میں گرفتار ہوتا ہے، وہ وہیں تباہ ہو جاتا ہے۔ بڑائی صرف اور صرف اللہ کیلئے ہے۔

نماز میں وساوس:

وسوسہ شیطان ڈالتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر دل غفلت میں ہو تو شیطان اس میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے اور اگر دل روشن ہو تو وہ وسوسے نہیں ڈال سکتا۔ جیسے کوئی گھر تاریک پڑا ہو تو اس میں کیڑے مکوڑے، سانپ وغیرہ داخل ہو جاتے ہیں۔

☆ شیطان کے وساوس بنیادی طور پر ایمانیات پر حملہ کرتے ہیں اور عقائد کو مجروح کرنے کے لیے اور فضول قسم کے اعتراضات کیلئے ہوتے ہیں۔

☆ دوسرے درجے کے وسوسے ہمارے نفس کے ہوتے ہیں اور محض اندیشے ہوتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ یہ ہو گیا تو لوگ کیا کہیں گے، میری عزت مجروح ہو گی۔ لوگوں کو اپنی فرصت نہیں ہوتی اور اس کو وسوسہ ستا رہا ہوتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہیں گے۔ لوگ تمہیں کیا جانتے ہیں۔ لوگوں کو کیا ضرورت ہے تمہارے بارے کچھ کہنے کی؟ ہر ایک نفسا نفسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ہمارے معیار کہ شاید میرے بارے لوگ بہت کچھ کہتے ہیں، یہ خود ساختہ ہوتے ہیں لوگ کچھ بھی نہیں کہتے۔

☆ عموماً زیادہ وساوس بیکار آدمی کو آتے ہیں۔ آدمی جب کام نہیں کرتا، فارغ رہتا ہے، عبادت نہیں کرتا، ذکر بھی نہیں کرتا تو خالی ذہن شیطان کیلئے کھیل کا میدان

بن جاتا ہے۔

☆ یاد رکھیں وسوسے کا آنا جرم نہیں، وسوسے لانا جرم ہے۔ وساوس کا از خود آنا گناہ نہیں، وسوسے لانا گناہ ہے۔ خیالات کا آنا نماز کو خراب نہیں کرتا، خیالات کا لانا خراب کرتا ہے۔ جب ہم خود سوچنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ نماز کو بگاڑتا ہے۔ وساوس بڑھتے تب ہیں جب ہم سوچنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر وہ پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

وساوس کا علاج

خیالات کو بھگانے کا بڑا آسان سا نسخہ ہے کہ ان کے پیچھے نہ لگو، ان پہ دھیان نہ دو تو آنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے متعلق سوچتے رہو تو زیادہ آتے ہیں۔ یہ انسان کے بس میں ہے کہ وسوسہ آئے تو اس پر سوچنا نہ شروع کر دے بلکہ اسے رد کر دے۔ درود شریف پڑھنا شروع کر دے، کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دے، کسی کام کی طرف لگ جائے تاکہ توجہ بٹ جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر نمازی کو نماز میں شیطانی خیالات آئیں اور وہ انہیں رد کر دے، اُن کی پروانہ کرے تو اسے جہاد کا ثواب ملتا ہے۔ نماز تو اپنی جگہ ہو گئی، ساتھ جہاد کا ثواب بھی شامل ہو گیا۔ وساوس کو اگر سوچنا چھوڑ دیا جائے اور اُن سے دفاع کیا جائے تو خود شیطان وسوسے ڈالنے سے گھبراتا ہے کہ اس دفاع میں اسے جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ فرمایا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (الاعراف:201) جب انہیں شیطان کا کوئی ٹولہ پریشان کرتا ہے، وسوسے ڈالتا ہے تذکرون وہ مجھے پکارنے لگ جاتے ہیں، اُن کا دل اللہ اللہ کرنے لگ جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم اس طرح سے ہے کہ شیطان اپنی سونڈ مومن کے دل کی طرف بڑھاتا ہے۔ اگر وہاں روشنی ہے، گھر والے جاگ رہے ہیں، اللہ اللہ ہو رہی ہے تو پھر وہ اپنی سونڈ پیچھے کھینچ لیتا ہے لیکن اگر گھر والے سو

گئے اور وہاں کوئی نہیں تو پھر وہ چوری کرتا ہے، اُس کی چوری یہ ہے کہ وہاں وہ وسوسہ ڈالتا ہے۔ اب انسان ہے کسی وقت اس حال میں نہیں ہے کہ وہاں اتنی روشنی ہو تو فرمایا تذکرون تو وہ فوراً اپنی شمع جلا لیتے ہیں۔

یہاں صاحب ترجمہ نے تذکرون کا معنی کر دیا ہے "چونک پڑتے ہیں"۔ چونک نہیں پڑتے، ذکر کرتے ہے۔ دل جاگ جاتا ہے، دل بیدار ہو جاتا ہے اور وہ مشینری جو اللہ اللہ کرنے والی ہے وہ چل پڑتی ہے اور اللہ اللہ کے گولے شیطان پر برستے ہیں اور اسے بھاگنا پڑتا ہے۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ اللہ کریم مترجم کو نیک اجر دے، یہاں اس نے لکھ دیا بریکٹ ڈال کر (دل کی آنکھیں کھول کر دیکھنے لگتے ہیں) دل کی آنکھیں کھولے تو تب، پہلے دل میں آنکھ لگوائے تو سہی۔ دل کی آنکھ ہوگی تب ہی کھلے گی۔

وساوس کا علاج یہ ہے کہ یقین پختہ کر لے کہ ہوگا وہی جو میرا رب چاہے گا۔ میرے سوچنے یا وہم کرنے سے کچھ نہیں ہوگا تو بجائے وسوسہ کرنے کے اللہ کریم سے دعا کرے۔ وہم کرنے سے مصیبتیں بڑھتی ہیں، کم نہیں ہوتیں۔ وہم کی کوئی حیثیت نہیں ہے یقین پر کام ہوگا۔

اگر یہ خیالات آنا بند ہو جائیں اور کوئی رکاوٹ نہ ہو، آدمی آسانی سے ذکر، نماز ایک روٹین میں کرنے لگے تو اُسے ثواب کس بات کا ملے گا؟ پھر تو ترقی فرشتوں کو ملنی چاہئے جو ہمیشہ سے روٹین ورک کرتے ہیں۔ انسان کو ترقی درجات اس لئے ملتی ہے کہ اسے طرح طرح کے وساوس گھیرتے ہیں، خیالات آتے ہیں۔ اس کی ضروریات ہوتی ہیں، مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اِن سب کو چھوڑ کر محنت مجاہدہ کرتا ہے تو اس پر اجر مرتب ہوتا ہے۔

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف:31)

ہر نماز میں لباس کی بھی تیاری کرنی چاہیے کہ وہ پاکیزہ ہو، صاف ستھرا بھی ہو اور

ایسا ہو جسے پہن کر آپ ہر کسی سے مل سکتے ہوں۔ اگر آپ ایک لباس بندوں سے ملنے کے لیے پسند نہیں کرتے تو اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے کے لیے اس سے بہتر لباس پہننا چاہیے تاکہ آپ کو اس حاضری کی اہمیت کا احساس ہو۔

بڑی عجیب بات ہے کہ ہمیں اگر کہیں کسی محفل میں جانا ہو تو ہم پوری احتیاط سے اپنے کپڑے درست کر کے جاتے ہیں۔ دفتر وغیرہ جانا ہو تو بھی جوتے سے لے کر ٹوپی تک یا کوٹ، ٹائی، شلوار قمیض، پتلون جو بھی لباس ہے وہ سب درست کر کے جاتے ہیں۔ لیکن جب اللہ کی عبادت کے لیے جاتے ہیں تو بے ڈھنگے لباس میں ملبوس، لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جیب سے رومال نکالا، سر پر رکھ لیا، نماز پڑھ لی۔ دفتر یا کام سے آتے ہیں تو اچھا لباس اتار کے کوئی ڈھیلا ڈھالا دھوتی کرتہ پہن کے مسجد کے لیے چل نکلتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ نماز ادا ہو جائے گی لیکن مکروہ ہوگی۔

نماز میں یہ ضروری ہے کہ جو لباس پہن کر آپ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے وہ لباس پہن کر نماز ادا نہ کریں ورنہ نماز مکروہ ہوگی۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ نماز کے لیے جو بھی پہنا ہو وہ ٹھیک ہے اور کسی سے ملنا ہو تو لباس بدلنے بیٹھ گئے۔ مساجد میں، میں نے دیکھا ہے پٹھوں سے بنی ہوئی ٹوپیاں پڑی ہوتی ہیں۔ ان کے پہننے سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔ سر ڈھانپنا نماز کی شرائط میں سے نہیں ہے اور نہ مرد کا سر، عورت ہے (جس کا چھپانا شرعاً واجب ہو)۔ مناسب یہ ہے کہ سر پر پگڑی ہو، ٹوپی کے اوپر پگڑی ہو یا صرف ٹوپی ہو تو بھی درست ہے لیکن اگر مناسب ٹوپی اور پگڑی نہ ہو تو یہ جو عارضی انتظام ہے کہ جیب سے رومال نکالا اور تکونہ کر کے باندھ لیا یا مسجد میں پرانی ٹوپیاں پڑی ہوتی ہیں، وہ پہن لیں، یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ کسی محفل میں جاتے ہوئے یا کسی شریف آدمی سے ملتے ہوئے وہ ایسا کرے۔ میں نے کسی کو رومال باندھ کر کسی عدالت میں

یا کسی افسر کے سامنے جاتے نہیں دیکھا۔ پھر اللہ کی بارگاہ میں کیوں ایسے جاتا ہے؟ اس سے تو ننگے سر پڑھ لینا بہتر ہے۔ اگر آپ اچھا لباس پہن کر لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں تو اللہ کے حضور بھی اچھا لباس پہن کر جانا چاہیے۔ اس عہد کی بدنصیبی یہ ہے کہ جو چیزیں ضروری اور فرضِ عین ہیں وہ چھوٹ گئی ہیں اور غیر اہم چیزوں اور رواجوں پر ہم نے بہت زور لگا دیا ہے۔

نماز کی قبولیت کا معیار اور اجر کیا ہے؟

اس بات کا اندازہ کہ میری نماز کتنی مقبول ہے یا کتنی صحیح ہے؟ قرآن کریم کی اس آیت سے لگایا جاسکتا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (العنکبوت: 45)۔ اب ہر شخص اپنی نماز کو جانچ سکتا ہے۔ نماز ادا کرنے سے اگر اس کے دل میں بے حیائی سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور وہ برائی سے رک جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے نماز کا اجر مل رہا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ وہ نماز بھی پڑھ رہا ہے اور برائی بھی جاری رکھی ہوئی ہے تو پھر بھی اس نے نماز نہیں پڑھی وہ محض رسم نبھا رہا ہے۔ اگر نماز ہوتی تو یقیناً اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا کرتی۔ وصالِ الٰہی نصیب ہو تو بے حیائی اور برائی چھوٹ جاتی ہے۔ احساس رہتا ہے کہ ابھی ابھی حضورِ حق سے آیا ہوں، وقت آرہا ہے، پھر اللہ کے حضور پیش ہونا ہے تو قرآنِ کریم نے فرمایا جسے صلوٰۃ نصیب ہوتی ہے، وہ برائی اور بے حیائی سے بچ جاتا ہے۔ یہ احساس اسے بچالیتا ہے۔ یہ دیکھنا ہو کہ میری نماز میں کوئی معراج کا عنصر ہے کہ نہیں تو پھر اپنے کردار کو دیکھو کہ میرے اعمال میں اگر مثبت تبدیلی آرہی ہے تو پھر میری نماز میں کوئی نہ کوئی رمق معراج کی ہے۔ بہت ہے یا تھوڑی لیکن ہے ضرور۔ اور اگر کردار میں اور عملی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی تو پھر اس میں اُس کی رمق بھی نہیں۔

نماز کیلئے مساجد میں حاضری کیسی ہو؟

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ مسجد کا جب ذکر آتا ہے تو فرمایا اللہ کی بارگاہ ہے جہاں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور یہ کسی کے لیے مناسب نہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہو تو لرزاں اور ترساں نہ ہو، اسے عظمتِ الٰہی کا احساس نہ ہو۔ اسے یہ تو پتہ ہو کہ میں کس بارگاہ میں جارہا ہوں۔ جس طرح آپ صدر یا وزیراعظم کے دفتر میں جائیں تو آپ پر ایک خاص کیفیت ہوتی ہے۔ آپ اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، کپڑے درست کرتے ہیں، بال بنواتے ہیں، کوئی غلط چال نہیں چلتے، کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرتے۔ ایک کیفیت ہوتی ہے ادب واحترام کی کہ میں اتنے بڑے گھر میں جارہا ہوں، اتنی بڑی ہستی کے سامنے۔ تو جب اللہ رب العزت کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو فرمایا ما کان لھم انہیں کسی طرح سزاوار نہیں کہ ان یدخلوھا کہ وہ مساجد میں داخل ہوں الا خائفین سوائے اس کے کہ لرزاں وترساں ہوں، عظمتِ الٰہی ان کے ایک ایک بن مُو سے ہویدا ہو۔

رمضان المبارک ہمارے لئے آئینہ:

ہم پورا سال اپنے ہر جرم کا الزام ابلیس کو دیتے ہیں لیکن کم از کم رمضان المبارک میں ہمارا جو کردار ہے، اس کا الزام ابلیس پر نہیں جاتا۔ ہمارے اندر جو ابلیسیت بھر گئی ہے، یا اللہ کی نافرمانی کرتے کرتے اور شیطان کے ساتھ چلتے چلتے جو شیطانی خصوصیات ہمارے اندر آگئی ہیں، رمضان المبارک میں جو برائی ہوگی، وہ ان کے ذریعے سے ہوگی۔ کچھ انسان تو مجسم شیطان بن جاتے ہیں جس طرح ارشاد باری ہے قرآنِ حکیم میں شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (الانعام: 112) یاد رکھیں! رمضان المبارک میں جتنا ظلم ہوگا، جتنی نافرمانی ہوگی، جتنا جھوٹ بولا جائے گا، جتنی برائی ہوگی یہ اس وجہ سے ہوگی کہ شیطانوں کے

اوصاف انسانوں میں آگئے۔ دوسروں کو دیکھنے کی بجائے رمضان المبارک ہمارے اپنے لئے ایک آئینہ ہے کہ ہم اس میں دیکھیں کہ میرے اندر شیطنت تو نہیں ہے، کسی کا برا تو نہیں سوچ رہا، میں کہیں اللہ کی نافرمانی کا ارادہ تو نہیں کر رہا۔

آپ روشنی کی ایک کرن کو شیشے پر ڈالتے ہیں تو سارا شیشہ جگمگا اٹھتا ہے لیکن اس کرن کو کیچڑ پر پھینکیں تو کیا کیچڑ جگمگا اٹھے گا، پتھر پر ڈالیں تو کیا روشنی منعکس ہوگی؟ تو بندے اپنے غلط کردار عقیدے اور ایمان سے گندے جوہڑ کا کیچڑ بن جاتے ہیں جبکہ روزہ اس مٹی کو، اس کیچڑ کو، اس پتھر کو پالش کر کے شیشہ بناتا ہے، آئینہ بناتا ہے۔

روزہ

روزہ رکھنے کا اصل مفہوم یہ ہے کہ حضورِ حق نصیب ہو۔ مال اپنا ہے، کمایا حلال طریقے سے ہے لیکن فرمایا فجر کے بعد تم نہیں کھا سکتے۔ بندے کو یقین ہو گیا کہ یہ میرا نہیں ہے، اُس کا ہے جس نے روک دیا۔ اُس نے وقتی طور پر مجھے مالک بنا دیا تھا۔ اس ایک عمل نے ہمیں سکھا دیا کہ میرے پاس جو مال و دولت، جو علم و فن، جو کمال و خوبی، جو حکومت و اقتدار ہے، یہ میرا نہیں ہے، اُس کا ہے۔ وقتی طور پر مجھے دے کر آزما رہا ہے۔ لہٰذا مجھے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ میں جب خرچ کرتا ہوں تو اللہ کے مال سے خرچ کرتا ہوں۔ جب یہ احساس ہوگا تو آدمی اپنی دولت کو غلط مصرف پر خرچ کرنے سے رک جائے گا کیونکہ وہ اس کی اپنی تو نہیں ہے، اللہ کی ہے۔ اب اللہ کے پیسے سے وہ جوا تو نہیں کھیلے گا، شراب تو نہیں خریدے گا۔ پھر سارا دن تنہا ہے، اکیلا ہے، بیڈ روم میں ہے، جنگل میں ہے، کوئی بندہ پاس نہیں۔ پھر بھی وہ کھاتا پیتا نہیں۔ اس کا مطلب ہے اسے یقین ہے کہ میرا رب جس نے مجھے منع کیا ہے، میرے پاس ہے۔ یعنی حضورِ حق کی ایک تربیت ہو گئی کہ میرا اللہ ہر وقت میرے پاس ہے اور یہی کیفیت مقصود ہے۔

دوسری سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شیطان تو قید ہے، اب اگر ہم جھوٹ بولتے ہیں تو یہ شیطنت ہمارے اندر آگئی ہے۔ کچھ لوگ شیطنت میں آگے بڑھتے بڑھتے اتنے شیطان کے قریب ہو جاتے ہیں کہ وہ خود شیطان بن جاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم نے شیاطین الجن والانس فرمایا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جن شیطان، اُس شیطان سے کمزور ہے جو انسانوں میں سے شیطان بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ صرف مشورہ دے سکتا ہے، بات دل میں القاء کر سکتا ہے لیکن انسانوں والا شیطان بندے کو پکڑ کر، کھینچ کر برائی کی طرف لے جاتا ہے۔

لیلۃ القدر:

علماء نے لکھا ہے کہ لیلۃ القدر ہر جگہ ایک ہی رات نہیں ہوتی۔ کسی طاق رات میں زمین کے کسی حصے پر اور اگلی طاق رات میں کسی اور حصے پر ہوتی ہے۔ بہر حال رمضان المبارک کی آخری طاق راتوں میں زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں رہتا جس پر لیلۃ القدر کا ورود نہ ہو۔

لیلۃ القدر کا گلشن اس طرح مہکتا ہے کہ ہر طرف نور ہی نور ہوتا ہے اور رنگا رنگ کے انوارات ہوتے ہیں۔ کوئی سمجھ نہیں آتی، کوئی پتہ نہیں چلتا جیسے آپ بے حساب قسم کی مختلف رنگوں کی آتش بازیاں چلا دیں تو دیکھنے والا کس کس رنگ کو پہچانے، کس کس کو دیکھے گا۔ تو آتش بازی تو انسان کی ایجاد کردہ ہے کہ مختلف روشنیاں اور مختلف رنگ بکھیرتی ہے، لیلۃ القدر میں تو اللہ جل شانہ کے انوارات ہوتے ہیں، برکات ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس کا حسن و رنگ ہی اور ہوتا ہے۔

حج کا مقصد:

حج ادا کرنے سے صرف حاجی کہلانا مقصد نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان کو

قربِ الٰہی نصیب ہو اور وہ بالکل بدل جائے۔ جب وہ سوچے تو اسے احساس ہو کہ میرا اللہ میرے پاس ہے۔ بولنے لگے تو یہ احساس ہو کہ میرا اللہ سن رہا ہے۔ کوئی کام کرنے لگے تو اسے پتہ ہو کہ میرا اللہ میری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے زمانے کے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سفر ہر حال میں مبارک ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر سفرِ حج میں بھی اور ارکانِ حج کی ادائیگی میں بھی لاپرواہی اور کوتاہی کو اختیار کیا جائے تو یہی بات غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کا سبب بن جاتی ہے۔ بیت اللہ کی ایک نماز جہاں ایک لاکھ نماز کا ثواب پاتی ہے وہاں کی نماز کو چھوڑ دینا گویا ایک لاکھ نماز کو ضائع کرنا ہے۔

قربانی کی حقیقت:

ہر عبادت کے اپنے انوارات اور اپنے ثمرات ہوتے ہیں اور ہر بندے پہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر بندے کا اللہ سے رشتہ الگ ہوتا ہے۔ ایک ہی جگہ دس بندے نماز پڑھتے ہیں لیکن ہر ایک کی کیفیت اس کے ایمان، اس کے خلوص اور اس کے دل کی گہرائی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر اطاعت پر بندے کی حیثیت کے مطابق انوارات و برکات نازل ہوتی ہیں۔

قربانی کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز، دنیا کا کوئی کام، کوئی محبت، کوئی پیار، کوئی عزیز ترین رشتہ، کوئی محبوب ترین شے اللہ کی اطاعت کے مقابلے میں رکاوٹ نہ بنے۔ آج ہمیں بطفیلِ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ نے یہ سعادت بخشی ہے کہ ہم بھی اللہ کی راہ میں جانور ذبح کریں اور ان رحمتوں کا، ان عنایات کا اور اللہ کی اس بخشش کا مزہ لیں اور وہ کیفیات ہم پر بھی وارد ہوں تو یہ قربانی کی حقیقت ہے۔

فلسفۂ قربانی

ہاں! سمجھنے والوں کیلئے ایک انتہائی قیمتی بات ہے اور وہ ہے فلسفۂ قربانی۔ یوں تو سارے نبیؑ اللہ کے دوست ہوتے ہیں۔ ہر ولی اللہ بھی، ہر مسلمان بھی اللہ کا دوست ہوتا ہے۔ (اللہ سے دشمنی تو صرف کافر کے نصیب میں ہے)۔ لیکن بعض لوگ اس دوستی میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ یہی ان کا نشان بن گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا امتیازی نشان بھی خلیل اللہ ہے۔ اِس دوستی کا اظہار اللہ نے انسانوں اور فرشتوں پر یوں فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ پر پے در پے امتحان بھیجے حتیٰ کہ اپنے پیارے اور عظیم فرزند کو اپنی راہ میں قربان کرنے کا حکم دے دیا۔ حکم دینے والے سے اب کتنی محبت چاہئے کہ اپنی پیاری اولاد کی گردن پر چھری پھیری جا سکے۔ یہی وہ نظارہ تھا جو رب العالمین نے ان فرشتوں کو کروایا جو کہتے تھے کہ تخلیقِ آدم کا کیا فائدہ ہوگا؟ اللہ کریم نے فرمایا کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو ہر رشتہ میرے نام پر قربان کر سکتے ہیں۔

یہ قربِ الٰہی کا انتہائی اعلیٰ درجہ ہے اور اللہ کریم نے حضورِ اکرم ﷺ کی امت کو یہ سعادت بخشی کہ میری راہ میں جانور ذبح کرو، تمہیں ایثارِ ابراہیمی میں سے حصہ دے دوں گا۔ اس طرح ہم اس فلسفۂ قربانی کو دیکھیں اور اپنے ان چند سکوں کو دیکھیں جن سے جانور خریدتے ہیں تو کیا یہ سودا مہنگا ہوگا؟

قربانی پر اعتراض اور اس کا جواب

ہمارے معاشرے کے ایک بزعمِ خود روشن خیال طبقے کو قربانی پر بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ کروڑوں یا اربوں روپے کے جانور ایک وقت میں ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر جانور ذبح کرنے کی بجائے یہی رقم کسی تعمیری کام پر خرچ کی جائے تو بہت سے قومی مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔ بظاہر یہ بڑا دلکش اور پرزور سوال نظر آتا ہے، اس سوال کا

سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ

☆ ہم قربانی اس لئے کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کی ہے اور قربانی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا یہ جواب ہرگز نہیں کہ یہ سنتِ ابراہیمی ہے یا یہ کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی دی گئی۔ تمام مسلمان اور پوری امتِ مسلمہ اس لئے قربانی کرتی ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے قربانی کی اور ہمیں بھی قربانی کا حکم دیا۔

☆ اس سوال کو دوسرے پہلو سے دیکھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قربانی پر خرچ ہونے والی رقم جس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر ہے کا ہی کیوں حساب کیا جاتا ہے؟ اور آئے روز حکومتوں کے اللے تللوں پر، وزیروں کے جلوسوں پر جو کروڑوں خرچ ہوتے ہیں، اس پر کیوں نہیں سوچا جاتا؟ کوئی دانشور اس رقم کی بات کوئی نہیں کرتا؟ ان غیر مذہبی، لغو اور بیکار کاموں سے رقم کیوں نہیں بچائی جاسکتی جب کہ ان کاموں کے پیچھے نہ کسی نبیؑ، نہ کسی رسولؑ کا حکم ہے بلکہ انہی کاموں سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

☆ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے سو اونٹ قربان کئے۔ کس طرح یہ رقم پس انداز کی ہوگی، کتنی بھوک کاٹی ہوگی اور یوں سو اونٹ اللہ کی راہ میں قربان کئے۔ یہی رقم حضور اکرم ﷺ کسی فنڈ میں دے دیتے، جہاد میں اتنی ضرورت تھی وہاں دے دیتے، سو اونٹ بیچ کر مجاہدین کیلئے سامان جمع کر لیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قیمت دینا مقصد نہیں، ضرورتیں پوری کرنا مقصد نہیں، قربانی کا مقصد اس جذبے کو حاصل کرنا ہے جس سے بندہ اللہ کی خوشنودی کیلئے کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔

☆ یہی حالات رہے تو کل نماز کا متبادل بھی نکل آئے گا، پھر رمضان کا متبادل بھی

تلاش کیا جائے گا اور اللہ نہ کرے پھر قرآن کا متبادل بھی آجائے گا۔ اسلام متبادل احکامات کا نام نہیں ہے، اس کے ہر حکم کی اپنی اہمیت ہے۔ جیسے حضور اکرم ﷺ نے کیا، ویسے کرنا پڑے گا۔ دینِ اسلام ایک کیفیت کا نام ہے، ایک حالت کا نام ہے، ہر حکم میں ایک حال ہے، ربِ دو جہاں سے رابطے کی ایک صورت ہے۔

☆ بات یہ ہے کہ دین صرف اطاعت کا نام ہے اس میں ہمیں مشورے دینے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے اور وہ بہر حال ہر ایک سے بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا دین بلا دلیل و حجت، بلا چون و چراں تعمیلِ ارشاد کا نام ہے۔ دین کے ہر حکم کی اہمیت اپنی جگہ ہے، عبادت کے حکم کا جواب تعمیلِ حکم ہے، حکم کا جواب حجت بازی نہیں ہے۔ دین مکمل اطاعت کا نام ہے، اس میں ہمیں مشورے دینے کی اجازت نہیں ہے۔ دین اللہ کے حکم کے آگے سر جھکا دینے کا نام ہے۔

دین پر ان اعتراضات کو روشن خیالی کا نام دیا جاتا ہے۔

قربانی کا اجر

ہر عبادت کا اثر ہوتا ہے کہ اس پر خاص طرح کے انوارات نازل ہوتے ہیں۔ اللہ کی ایک خاص قسم کی رحمت مرتب ہوتی ہے، جو عبادت کرنے والے کے قلب کو اللہ کے اور قریب یا اس سے رشتے کو اور مضبوط کر دیتی ہے۔ ساری زندگی کی قربانیوں کے بعد یہ قربانی جو حضرت ابراہیمؑ نے دی (اور ان پر جو رحمتِ باری متوجہ ہوئی) وہ ظہورِ آدمؑ سے لے کر قربانیٔ اسماعیلؑ تک ایک الگ قسم کی اور ایک انوکھی قربانی تھی۔ یہ ایسی عبادت نہ تھی جو ہر کسی پر فرض کی جاتی اور نہ ہر کوئی اس قسم کی برکات و انوارات سمیٹ سکا۔ اب یہ اللہ کا ہے اور احسان ہے کہ رب کریم نے حضور ﷺ کی امت کو آپ ﷺ کی ذات کے طفیل یہ شرف

بخشا کہ آپ بھی دنبہ، بکرا، اونٹ، گائے، بھینس وغیرہ اُس دن میری راہ میں، میرے نام پر ذبح کر دیں تو وہ انوارات اور وہ برکات اور وہ کیفیات جو میں نے ابراہیمؑ پر نازل کی تھیں، آپ ﷺ کے ہر ماننے والے، ہر پیروکار پر نچھاور کر دوں گا۔ اب موجودہ روشن خیالی اور قربانی کے اس فلسفے کو مقابلے میں رکھ کر اندازہ کیجیے کہ کیا پیسے جمع کر کے، کوئی ادارہ بنا کر یا خیرات کر کے وہ برکات حاصل کی جا سکتی ہیں؟

قربانی کا اجر کیفیات کی صورت میں عطا ہوتا ہے۔ ہم حضرت ابراہیمؑ کی نہیں، ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی امت ہیں اور یہ اللہ کا کرم ہے کہ جو انوارات انہیں آگ میں ڈالے جانے پر نصیب ہوئے، وہ ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی کرنے پر ہماری حیثیت کے مطابق ہمیں عطا فرما دیئے۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ جو کیفیت حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو حضرت اسماعیلؑ جیسا لختِ جگر قربان کرنے پر نصیب ہوئی، ہمیں ہماری حیثیت کے مطابق ایک جانور ذبح کرنے پر نصیب ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کے غلام ہیں ورنہ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر نبی کریم ﷺ تک امتیں تو اور بھی گزری ہیں، کسی کو پہاڑوں پر بھاگنا نصیب ہوا نہ ہی کسی جانور کو ذبح کر کے اس اجر کو پانا نصیب ہوا۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں، ہو سکے تو اپنا جانور خود ذبح کرو، اتنا بھی نہ کر سکو تو کم از کم پاس کھڑے ہو کر ذبح کراؤ۔ اس کیفیت سے اپنے آپ کو گزارو۔ یہ کیفیت کسی مولوی کے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کرا کر نہیں ملتی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا ہے، بڑی بڑی تنظیموں نے اخبارات و جرائد میں ہزاروں روپے کے اشتہارات چھپوائے ہیں، لوگوں سے قربانی کے پیسے لے کر اشتہارات پر خرچ کرتے ہیں تاکہ مزید رقم ملے۔ اس طرح لوگوں کی قربانی کیسے ہو گئی اور انہیں بغیر اطاعتِ رسول اللہ ﷺ کے قربانی کی کیفیات کیسے ملیں گی؟

ہم بھی عجیب لوگ ہیں یا تو عیب دار جانور سستا سا خرید کر جان چھڑاتے ہیں یا

پھر نمائش کیلئے پچاس ہزار میں ایک دنبہ خرید کر چر چا کرتے پھرتے ہیں۔ اللہ کو ہماری بڑائی چاہیے نہ خانہ پُری۔ اللہ رب العزت تو اتنا کریم ہے کہ اس نے ہماری چھوٹی سی قربانی پر اتنا بڑا اَجر یعنی دردِ دل عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اب یہ تو اپنے شعور کی بات ہے کہ کیا ہم وہ حاصل کرتے ہیں؟ ہمیں اس کا پتہ بھی ہے یا نہیں؟ مولوی بتاتا ہے کہ قربانی کرو ثواب ہوگا، کیا ثواب ہوگا، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ حق یہ ہے کہ ثواب کا مطلب ہے کہ اس کے بدلے میں جو کیفیت نصیب ہوگی، جو عشقِ الٰہی نصیب ہوگا، جو قربِ محمد رسول اللہ ﷺ نصیب ہوگا، وہ قربانی کا بدلہ ہے۔

قربانی کا حاصل:

یہ یقینی بات ہے کہ اگر ہم نے خلوص کے ساتھ قربانی کی تو صرف بکرا قربان نہیں ہوگا۔ صرف جانور ذبح نہیں ہوگا بلکہ اللہ کی توفیق بھی عطا ہوگی کہ ہم اللہ کیلئے اپنے مفادات کو بھی قربان کر سکیں۔ ہم عبادات کے اوقات میں آرام قربان کر سکیں۔ ہم حلال کے مقابلے میں حرام کو چھوڑ سکیں۔ ہم بھوک قبول کر لیں اور حرام نہ کھائیں۔ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں خواہ اس میں ہمیں تکلیف اٹھانا پڑے۔ ہم برائی سے اجتناب کرنا شروع کر دیں خواہ ہمیں ایثار کرنا پڑے، کوئی بھی نقصان اٹھانا پڑے۔

جہاد:

اسلام سلامتی کا مذہب ہے اور اسلام کی دشمنی اگر ہے تو ظلم کے ساتھ ہے، جہالت کے ساتھ ہے۔ کفر جہالت ہی کا پھل ہے، ظلم جہالت کا پھل ہے، جور و جفا جہالت کا پھل ہے۔ جہاں جہالت ہوگی اسلام اس کی مخالفت کرے گا اور یہی مخالفت جہاد کہلائے گی۔ اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا لیکن وہ پُرامن شہری کے طور پر رہتا ہے تو اسلام اس کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرے گا۔

اس وجہ سے کہ میرا عقیدہ اور ہے اور اس کا عقیدہ اور کوئی کسی کی جان لے لے تو یہ جہاد نہیں ہوگا۔ میں بریلوی ہوں یہ دیوبندی ہے اس لئے اسے قتل کر دیا جائے، میں سنی ہوں یہ شیعہ ہے اس لئے اسے گولی مار دوں، یہ جہاد نہیں ہے یہ فساد ہے۔

ہر بندے کو دو حق حاصل ہیں۔ ایک زندہ رہنے کا حق۔ زندگی وہی لے سکتا ہے جس نے عطا کی ہے۔ جو زندگی دے نہیں سکتا وہ لے نہیں سکتا۔ کسی مرنے والے کو ہم اگر ایک پل کی حیات نہیں دے سکتے تو کسی کی زندگی، کسی کی حیات لینے کا اختیار کیوں ہوگا؟ اور دوسرا حق ہے عقیدہ رکھنے کی آزادی۔

نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہے

اصل میں راستے تو دو ہی ہیں، اللہ کا راستہ اور شیطان کا راستہ۔ عجیب بات ہے کہ جہنم کا راستہ آسان نہیں ہے اور جنت کا حصول آسان ہے۔ جنت کے حصول کا راستہ فطرت کا راستہ ہے، جہنم کا راستہ اس لئے مشکل ہے کہ برائی کرنا ہزار مشکلات کو دعوت دینا ہے۔ ہر نیک کام صرف نفس پر دشوار ہے کیونکہ یہ خواہشاتِ نفس کے خلاف ہوتا ہے ورنہ عملی زندگی میں نیکی کرنا آسان ہے۔ جو لوگ کفر کرکے، حرام کھا کر یا قتل و غارت گری اور برائی کر کے اور دوسروں کے حقوق غصب کر کے جہنم جانے کی کوشش کرتے ہیں، اس پر اُن کی بڑی محنت لگتی ہے۔

برائی کرنا کتنا مشکل ہے، چوری، ڈاکہ کتنا مشکل کام ہے۔ کسی کو بُرا کہنے پر، جب وہ بات اس تک پہنچتی ہے تو اس پر کتنا سخت ردِعمل آتا ہے۔ کوئی چھوٹی سی برائی ہی لے لیں تو ہمیں اس کے ردِعمل کو فیس کرنا پڑتا ہے جبکہ کسی نیکی کیلئے کوئی خطرہ نہیں۔ نیکی اگر دشمن سے بھی کی جائے تو کم از کم وہ اس کے بدلے میں دشمنی تو نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی دشمنی ختم نہ بھی ہو تو اس عمل کے بدلے میں وہ دشمنی تو نہیں کر سکتا۔ بہت خوبصورت سا راستہ بنا دیا

ہے رب کریم نے۔

نیکی کا حاصل

اللہ اللہ کرنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر بدکار بھی کرنا شروع کر دے تو اس کا سفر نیکی کی طرف شروع ہو جاتا ہے۔ اب یہ سمجھ لینا کہ فلاں شخص اللہ اللہ بھی کرتا ہے اور گناہ بھی کرتا ہے، یہ صحیح نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے وہ سو گناہ کرتا تھا اور اب اللہ اللہ کرنے کے بعد پچاس کر رہا ہو تو آپ اس کے پچاس گناہوں کو گنتے رہیں گے لیکن یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ کہاں سے واپس آیا اور کہاں پہنچ گیا۔ اور اللہ نے استقامت دی اور وہ ذکر کرتا رہا تو اللہ اس کی ان پچاس گناہوں سے بھی جان چھڑا دے گا چونکہ یہ تو ایک سفر ہے۔

نیکی تب ہی نیکی قرار پاتی ہے جب وہ قبول ہو جائے اور قبولیت کی ہمارے پاس کوئی سند نہیں۔ ہاں! تمام نیکیوں سے جو حاصل ہوتا ہے وہ ہے، بندے کے ساتھ اس کے مالک کا تعلق، اگر وہ تعلق موجود ہے تو وہ کامیاب ہے۔ اب ہر شخص اپنے دل کا حال جانتا ہے، اپنے دل کی کیفیت جانتا ہے، اپنے دل پر بیتے حالات سے واقف ہے۔

فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ (النجم:32)

بعض انسان ایسا بدنصیب ہوتا ہے کہ اسے عبادت کی توفیق نہیں ہوتی۔ ایک اور بدبختی یہ بھی ہے کہ ایسا انسان جسے عبادت میں شغف تو ہوتا ہے لیکن وہ کچھ عجیب طرح سے اپنے ٹوٹے پھوٹے سجدوں پہ یا ذکر اذکار، وظائف پر فخر کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں بہت بڑا کام کر رہا ہوں اور میرا تو اب بہت حساب اللہ کے ذمہ نکلتا ہے۔ اس گھمنڈ میں آ جاتا ہے کہ میں بہت نیک ہوں، پارسا ہوں، فرمایا فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ اپنے آپ کو پارسا مت سمجھو اس لئے کہ جن کاموں کو تم نیکی سمجھے بیٹھے ہو، شائد وہی اس کے ہاں گستاخی ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا خبر جس سجدے کو ہم عبادت سمجھ رہے ہیں، اُس

میں وہ ناراض ہو کہ تو نے اپنی پارسائی کیلئے سجدے لمبے کئے تھے کہ لوگ سمجھیں یہ بڑا نیک ہے۔اس میں میرے لیے سجدہ کون سا سجدہ ہے؟ پھر ہم نے تو جسے نیکی سمجھا ہوا ہے کہ میں نے اتنے نفل پڑھے اس پہ وہ ناراض ہو کہ تم نے بُری نیت سے پڑھے۔تمہارا ارادہ اپنی پارسائی جتانے کا تھا، میری عبادت کا تو نہیں تھا۔

گناہ کیا ہے؟

گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی حدود سے باہر نکل کر کام کرے۔ ہر گناہ ایک بوجھ ہے جو بندے کی ٹانگ کے ساتھ بندھ جاتا ہے اور اسے غرق کرتا چلا جاتا ہے۔ کسی کشتی میں اگر انسان ایک ایک کنکر بھی پھینکتا رہے تو ایک دن وہ اتنی بوجھل ہو جاتی ہے کہ وہ غرق ہو جاتی ہے۔کوئی بڑا منوں وزنی یا ٹنوں وزنی پتھر نہ رکھے لیکن وہ چھوٹے چھوٹے کنکر بھی لے ڈوبتے ہیں۔یہی مثال علماء حق نے گناہِ صغیرہ کی دی ہے۔

صغیرہ اور کبیرہ میں فرق یہ ہے کہ گناہِ کبیرہ فوراً کشتی ڈبونے کا سبب بنتا ہے جبکہ گناہِ صغیرہ کا تسلسل بھی انسان کو غرق کرنے میں پیچھے نہیں رہتا۔جس طرح ظاہری آنکھ بدپرہیزیوں یا بعض حادثات کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہے یا نظر کھو بیٹھتی ہے، اسی طرح بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو دل کو اندھا کر دیتے ہیں اور حق کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔

علماء نے گناہوں کو صغیرہ اور کبیرہ میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہر گناہ نافرمانی ہے اور اللہ کی ذات کی نافرمانی ہے۔ جب اس نظریے سے دیکھا جائے کہ حکم عدولی کس ذات کی ہے تو کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا، ہر صغیرہ گناہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔کام خواہ چھوٹا ہی ہو لیکن کہنے والا اگر بڑا آدمی ہے تو حکم عدولی کا جرم حکم دینے والے کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ہم نے جو یہ طریقہ بنالیا ہے کہ فلاں ایسا کر رہا ہے، میں نے بھی کر لیا تو کیا ہوا؟ بھئی! اگر بہت سے لوگ گناہ کرنے لگیں تو کیا گناہ جائز ہو جاتا ہے؟ اگر بہت سے لوگ جرم کرنے لگیں تو کیا وہ

جرم درست یا صحیح مانا جائے گا؟ آپ بہت سے لوگوں کو چھوڑیے، اپنی فکر کیجیے۔

گناہ معاف ہو جائے تو ایک احساس پیدا ہو جاتا ہے، گناہ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ برائی سے بچنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے زخم بھر جائے تو آدمی نہیں چاہتا کہ وہاں کوئی انگلی بھی لگائے، اسے بچاتا ہے۔ وہ جگہ زیادہ حساس ہو جاتی ہے۔اسی طرح گناہ معاف ہو جائیں تو مزاج حساس ہو جاتا ہے اور گناہ کڑوے لگتے ہیں، برے لگتے ہیں اور نیکی کی بھوک لگتی ہے۔

گناہ، گناہ میں بہت فرق ہے:

ہمارے ہاں یہ تصور ہے کہ نماز چھوڑ دینا گناہ ہے۔ درست ہے، نماز چھوڑ دینا گناہ ہے۔ کسی کے ساتھ زیادتی کرنا، کسی کا مال لے لینا، کسی کی ناحق جان لے لینا، کسی کی آبرو لوٹ لینا، کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا، یہ سب گناہ ہے۔لیکن گناہ، گناہ میں بڑا فرق ہے۔ایک آدمی گناہ کرتا ہے، اس سے اس کی ذات متاثر ہوتی ہے یا معاشرے کا کوئی فرد متاثر ہوتا ہے۔ اقتدار میں بیٹھے ہوئے لوگ جب گناہ کرتے ہیں تو ایک شخص کے فیصلے بیس کروڑ مسلمانوں کو ذلت سے دوچار کر دیتے ہیں۔وہ روزانہ اسی قرآن کو چومتے ہیں، پڑھتے ہیں، سنتے ہیں، جہاز بھر کے جاتے ہیں بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہیں۔ روضہ اطہر ﷺ پہ جاتے ہیں اور اُن کیلئے روضہ ﷺ کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ بیت اللہ شریف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور یہ اندر چلے جاتے ہیں۔تو کیا اس طرح ان کی نجات ہو جائے گی؟ یاد رکھیں! گناہ پر دلیری کر کے بیت اللہ شریف میں جانا تو شاید غیرتِ الٰہی کو للکارنے والی بات ہے۔ سترہ کروڑ مسلمانوں کو سود کھانے پر، حرام کھانے پر مجبور کر کے روضہ اطہر ﷺ پہ جانا، میرے خیال میں اس سے بڑی کسی گستاخی کا تصور نہیں ہو سکتا۔

صدورِ ذنب نیک لوگوں سے بھی ممکن ہے

نیک سے نیک اور بڑے سے بڑے آدمی سے صدورِ ذنب (گناہ کا ہو جانا) ممکن ہے۔ کیا صحابہ کرامؓ پر حدود نہیں لگائی گئیں؟ کیا صحابہ کرامؓ پر مقدمات نہیں چلے؟ پھر کون ہے جو اُن کی جوتیوں کی خاک کے برابر بھی ہو؟ صدورِ ذنب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ہر شخص سے ممکن ہے۔ گناہ ہو سکتا ہے لیکن اصرار علی الذنب (گناہ پر اصرار) تقویٰ کے خلاف ہے کہ اس گناہ کو وظیفہ بنا لے اور مسلسل کرے۔ کوئی نیک آدمی ایسا نہیں کرتا۔ خطا ہو جائے تو توبہ کرتے ہیں، رجوع الی اللہ کرتے ہیں اور اس داغ کو دھونے کی کوشش کرتے ہیں۔

گناہ کی وجہ جہالت ہے:

قرآنِ کریم نے جہاں گناہ کا ذکر کیا ہے اور آگے توبہ کا ارشاد فرمایا ہے، وہاں صدورِ ذنب کو فرمایا، **بجهالته**، کہ جہالت کی وجہ سے گناہ کرتا ہے۔ مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی گناہ کرتا ہے تو کتنی بھی ڈگریاں اس کے پاس ہوں، کتنا پڑھا لکھا اور عالم فاضل ہو، اس لمحے میں وہ بھی جاہل ہوتا ہے۔ گناہ ہے ہی جہالت۔ وہ سارے علوم اس کے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اس لئے گناہ کرتا ہے۔ اگر وہ علم اس کے پاس ہو تو گناہ سے روک دے، علم تو نور ہے، روشنی ہے۔

امام شافعیؒ کے استاد تھے امام وکیعؒ۔ انہوں نے ان سے شکایت کی

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی واوصانی الیٰ ترک المعاص

امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ سے شکایت کی کہ میں جو پڑھتا ہوں تو مجھے باتیں یاد نہیں رہتیں۔ مجھے حافظے کیلئے دم کر دیجیے، دے دیجیے، بتا دیجیے تو انہوں نے یہ دوا بتائی واوصانی الیٰ ترک المعاص انہوں نے مجھے فرمایا، گناہ نہ کیا

کرو۔ یہ حافظے کی دوا بتا رہے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہ جو سرزد ہوتے ہیں ان سے بچو، پھر آگے وجہ بتاتے ہیں کہ

لان العلم نور من الٰهی

نور الله لا یوتی المعاصی

کہ علم اللہ کا نور ہے اور اگر بندہ گناہ کرتا رہے تو اسے نور نصیب نہیں ہوتا۔

گناہ کے ثمرات

گناہ کے ثمرات دو طرح کے ہوتے ہیں۔

☆ ایک قسم کا اثر تو بندے کی اپنی ذات پہ مرتب ہوتا ہے کہ اس نے جرم کیا اور اس کی گمراہی میں اضافہ ہو گیا اور نورِ ایمان کم ہوتا گیا۔ وہ بھٹک گیا، حتیٰ کہ گناہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ دل سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر مہر کر دی جاتی ہے۔ توفیقِ توبہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔

☆ ایک گناہ کا اثر وہ ہوتا ہے جو ماحول کو متاثر کرتا ہے، دوسرے لوگوں کو متاثر کرتا ہے جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (الروم:41) خشکیوں اور تریوں میں، زمینوں اور سمندروں میں فساد ظاہر ہو گئے۔ تباہی پھیل گئی۔ ہر طرف موت رقص کرنے لگی، ہر طرف جور و ستم پھیل گیا۔ بما کسبت ایدی الناس یہ سب لوگوں کے کردار کے نتیجے ہیں، لوگوں کے اعمال کا ثمر ہے۔ یعنی گناہ کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی زمین پر فساد پھیلتا ہے، دوسرے لوگ متاثر ہوتے ہیں، ان کے لیے مصیبتیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔

مسلسل نافرمانی کے اثرات:

نافرمانی کا جو اثر انسانی زندگی پر مرتب ہوتا ہے وہ بڑا بھیانک ہے۔ علماء حق

فرماتے ہیں کہ گناہ کی مثال زہر کی سی ہے، جب آدمی جرم کرتا ہے تو اس نے جیسے زہر کھالیا ہو۔ اگر اس سے بیمار ہو گیا، قے ہو گئی، پیچش لگ گئے، تکلیف ہوئی، وہ زہر خارج ہو گیا تو شاید بچ جائے گا۔ اسی طرح گناہ کرنے کے بعد کوئی دنیوی تکلیف آ جائے، کوئی دنیوی مصیبت آ جائے، کوئی نقصان ہو جائے تو اسے توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔ اسے احساس ہو جاتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور اس کے کچھ بچاؤ کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن اگر گناہ بھی کئے جائیں اور وہ ہضم بھی ہوتے رہیں تو وہ بالکل ایسے ہے جیسے کسی نے زہر کھایا اور وہ ہضم ہو گیا۔ زہر جب ہضم ہو جائے تو اس کا نتیجہ موت ہوتا ہے۔ لیکن جسے قرآن موت کہتا ہے وہ ہے اللہ سے دُوری کا نام۔ یہ موت تو زندگی کا ایک رخ ہے۔ انسان یہاں تھا یہاں سے منتقل ہو کر اگلی دنیا میں چلا گیا۔ لیکن زہرِ عصیاں کے نتیجے میں موت جس سے ایمان ضائع ہو جاتا ہے، جس سے نورِ ایمان بجھ جاتا ہے اور روح مر جاتی ہے اور اللہ سے بچھڑ کر یہ بدن چلتی پھرتی قبر بن جاتا ہے۔ وہ موت رحمتِ الٰہی سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دینے والی ہے۔ ہر گناہ کی سزا یہ ہوتی ہے کہ عبادات میں کمی واقع ہونے لگتی ہے، عبادات کی لذت چھن جاتی ہے، عبادات کو جی نہیں چاہتا۔

ثواب کیا ہے؟

ہمیں ثواب کے بکھیڑوں میں الجھا دیا گیا ہے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ ثواب ہے کیا؟ کافروں کو جو سزا ملے گی قرآن نے اسے بھی ثواب کہا ہے۔ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (المطففین:36) کافروں کو کیا ثواب ہو گا؟ وہی جو کرتے تھے، وہی جو وہ ان کے کرتوت تھے۔ قرآن کہتا ہے کافر جو کرتوت کرتا ہے، اس کا جو بدلہ اسے ملے گا وہ اس کا ثواب ہے۔ اسی طرح مومن جو اعمال کرتا ہے اس کا جو بدلہ ملتا ہے، وہ ثواب ہے۔ عبادات کا بدلہ کیا ملتا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا، اللہ اُدھار کرتا ہے۔ بھئی کمال ہے، اللہ

ہمیں کہتا ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دو۔ وہ خود اُدھار کرتا ہے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ جو خود قادرِ مطلق ہے، جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں، وہ کیوں اُدھار کرے گا؟ نہیں..... وہ ہرگز اُدھار نہیں کرتا، وہ نقد دیتا ہے۔ وہ کیا دیتا ہے؟ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (العنکبوت:45) ہر عبادت بندے کو اللہ کی نافرمانی سے روک کر قربِ الٰہی عطا کرتی ہے۔ وہ نقد مزدوری دیتا ہے۔ ہر سجدے کی نقد مزدوری، ہر رکوع کی نقد مزدوری، ہر تسبیح کی نقد مزدوری، ہر تلاوت کی نقد مزدوری کہ جب بھی کوئی اللہ کا نام لیتا ہے تو کسی گناہ میں غرق ہونے کی بجائے نیکی کی طرف چل پڑتا ہے۔ یہی مزدوری ہے اور یہی ثواب ہے۔ مولوی کے اس وعدے پہ نہ رہنا کہ مرنے کے بعد ملے گا، جس کو زندگی میں کچھ نہیں ملا، مرنے کے بعد بھی کچھ نہیں ملے گا۔

توبہ:

نبیِ رحمت ﷺ کا ارشاد ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا اللہ کا محبوب ہے۔ اور توبہ کرنے والا ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ کسی نے غرغرۂ موت تک توبہ نہ کی، تو یہ شیطان کے اوصاف میں سے ہے۔ پھر جب موت سر پر آ گئی، آخرت ظاہر ہو گئی تو قبولیتِ توبہ کا وقت نکل گیا۔

جب کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ میں غلطی کر چکا ہوں، بہت گناہ کر چکا ہوں تو کسی کو بھی درمیان میں نہ لائے اور ذاتی طور پر اللہ کے حضور پیش ہو جائے۔ اور یہ تو اللہ کریم کی صفت ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، ہماری خواہشوں اور آرزوؤں تک سے آگاہ ہے۔ انسان اگر زندگی بھر بھی غلطی کرتا رہا اور پھر اُسے احساس ہو گیا کہ میں نے غلط کیا ہے۔ تو جب بھی اُس کی ذات کو، اُس کے کرم کو، اُس کی رحمت کو آواز دے گا، وہ اُس کی دستگیری کیلئے موجود ہو گی۔ وہ ساری غلطیاں، کوتاہیاں معاف کرنے والا ہے بلکہ ہماری سوچ سے

اس کا کرم بہت زیادہ ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میں نہ صرف گناہ معاف کرتا ہوں بلکہ ان کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہوں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ

☆ کبھی گناہ کا ارتکاب نہ ہونا، یہ فرشتوں کا مقام ہے اور صرف انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔

☆ مسلسل گناہ کرنا اور کبھی ندامت نہ ہونا یا ترکِ گناہ کی طرف نہ آنا، یہ شیطان کی صفت ہے۔ مسلسل گناہ پر ندامت نہ ہونا، شقاوتِ قلبی کا پتہ دیتا ہے جو دنیا کی زندگی میں ایک بہت بڑا عذاب ہے اور مفضی الی الکفر (کفر کی طرف لے جانے والا) ہے، کہ ایمان کا سلب ہو جانا اس کی آخری سزا ہے۔

☆ تیسرا گروہ بنی آدم کا ہے کہ گناہ کا ہو جانا لیکن اس پر فوراً ندامت ہونا، آئندہ اسے چھوڑنے کا پختہ عزم اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا۔

آپ جانتے ہیں کہ جہاں زخم ہوا اور وہ بھر جائے تو وہ جگہ کتنی حساس ہو جاتی ہے۔ وہاں دوبارہ چوٹ کھانے کو جی تو نہیں چاہتا، وہاں تو کوئی انگلی رکھ دے تو احساس ہوتا ہے اور ہم کہہ اٹھتے ہیں "اسے نہ چھیڑ یار! یہ زخم ابھی ٹھیک ہوا ہے"۔ اگر توبہ قبول ہو جائے اور گناہ معاف ہو جائیں تو اسی طرح گناہ کرنے کو جی نہیں چاہتا اور گناہ کی بات ہو تو بندے کو درد ہوتا ہے کہ یار! ابھی تو یہ زخم بھرا ہے، دوبارہ چوٹ نہیں کھاؤں گا۔

اب ماننے کا وقت بھی ہے اور فائدہ بھی:

ایک بادشاہ کسی بستی کے بازار سے گزرا تو اس کی نظر ایک درویش صفت، اللہ کے نیک بندے پر پڑی جو کسی گاؤں میں مقیم تھے۔ تو اس نے پوچھ لیا کہ حضرت آپ یہاں کہاں، آپ تو فلاں شہر میں تھے۔ اللہ کے اس بندے نے کہا "اللہ کریم اور اس کے بندوں

کے درمیان صلح کروا رہا ہوں"۔ تو بادشاہ نے پوچھا، "پھر کامیابی ہوئی"؟ کہنے لگے "اللہ کریم تو مانتے ہیں، بندے نہیں مانتے"۔ عرصہ دراز کے بعد وہ بادشاہ پھر وہاں سے گزرا تو وہ بزرگ اُس بستی کے قبرستان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "حضرت یہاں کیا کر رہے ہیں"؟ انہوں نے فرمایا "اس بستی میں جو بندے پڑے ہیں اُن کی اور اللہ کی صلح کرا رہا ہوں"۔ بادشاہ نے پوچھا، کامیابی ہوئی؟ کہنے لگے "بندے تو مان رہے ہیں لیکن اب اللہ نہیں مانتا"۔

خدارا۔۔۔ اتنا تو کوئی کر لے!

میں کہتا ہوں کہ بھلے نماز نہ پڑھیں، آپ روزہ نہ رکھیں، آپ جھوٹ بول لیں، لیکن خدارا! ایک معمول بنا لیں، بیٹھے ہوئے نہ سہی، وضو کر کے نہ سہی، سوتے وقت ہی سہی، بستر میں جاتے ہوئے سہی، کچھ دو باتیں اپنے رب سے کر لیں۔ سوتے سوتے ہی کوئی آخری بات اپنے رب سے کر لیں۔ یہ آپ کے ذہن کو بیدار کرے گی، یہ آپ کے دماغ کو اس سمت میں لائے گی، یہ آپ کی سوچ کو بدل دے گی اور اے مسلمان! تو خود بخود نمازی بن جائے گا۔ تو خود سچ بولنے والا بن جائے گا۔ تو تمام برائیوں سے اجتناب کرنے والا بن جائے گا لیکن تب بنے گا جب تیری کوئی بات اللہ کریم کے ساتھ ہوگی۔ اللہ کریم کے ہاں آنا جانا ہوگا، اللہ کریم کی بات تیری زبان پر ہوگی اور پھر اگر اس کا ذکر تیرے دل میں اتر جائے گا۔ اگر زبان سے چل کر اللہ کی یہ یاد تیرے دل تک جا پہنچے، تو تُو جو شیطان کا گدھا بنا ہوا ہے، وہ تجھ پر بوجھ لادتا ہے۔ اللہ کی قسم! وہ تیری جوتیوں کی آواز سُن کر بھاگ جایا کرے گا۔ اب تو تُو ڈرتا ہے اور تُو گھبراتا ہے، پھر ایسا وقت آئے گا کہ شیطان گھبرائے گا۔

ارشادات

☆ ذکر کو پوری توجہ اور محنت سے کریں۔ اُسے اس کے مقررہ اوقات میں کریں اور

جتنی فرصت ملے اتنا زیادہ کریں۔

- تلاوت کو لازمی بنائیں۔کوئی دن ایسا نہ ہو جو تلاوت سے خالی ہو۔خواہ چند آیات پڑھ لیں لیکن قرآن کو مطلقاً نہ چھوڑیں۔
- پڑھنے کیلئے سب سے اچھا کلام، قرآن مجید ہے۔
- دنیا کے ہی نہیں آخرت کے بھی تمام کاموں کی بہتری کیلئے اللہ نے بہترین وظیفہ درود شریف بتایا ہے۔درود شریف پڑھیں۔
- نمازِ پنجگانہ پابندی سے ادا کریں۔
- وہ عمل کریں جو اللہ نے کرنے کا حکم دیا، رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔ان سے بچیں جن سے بچنے کی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے تاکید کی ہے۔
- یاد رکھیں! فرصت تو زندگی بھر نہیں ملے گی، ضروریاتِ زندگی ایک ایسا چکر ہے جس میں انسان گھومتا رہتا ہے اور کبھی کوئی شخص فارغ نہیں ہوتا۔جو لوگ کوئی کام نہیں کرتے، آرام کرتے رہتے ہیں۔فارغ وہ بھی نہیں ہوتے، سوئے رہتے ہیں۔زندگی کی مصروفیات میں فراغت نام کا کوئی لفظ نہیں، بلکہ مصروفیات میں ترجیحات کی ایک ترتیب بنانا پڑتی ہے۔یہ نہیں کہ جاہلوں کی طرح صبح اٹھ کر نکل پڑے، جو مل گیا اس کے گلے پڑ گئے، یہ اللہ کی دی ہوئی مہلت کو ضائع کرنا ہے۔ہر انسان کو سونے سے پہلے اپنے کل کے بارے میں سوچنا چاہئے کہ کل اگر اللہ نے مجھے زندگی دی تو کون سا کام سب سے اہم ہے اور اس کے بعد پھر اور کون سا کام کرنا ہے۔

بدعات، رسومات

بدعات اور مباحات

یاد رکھیں! کسی کام میں کوئی اباحت نہیں سوائے اس کے کہ وہ کام محمد رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہو۔جس طرح آپ خوبصورت سے خوبصورت کاغذ لے آئیں، اسے مارکیٹ میں سکے کے طور پر کوئی قبول نہیں کرتا۔لیکن آپ پھٹا ہوا نوٹ لے آئیں اور اُس پر حکومت کی مہر ہو، وہ کاغذ سرکاری ہے، وہ سکے کا کام دیتا ہے۔آپ بڑے سے بڑا خوبصورت عمل کر کے لائیں، لیکن اس پر نبی کریم ﷺ کی اطاعت کی مہر نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں۔

ہمارے ہاں ہر بدعت کو بدعتِ حسنہ کہنے کا رواج ہو گیا ہے اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بدعت میں کبھی حسن نہیں ہوتا۔آپ نے کبھی کوئی خوبصورت ظلمت دیکھی ہے؟ ظلمت میں کیا خوبصورتی ہوگی؟ جتنی بڑی ظلمت ہوگی اتنی زیادہ تاریکی ہوگی۔بدعت میں حسن نہیں ہوتا۔جسے فقہا نے بدعتِ حسنہ لکھ دیا ہے وہ حقیقتاً بدعت نہیں ہوتی۔دراصل وہ مسنون کام ہے جس کی بنیاد سنتِ نبوی ﷺ میں موجود ہے۔حضور ﷺ کے زمانے میں کوئی خارجی رکاوٹ موجود تھی یا کوئی امر مانع تھا، وہ کام ہو نہیں سکتا تھا لیکن حضور ﷺ نے اس کام کے کرنے کا حکم دیا یا اس کام کے کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس ظاہری مانع کی وجہ سے وہ کام نہیں ہو سکا۔جب وہ مانع ہٹ گیا اور وہ کام کر لیا گیا تو فقہاء نے اسے بھی بدعت لکھ دیا کہ نیا شروع کیا گیا لیکن یہ بدعتِ حسنہ ہے۔حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے بیت اللہ شریف کی عمارت کو گرا کر اسے بنائے ابراہیمی پہ بنا دیا تھا۔کیونکہ صحاح میں حضور ﷺ کی حدیث موجود ہے کہ اگر مجھے مسلمانوں کے پریشان ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میرا دل چاہتا تھا

کہ میں بیت اللہ شریف کو شہید کر کے حضرت ابراہیمؑ والی بنیاد پر بنا دیتا۔ لیکن بعد میں حجاج بن یوسف نے بیت اللہ شریف کو حضرت ابن زبیرؓ کی مخالفت میں شہید کر کے پھر اسی طرح کر دیا جس طرح قریش نے بنایا تھا۔

اب دیکھیں ایک پورا مٹکا دودھ کا ہو، اس میں ایک قطرہ شراب ڈال دیں۔ وہ سارے کا سارا خراب ہو جائے گا۔ سارا کام آپ شریعت کے مطابق کریں اور اس میں ایک بدعت داخل کر دیں تو سارے کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہمارے ہاں رسومات بہت ہو گئی ہیں اور ہر کام میں غلو، زیادتی اور افراط و تفریط ہے۔

مباحات کو آپ بدعت نہیں کہہ سکتے۔ کھانے پینے میں جو چیزیں مباح ہیں جیسے حضور ﷺ کے زمانے میں چائے نہیں بنتی تھی آج کسی نے چائے بنالی، آپ بدعت کہہ دیں، نہیں، یہ مباحات ہیں۔ ہاں! اگر اس کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ کر لیا جائے کہ چائے پینا باعثِ ثواب ہے، تو وہ بدعت ہو جائے گی۔

بدعات و رسومات

ہر وہ کام بدعت ہے جو قرآن نے نہیں بتایا، جو حضور اکرم ﷺ نے نہیں بتایا، جو سنت میں نہیں ہے اور جسے خود اپنی طرف سے بنا کر اسے ثواب بھی کہا جائے۔ بہت سی رسومات جو ہندوؤں سے مسلمانوں میں آ گئی ہیں، اب وہ اتنی راسخ ہو گئی ہیں کہ لوگ فرائض ترک کر سکتے ہیں، صلوٰۃِ پنجگانہ چھوڑ سکتے ہیں، روزہ نہیں رکھتے لیکن ان رسومات پر ضرور عمل کرتے ہیں۔ کچھ تو شادی بیاہ کے معاملے میں ہیں اور اور کچھ موت کے معاملے میں اور دوسرے دیگر اُمور میں بھی بیشمار ایسی رسومات ہیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں۔ ایسی رسومات ایجاد کرنا جو قرآن و سنت سے ثابت نہ ہوں اور اُن پر عمل کو ثواب بھی سمجھنا، اس کو بدعت کہتے ہیں۔

بدعت کی صورت میں ہم نے کفار سے بڑھ کر گستاخی کرنے کی جسارت کی ہے۔ بڑی قابلِ غور بات ہے کفار نے جو کیا انہوں نے یہ کہہ کر کیا کہ اسلام کے اصول ہم نہیں مانتے، ہمارے اپنے اصول ہیں۔ انہوں نے اگر کفر کی راہ اپنائی ہے تو اسے وہ کفر ہی سمجھتے ہیں، کوئی اسلام نہیں کہتا۔ ہم نے یہ زیادتی کی کہ ہم نے اسلام کے نام پر اپنی مرضی کی رسومات بنا کر انہیں اسلام کا نام دے دیا، اسے ثواب اور عبادت قرار دیا۔ یعنی ہم گستاخی میں اُن سے بھی آگے نکل گئے۔

ہمارے ہاں بچے کی پیدائش سے لے کر میت کے دفن تک سنت معدوم ہوتی جا رہی ہے اور رسومات سر پر چڑھتی جا رہی ہیں۔ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن یہ چھوٹی باتیں نتائج کے اعتبار سے بہت بڑی ہوتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کیا حرج ہے یہ چھوٹی سی بات ہے۔ لیکن جب ہم خلافِ اسلام چھوٹی باتوں کا جواز پیدا کرتے ہیں تو بڑی باتوں کو روکنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ جہاں چھوٹا سوراخ ہو سکتا ہے وہاں بڑا دروازہ بھی بن سکتا ہے۔ ایک دفعہ راستہ بن جائے تو پھر کوئی نہ کوئی اُس میں سے ایک نہ ایک اینٹ اکھیڑتا رہتا ہے اور وہاں بڑا دروازہ بھی بن جاتا ہے اور ہم نے یہ زیادتی کی ہے۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ جو رواج عبادت بن گئے ہیں وہ اتنے اہم ہو چکے ہیں کہ صرف انہی پر اصرار کیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اس بارے کیا فرمان ہے اور کیا حکم ہے۔ مثلاً رمضان کی ستائیسویں کو اکثریت نے شب قدر سمجھ رکھا ہے۔ دیہاتوں تک میں اُسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ حلوے پک رہے ہوتے ہیں اور عبادت کو اُسی رات کے ساتھ مخصوص کر لیا گیا ہے، اس لئے کہ یہ ایک رواج بن چکا ہے۔ یہ حال تو اُن لوگوں کا ہے جو نماز، روزہ کے پابند ہیں، تو وہ جو یہ فرض عبادات بھی نہیں کرتے وہ اتباعِ رسالت ﷺ کیسے کرتے ہوں گے۔ اور پھر جو ایمان ہی نہیں رکھتے، ان کا کیا حال

ہوگا۔ اگر نیک اس نوبت تک پہنچ گئے ہیں تو بدکار کہاں ہوں گے اور کافر تو پھر کہاں ہوں گے۔

بدعت کرنے والا توبہ سے محروم ہو جاتا ہے:

بدعات میں جو لوگ گرفتار ہوتے ہیں، انہیں بہت کم توبہ نصیب ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر آدمی بدعت کو گناہ سمجھے تو اس سے توبہ کرے۔ جب اس بدعت کو قربِ الٰہی کا سبب اور ثواب سمجھ لیتے ہیں تو ثواب سے بھلا کوئی کیوں توبہ کرے گا۔ توبہ تو تب کرے گا جب وہ اسے گناہ سمجھتا ہو۔ تو علماءِ حق فرماتے ہیں کہ بدعت کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس سے توبہ نصیب نہیں ہوتی۔

خوشی غمی کی رسومات:

مسلمانوں میں دیکھ لیجیے! موجودہ حالات میں کوئی ایسا کام نظر نہیں آتا جس میں رسم داخل نہ کر دی گئی ہو حتیٰ کہ اذان، نماز، روزے کی افطاری میں بھی رسوم داخل کر دی گئی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو مر جاتا ہے، یتیم بچے چھوڑ جاتا ہے، اس کی میراث جب تک ورثاء میں اور یتیم ہونے والے بچوں میں تقسیم نہ ہو، تب تک اس سے خرچ کرنا جائز نہیں۔ جبکہ میرے علم کے مطابق شادی سے بڑی دعوت مرنے پہ ہوتی ہے اور اس پہ کوئی پابندی بھی نہیں ہے جبکہ حکومت نے شادی کی دعوت پہ پابندی لگا دی ہے حالانکہ لڑکے والوں کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق شادی کی دعوت بطور ولیمہ کرنا تو سنت ہے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک مریض دوائی کیلئے ترستا رہتا ہے اور اسے سو پچاس کی دوائی لا کر کوئی نہیں دیتا، لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو پھر دیگیں پکنا شروع ہو جاتی ہیں اور ہزاروں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ اب غسل، کفن تو مجبوری ہے لیکن ہم ساری رسومات وہ ادا کریں گے جو باپ، دادا سے ورثے میں ملی ہیں، دسواں، اکیسواں اور چالیسواں، حالانکہ کسی کا کوئی

شرعی ثبوت نہیں ملتا۔

شرعاً قاعدہ تو یہ ہے کہ تین دن تک رشتہ دار اور دوست احباب مہمانوں کو کھانا دیں۔ دعوتیں نہ کریں لیکن جو دور سے مہمان آئے ہیں یا خود اس کے بچے، اہلِ خانہ رہ گئے ہیں ان کے کھانے کا انتظام کریں۔ جو رسمیں ہم نے بنالی ہیں، ان پر ہم حرف نہیں آنے دیتے اور جو اللہ کا حکم ہے، جو فرائض شریعت نے مقرر کئے ہیں، ان کیلئے ہمارے پاس فرصت ہی نہیں ہوتی۔

شادی میں کتنی رسومات ہیں جن کی کوئی شرعی دلیل نہیں ملتی۔ اس پہ دلیل ہوتی ہے کہ جی باپ دادا سے اسی طرح ہوتا آیا ہے، ہم نہیں کریں گے تو ناک کٹ جائے گی۔ وہ کون سی ناک ہے بھئی جو شریعت پر عمل کرنے سے کٹتی ہے۔ اگر شریعت پر اور سنت پر عمل کرنے سے ناک کٹتی ہے تو اس کا کٹ جانا ہی بہتر ہے کہ ناک کے بغیر تو گزارا ہو سکتا ہے لیکن شریعت کے بغیر گزارا ممکن نہیں ہے۔

رسومات دین کا لازمی حصہ بنتی جا رہی ہیں:

اب رسم کو رسم کے درجے میں سمجھا جائے تو شاید اسے برداشت کرنے کی کوئی گنجائش نکل آئے لیکن اگر اسے دین کا درجہ دے دیا جائے تو پھر یہ آپ کو اسلام سے باہر لے جائے گی۔ اب رسم، دین کا اتنا لازمی حصہ بنا دی گئی ہے کہ جو سنت کے مطابق عمل کرتا ہے، اسے کہتے ہیں یہ بے دین ہے، یہ وہابی ہو گیا ہے۔ ایک طرفہ تماشہ ہے کہ چوری کرنے والے کو، ڈاکہ ڈالنے والے کو، قتل کرنے والے کو کوئی وہابی نہیں کہتا۔ دین بیان کرو تو کہتے ہیں یہ وہابی ہو گیا ہے۔ حد ہو گئی۔

یاد رکھیں! دین کے نام پر رسومات جاری کرنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کا ایمان سلب کر لیتا ہے اور انہیں ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔ ہر کام کا ایک سلیقہ، طریقہ ہے

جو شریعت میں متعین ہے۔ شریعت سے باہر جا کر رسومات ادا کرنا اور پھر توقع کرنا کہ ان سے میرا بھلا ہو گا، یہ خود فریبی ہے۔ ہمارے ہاں زیادتی یہ ہے کہ جو انکار کرنے پہ آجائے، وہ جائز بات کا بھی سرے سے انکار کر دیتا ہے اور جو اقرار کرنے پہ آئے، وہ اسے دین کا حصہ بنا کر چھوڑتا ہے۔

لوگ کیا کہیں گے؟

آج اگر آپ غور فرمائیں تو دین پر عمل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ "لوگ کیا کہیں گے"۔ شادی تو شادی، موت پر بھی کسی کو کہا جائے کہ شریعت کے مطابق معاملہ کرو تو کہتے ہیں لوگ کیا کہیں گے۔ شادی میں کہو کہ ہندوؤانہ رسومات ادا نہ کی جائیں اور سادہ سی اسلامی اطوار کے مطابق شادی اور دعوت کی جائے تو کہتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اور عجیب بات ہے کہ ایسے لوگ بھی کہتے ہیں جنہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ لوگ انہیں یاد بھی نہیں کرتے، انہیں بھی یہ ڈر ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ یہ نہ دیکھو کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ لوگوں نے آپ کا حساب نہیں لینا، لوگ آپ کو روزی دے رہے ہیں نہ ہی آپ کے جسم و جان کے مالک ہیں۔ صرف یہ دیکھو کہ میرا اللہ اور میرا حبیب ﷺ کیا فرماتے ہیں۔ ہر کام اس نظر سے کرو کہ شریعتِ مطہرہ میں اس کی کیا حیثیت ہے۔ لوگ کیا کہتے ہیں، لوگوں کو کہنے دو۔ معاشرے میں اگر سارا معاشرہ بھی برائی کی طرف چل پڑے تو ہمارے پاس یہ کوئی جواز نہیں ہے کہ دوسرے برائی کر رہے ہیں، میں بھی کروں گا۔ یہ کیا جواز ہے؟ خدانخواستہ اگر دوسرے سارے غرق ہونا شروع کر دیں تو کیا ہم بھی غرق ہو جائیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ جو شخص اپنے وجود کے ساتھ، اپنے آپ کے ساتھ وفا نہیں کرتا، اس سے کوئی دوسرا امیدِ وفا رکھے تو وہ بھی بیوقوف ہے۔

جو لوگ، لوگوں کی پروا کرتے ہیں، وہ دین پر عمل نہیں کر پاتے۔ دین پر عمل

کرنے کیلئے ایک ہی معیار ہے کہ شریعت کیا کہتی ہے۔ اللہ اور اللہ کا حبیب ﷺ کیا کہتے ہیں۔ لوگوں کو، رسومات کو اور رواج کو چھوڑ کر، اس سب سے بالکل الگ ہو کر، تنہا کھڑا ہو کر کوئی سوچے کہ مجھے وہ کرنا ہے جو آقائے نامدار ﷺ نے حکم دیا ہے۔ میری اور کوئی غرض نہیں، میری غرض صرف نبی کریم ﷺ کی اطاعت ہے، بس بات ختم۔ کوئی مجھے اچھا کہے، کوئی مجھے برا کہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ مجھے ویسا کرنا ہے جیسا محمد رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔ اس سارے الم غلم کو چھوڑ کر، اپنی ذات کو لے کر اور سامنے محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کو رکھ کر دو قدم چل کر دیکھے کہ پھر اللہ کی محبت نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔ محبتِ الٰہی تو آسان کام ہے، مشکل اگر ہے تو اپنے آپ میں، اپنے اردگرد جو ہم نے بکھیڑے بنا رکھے ہیں، ان سے نکلنا مشکل ہے۔ بس اس سے انا مجروح ہوتی ہے۔ ہر بندے کے دل میں ہے کہ میں بھی کچھ ہوں۔ جب تک یہ 'میں' اور 'میری' ہے، تب تک دوسری بات نہیں بنتی۔ اللہ کے بندوں کی یہ کوالٹی سب کے سامنے آجاتی ہے کہ جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتے کہ لوگ کیا کہیں گے، وہ یہ سوچتے ہیں کہ میرے اللہ کا کیا حکم ہے، میرے نبی ﷺ کا کیا حکم ہے۔

خطرناک بات

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ جو چیزیں حق تھیں، ان سب کو ہم نے رسومات و رواجات کی نذر کر دیا اور بجائے شکر ادا کرنے کے ناشکری کے مرتکب ہوئے۔ دینی شعائر کو رسومات و رواجات کی نذر کر دینا بہت خطرناک بات ہے کہ دین کو اتنا نقصان مخالف دین قوتوں سے نہیں پہنچتا، جتنا دین کے نام پر ایجاد کی جانے والی رسومات سے پہنچتا ہے۔ کیونکہ کفر کی مخالفت تو گناہ گار مسلمان بھی کرتا ہے لیکن اسلام کے نام پر کوئی رواج ایجاد ہو جائے تو اس میں نیک مسلمان بھی پھنس جاتے ہیں۔ یہ زیادہ بڑا جرم اور زیادہ

خطرناک کام ہے۔ اللہ اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

خلافِ سنت عمل

ہم کلمہ تو پڑھتے ہیں، دعویٰ ایمان بھی کرتے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ کی ادائیں بھلائے جا رہے ہیں۔ عملی زندگی خلافِ سنت گزار رہے ہیں۔ ہم جہاں جہاں مغربی تہذیب کے انداز اپناتے ہیں، وہاں وہاں اپنے عمل میں ایک ایک سنت ترک کرتے ہیں۔ خلافِ سنت عمل کرنے کیلئے ایک سنتِ خیر الانام ﷺ کا خون کیا جاتا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمیں اس کا دکھ نہیں ہوتا، ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔

کتنا بدنصیب ہوگا وہ شخص جو دعویٰ ایمان کے ساتھ وظیفے، چلے اور پتہ نہیں کیا کیا کرتا رہے۔ محنتیں اور مجاہدے کرتا رہے، لیکن وہ خلافِ سنت ہوں، قابلِ قبول نہ ہوں۔ چونکہ کوئی بھی عمل جو سنت کے خلاف ہے، اس میں بہتری نہیں ہے، نہ ہی وہ اللہ کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا۔ اب نوٹ حکومت کا سکہ ہے، جب آپ نوٹ لے کے جاتے ہیں تو کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ آپ خود چھاپ کر، اوپر مہر لگا کر لے جائیں تو کون لے گا؟ ہر عمل سکہ ہے۔ اصلی ہوگا تو کیوں محروم رہو گے اور نقلی لاؤ گے تو کیا ملے گا۔ اپنی طرف سے گھڑ کے، اپنے رواج بنا کے، اپنی رسومات بنا کر اسے عبادت کہہ کر لاؤ تو پھر یہ یہود و نصاریٰ والا دعویٰ ہی ہے۔ ہاں! صدقِ دل سے محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی کر لو، تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوگا کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا۔ کبھی خوف نہیں ہوگا کہ میرے ساتھ کیا ہو جائے گا؟ خوف سے بھی محفوظ ہو جاؤ گے اور افسوس سے بھی۔

میں اللہ کو گواہ بنا کر آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اللہ کا جو بندہ، کسی بھی وقت یہ عہد کر لے کہ وہ زندگی کے اعمال و کردار، فکر و نظر، قول و عمل تک کو سنتِ خیر الانام ﷺ کے تابع لے آئے گا، اس پر اسی لمحے اللہ مہربان ہو کر اس کی ایسی مدد کرے گا کہ اسے سنت بھی

نصیب ہوگی، دنیا کی کامیابی بھی اور آخرت کی کامیابی بھی نصیب ہوگی۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

عبادت اور عملِ صالح کیلئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ کا حکم ہو اور دوسرا یہ کہ طریقہ وہ ہو جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا یا سکھایا یا اختیار کیا یا کسی کو کرتے دیکھ کر پسند فرمایا۔ یہ ساری باتیں اس عمل کی صالحیت کی دلیل ہیں۔ اب وہ اذان جس کا محمد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اور پچھلی چودہ صدیوں میں وہی اذان ہوتی رہی۔ اب پندرھویں صدی میں اس کے ساتھ پتہ نہیں کیا کیا شامل ہو گیا۔ ہر مسجد کا مؤذن اپنی مرضی سے اس میں جو چاہے، آگے پیچھے لگا لیتا ہے۔ یعنی کوئی چیز اس میں مستقل بھی نہیں ہے۔ اب ہمارے پاس جواز یہ ہے کہ جی ہم درود ہی تو پڑھتے ہیں۔ درود ضرور پڑھیں، دن رات پڑھیں، اٹھتے بیٹھتے پڑھیں بلکہ مجھ سے کوئی وظیفہ پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے درود شریف پڑھا کرو۔ لیکن درود شریف اذان کا حصہ تو نہیں۔ آپ اذان میں کیوں داخل کرتے ہو؟ اذان تو وہی ہے جو بلال حبشیؓ سے دلوائی گئی اور سارے عہدِ صحابہ، تابعین، تبع تابعین میں ہوتی رہی۔ یہ سب تو ہمارے سامنے ہو رہا ہے، آنے والی نسلوں کو شاید یہ بھی پتہ نہ چلے کہ اصل اذان کیا تھی؟ یہ کیسی عجیب بات ہو گئی کہ جو حضور ﷺ کے حکم کے مطابق چلتا ہے وہ وہابی ہے، منکر ہے۔ وہ توہینِ رسالت کا مرتکب ہے اور جو نافرمانی کر رہا ہے وہ اس کا مرتکب نہیں ہے۔

عبادت کی قبولیت کا نتیجہ:

شب برأت ہو یا لیلۃ القدر، یہ ساری نفلی عبادتیں اس زندگی کی سجاوٹ ہیں جو سنت کے مطابق ہو، اس شخص کے لئے جو فرائض کا پابند ہو، اس شخص کے لئے جو حلال و حرام میں تمیز کرتا ہو، اس شخص کے لئے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہو۔ اب اگر

درمیان میں سے یہ اصل چیز ہی نکال دیں تو ظاہری سجاوٹ کس کام آئے گی!

میرے بھائی! یہ شبِ برأت بھی اور اس کی شب بیداری اور اس کے نوافل بھی تب ہیں کہ جب ہم اصل کو قائم کریں۔ اب رواج یہ آ گیا ہے کہ اصل کو تو بھول جاؤ، جانے دو، سال بھر سجدہ نہ کرو، ایک شبِ برأت کو جاگ لو۔ یاد رکھیں! ان مبارک راتوں کی عبادت کا بھی ثواب اگر آپ کو چاہیے تو ثواب یہ ہے کہ رات کو جاگیں تو صبح کو توفیقِ عمل ارزاں ہو جائے، پھر آپ سمجھیں کہ رات کا جاگنا قبول ہو گیا۔ عبادت کا نتیجہ توفیقِ عمل ہے۔ اگر توفیقِ عمل ارزاں نہیں ہوتی تو عبادت قبول نہیں ہے۔

حج رسومات کی نذر

حج ایک ایسی عبادت ہے کہ جس نے زندگی میں ایک بار کر لیا، حضور ﷺ فرماتے ہیں گویا وہ اس طرح ہو گیا جس طرح آج دنیا میں پیدا ہوا، اس کے تمام گناہ اور برائیاں مٹ گئیں۔ بھائی! برائیاں مٹ جانے کا مطلب ہے آئندہ کے لیے نیکی کی توفیق مل جانا۔

لوگ حج کر کے ایسے آتے ہیں جیسے پکنک منا کر آ گئے۔ ڈھول باجے بجاتے ہوئے جاتے ہیں، پٹاخے چلاتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ ہار پہنائے جاتے ہیں، دعوتیں اڑائی جاتی ہیں اور شاید شکر کرنے کی بجائے، تواضع انکساری کی بجائے ایک اور نمائش لگ جاتی ہے۔ شادی سے زیادہ خرچ تو حج پر جانے والوں کو رخصت کرنے والوں کی دعوتوں پر لگ جاتا ہے۔ جب وہ آتے ہیں پھر وہی حال ہے۔ گاڑیوں کا جلوس ہے، پھول لٹک رہے ہیں اور تماشا ہو رہا ہے اور بندہ پہلے سے بھی گیا گزرا ہو جاتا ہے۔ حج بھی ایک تماشا بن گیا ہے، عبادت نہیں رہی۔ یہ ایک ایسا علاج تھا جس سے مردے زندہ ہو جاتے تھے، اب وہی دوا کھا کر لوگ مرنے لگے ہیں۔ رسومات رہ گئیں، دلوں کے رابطے ٹوٹ گئے۔ نرا دعویٰ رہ گیا، اس میں حقیقت نہ رہی اور اسی بات نے ہمیں رسوا کر دیا۔

شیطان کے فریب بھی عجیب ہیں

اولیاء اللہ نے کوششیں فرمائیں اور آپ کے سامنے ہے کہ شیطان نے ان کے زمانے میں تو مار کھائی لیکن ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد انہی کی قبروں کی عبادت اور پرستش پہ لوگوں کو لگا دیا جنہوں نے زندگی بھر دین کی سربلندی کیلئے جہاد کیا، محنتیں کیں، مجاہدے کئے اور جن کے طفیل اللہ کی ایک مخلوق کو ہدایت نصیب ہوئی۔ ان کے وصال کے بعد کچھ ہی عرصہ گزرا تو ان کی قبروں کی پوجا شروع ہو گئی۔ لوگ بھٹک گئے، گمراہ ہو گئے۔ ڈھول، باجے گاجے لے کر ان کی قبروں پر جمع ہو گئے، قوالیاں شروع ہو گئیں، حقائق کی جگہ روایات نے لے لی۔ یہ کیا ہے بھئی؟ کہتے ہیں یہ روح کی غذا ہے؟ یہ میلے ٹھیلے، ڈھول تماشے، ظاہری کردار کو بھی خراب کرتے ہیں چہ جائیکہ روح کی غذا بن جائیں۔ یہ ابلیس کا انتقام تھا اور ہم اس کی نذر ہوتے رہے اور دیکھتے رہے۔ شیطان کے فریب بھی عجیب ہیں۔

آپ اہل اللہ کی سرگزشت پڑھیں تو ہر ولی اللہ نے، ہر عالمِ حق نے، ہر اس بندے نے جسے اللہ نے توفیق دی، کوشش کی کہ لوگوں کو اللہ کے روبرو کر دیں، لوگوں کو اللہ سے ملائیں۔ مرورِ زمانہ سے ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو لوگ اللہ کو بھول کر پھر اپنی دنیا میں گم ہو گئے۔ اب خانقاہوں سے دنیا طلب ہونے لگی۔ اس خانقاہ پہ جاؤ تو روزگار مل جاتا ہے۔ اس مزار پہ جاؤ تو بیماری ٹھیک ہو جائے گی "بدیں تفاوت راز کجا است تا بکجا"۔ بات کیا تھی، کہاں پہنچ گئی!

ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ کسی کا ماں باپ، بیٹا، بھائی بیماری سے مر رہا ہو گا، اس کیلئے دوائی لا کر نہیں دیتے، وہ جو بھوکا سو گیا ہے، اسے چند دانے غلے کے یا تھوڑا سا آٹا نہیں دیتے کہ وہ بھی کھا لے۔ لیکن دنبے، بکرے لے کر چڑھاوے چڑھاتے پھرتے

ہیں۔ یہ کون سا دین ہے؟ کسی بت کو نذر کرنے میں اور بزرگ کے مزار پر چڑھاوا چڑھانے میں کیا فرق ہے؟ یہی کہ انہوں نے بت کو دیا اور یہ مزار کو دیتے ہیں تو مزار پر دینے والے نے دوہرا ظلم کیا کہ اللہ کے ایک نیک بندے کو وہ حیثیت دے دی جو ایک بت کی ہے۔

اخلاقیات ومعاشرت

تقویٰ

تقویٰ سے مراد وہ کیفیت ہے جو قلب کی، روح کی، دل کی، انابر کے انسان کی اللہ کریم کے ساتھ تعلق پیدا ہونے سے بن جاتی ہے۔ ایسا ایک احساس، ایسا تعلق جو ذرا ذرا سی بات پر بندے کو چونکا دے۔ ایک ایسا تعلق رب جلیل سے بن جائے کہ بات کرتے وقت، کام کرتے وقت، یہ فکر دامن گیر ہو جائے، یہ خوف دل میں آجائے کہ ایسا کرنے سے کہیں اللہ کریم خفا تو نہیں ہو جائیں گے۔ یا کہیں اس بات سے اللہ کریم ناگواری تو نہیں محسوس فرمائیں گے، ناپسند تو نہیں فرمائیں گے۔ مجھ پر جو کرم ہے، جو نوازشات کی بارش ہے، میرا یہ اقدام اس میں کوئی تعطل تو پیدا نہیں کر دے گا۔ یہ خطرہ جب طبیعت میں پیدا ہو جائے تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔

تقویٰ اپنی عاجزی کا احساس، اپنی عاجزی کا اقرار اور اپنے کچھ نہ ہونے کی خبر کا نام ہے۔ اللہ کے سب کچھ ہونے کے اقرار کا نام ہے کہ وہ سب کچھ ہے، میں کچھ بھی نہیں۔ تقویٰ اس کیفیت کا نام ہے کہ جب انسان سمجھ لے کہ اگر دنیا کی دولت چھنتی ہے، چھن جائے، جان جاتی ہے چلی جائے لیکن کسی بھی قیمت پر میں اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ ایک ایسی کیفیت، ایک ایسا تعلق، ایک ایسا رشتہ اللہ کریم سے پیدا ہو جائے جس میں آدمی مرضیاتِ باری کا اسیر ہو جائے۔ اگر کبھی بتقاضائے بشریت اس سے خطا سرزد ہو جائے تو اس پہ نادم ہو کر روئے، اسے دکھ ہو۔ اس کیفیت کو پانے کیلئے صرف ایک بارگاہ ہے اور وہ ہے بارگاہِ محمد رسول اللہ ﷺ۔ تمام دروازے جو بارگاہِ الوہیت کی طرف کھلتے تھے، تمام انبیاءؑ جو مخلوق اور خالق کے درمیان واسطہ تھے، سب کی نبوتیں تمام ہو

چکیں، شریعتیں تمام ہو چکیں، سب دروازے بند ہو چکے۔ صرف ایک در کھلا ہے اور وہ ہے درِ محمد رسول اللہ ﷺ۔

تقویٰ اور کیفیاتِ قلبی

ورع و تقویٰ کا تعلق کیفیاتِ قلبی سے ضرور ہے لیکن نرے ورع و تقویٰ سے کیفیات نصیب نہیں ہوتیں۔ کیفیات کا تعلق براہِ راست محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے، ورع و تقویٰ ان میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن اگر برکاتِ نبوی ﷺ جو سینہ اطہر ﷺ سے نصیب ہوتی ہیں، نصیب نہ ہوں تو ورع و تقویٰ نجات کا سبب تو ہے، بہت اچھی بات ہے لیکن اس سے کیفیات نصیب نہیں ہوتیں۔

اتقو فراست المومن۔۔۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے اتقوا فراست المومن فانه ینظر بنور الله کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ حضرت عثمانِ غنی مسجدِ نبوی ﷺ میں تشریف فرما تھے ایک آدمی ملنے آیا۔ اس نے کہیں راستے میں کسی غیر محرم عورت پر نظر ڈالی تھی۔ جب آپؓ نے اسے دیکھا تو فرمانے لگے کہ لوگ مسجد میں بھی اس حال میں آتے ہیں کہ ان کی نگاہوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ امیر المومنین! کیا وحی باقی ہے؟ فرمایا! ''نہیں وحی باقی نہیں ہے، فراستِ مومن باقی ہے''۔

ایمان اور بر (نیکی):

ایمان نام ہے اعتماد علی الرسول ﷺ کا۔ قلبِ پیغمبر ﷺ کے ساتھ مومن کے دل کا رشتہ اعتبار و اعتماد کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے اور وہ برکات جو قلبِ اطہر ﷺ سے قلبِ مومن پہ آتی ہیں وہ ایک یقین کی فضا پیدا کرتی ہیں، اس یقین کا نام ایمان ہے۔ اس ایمان میں اتنی قوت آجائے کہ وہ ہمارے کردار کا احاطہ کر لے، یہ ''بر'' ہے، نیکی ہے۔ جیسے ہمیں پتہ

ہے کہ آگ جلاتی ہے، یقین کا یہ عالم ہے کہ ہم اس میں انگلی نہیں ڈالتے۔ ہمیں پتہ ہے کہ یہ جلاتی ہے۔ اگر اسی طرح کا اعتبار آجائے کہ نافرمانیِ پیغمبر ﷺ آگ ہے، جلاتی ہے اور وہ جو یقین دل میں ہے، ہمارے کردار کو بدل دے، گناہ سے ڈر لگے اور نیکی کی طرف جانے کو جی چاہے تو یہ ''بر'' ہے۔

یقین:

ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہمارے یقین میں لچک ہوتی ہے۔ یقین لچکدار نہیں ہوا کرتا۔ جس میں لچک ہو، اسے یقین نہیں کہتے۔ یقین ایک ٹھوس حقیقت ہوتی ہے۔ ہمارے پاس رکھا کیا ہے؟ بیویاں ہیں تو دین سے ناآشنا ہیں، اولاد ہے تو وہ خود ہم سے ناآشنا ہے، ہم کچھ کہتے ہیں وہ کچھ اور کہتے ہیں۔ ہم تو بے مایہ لوگ ہیں۔ اس عہد کے فرد کے ساتھ نہ اولاد ہے، نہ اس کے ازواج ہیں۔ یعنی ہم تہی دامن لوگ ہیں، ہم نے کیا قربان کرنا ہے۔ اپنا نفس ہے اور اسی کو پالتے رہے، ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

تو پورے یقین کے ساتھ اپنے اللہ سے وفا کیجیے، اپنے نبی ﷺ سے وفا کیجیے۔ آپ ان کے ہو جائیں، سب کچھ آپ کا ہو جائے گا۔

خلوص:

خلوص ایک کیفیت کا نام ہے، انسان کے دل کے اندر کی ایک حالت ہے جو کاموں اور چیزوں کی اہمیت کا تعین کرتی ہے۔ ایک بندہ ایک لاکھ سجدے بغیر خلوص کے کرتا ہے اور ان میں سے کوئی ایک سجدہ خلوص سے کرتا ہے تو وہ ایک لاکھ سجدوں پر بھاری ہے۔ لاکھوں بندے گناہ کرتے ہیں، کوئی ایک پر خلوص بندہ سجدے میں ہوتا ہے تو لاکھوں کے گناہ سے جو ظلمت پیدا ہوتی ہے، اس پہ وہ نور حاوی آجاتا ہے۔ تو یوں کائنات کا نظام متوازن رہتا ہے۔

خلوص کی پہچان عملی زندگی میں ہمارے فیصلوں سے ہوتی ہے۔ خلوص کوئی جنس نہیں ہے۔ کوئی ٹھوس، مائع، گیس نہیں ہے، ایک کیفیت ہے۔ جیسے ماں اپنے چھوٹے بچے کیلئے کتنی مخلص ہوتی ہے کہ اسے سلانے کے لیے اپنی نیندیں قربان کرتی ہے۔ اس کی صحت کے لیے اپنا کھانا پینا قربان کرتی ہے۔ اسے آرام دینے کے لیے اپنا آرام چھوڑتی ہے۔ یہ اس ماں کا اس ننھی جان کے ساتھ خلوص ہے۔ اب اگر وہ کیفیت ہم میں آجائے کہ ہم اتباعِ دین، اتباعِ رسالت ﷺ کے لیے اپنی خواہشات، اپنی دولت، اپنا آرام چھوڑ سکیں تو اس کیفیت کا نام خلوص ہے اور اس کے حصول کا طریقہ ذکرِ الٰہی ہے۔

جہاں خلوص ہوگا وہاں بندہ اپنی بڑائی، اپنی پارسائی کے زعم میں مبتلا نہیں ہوگا۔ اگر اس کے پاس کوئی خوبی ہوگی، کوئی کمال ہوگا تو وہ اسے اللہ کی عطا سمجھے گا۔ اگر اسے عبادت کی توفیق ہے، اگر اسے نیکی کی توفیق ہے، رزقِ حلال کی توفیق ہے تو وہ مزید اللہ کا شکر ادا کرے گا۔

خلوص اور لذت: لذت آپ کس کو کہیں گے! feelings کو، احساسات کو۔ وہ احساس جو خوشی اور فرحت دے، وہ لذت کہلائے گا۔ کسی کو لوٹ کر لذت ملتی ہے اور کسی کو لٹا کر لذت ملتی ہے۔ بات تو ہر ایک کی اپنی اپنی لذت اور لطف کی ہے۔ صحابہ کرامؓ کو جب اللہ رب العزت سے تعلق نصیب ہوا تو اللہ کے نام پر گھر چھوڑنے میں بھی لذت تھی، اللہ کے نام پر مار کھانے میں بھی لذت تھی، اللہ کے نام پر تکالیف برداشت کرنے میں بھی ایک لذت تھی۔ اسی لئے آپ پوری تیرہ سالہ مکی زندگی میں کوئی ایک صحابیؓ ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ جس نے یہ عرض کیا ہو، یارسول اللہ ﷺ! ہم ان مصیبتوں سے تھک گئے ہیں، اللہ سے دعا کیجیے کہ یہ کافر تباہ ہو جائیں۔ آخر وہ کہہ سکتے تھے، کیوں نہیں کہا؟ وہ بھی تو انسان تھے، مٹی کے بنے ہوئے، خاک کے پتلے۔ انہیں درد بھی ہوتا تھا، چوٹ بھی لگتی تھی، بھوک بھی لگتی

تھی، انہیں بھی گھر کی، گھر کے سامان کی، اپنے کاروبار کی ضرورت تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ خلوص سے جب انہوں نے اطاعتِ پیغمبر ﷺ کا عہد کر لیا تو انہیں قربِ الٰہی کا وہ لطف نصیب ہونے لگا، جس میں اللہ کے نام پر کچھ کھو کر مزہ آتا تھا، مار کھا کر راحت ملتی تھی، پریشانیاں ان کا لطف دوبالا کر دیتی تھیں۔

اخلاص اور یکسوئی: میں یہ چاہتا ہوں کہ جب آپ لوگ ذکر کی مجلس میں آئیں، کہیں بھی ذکر کر رہے ہوں، گھر میں یا یہاں کر رہے ہوں تو جو لمحے ذکر کیلئے ہیں، وہ صرف ذکر کیلئے مختص ہوں۔ اولاد بڑی پیاری ہوتی ہے، بندے کو گھر والوں سے محبت ہوتی ہے لیکن کبھی آپ گھر جائیں، آپ کی اہلیہ آپ سے بھی بات کر رہی ہو اور دوسری طرف کسی اور سے بھی مخاطب ہو، بیٹے کو بلائیں تو وہ ادھر آپ سے بھی بات کر رہا ہو اور دوسری طرف فون پر بھی بات کر رہا ہو، تو آپ کیا محسوس کریں گے؟ پھر کہاں خالقِ لم یزل، کہاں دعویٰ طلبِ جمال اور کہاں یہ بے توجہی۔ یوں بات نہیں بنے گی۔ زیادہ لوگوں کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ یہ اللہ کے وصال کے طالب ہیں۔ لیکن حرکات دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ یار! یہ بات تو کرتے ہیں لیکن حقیقت میں طالب نہیں ہیں۔ ان کا دل پیچھے اٹکا ہوا ہے۔ ان کو تو اپنے موبائلوں سے ہی فرصت نہیں ان کی تو کالیں ہی ختم نہیں ہوتیں، ان کے تو کام ختم نہیں ہوتے۔ وہ خالقِ کائنات ہے، وہ غفور الرحیم ہے، اس کی عطا کی بات نہ کرو، اپنے دامن کو دیکھو کہ ہم نے پھیلا کدھر رکھا ہے اور مانگ کس سے رہے ہیں۔

جب آپ یہاں آئیں تو یکسو ہو کر آئیں، جب یہ موبائل نہیں تھے، تب بھی ہم کام کرتے تھے، بتا کر جاتے تھے کہ میں نے یہ کام کرنا ہے میں اس وقت جا رہا ہوں، میں کل اس وقت آؤں گا، بات ختم۔ یار! اب کچھ اللہ پر بھی چھوڑ دو۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ زندگی کم پڑ جائے اور طلبِ الٰہی بڑھ جائے۔

انسان بھی ایک عجیب مخلوق ہے، اُسے تھوڑا سا اختیار دیا گیا ہے، اس میں بھی یہ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اگر اس سے زیادہ اختیار ہوتا تو نہ جانے یہ دنیا میں کیا اُدھم مچاتا۔ اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوسکتا، اپنی مرضی سے اپنی شکل نہیں بنا سکتا، اپنی مرضی سے اپنی عقلی استعداد نہیں بنا سکتا، اپنی مرضی سے اپنی صحت برقرار نہیں رکھ سکتا، بیمار ہونا پڑتا ہے مجبوراً۔ اپنی مرضی سے جی نہیں سکتا۔ مرجانا پڑتا ہے مجبوراً۔ ایک ہی اختیار ہے اسکے پاس، اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:3) ہم نے اسے واضح راستہ دکھادیا، وہ شکر کرے تو اسے اختیار ہے اور ناشکری کرے تو اس پر بھی اسے اختیار ہے۔ بس اتنی سی بات انسان کے بس میں ہے۔ اتنے اختیار پہ بھی یہ نہ جانے کیا کیا گل کھلاتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب انسان کوئی کام شروع کرتا ہے تو اس وقت وہ تہی دامن ہوتا ہے۔ جب بندے کا دامن خالی ہو تو بڑائی کس چیز کی آئے؟ تہی دامن کو کس چیز کا تکبر ہوگا اور کس چیز کی وہ نمائش کرے گا؟ پھر جب وہ محنت کرتا ہے اور اسے کچھ حاصل ہونا شروع ہوتا ہے تو اسے اپنے پاس کچھ ہونے کا احساس ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اس پر اترانے لگ جاتا ہے اور یہیں سے بات بگڑنا شروع ہو جاتی ہے۔

مشائخ کی صحبت پانے کے بعد گمراہ ہونے والوں کو بھی یہی اپنی بڑائی میں مبتلا ہونے کا مرض لاحق ہوتا ہے۔ بعض لوگ ابتداء میں نیکی سمجھ کر آتے ہیں، ذکر اذکار کرتے ہیں اور شیخ کی توجہ سے انہیں مشاہدات نصیب ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ انہیں بڑائی میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں، بندے کو غیر ضروری اہمیت دینے لگتے ہیں۔ کچھ بندے بھی کم حوصلہ ہوتے ہیں جنہیں اللہ سے امید کم اور لوگوں سے امیدیں زیادہ وابستہ ہوتی

ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے شاید وہ بہت فائدے حاصل کرلیں گے۔ اس جرم میں مبتلا کرنے کا سبب ایسے خوشامدی لوگ ہوتے ہیں جو اتنی انہیں غیر ضروری اہمیت دیتے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید کائنات انہی کے دم سے چل رہی ہے۔ کچھ شیطان اُنہیں اس طرف کھینچنے کا سبب بنتا ہے لیکن زیادہ خطرہ انسانوں سے ہوتا ہے جو انہیں غیر ضروری، حد سے زیادہ احترام دے کر انہیں اس جرم میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

دُنیوی معاملات میں بھی یہی ہوتا ہے۔ بندہ غریب ہو تو متواضع ہوتا ہے۔ اس میں اکڑ نہیں ہوتی اور جب اللہ اسے آسودہ حال کردے تو رویہ بدل جاتا ہے۔ پھر اس کے سوچنے، بات کرنے، ملنے جلنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ پھر اس میں وہ تواضع نہیں رہتی۔

حصولِ اخلاص کا راستہ بھی اسی خطرناک گھاٹی سے گزرتا ہے تو بندے کو یہ احساس قائم رکھنا چاہئے کہ اتنی محنت اور مجاہدے کا مقصد ہی یہی ہے کہ جب اللہ اپنی طرف آنے والے راستے پر چلادے، بندے کو کچھ نصیب ہو جائے تو وہ اپنی اصل کو نہ بھولے۔ وہ اس حال پر قائم ہو جائے اور اسے پتہ ہو کہ اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی اپنی ذات بھی اس کی اپنی نہیں ہے، سب کچھ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنی نعمت عطا کی ہے۔ اگرچہ محنت کرنا فرض ہے لیکن محض محنت سے کوئی نعمت حاصل نہیں ہوتی، اللہ کے دینے سے ہوتی ہے۔ اللہ کریم نے انسانی مزاج بھی ایسا بنایا ہے کہ اسے ہر گھڑی کسی نہ کسی بات پر اپنی بڑائی کا احساس دامن گیر رہتا ہے۔ جس سے بچنے کے لیے یہ مسلسل کی جانے والی محنت درکار ہے۔

اپنی بڑائی کا مرض

بعض لوگوں کو 'اللہ اللہ' ری ایکشن کر جاتا ہے۔ بجائے اللہ کی معرفت اور اللہ کی عظمت کے قائل ہونے کے خود کو بڑا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بدنصیبی کی انتہا ہوتی

ہے۔ پھر وہ اپنی ذات کے اور اپنی رائے کے اسیر ہو جاتے ہیں اور خود کو اہم سمجھنے لگتے ہیں۔ پیر بن جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مخلوق کے سرپنچ بنے رہیں۔ جو میں چاہوں سب وہی کریں۔ یہ بدبختی کی انتہا ہوتی ہے کہ کسی کو یہ Life saving drug زندگی بچانے کی جو دوا ہے، یہ بھی ری ایکشن کر جائے اور پھر اس کا کوئی علاج نہیں۔

یاد رکھیں! منازل کا کوئی اعتبار نہیں کہ یہ ایک لمحے میں سلب بھی ہو سکتے ہیں اور ایک آن میں عطا بھی ہو سکتے ہیں۔ معرفتِ نبوی ﷺ نصیب نہ ہو اور مقام و منازل کی بڑائی دل میں آ جائے تو بے شمار، بے پناہ مراقبات، آنِ واحد میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا کوئی اعتبار نہیں، اعتبار اس تعلق اور رشتے کا ہے جو ذاتِ باری سے استوار ہو جائے۔

ایک تو یہ مصیبت ہے کہ کسی کو دو دن ذکر کرانے کا کہہ دو تو وہ خود بایزید بسطامیؒ بن جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے وضو کراؤ، میرے جوتے بھی پالش کرو، بس میرے قدموں میں ہی نجات ہے۔ یار خدا کیلئے! ہم سب نوکر چاکر ہیں۔ میرے سمیت، کوئی حیثیت نہیں ہماری۔ نسبت جو امانت ہے اللہ کی، جس سے چھن جائے گی وہ رسوا ہو جائے گا۔ نہ میری کوئی حیثیت ہے نہ آپ کی۔ حیثیت اس غلامی کی ہے، اس تعلق کی، اس رشتے کی ہے جو ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ سے نصیب ہے۔ اس کی عزت کرو اور اس کی عزت کراؤ۔ میں اور آپ کچھ نہیں۔ اپنی بڑائی کے اسیر نہ ہو جایا کرو۔ کوشش کرو کہ لوگوں کو اپنی غلامی میں نہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں لے آؤ۔ میری اور آپ کی غلامی کوئی نہیں کرے گا، ہم سب ایک جیسے ہیں اور کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ کوئی اپنے جیسے بندے کی غلامی کرے۔

صبر:

ہم سمجھتے ہیں جب کوئی نقصان ہو جائے اور اس پر جزع فزع نہ کی جائے، شور

شرابہ نہ کیا جائے تو یہ صبر ہے۔ صبر کا عربی لغت میں معنی ہوتا ہے کسی چیز کو روک لینا، جیسے گھوڑے کی باگ کھینچ کر روک لیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس کا مفہوم ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے روک لیا جائے۔ ہمارے ہاں تو عرفِ عام میں یہ ہوتا ہے کہ کسی پر کوئی مصیبت آ جائے اور وہ شور شرابہ نہ کرے تو کہتے ہیں، اس نے صبر کیا۔ اس سے بھی مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی رضا پر راضی ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اللہ کا کام ہے۔ اور جو اللہ نے کیا ہے وہی درست ہے۔

صبر یہ ہے کہ دولت آ جائے، فراخی آ جائے، حکومت آ جائے، اقتدار و اختیار آ جائے تو بھی تم اللہ کو بہر طور یاد رکھو اور اس کی نافرمانی کی طرف مت جاؤ۔ اپنے آپ کو روک لو۔ اگر تم کمزور ہو گئے ہو، مجبور و بے بس ہو گئے ہو، مصیبت آ گئی ہے تو اس مصیبت میں بھی گھبرا کر کسی غیر اللہ کا دامن مت پکڑو اور دامانِ رسول اللہ ﷺ سے وابستہ رہو۔ جیسے بھی حالات ہوں، ہر حال میں اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے روکو۔ کوئی مصیبت اتنی بڑی مصیبت نہیں ہے جتنی بڑی مصیبت اللہ کریم کی نافرمانی ہے۔ کوئی مصیبت اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی خطرناک اللہ کریم کی نافرمانی ہے۔

خیر خواہی اور بھلائی

ہمیشہ بھلائی اسی کو نصیب ہوتی ہے جو دوسروں کی بھلائی چاہتا ہے۔ جو دوسروں کا نقصان چاہیں وہ بھلے لوگ نہیں ہوتے، انہیں خود بھی فائدہ نہیں ہوتا، وہ بھی نقصان میں ہی رہتے ہیں۔ یاد رکھو! بندہ کسی سے نفرت کرتا ہو تو اس کی بھلائی نہیں چاہتا۔ نسلِ انسانی سے محبت کرو کہ وہ اللہ کا بہترین شاہکار ہے۔ اسے اللہ کے قریب لانے کیلئے محنت کرو، اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے محنت کرو۔ اور اس لیے محنت کرو کہ ہم اس محنت کے مکلف ہیں۔

خودغرضی:

ہر کوئی اپنے اپنے دکھوں کی پوٹلی اٹھائے پھرتا ہے۔ ہم اتنے خودغرض ہیں کہ ساری زندگی ہمیں دنیا میں اپنے ہی دکھ نظر آتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ خیال بھی آتا ہو کہ میں تو دکھی ہوں ہی، میرے اس پڑوسی کا کیا حال ہے، اس دوسرے مسلمان بھائی کا کیا حال ہے؟ اولاد کو، بیویوں کو، والدین کو چھوڑ کر لوگ اپنے دکھ لئے پھرتے ہیں۔ اتنی فرصت نہیں کہ کوئی یہ بھی سوچے کہ میرا بوڑھا والد بھی شاید دکھی ہوگا، اسے تکلیف ہوگی۔ ہم اتنے خودغرض ہو گئے ہیں کہ بہت کم لوگ ہیں جو گھر میں سے کسی اور کے بارے میں بھی سوچیں۔ بس اپنی اولاد، اپنے کاروبار سے ہم باہر نکلتے ہی نہیں کہ دیکھیں اللہ کی اس وسیع کائنات میں کون کس مصیبت میں مبتلا ہے۔ اگر ہم یہ دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ میں تو دکھی ہوں ہی نہیں۔

سچ:

سچائی کیا ہے اور صداقت کسے کہتے ہیں؟ اس پر دنیا میں ہر مکتبِ فکر نے اپنے اپنے طرز پر دلائل جمع کئے ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑی دلیل انسان کا اپنا دل بھی ہے۔ اور بہت عجیب بات ہے کہ قلبِ انسانی سچائی کے علاوہ کسی بات پر مطمئن نہیں ہوتا۔ انسان دولت جمع کر سکتا ہے، دولت سے دنیا کے عیش و عشرت خرید سکتا ہے، حکومت و اقتدار حاصل کر سکتا ہے، بے شمار طرز کی مذہبی رسومات ایجاد کر سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے، لوگوں سے مال و زر جمع کر لے۔ یہ سارے کام ممکن ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ بغیر صداقت کے، بغیر حق کے، بغیر سچائی کے دل میں اطمینان بھی آ جائے۔

جب ہمارا ایمان ہے کہ سب ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ سب ایک اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کرتے ہیں، سب ایک نبی ﷺ کے دامانِ رحمت سے وابستہ ہیں۔ تو پھر یہ باتیں ہمیں

اپنے عمل سے ثابت کرنا ہوں گی۔ جب ہمارے عمل میں آئیں گی تو حرام کھانے سے بھوک سہہ لینا آسان ہوگا۔ جھوٹ بولنے سے خاموش رہنا بہتر ہوگا۔ دنیا میں ہزار مواقع ایسے آتے ہیں کہ بات آدمی کے بس سے باہر ہو جاتی ہے، حق کہے بغیر گزارا نہیں اور کہہ کر مشکل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر بات سچ نہیں کر سکتا تو کم از کم جھوٹ نہ کہے۔ یہ بھی کمزوری ہے، غلطی ہے کہ سچ جانتا ہے اور سچ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اگر سچ کہہ نہیں سکتا تو جھوٹ نہ بولے، یہ جرم ہے۔

شکوے ہی شکوے

اب ہم کیا کہیں کہ ہمارے ایمان کیا ہیں، کس درجے کے ہیں اور ان میں کیا طاقت ہے۔ یہاں تو ہر دوسرا بندہ کہتا ہے کہ مجھ پر فلاں نے جادو کر دیا۔ اس نے میری روزی روک دی، اس نے میری اولاد روک دی۔ اس نے میرا فلاں کام روک دیا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ سارے کام اللہ کریم خود کرتا ہے۔ اب یہ لوگوں کے ہاتھ میں کیسے آ گیا، کوئی کیسے روک سکتا ہے۔ جسے رب دیتا ہے، اس کی دین کو کون روک سکتا ہے اور جسے وہ نہیں دیتا، اسے دلا کون سکتا ہے؟ یہ تو قرآن میں واضح ہے۔ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ اس میں ہر سہولت کے ساتھ کچھ آزار بھی ہے۔ جہاں آمدنی ہوتی ہے، وہاں نقصان بھی ہوتے ہیں۔ جو چیزیں زندگی کیلئے ضروری ہیں ان ہی سے بندہ بیمار بھی ہوتا جاتا ہے۔ یہ صحت و جوانی اور بڑھاپا، گرمی اور سردی، رات اور دن یہ چلتے رہتے ہیں۔ اس میں اگر بندہ اپنی منزل پا لے تو اس کا مسئلہ حل ہو گیا اور اگر نہ پا سکے تو پھر اس میں کھویا رہتا ہے، گرمی ہو تو گرمی سے شکوہ، سردی ہو تو سردی سے شکوہ۔ بارش ہو تو بارش سے ناراض، دھوپ نکل آئے تو دھوپ سے خفا۔ آپ لوگوں میں پھر کر دیکھیں، لوگوں کی باتیں سنیے، بولیے کچھ نہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ لوگ ہر بات پہ خفا ہیں۔

شکر کیا ہے؟

شکر کیا ہے؟ اہلِ علم نے اس کی بہت سی تشریحات کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب بندے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس پر اللہ کے اتنے احسانات ہیں کہ وہ تو اللہ کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا، تو یہ شکر ہے۔

جب ایمان نصیب ہوتا ہے تو وہ بندے کو اس مقام پہ لے جاتا ہے کہ اس کیلئے زندگی میں بھی مزا ہے اور موت میں اس سے بھی بڑھ کر مزا ہے۔ صحت میں بھی مزا ہے اور بیماری میں اس سے بھی بڑھ کر مزا ہے۔ تونگری میں بھی مزا ہے لیکن مفلسی میں اس سے بھی بڑھ کر مزا ہے۔ یہ ہی قوتِ ایمانی ہے۔ یہ بیماری، دکھ کو تو جانے دیجیے، موت تک کو مزیدار بنا دیتی ہے۔ ہر نشیب و فراز کا اپنا ایک مزا ہے۔ زندگی مزیدار، پُر لطف اور پُر سکون ہو جاتی ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے اس میں سے ہر حال میں گزرنا ہے۔ افلاس بھی آتا ہے، بہتان بھی لگتے ہیں، بیماریاں بھی آتی ہیں۔ لیکن اللہ کا ساتھ نصیب ہو، محمد رسول اللہ ﷺ کا دامانِ رحمت نصیب ہو تو کسی چیز سے بندے کو کچھ نہیں ہوتا۔

توکل کے معنی:

توکل کا معنی یہ ہے کہ تمام وسائل و اسباب پوری ہمت و کوشش کے ساتھ پورے کیے جائیں اور پھر اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ توکل کرنے کا طریقہ ہے اور آپ ﷺ کی سنت ہے۔

بدر میں حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اللہ پر توکل کا جو مظاہرہ فرمایا وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بدر سے مدینہ منورہ تک کا سفر فرمایا۔ سامانِ سفر، خوراک و راشن کی کمی کے باوجود بدر پہنچے۔ صحابہ کرامؓ کی صف بندی فرمائی، سالار متعین فرمائے۔ پھر عریشِ بدر میں دعا فرمائی کہ اے اللہ! سارے کا سارا اسلام لے آیا ہوں، اگر یہ لوگ یہاں کھیت رہے تو

قیامت تک کوئی پیشانی تیرے سجدوں سے آشنا نہ ہو سکے گی۔

آج عموماً توکل کا معنی یہ لیا جاتا ہے کہ آدمی خود کچھ نہ کرے، بس دعائیں کرتا رہے اور سمجھے کہ وہ بڑا متوکل ہے۔ توکل کا یہ مفہوم سرے ہی سے غلط ہے۔

اصل سکون:

ہر شخص اپنی زندگی کیلئے راحتیں تلاش کرتا ہے اور یہ ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ صرف انسان نہیں کرتا بلکہ ہر حیوان کی جبلّت میں بھی یہ داخل ہے کہ وہ اپنے لیے راحت تلاش کرے۔ اب یہ اور بات ہے کہ کس جانور کی راحت کا معیار کیا ہے۔ ایک بات یاد رہے کہ انسان کے علاوہ روئے زمین پر جتنے حیوانات بستے ہیں، ان کی ساری راحت جسمانی آرام میں ہے۔ اس سے زیادہ کوئی جانور سوچ بھی نہیں سکتا نہ ہی اس میں سوچنے کی صلاحیت و استعداد ہے۔ اب انسان جو تخلیقِ باری کا شاہکار ہے، یہ بھی راحت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن انسان کی راحت کا معیار مختلف ہے۔ وہ معیار اس کی شان کے مطابق ہے، اس کے اپنے مقام کے مطابق ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کبھی تو اسے جسم کو آرام پہنچا کر راحت ملتی ہے اور کبھی جسم کے ٹکڑے کروا کر راحت پاتا ہے۔ انسان کی راحت و سکون انسان کے بدن اور جسم سے متعلق ہے ہی نہیں، یہ معیار دوسرے حیوانات کا ہے۔ اس کی اصل راحت اس کی انسانیت کے اصل یعنی اس کی روح سے متعلق ہے۔ گناہ کر کے کسی بندے کو کبھی راحت نہیں ملتی۔ کوئی بدکار کبھی سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ کوئی لمحہ اس کے پاس سکون کا نہیں ہوتا۔ ممکن نہیں کہ وہ گناہ کر کے خوش ہو سکے۔ گناہ کر کے بندے کو خود تاسف ہوتا ہے کہ کاش میں نے یہ نہ کیا ہوتا۔ وہ سسٹم جو اس کے اندر لگا ہوا ہے وہ اسے یاد دلاتا رہتا ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یا اس کے اندر، بہت اندر کہیں ایک بے چینی اور اضطراب ضرور رہتا ہے۔ انسان حقیقی سکون اور راحت

صرف اور صرف نیکی ہی میں پاتا ہے کہ روح کا قرار ہی اصل قرار ہے۔

غصہ:

غصہ انسانی فطرت میں شامل ہے جو کسی نقصان یا ناپسندیدہ بات یا حرکت پر آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا بہت خوب صورت اور آسان علاج بتایا ہے اور وہ ہے حالت کی تبدیلی۔

☆ پہلا کام یہ کیا جائے کہ حالت تبدیل کر لی جائے۔ اگر آپ کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں، بیٹھے ہیں تو کھڑے ہو جائیں۔ حالت بدلنے سے بھی کیفیت میں فرق پڑ جاتا ہے۔

☆ پھر فرمایا غصہ آئے تو وضو کریں۔ وضو کرنے سے غصہ ان شاء اللہ کافور ہو جائے گا

☆ اور تیسری بات یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی غصہ ہو، درود شریف پڑھنا شروع کر دیں تو وہ ختم ہو جائے گا۔

یہ بات حرمین شریفین کی حاضری کے دوران مشاہدہ میں آئی کہ عرب احباب جب آپس میں کسی بات پر ناراض ہونے لگتے یا باتوں باتوں میں آپس میں الجھ پڑتے اور کوئی ایک غصہ میں آ جاتا تو ہم سادہ سی بات کہتے، "یا شیخ صلوا علی النبی" کہ درود شریف پڑھو تو جتنے لوگ اس محفل میں ہوتے سب درود شریف پڑھنے لگ جاتے۔ وہ بات ختم ہو جاتی، وہ کیفیت ختم ہو جاتی اور مزاج کی تندی جاتی رہتی۔ پچھلے چند سالوں سے تو میں جا نہیں سکا لیکن میرے خیال میں آج بھی کوئی یہی تجربہ کرے تو یہی فائدہ ہو گا۔

اسراف، انفاق اور بخل:

اسراف کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ دولت لٹائی جائے۔ اسراف کا یہ مطلب ہے کہ کوئی پائی، کوئی پیسہ جو خلافِ شریعت خرچ ہو جہاں اللہ نے روک دیا ہے کہ خرچ نہ کیا

جائے، وہاں خرچ ہو گا تو اسراف ہو گا۔ جہاں اللہ نے حکم دیا ہے کہ خرچ کیا جائے وہاں خرچ ہو تو صدقہ ہو گا، اللہ کے نام پر ہو گا۔

کوئی شخص اپنی شہرت کیلئے پیسے لٹاتا ہے تو یہ اسراف ہے۔ جہاں شریعت حکم دیتی ہے وہاں خرچ کرتا ہے تو یہ اِنفاق ہے۔ اور جہاں اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ خرچ کرنے کا حکم دیں وہاں خرچ روکنا بخل ہے۔

فواحشات دیکھنے، جھوٹ سننے کے اثرات:

مجھے اگلے دن ایک خط ملا۔ اس نے کہا کہ میں بہت پریشان ہوں اس لئے کہ میرے دل میں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ عالی صفات کے بارے میں بڑے غلط وساوس آتے ہیں اور میں پریشان ہو گیا ہوں۔ میں رد کر کر کے تھک گیا ہوں، مجھ سے رد نہیں ہوتے عجیب بات ہے کہ براہِ راست نبی کریم ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کے خلاف میرے دل میں ایک طوفان امڈا چلا آ رہا ہے، اتنا شیطان نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، کیا کروں؟

میں نے کہا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ فواحشات دیکھتے یا سنتے ہیں۔ ہمارے ہاں بے شمار ٹی وی پروگرام ایسے ہیں جن میں بے حیائی اور برہنگی کا پہلو نمایاں ہے۔ یا ایسی سی ڈیز دیکھتے ہیں جن میں بے حیائی ہے۔ یا آپ ایسے لوگوں کی محفل میں بیٹھتے ہیں جو بکواس کرتے ہیں اور آپ سنتے رہتے ہیں۔

یہ جو فحش سننا ہے، یہ دل کو اس طرح کر دیتا ہے کہ اس میں شیطان کیلئے بہت سے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یادِ الٰہی، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن اور درود شریف کا پڑھتے رہنا، زبان کو ذکرِ الٰہی سے تر رکھنا، دل میں ذکرِ الٰہی کو بسائے رکھنا، شیطان کیلئے دروازے بند کر دیتا ہے۔ جتنی بے حیائی آپ دیکھیں گے یا سنیں گے، وہ شیطان کیلئے دروازے کھولتی چلی جائے گی اور پھر شیطان آپ کو شیخ سے کاٹنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ وہ برداشت کر

صرف اور صرف نیکی ہی میں پاتا ہے کہ روح کا قرار ہی اصل قرار ہے۔

غصہ:

غصہ انسانی فطرت میں شامل ہے جو کسی نقصان یا ناپسندیدہ بات یا حرکت پر آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا بہت خوب صورت اور آسان علاج بتایا ہے اور وہ ہے حالت کی تبدیلی۔

☆ پہلا کام یہ کیا جائے کہ حالت تبدیل کر لی جائے۔ اگر آپ کھڑے ہیں تو بیٹھ جائیں، بیٹھے ہیں تو کھڑے ہو جائیں۔ حالت بدلنے سے بھی کیفیت میں فرق پڑ جاتا ہے۔

☆ پھر فرمایا غصہ آئے تو وضو کریں۔ وضو کرنے سے غصہ ان شاء اللہ کافور ہو جائے گا

☆ اور تیسری بات یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی غصہ ہو، درود شریف پڑھنا شروع کر دیں تو وہ ختم ہو جائے گا۔

یہ بات حرمین شریفین کی حاضری کے دوران مشاہدہ میں آئی کہ عرب احباب جب آپس میں کسی بات پر ناراض ہونے لگتے یا باتوں باتوں میں آپس میں الجھ پڑتے اور کوئی ایک غصہ میں آجاتا تو ہم سادہ سی بات کہتے، ''یا شیخ صلوعلی النبی'' کہ درود شریف پڑھو تو جتنے لوگ اس محفل میں ہوتے سب درود شریف پڑھنے لگ جاتے۔ وہ بات ختم ہو جاتی، وہ کیفیت ختم ہو جاتی اور مزاج کی تندی جاتی رہتی۔ پچھلے چند سالوں سے تو میں جانہیں سکا لیکن میرے خیال میں آج بھی کوئی یہی تجربہ کرے تو یہی فائدہ ہوگا۔

اسراف، انفاق اور بخل:

اسراف کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ دولت لٹائی جائے۔ اسراف کا یہ مطلب ہے کہ کوئی پائی، کوئی پیسہ جو خلافِ شریعت خرچ ہو جہاں اللہ نے روک دیا ہے کہ خرچ نہ کیا

جائے، وہاں خرچ ہوگا تو اسراف ہوگا۔ جہاں اللہ نے حکم دیا ہے کہ خرچ کیا جائے وہاں خرچ ہو تو صدقہ ہوگا، اللہ کے نام پر ہوگا۔

کوئی شخص اپنی شہرت کیلئے پیسے لٹاتا ہے تو یہ اسراف ہے۔ جہاں شریعت حکم دیتی ہے وہاں خرچ کرتا ہے تو یہ اِنفاق ہے۔ اور جہاں اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ خرچ کرنے کا حکم دیں وہاں خرچ روکنا بخل ہے۔

فواحشات دیکھنے، جھوٹ سننے کے اثرات:

مجھے اگلے دن ایک خط ملا۔ اس نے کہا کہ میں بہت پریشان ہوں اس لئے کہ میرے دل میں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ عالی صفات کے بارے میں بڑے غلط وساوس آتے ہیں اور میں پریشان ہو گیا ہوں۔ میں رد کر کر کے تھک گیا ہوں، مجھ سے رد نہیں ہوتے ۔عجیب بات ہے کہ براہِ راست نبی کریم ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کے خلاف میرے دل میں ایک طوفان اُمڈا چلا آرہا ہے، اتنا شیطان نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، کیا کروں؟

میں نے کہا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ فواحشات دیکھتے یا سنتے ہیں۔ ہمارے ہاں بے شمار ٹی وی پروگرام ایسے ہیں جن میں بے حیائی اور برہنگی کا پہلو نمایاں ہے۔ یا ایسی سی ڈیز دیکھتے ہیں جن میں بے حیائی ہے۔ یا آپ ایسے لوگوں کی محفل میں بیٹھتے ہیں جو بکواس کرتے ہیں اور آپ سنتے رہتے ہیں۔

یہ جو فحش سننا ہے، یہ دل کو اس طرح کر دیتا ہے کہ اس میں شیطان کیلئے بہت سے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یادِ الٰہی، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن اور درود شریف کا پڑھتے رہنا، زبان کو ذکرِ الٰہی سے تر رکھنا، دل میں ذکرِ الٰہی کو بسائے رکھنا، شیطان کیلئے دروازے بند کر دیتا ہے۔ جتنی بے حیائی آپ دیکھیں گے یا سنیں گے، وہ شیطان کیلئے دروازے کھولتی چلی جائے گی اور پھر شیطان آپ کو شیخ سے کاٹنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ وہ برداشت کر

گئے تو پھر نبی کریم ﷺ سے کاٹنے کی کوشش کرے گا، پھر اللہ کے خلاف انکار دل میں لائے گا۔ یہ تو اس کا کام ہے، آپ resist کر رہے ہیں اچھی بات ہے لیکن آپ اس سبب کا بھی تدارک کریں جس کی وجہ سے شیطان کو یہاں تک رسائی حاصل ہے، وہ سبب ہے بے حیائی اور جھوٹ کا سننا اور دیکھنا اسے ترک کیجیے۔

غض البصر:

اللہ کریم نے جہاں بہت سی چیزیں رکھی ہیں وہاں جنسِ مخالف کیلئے ایک فطری کشش کا جذبہ بھی ہے۔ تخلیقی طور پر محققین کے نزدیک اور جدید سائنس کی تحقیق کے مطابق بھی انسان کے جسم سے ایک خاص طاقت کی یا ایک خاص فریکوئنسی (frequency) کی لہریں جنسِ مخالف کیلئے نشر ہوتی رہتی ہیں اور یہ مذکر مؤنث دونوں میں ہوتی ہیں۔ ان کے ملنے کا سب سے زیادہ مدار نظر کے ملنے پر ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسے مرد کی نگاہ کسی ایسی خاتون پر پڑے جس کی فریکوئنسی برابر ہو تو وہ اس کیلئے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی خاتون کی نگاہ کسی ایسے مرد پر پڑے جس کی فریکوئنسی اس کی فریکوئنسی سے ملتی ہو تو وہ اس کیلئے پاگل ہو جاتی ہے۔

اسلام نے جو پردے کا حکم دیا ہے اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ نگاہ کسی غیر مرد کو دیکھے ہی نہیں۔ کسی خاتون کی یا کسی مرد کی نگاہ کسی نامحرم کو نہ دیکھے۔ یہ جو پردے پہ زیادہ زور دیا گیا ہے وہ غض البصر پر ہے یعنی نگاہ کو بچایا جائے۔ شرعی پردہ یہ ہے کہ خاتون کے مخنے بھی نظر نہ آئیں اور اوپر کھلی چادر ہو جس سے بدن کا ڈیل ڈول یا shape بھی واضح نہ ہو۔ سر کا پردہ چہرے پر اسی طرح کھنچا ہوا ہو کہ اس کا چہرہ بھی بڑی حد تک اس میں ڈھکا رہے اور اس کی نگاہ بھی دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔

حق و باطل:

قانون یہ ہے کہ حق کو اللہ کریم تقویت دیتے ہیں اور وہ ترقی کرتا ہے۔ یہی تو حق میں سند ہوتی ہے۔ جتنے لوگ نورِ نبوت سے مستفید ہوئے، وہ ایسے مثالی انسان قرار پائے کہ مورخ خواہ وہ کافر ہی ہو، اسے بھی ان کے کمالات اور خوبیوں کا اعتراف کرتے ہی بنی اور کافر کو بھی یہ کہنا ہی پڑا کہ ان جیسے انسان تاریخِ عالم میں کہیں اور نظر نہیں آتے۔ صداقت، بھلائی، اچھائی اور نیکی انسانی وجود میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے کہ نہ صرف وہ وجود اس کی صداقتوں کا مظہر بن جاتا ہے بلکہ ان حقیقتوں کو ماننے پر ہر ایک کو مجبور کر دیتا ہے۔

باطل، جھوٹ اور برائی کو انسان فطرتاً بُرا سمجھتا ہے خواہ وہ خود برائی میں ملوث ہی ہو۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کتنی مخلوق ہے جو شیطان کی اطاعت کرتی ہے لیکن اس ساری مخلوق میں شیطان کو بھلا کہنے والا ایک بھی نہیں ملتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کی بات کو مانتے ہیں۔ اس کے پیچھے چلتے ہیں، جو وہ کہتا ہے ویسا عمل کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دل میں اس کی عظمت کا تعلق ہے، وہ شیطان کیلئے کسی کے دل میں نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ دن رات اس کی پوجا کرنے والے بھی اسے بُرا ہی کہتے ہیں۔ باطل کے مزاج میں اور اس کے مقدر میں مٹ جانا ہوتا ہے اور اس کے مٹنے کی یہی دلیل کافی ہے کہ جو اُس پر عمل کرتے ہیں وہ بھی اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ اور آپ دیکھ لیں، گناہ کیلئے کسی گناہ گار کے دل میں عظمت و احترام نہیں ہوتا۔

حسنِ کلام اور کثرتِ کلام:

حسنِ کلام یہ ہے کہ بات کم از کم کی جائے۔ گفتگو طویل اور مفہوم کم ہو تو یہ کمال نہیں ہے۔ کمال اور حسنِ کلام یہ ہے کہ گفتگو کم ہو اور اس میں مفاہیم کا دریا ہو۔ اسی لئے

حضورﷺ کا ارشاد ہے اوتی جامع الکلام "اللہ نے مجھے یہ کمال بخشا ہے کہ میں ایک جملہ کہوں تو اس میں جہاں بھر کے حالات سمو دیتا ہوں"۔

کثرتِ کلام کیفیاتِ قلبی کو مانع ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ آپ باتیں کریں گے، کیفیاتِ قلبی میں اتنی کمی آئے گی۔ جب کہ زبان جتنی کنٹرول میں رہے گی، اتنی کیفیاتِ قلبی میں زیادتی اور تیزی آئے گی۔ ضروری بات بھی مختصر الفاظ میں کی جانی چاہیے۔ دنیا کی باتوں کی کثرت نہیں ہونی چاہیے خواہ وہ جائز بھی ہوں۔ اگرچہ دنیا کی باتیں منع نہیں ہیں، حرام نہیں ہیں، مکروہ نہیں ہیں اس کے باوجود بھی کثرتِ کلام، فیض کو مانع ہے۔

محققین فرماتے ہیں گناہ سے تو اللہ بچائے لیکن ایسی باتوں سے بھی اللہ بچائے جو عبادت کے زمرے میں نہیں آتیں۔ چونکہ انسان کا بہت سا وقت اس پہ لگتا ہے، اس کی قوتِ گویائی خرچ ہوتی ہے۔ اگر کوئی بات ایسی بھی ہو جو گناہ نہ ہو لیکن ثواب بھی نہ ہو تو یہ بھی ایک ضیاع ہے، یہ بھی نقصان ہے۔ اس طرح ہر کام یا تو عبادت ہوتا ہے یا بیکار، جو کہ عدمِ اطاعت ہو کر ناشکری بن جاتا ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ (المومنون:94)

ایسا تو ممکن ہے کہ لوگ آپ کا شکریہ ادا کریں، آپ کے ہاتھ چومیں، آپ کا احسان مانیں اور آپ ان پر عطا کے بادل برساتے جائیں۔ لیکن یہ کتنا مشکل ہے کہ لوگ پتھر برسائیں اور آپ دعائیں دے رہے ہوں۔ کتنا مشکل کام ہے کہ لوگ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائیں اور آپ ان میں پھول بانٹیں، یاد رکھیے! مسنون طریقہ یہی ہے۔ جنہوں نے نبی کریمﷺ پر پتھر برسائے تھے، ان کیلئے بھی حضورﷺ نے دعا کی تھی۔

اللہ کی بے پناہ رحمتیں ہوں ان لوگوں پر جنہوں نے پتھر کھا کر بھی نعمتیں بانٹیں اور

کتنی عجیب بات ہے کہ لوگوں کو نعمت بھی طلبِ حق کی عطا کی کہ اللہ طلب پر دیتا ہے۔ محبت خود دی، آرزو اس کی بھی خود دی کہ یہ تمہارے دل میں ہونی چاہئے اور اس پر ثمرات بھی لگا دیئے۔

بندہ مانگتا اپنی حیثیت کے مطابق ہے، وہ دیتا اپنی شان کے مطابق ہے

حضرت عبید اللہ احرارؒ کے پاس کوئی خاتون سوال لے کر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا۔ اس نے کہا حضور! میرا بچہ بیمار ہے اور مجھے کسی نے کہا ہے کہ اسے شہد چٹاؤ اور بازار سے خریدنے کی ہمت نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے خادم کی طرف دیکھا اور اسے کہا کہ اسے ایک مشکیزہ شہد کا دے دو۔ وہ دعائیں دیتی چلی گئی۔ خادم نے کہا کہ حضور! اس کے ہاتھ میں تو پیالہ تھا، اس میں پاؤ بھر شہد آجاتا، آپ نے اسے پورا مشکیزہ دے دیا۔ فرمایا! وہ اپنی حیثیت کے مطابق سوال کر رہی تھی۔ مجھے اپنی حیثیت کے مطابق دینا ہے ورنہ کل اللہ مجھ سے پوچھے گا کہ اس نے تو ایک پیالہ شہد مانگا تھا لیکن تیرے پاس تو پچاس مشکیزے لٹک رہے تھے، تو نے بھی وہ ایک پیالہ ہی دیا، تو میں کیا جواب دوں گا؟ اگر اللہ کے بندوں کا مزاج ایسا ہے تو خود اللہ کا کرم کیسا ہوگا؟ بندہ مانگتا اپنی حیثیت کے مطابق ہے اور وہ دیتا اپنی شان کے مطابق ہے۔ ہم اُتنا مانگتے ہیں جتنی ہماری سوچ، فکر اور استعداد ہے۔ جب وہ عطا کرتا ہے تو اپنی شان کے مطابق عطا کرتا ہے۔ بس مانگنے کیلئے وہ خلوص، وہ درد چاہیے کہ آواز دل سے اٹھے۔

کردار:

یاد رکھیں! کردار کبھی از خود تبدیل نہیں ہوتا۔ ہمارا کردار ہمارے اندازِ فکر کا مظہر ہوتا ہے۔ ہم جو سوچتے ہیں، جو ہماری نیت ہوتی ہے وہ ہمارے اعضاء و جوارح سے، ہماری زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ اندازِ فکر بدلتا ہے دل کے بدلنے سے اور دل بدلتا ہے اللہ کی یاد

سے۔

عذابِ الٰہی کردار و اعمال پر مرتب ہوتا ہے۔ جو کردار یہود و نصاریٰ کا تھا، جس کردار پر عذابِ الٰہی کی وعید یہود و نصاریٰ کو سنائی گئی، وہ کردار کلمہ گو مسلمان اپنائے گا تو اسی عذابِ الیم سے دوچار ہوگا کہ اللہ کا عذاب اعمال پر واقع ہوتا ہے۔ حتمی اور مکمل عذاب تو آخرت میں ملے گا، یہ عذاب برزخ میں بھی ہوتا ہے اور دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد قیامت تک کبھی اجتماعی عذاب نہیں آئے گا لیکن عذاب کی مختلف صورتیں واقع ہوتی رہیں گی۔

صرف کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں، فیصلے تو کردار پر ہوتے ہیں:

ہم کلمہ گو ہیں تو پھر ہمارا کردار کیوں نہیں بدلتا؟ ہم کیوں حرام کھاتے ہیں؟ کیوں جھوٹ بولتے ہیں؟ کیوں دوسروں کی حق تلفی کرتے ہیں؟ کیوں ذخیرہ اندوزی کر کے اللہ کے بندوں کو افلاس میں مبتلا رکھتے ہیں؟ ہم لوگوں کو بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم کر کے پھر کیوں غریبوں کی بے بسی کا تماشا دیکھتے ہیں؟ ہمارے ملک میں وافر مقدار میں غلہ پیدا ہوا اور لوگ اس کی تلاش میں سڑکوں پر ڈنڈے کھا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم اجارہ داری بنا کر لوگوں سے مال چھینتے ہیں اور ان کی عزتِ نفس کو بھی کچلتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ ہمیں یہ یقین نہیں کہ اس کردار کا محاسبہ ہوگا، ہمیں اس کردار کی جوابدہی کرنی ہوگی، اس پر ہمیں سزا ملے گی۔ ہم نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اب ہم موج میلہ کرتے رہیں، جو جی چاہے وہ کریں، آخرت کے لیے ہماری یہی مسلمانی کافی ہے۔

ہمارے تاجر پیشہ حضرات میں شاید ہی کوئی ہے جو حاجی نہ ہو، یہ ہر سال حج اور عمرے پر جاتے ہیں۔ حج اور عمرہ تو کر آتے ہیں لیکن اپنے کاروبار میں وہ روش نہیں اپناتے

جو نبی کریم ﷺ نے اپنائی، جس کا حکم اللہ کا دین دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ساری عبادات ہم رسماً کرتے ہیں۔ یاد رکھو! نرا دعویٰ کر لینا، صرف کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں، بندے کا کردار، اس کی عملی زندگی بھی گواہی دے کہ یہ شخص مسلمان ہے۔ کلمہ گو مسلمان جس طرح غیر مسلم اقوام کی تقلید میں ان کے کردار و اخلاق کو اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں، اسی طرح ان کو مصیبتیں بھی وراثت میں ملتی جا رہی ہیں۔ دعوے کے اعتبار سے تو ہم مسلمان ہیں، کردار کے اعتبار سے نہیں۔ عملی زندگی میں ہم وہی کردار اپنانا چاہتے ہیں جو یہود و نصاریٰ کا ہے تو فیصلے تو کردار پر ہوتے ہیں۔ جن کرتوتوں کی وجہ سے ان پر عذاب آ رہے ہیں اگر وہی کرتوت ہم کریں تو اس مصیبت میں ہمیں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

ہمارا قومی وتیرہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم جو رشوت لیتے ہیں وہ لیتے رہیں۔ جو سود کھاتے ہیں وہ کھاتے رہیں، جو کافروں سے مانگ رہے ہیں وہ مانگتے رہیں، جو چوری ہم کرتے ہیں وہ کرتے رہیں لیکن حالات بدل جانے چاہییں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم جو بد پرہیزی کرتے ہیں وہ کرتے رہیں لیکن صحت ٹھیک ہونی چاہیے۔ صحت کیسے ٹھیک ہوگی؟ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا کردار چاہے ویسا ہی رہے حالات ٹھیک ہونے چاہییں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جس بد پرہیزی نے یہ بیماری ہم پر مسلط کی ہے وہ بد پرہیزی تو ہم جاری رکھیں لیکن ہمارا معاشرہ صاف ستھرا ہونا چاہیے۔

لوگوں کو یہ پسند ہے کہ کوئی انہیں کہہ دے کہ تم جنتی ہو، بخشے گئے ہو، موج کرو، جو جی چاہے کرتے پھرو۔ میاں! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ کے بغیر کہیں سے اس کا کوئی ذرہ نہیں ملے گا۔ یہ انسان کی مجبوری ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ سے عہدِ غلامی نبھائے، پھر اس عہد کو نبھانے کے لیے جو اس کے بس میں ہے وہ کر گزرے، پھر بات اس کے کرم پر ہے۔ انسان کتنی کوشش بھی کر لے، انسان کی بساط بھر ہوگی۔ لیکن جب وہ کرم کرتا

ہے تو وہ کرم اس کی شان کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان خود فقیر ہے، بے بس ہے۔ اس کی کوششیں بے بس اور حقیر ہوتی ہیں۔ اللہ کا کرم اس کی شان کے مطابق ہوتا ہے، انسانی کوششوں کے مطابق نہیں ہوتا۔

"اعمالکم عمالکم":

آج ہم نے اطاعتِ الٰہی سے منہ موڑ لیا، سنتِ مطہرہ کو پسِ پشت ڈال دیا، ہم ہر کام اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسا بے نیاز ہے کہ پھر وہ ہم سے گھٹیا لوگ ہم پر مسلط کر دیتا ہے۔ جو ہم سے عقیدے اور عمل میں بدتر ہوں، انہیں ہم پر حکمران بنا دیتا ہے کہ تم بڑے دانشور بنتے ہو، اب یہ جاہل تمہیں سیدھا کریں گے۔ پرہیزگاروں پر بدکاروں کو مسلط کر دیتا ہے، عالموں پر جاہلوں کو حاکم کر دیتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ خود کو پرہیزگار کہنے والے عظمتِ الٰہی سے آشنا نہیں ہوتے۔ خود کو بڑا سمجھنے والوں کو وہ دنیا ہی میں دکھا دیتا ہے کہ تم بڑے نہیں ہو، صرف ذاتِ باری ہی بڑی ہے۔

اندر جو کچھ ہوتا ہے اسی کا اثر باہر آتا ہے

بڑی عجیب بات ہے آج کل ایک رواج ہو گیا ہے، لوگ کہتے ہیں اگر ہم نماز نہیں پڑھتے تو کیا ہوا، ہمارا اندر بڑا صاف ہے، ہمارے دل میں بڑا خلوص ہے۔ حالانکہ اندر جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر باہر بھی آتا ہے۔ اگر اندر خلوص ہے، اگر اندر اللہ سے تعلق ہے، تقویٰ ہے، پرہیزگاری ہے تو وہ اعضاء و جوارح سے، زبان و کلام سے، کردار سے، لوگوں کے ساتھ برتاؤ سے ظاہر ہوگا۔ اگر لوگوں کے ساتھ برتاؤ اچھا نہیں ہے، زبان و کلام اچھی نہیں ہے، لین دین اچھا نہیں ہے، عبادات صحیح نہیں ہیں یا عبادات ادا ہی نہیں کرتا، فرائض ادا ہی نہیں کرتا تو اندر کی صفائی کا دعویٰ محض جھوٹ ہے۔ دل تو بادشاہ ہے جو کچھ دل میں ہوتا ہے اعضاء و جوارح اسی کی تائید کرتے ہیں۔

بعض لوگ ظاہر اُبڑا حلیہ بنا لیتے ہیں، داڑھی بھی رکھ لیں گے، لباس بھی مخصوص بنا لیں گے، طویل وظائف پڑھیں گے، بڑے لمبے لمبے سجدے کریں گے اور مقصد یہ ہوگا کہ لوگ بڑا پارسا سمجھیں یا نذر و نیاز دیتے رہیں گے، خدمت کرتے رہیں گے، ہاتھ چومیں گے۔ یوں بندے کا ظاہر تو درست ہے لیکن اس میں اتنی بڑی خرابی آ گئی کہ اس کے ظاہر کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ جب تک خلوص نہ ہو صورتِ عبادت کوئی معیار نہیں۔

دینداری کے بھیس میں بے دینی

مرورِ زمانہ ہمیں اس ڈگر پر لے آیا ہے جہاں دینداروں کے بھیس میں بے دین لوگ بے دینی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ پہلے ادوار میں وہ لوگ برائی کرتے تھے جو دین سے دور ہوتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ لوگ دین کا دعویٰ بھی کریں اور عالمِ دین بھی کہلائیں، صوفی اور اہلِ دل بھی کہلائیں وعظ بھی کریں، صلوٰۃ کے امام بھی ہوں، صلوٰۃ ادا کرنے والے بھی ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ چوری، برائی اور بدکاری بھی کریں۔ پہلے لوگوں میں نیکی کرنے والے نیکی کرتے تھے اور برائی کرنے والے برائی کرتے تھے اور برے لوگ بھی اللہ سے حیا کرتے تھے۔

آج جس عہد میں ہم ہیں، یہ عہد اپنے کردار کے اعتبار سے سخت ترین اور بدترین عہد ہے۔ ایسا دور آ گیا ہے کہ کسی بندے پر کوئی اعتبار نہیں ہے۔ عجیب وقت آ گیا ہے کہ یہاں لوگ نیکوں جیسا حلیہ بھی بنا لیتے ہیں، بظاہر کام بھی نیکوں جیسا کرتے ہیں۔ اپنے ملک کی تاجر برادری کو دیکھ لیں اکثریت ادائیگیٔ صلوٰۃ میں کوشاں ہے، حج، عمرے بھی کرتے ہیں، خیرات بھی کرتے ہیں لیکن آج کیا ہو رہا ہے؟ پیسوں کے لالچ میں جھوٹ بول دیا جاتا ہے اور پھر فخر بھی ہے کہ کتنی ہوشیاری کر لی گئی ہے۔ یہ سارا عمل انسان کی ذات تک محدود نہیں رہتا، یہ عالمی حالات کو متاثر کرتا ہے اور پھر اس کا وبال پلٹ کر اسی

بندے کی ذات پر بھی آتا ہے اور عاقبت علیحدہ برباد ہوتی ہے۔

انسانی مزاج کے عجائب

انسانی مزاج یہ ہے کہ اسے جو چیز پسند نہ ہو اسے یاد رکھتا ہے کہ میرے ساتھ یہ بھی ہوا، میں بیمار ہوا، میرا مالی نقصان ہو گیا، میرا مکان گر گیا۔ ان سب دکھوں کی لسٹ اس کے پاس ہوتی ہے لیکن کبھی نعمتوں کا شمار نہیں کرتا۔ ایسا بدنصیب ہے کہ احسانات باری کو شمار نہیں کرتا۔ اگر یہ ستر سال بھی صحت مند زندگی گزارے اور اسے سات دن بیمار ہونا پڑے تو ان سات دنوں کو اس نے گنا ہوتا ہے، ستر سالوں کو نہیں۔ آسائشیں اور تکلیفیں اگر شمار کی جائیں تو ہزار تنگی کے باوجود ہر آدمی کی زندگی میں آسائشیں زیادہ ہوتی ہیں اور تکلیفیں وہ بہت کم بھیجتا ہے۔ پریشانی کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ ہم زندگی کو اپنی نظر سے دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ میں تین عجیب واقعات قرآن میں ذکر فرمائے گئے ہیں۔

- کشتی والے واقعے میں ہے کہ اللہ نے چاہا کہ اس غریب ملاح کی کشتی نہ چھینی جائے تو اس نے حکم دیا اور حضرت خضرؑ نے اللہ کے حکم سے کشتی میں دراڑ پیدا کر دی۔ اب وہ ظالم بادشاہ اس ٹوٹی ہوئی کشتی کو کیا کرے گا، اس کی کشتی چھینی نہیں جائے گی بعد میں ملاح مرمت کر لے گا۔ یعنی اللہ کا احسان تھا۔ بظاہر کتنا بڑا نقصان ہے کہ ایک آدمی کا گزارا ہی اس کشتی پر ہے اور اس کشتی میں دراڑ ڈال دی جائے۔
- دوسرے واقعے کے بارے میں فرمایا کہ بچہ جو فوت ہو گیا، آپ کہتے ہیں کہ آپ نے قتل کر دیا۔ یہ مزاجاً ایسا تھا کہ یہ بڑا ہو کر والدین کیلئے بے دینی کا سبب

ہوتا۔ خود تو بے دین تھا، والدین کو بھی دین کے معاملے میں ابتلاء میں مبتلا کر دیتا۔ اللہ نے وہ لے لیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی، جس کی شادی اللہ کے ایک نبیؑ سے ہوئی اور اس کی اولاد میں ستر نبی پیدا ہوئے۔

- اسی طرح فرمایا کہ جو دیوار میں نے سیدھی کر دی وہ یتیم بچوں کے گھر کی دیوار تھی۔ اگر دیوار گر جاتی تو خزانے کا راز کھل جاتا۔ ابھی بچے کمسن ہیں تو میں نے اس دیوار کو سیدھا کر دیا۔

تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے نقصان کی فہرست میں ڈال رکھا ہوتا ہے ان میں بھی کتنے فائدے پنہاں ہوتے ہیں، یہ اللہ جانتا ہے۔ جو چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں انہیں ضائع ہو جانا چاہیے۔ لوگ ہم سے جدا ہو جاتے ہیں، انہیں ہم سے جدا ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ اللہ بہت بڑا کریم ہے اِلّا یہ کہ کوئی اتنا بدنصیب ہو کہ بطور عذاب اس سے چھینی جائیں اور بطور عتاب اس کو سزا دی جائے۔ لیکن اللہ کے وہ بندے جو اللہ کی اطاعت میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کا نقصان بھی بظاہر نقصان ہی ہوتا ہے لیکن اس میں بھی اللہ کی بے شمار نعمتیں ہوتی ہیں جو اس نقصان کے باعث نصیب ہوتی ہیں۔ تو زندگی کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے۔

کیا انسانی فکر، مزاج اور عادات میں تبدیلی ممکن ہے؟

انسانی عادت کو تبدیل کرنا آسان نہیں۔ یہ جبلی اور پیدائشی ہوتی ہیں، مزاج کا حصہ ہوتی ہیں اور سیانوں کا کہنا ہے کہ ''جبل گردد جبلت نہ گردد'' پہاڑ کو اکھاڑا جا سکتا ہے لیکن فطری عادات نہیں بدلی جا سکتیں۔ ملکوں کی سرحدیں بدلی جا سکتی ہیں، زمانے کے حالات بگاڑے یا بنائے جا سکتے ہیں، کاروبار بڑھایا اور گھٹایا جا سکتا ہے لیکن اپنے فکری

انداز اور سوچوں کو تبدیل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ لوگ مزدوری سے، کلرکی سے شروع ہوتے ہیں اور حکمران بن جاتے ہیں لیکن ان کے مزاج نہیں بدلتے۔ اگر وہ معمولی ملازمت میں کام چور تھے تو وہ حکمران بن کر بھی کام چور ہی رہتے ہیں۔ رویئے میں تبدیلی نہیں آتی۔ حلیے بدل جاتے ہیں، لباس بدل جاتے ہیں، عہدے بدل جاتے ہیں لیکن مزاج نہیں بدلتے۔ حتیٰ کہ بندہ دنیا سے چلا جاتا ہے تو قیامِ حشر تک مزاج وہی رہتا ہے جو دنیا میں تھا۔ یہ صرف اللہ کے نام کی عظمتیں ہیں اور یہ کمال ہے حضور اکرم ﷺ کے فیوضات و برکات کا اور شیخ کی توجہ کا کہ آدمی اندر سے بدل جاتا ہے۔ سوچ کا انداز بدل جاتا ہے، فکر بدل جاتی ہے۔ اس کیلئے ایک بہت بڑی قوت چاہئے۔ ایک عشق و جنون چاہیے کہ بندہ اپنی رائے کو کچل کر اس کے اوپر سے گزر جائے۔ لیکن یہ عشق پیدا کرنے کیلئے برکاتِ نبوت کی ضرورت ہے۔ دانشوروں کا یہ قول کہ فطرت بدلنا ناممکن ہے اُن افراد کے لیے پرکاہ سی اہمیت نہیں رکھتا جنہیں برکاتِ نبوی ﷺ نصیب ہوں۔ برکاتِ نبوی ﷺ وہ برقِ تپاں ہے کہ بڑی سے بڑی نفسانی آرزو، عادت و جبلت کو بھی خاک کر دیتی ہے اور انسان بدل جاتا ہے۔

سارا ظاہر تبدیل کرنا کوئی کمال نہیں، کوئی مشکل نہیں لیکن بندے کی سوچ بدل جائے، اس کی خوشی اور غم کی کیفیت بدل جائے، اس کا مزاج اور خواہش بدل جائے۔ پہلے کن باتوں پہ خوش ہوتا تھا اب کن باتوں پہ خوش ہوتا ہے۔ وہ بالکل 180 ڈگری دوسری طرف ہو جائے۔ لُوٹ کے خوش ہونے والا حلال کمائے اور لٹا کر خوش ہو۔ کیسی عجیب بات ہے ایک لقمہ کیلئے لوگوں کی گردنیں کاٹ کر ان سے لقمہ چھیننے والا خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھانا کھلائے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے اور اسے لانے کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ پر غور کریں تو اللہ نے نئے لوگ آسمان سے نہیں اتارے تھے، نہ کہیں سے منگوا کر دیئے تھے۔ وہی خطۂ زمین تھا اور وہی عرب میں رہنے والے لوگ تھے۔ یہ ایسی قوم تھی کہ اردگرد کی بڑی حکومتیں بھی ان کے اُجڈپن اور بدتہذیبی کے باعث ان سے منہ پھیرے ہوئے تھیں۔ ان لوگوں میں محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور دیکھئے برکاتِ نبوی ﷺ کی قوت و طاقت کہ ان لوگوں کو تبدیل کر کے کہاں پہنچایا۔

وجود کے اندر کا الارم

وجود کے اندر جو الارم ہے وہ ان گھڑیوں کے الارم سے زیادہ مؤثر ہے۔ آپ شام کو، رات کو اس یقین کے ساتھ سوئیں کہ مجھے اڑھائی بجے اٹھنا ہے، یہ اندر کا الارم اڑھائی بجے آنکھ کھول دے گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ کا وجود آپ کے تابع ہو، آپ اس کے تابع نہ ہو جائیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ میں رات کو الارم تو لگا دیتا ہوں لیکن آنکھ اس سے چند منٹ پہلے کھل جاتی ہے۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ شاید ہی کبھی الارم سننا پڑا ہو۔ اس طرح سے اپنے وجود کو اپنے پیچھے لگائیں اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چلیں۔ اگر آپ وجود کی خواہشات کے پیچھے بھاگتے رہے تو یہ آپ کو اور کہیں نہیں جانے دے گا۔ اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ یہ آپ کو اپنے پیچھے، اپنے اردگرد گھماتا رہے گا اور آپ کی ساری زندگی اس کے گرد کٹ جائے گی۔ اس کو کھلاؤ، اس کو پہناؤ، اس کی دیکھ بھال کرو، ساری زندگی اسی میں کٹ جائے گی۔

میرے بھائی! آپ جسم کے پیچھے نہ لگیں بلکہ اس کو اپنے پروگرام کا عادی بنائیں۔ یہ آپ کے پروگرام کے مطابق چلے گا، چل سکتا ہے، چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ میں نے تجربے کر کے دیکھے ہیں، آپ بھی تجربہ کر کے دیکھیں۔ وجودِ انسانی میں اللہ جل شانہ نے اتنے کمالات رکھے ہیں جتنے دنیا کی کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہیں۔

دعویٰ کا اعتبار نہیں، اعتبار عمل کا ہے

یہ بات بڑی قابلِ توجہ ہے کہ شیطان نے اللہ کے خالق ہونے کا انکار نہیں کیا۔ عظمتِ الٰہی کا انکار نہیں کیا، کہا خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ (الاعراف:12) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ یعنی اللہ کو زبانی طور پر خالق تو مان رہا ہے اور عملاً اپنی رائے کو اولیت دے رہا ہے۔ یعنی صرف کہتے رہنا یا یہ کہنا کہ اللہ بڑا ہے، اللہ خالق ہے، اللہ مالک ہے، یہ کافی نہیں۔ یہ تو شیطان بھی کہہ رہا ہے اور اس وقت بھی کہہ رہا ہے جب سجدہ نہیں کیا۔ لیکن عملی طور پر اللہ کے حکم کا انکار کر رہا ہے یعنی جو حکم اللہ نے دیا وہ نہیں مان رہا۔

بدر میں مشرکین مکہ آئے تو ایک عرب سردار جس کا قبیلہ لڑائی میں مشہور تھا، ابلیس نے اس کی شکل بنالی اور ابوجہل وغیرہ سے آکر ملا اور کہا اِنِّیْ جَارٌ لَّکُمُ الْیَوْمَ آج میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر جب میدان سے بھاگا تو کہا اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تمہیں نظر نہیں آرہا۔ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ (الانفال:48)، میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ کمال ہے، حد ہوگئی، خشیتِ الٰہی تو اصلِ ایمان ہے اور یہ اس کا اظہار کر رہا ہے۔

مقامِ فکر یہ ہے کہ کیا یہ سب کہہ کر اس نے عملاً اللہ کی اطاعت کی؟ تو پھر کہنے کا کیا اعتبار ہے؟ اگر واقعی اللہ سے ڈرتا تو حضرت آدمؑ کو سجدہ کرتا۔ ڈرتا ہوتا تو جو غلطی ہوگئی تھی اس پر معافی مانگتا۔ یعنی عملاً اس نے کفر کا اور برائی کا رستہ اپنایا ہوا ہے اور دعویٰ نیکی کا کرتا ہے۔ تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ دعویٰ کا اعتبار نہیں، اعتبار عمل کا ہے۔ اسی میں قول و فعل کا تضاد سامنے آگیا کہ خالق بھی کہتا ہے، ڈرتا بھی ہے لیکن نافرمانی کر رہا ہے۔

یاد رکھیں! شیطان نے کوئی برائی، بدکاری نہیں کی۔ شیطان نے کوئی قتل نہیں کیا وہ تو اس بات سے مارا گیا کہ اس نے خود کو برتر کہا۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ (الاعراف:12) کہ میں بہتر ہوں، میں بہت اچھا ہوں۔

من تشبہ بقوم فھو منھم

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، من تشبہ بقوم فھو منھم جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے، میدانِ حشر میں وہ انہی لوگوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ علامہ ابنِ خلدون نے مقدمہ ابنِ خلدون میں اس بات پر بحث فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس قوم کی وضع قطع اختیار کی جائے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کی برائیاں معمولی محسوس ہونے لگتی ہیں خواہ وہ شخص خود ان کے عقیدے و عمل کی برائیوں میں مبتلا نہ ہو۔ لیکن ان کی برائیاں پھر خامیاں نہیں لگتیں اور آخر کار خرابیاں بھلائیاں لگنے لگ جاتی ہیں۔ یہ وہ نتیجہ ہے جس کے پیشِ نظر کفار و مشرکین کی مشابہت اپنانے کے انجامِ بد سے باخبر کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے صرف اسلام قبول کر لینا ہی اسلام نہیں ہے بلکہ ردِ کفر کو مقدم رکھا گیا ہے۔

یہود کا طریقہ تھا کہ وہ دسویں محرم کو ایک روزہ رکھا کرتے تھے۔ ابھی روزے فرض نہیں ہوئے تھے تو مسلمانوں نے بھی چاہا کہ ہم بھی عشرہ محرم میں دسویں کا روزہ رکھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اکیلا روزہ مت رکھو کہ یہودیوں سے مشابہت نہ ہو۔ اب آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ اگرچہ روزہ رکھنا درست بھی ہے، جائز بھی ہے لیکن چونکہ یہودی ایک روزہ رکھتے ہیں تو مسلمانوں کو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا ایک نہیں دو رکھو، تین رکھو۔ یعنی اُن جیسا روزہ بھی نہ رکھو۔ پھر اُن جیسا لباس پہننا کون سی عزت کا سبب ہوگا۔ اُن جیسا حلیہ بنانا اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کو صاف کر کے مونچھ داڑھی منڈوا کے اُن جیسا نظر آنا کون سی نیکی ہوگی؟ تہذیبی مقام پر اور محاذ پر شکست یہ ہوتی ہے کہ کوئی بندہ دوسروں کی عادات یا دوسروں کی رسومات یا اُن جیسی چیزیں اپنانا شروع کر دے۔ اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ اس کے اپنے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس کا اپنا کوئی رویہ، اس کی اپنی کوئی معاشرت، اس کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اب ہم اس سطح پر پہنچ گئے ہیں کہ ہم جتنے انگریز نظر آئیں، اتنا ہی

ہم اپنے آپ کو معتبر سمجھتے ہیں۔ اب تو بیشتر پڑھے لکھے علماء بھی اس لباس میں اور اس حلیے میں نظر آنے لگے ہیں۔ ترقی کے جس شجر تلے آج ہم کھڑے ہیں وہاں انسانیت کے اعتبار سے ڈالیں سوکھ رہی ہیں، پتے جل رہے ہیں، پھل گل سڑ چکے ہیں اور پھول خشک ہو کر بکھر رہے ہیں۔ جسے آج کا دانشور قدامت پسندی کہتا ہے اس میں تو ڈالیں بھی ہری بھری تھیں، خوشبو سے چمن معطر تھا اور پھل لذت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ قدامت پسند عہد تھا یا آج کا عہد قدامت پسند ہے کہ جو پھر چودہ سو سال پہلے والے معاشرے میں لوٹ کر چلا گیا ہے۔ فرق ہے تو ان برقی قمقموں کا، انسانی کردار کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ آپ گاڑیوں کو جہازوں کو، بجلی کو، ٹیلیفون کو چھوڑ دیں، انسان کو دیکھیں، انسانیت کہاں پہنچ گئی ہے۔

انسانی سوچوں کا اثر

انسانی سوچوں کا بھی ایک اثر ہوتا ہے۔ آپ اسے ظاہری طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک آدمی ہر وقت کڑھتا رہتا ہے، کسی کی برائی سوچتا رہتا ہے، غصے میں رہتا ہے تو یہ رفتہ رفتہ اس کی جسمانی صحت کو خراب کر دیتا ہے۔ اگر سوچوں کا اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ مادی وجود کو متاثر کرتا ہے تو کیا وہ اس روحانی نظام کو متاثر نہیں کرتا ہوگا جو اس سے نازک تر اور حساس ترین ہے۔

حقوق کا مطالبہ، فرائض سے غفلت

ہر آدمی کا جو حق ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کا فرض ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے فرائض چھوڑتے ہیں اور صرف حق کا مطالبہ کرتے ہیں تو کسی کو حق نہیں ملتا کہ ہم میں سے ہر ایک کے حقوق ہم نے خود ہی دبا رکھے ہیں۔ آپ پورے ملک میں دیکھیں ہڑتالیں ہوں گی، جلسے جلوس ہوں گے۔ کیوں! کہ ہمیں ہمارا حق چاہیے۔ ان سے پوچھا جائے کہ تم لوگ

جو اپنے حق کا مطالبہ کرتے ہو، تم اپنا فریضہ ادا کرتے ہو؟ اس طرف تو کسی کا خیال جاتا ہی نہیں ہے۔

تبدیلی دلوں کے بدلنے سے آتی ہے

جب بھی کبھی مثبت انقلاب آیا۔ کسی نہ کسی صاحبِ حال، کسی نہ کسی صوفی، کسی نہ کسی ذاکر کی وجہ سے آیا۔ کوئی بندہ جس کا انگ انگ ذاکر تھا، جس کا گوشت پوست ذاکر تھا، جس کا دل ذاکر تھا، جس کا دماغ ذاکر تھا، جس کی ہر سوچ میں اللہ کی یاد بستی تھی، ایسے ہی کسی بندے سے انقلاب آیا۔

آپ دُور کیوں جاتے ہیں، برصغیر کی تاریخ ہی اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی مثال لے لیجیے۔ یہ تو کل کی تاریخ ہے، بچے بھی جانتے ہیں۔ آپؒ اجمیر میں وارد ہوئے تو اکیلے مسلمان تھے۔ پوری ریاست اجمیر ہندو ریاست تھی اور ایک بندہ معین الدینؒ مسلمان تھا۔ جس وقت آپؒ اجمیر میں وارد ہوئے تو اجمیر کو اجمیر شریف بنانے والے کی عمر نوے برس تھی۔ نوے برس کی عمر کا بندہ اجمیر میں وارد ہوا۔ تیس برس قیام فرمایا اور ایک سو بیس برس کی عمر میں آپؒ کا وصال ہوا۔ جب ان کا وصال ہوا تو ایک لاکھ بیس ہزار افراد اُن کے جنازے میں تھے۔ کسی بادشاہ، کسی لشکر، کسی فوج سے ریاست کی سرحدیں تو تبدیل ہوتی ہیں لیکن دلوں میں، سوچ میں، فکر میں تبدیلی کوئی سلطان، کوئی شہنشاہ، کوئی فوج، کوئی لشکر نہ لا سکا۔

آج وقت ہے مزاج بدل لو

عرصۂ محشر میں گناہ گار دو خواہشوں کا اظہار کریں گے

☆ ایک تو کہیں گے کہ آج کیا کوئی ایسا سفارشی ہے جو ہماری جان چھڑا دے فَيَشْفَعُوْا لَنَآ (الاعراف:53)

☆ دوسرا کہیں گے او نود یا پھر اے اللہ! ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ (الاعراف:53) تو ہم ایسے عمل کریں گے جو پہلے نہیں کرتے تھے۔ یعنی پہلے برائی کرتے تھے اب نیکی کریں گے۔ کافر تھے ایمان لائیں گے، غافل تھے اللہ کو یاد کریں گے، ذکر کریں گے۔ ہمیں ایک دفعہ بھیج دے۔ یعنی پہلے تو نزدیک سے جان چھڑانا چاہیں گے کہ کوئی ہے ایسی ہستی جو ہماری سفارش کردے۔ پھر آرزو کریں گے کہ اگر اللہ ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے، پھر سے زندگی دے دے تو ہم ایسے عمل کریں گے جو پہلے نہیں کرتے تھے۔ اللہ رب العزت جو ہر غیب و حاضر کو جاننے والا ہے وہ ان کے حال پہ خبر دیتا ہے۔ فرماتا ہے وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (الانعام:28) اگر میں ان کو واپس بھیج بھی دوں تو جس کام سے منع کیا گیا ہے یہ پھر وہی کریں گے۔

کتنی عجیب بات ہے انہوں نے عرصۂ محشر کو دیکھ لیا، جنت و دوزخ کو دیکھ لیا، فرشتوں سے بات ہوگئی، بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوئے۔ بالفرض اگر دنیا میں لوٹائے بھی گئے تو فرمایا لعادوا لما نهوا پھر وہی کام کریں گے جس سے منع کیا گیا ہے۔ کمال ہے! گویا اس تھوڑی سی زندگی میں مزاج ایسا بن جاتا ہے کہ پھر وہ تبدیل نہیں ہوتا۔ اللہ فرماتا ہے یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے انہیں جو فرصتِ عمل دی تھی، دس سال، بیس سال، پچیس سال، پچاس سال، اس میں انہوں نے اپنا مزاج سیٹ کرلیا۔ اب اگر واپس جائیں گے تو پھر برائی کریں گے۔

تو آج اولیت اس بات کو دینی چاہئے کہ دیکھیں کہ میرا مزاج کیا بنتا جارہا ہے۔ آج وقت ہے آج بدل لو۔ میرے بھائی! یہ بڑی فکر کی بات ہے۔ اس دنیا کے تھوڑے

سے عرصے میں ایک مزاج بن جاتا ہے، پھر وہ دوزخ کو دیکھ کر بھی نہیں بدلتا۔ اگر دوبارہ زندگی مل جائے تو بندہ پھر وہی چوریاں، ڈاکے، بے ایمانیاں شروع کردے گا۔ آج ہمارے پاس موقع ہے اس سے پہلے کہ آنکھ بند ہوجائے، اس مزاج کو درست کرلو۔

ہر آدمی کا اپنا جہان ہے

ایک چھت کے نیچے رہنے والے، ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے ہر انسان کی اپنی اپنی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک جگہ مل کر رہتے ہیں، ایک ہی جگہ کھاتے پیتے ہیں لیکن اندر کا حال ہر ایک کا اپنا ہوتا ہے۔ ایک اسی چھت کے نیچے خوش ہوتا ہے، دوسرا اسی چھت کے نیچے خون کے آنسو بہا رہا ہوتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی اپنی کیفیت ہوتی ہے اور اس کیفیت کا سارا اثر وہ بندہ خود محسوس کر رہا ہوتا ہے، دوسرے کو خبر نہیں ہوتی۔ یعنی اندر شعلے لپک رہے ہیں لیکن پاس بیٹھے بندے کو خبر نہیں ہوتی۔ کوئی نہیں جانتا کہ کسی کے اندر کیا دکھ ہے، کون اپنے اندر خوشی محسوس کر رہا ہے، ہر آدمی اپنے اپنے جہان میں ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اس ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

فضا ایک ہے، ہوا ایک ہے لیکن ان کے عمل اور ان کے خیالات اور ان کے حالات کے مطابق دونوں کا جہان الگ الگ ہے۔

اسی طرح ہر فرد کا ایک اپنا جہان ہے۔ اب اس جہان میں وہ اکیلا ہے، اس میں نہ ماں داخل ہوسکتی ہے، نہ باپ، نہ بہن، نہ بھائی، نہ بیوی اور نہ بچے چونکہ وہ اپنے اپنے جہان کے اسیر ہیں۔ ماں کو دیکھو، اس کے اپنے دکھ اور فکریں ہیں۔ باپ کو دیکھو، اس کی اپنی فکریں ہیں، اس کے اپنے مسائل ہیں۔ بہن بھائیوں کو دیکھو، اولاد کو لے لو، ہر ایک کے اپنے مسائل ہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے جہان میں مصروف ہے۔ اسی طرح برزخ میں ایک قبر میں پچاس مُردے دفن کردو۔ ان میں کوئی کافر ہے، کوئی مومن ہے، کوئی نجات میں

ہے، کوئی عذاب میں ہے، تو سب اپنا اپنا حال بھگتتے رہیں گے، ایک کا حال دوسرے پر غالب نہیں آتا۔ دنیا کا کوئی فرد اپنے حالات کی قید سے اُوپر ہو کر نہیں دیکھتا۔ لیکن اگر مسلمان کو اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ سے رشتہ نصیب ہو جائے تو وہ اپنے جہان میں اکیلا نہیں رہتا۔ وہاں اللہ بستا ہے، اللہ کا رسول ﷺ بستا ہے۔ عشقِ الٰہی کی شمع ہوتی ہے، عشقِ رسول اللہ ﷺ کی عطر بیز ہوا چلتی ہے۔ پھر وہ شخص اتنی موج میں ہوتا ہے کہ خاردار وادیوں سے گزرتے ہوئے بھی اسے پتہ ہی نہیں ہوتا۔

زندگی کے نشیب و فراز

انسانی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آتے ہیں۔ اور زندگی کبھی بھی پسندیدہ چیزوں کے جمع ہونے کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری پسند کچھ اور ہوتی ہے، اللہ کے فیصلے کچھ اور ہوتے ہیں۔ ہماری پسند ہمارے کمزور ذہن کی عکاس ہوتی ہے۔ اس کے فیصلے کائناتِ بسیط کو دیکھ کر ہوتے ہیں۔ ہماری نظر میں صرف ہم ہوتے ہیں، اس کی نظر میں اس کی ساری کائنات ہوتی ہے اور وہ رب العالمین ہے۔ ہم اپنی ذات کے بارے میں فکر کرتے ہیں، وہ اپنی ساری مخلوق کے بارے میں سوچتا ہے۔ تو زندگی میں پسند کے فیصلے نہیں آتے، پسند کو اس کے فیصلوں کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے اور یہی تصوف ہے۔ انسان اپنی پسند نافذ کرنے کی فکر میں پڑ جائے تو ساری زندگی دُکھی رہتا ہے۔ اپنی پسند کو اُس کے فیصلوں کے مطابق ڈھالنا ہی اسلام ہے اور اس میں کامیابی ہے۔ یہ ساری محنت و مجاہدہ اسی لئے کرایا جاتا ہے۔

اعمال و کردار کے اثرات

حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ہر ایک کو جاتے دیکھا گیا ہے۔ کہاں ہیں وہ لوگ کہاں ہیں بڑے بڑے سلاطین عرب و عجم کہاں ہیں وہ شاہانِ جہاں جو تخت و تاج کی زینت تھے آج اُن کی قبور سیر گاہیں بنی ہوئی ہیں کس نے انہیں وہاں پہنچا دیا؟ میں ایک دفعہ

لاہور، جہانگیر کے مقبرے پر گیا تو سکولوں کے بچے وہاں بیٹھ کر مشروبات پی رہے تھے۔ چیزیں کھا رہے تھے اور پکنک منا رہے تھے۔ کہاں ہے وہ شہنشاہِ جہانگیر۔ کیوں انہیں نہیں جھڑکتا۔ کہاں گئے اس کے چوبدار اور پاسبان، کہاں ہے اس کی فوج و سپاہ اور لاؤ لشکر، کہاں ہے اس کی سلطنت۔ قلعے اجڑ گئے، محلات برباد ہو گئے اور آج ان کی چیزیں عجائب گھروں میں رکھی ہیں کہ کبھی یہ بھی بادشاہوں کے پاس تھیں۔ دریائے اُس پار حضرت علی ہجویریؒ کا مزار ہے، آج بھی وہاں احترام ہی احترام ہے۔ یہ فرق ہے اعمال و کردار کا کہ جس کے اثرات آج قبور تک نظر آتے ہیں۔

کیا کیا جائے انسان بڑی ٹیڑھی مشین ہے

انسان ایک بڑی ٹیڑھی مشین ہے۔ اس کے ہر بٹن کے دوہرے عمل (Double actions) ہیں۔ آپ اس کو کھانا کھلاتے ہیں صحت مندی کیلئے، وہ کھا کر بیمار ہو جاتا ہے۔ آپ اسے سلاتے ہیں کہ سو کر اٹھے گا تب تازہ دم ہوگا۔ وہ سو کر اُلٹا کاہل ہو جاتا ہے۔ آپ اس کو احترام دیتے ہیں کہ یہ بھی انسان ہے۔ اسے بھی احترام دیا جائے اور وہ میرے ساتھ پیار سے رہے۔ آپ عزت کرتے ہیں وہ اکڑ جاتا ہے یعنی اس انسانی مشین کے ہر ہر بٹن کے ڈبل ایکشن ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ محبت تو کی جاتی ہے عشقِ الٰہی کیلئے، لیکن یہ عشقِ الٰہی کی بجائے اپنی بڑائی کا اسیر ہو جاتا ہے۔ جس طرح کسی کو دودھ پلایا جائے تو وہ دودھ پی کر بیمار ہو جائے یا مر جائے۔

ایسے ہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ظاہری شریعت اور ہے اور عشق اور ہے۔ وہ گمراہی میں پڑ گئے۔ شریعت ترک ہو گئی، عبادت ترک ہو گئی، اتباعِ سنت جاتا رہا، تو جانتے نہیں کہ کچھ بھی نہیں بچا۔ اپنے طور پر سمجھتے رہتے ہیں کہ عشق باقی ہے۔ بھئی کہاں باقی ہے؟

اطاعت میں ہی سکون ہے

جب اطاعتِ الٰہی کی حدود سے کوئی نکل جاتا ہے تو جتنا کوئی بدکار یا جتنا کوئی بے دین ہوتا ہے، اتنا اتنا جہنم میں اس کی جگہ بنتی جاتی ہے۔ اتنا پَرَ تو جہنم کا اس کی زندگی پر پڑ رہا ہوتا ہے۔ وہ خواہ حکومت بھی کرتا رہے لیکن سکون کا ایک لمحہ اسے نصیب نہیں ہوتا۔ پریشانیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ ڈر اس کا نصیب بن جاتا ہے۔ سوتے میں ڈرتا ہے۔ جاگتا ہوا بھی ڈرتا ہے، کھاتا ہوا بھی ڈرتا ہے پیتا ہوا بھی ڈرتا ہے۔ ڈرتا ہی رہتا ہے اور ڈرتے ڈرتے دنیا سے گزر جاتا ہے۔ زندگی میں سکون اور اطمینان نام کی کوئی چیز اس کیلئے نہیں رہتی۔

تو میرے بھائی! زندگی جینے کیلئے بھی ہمیں اللہ کی اطاعت اور دامانِ مصطفوی ﷺ کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر زندگی بجائے خود عذاب بن جاتی ہے۔ اللہ نہ کرے اگر دامانِ نبوت، ہاتھ سے چھوٹنے لگے تو یادِ الٰہی، ذکرِ الٰہی اور سکونِ قلب کس طرح اور کس بنیاد پر باقی رہے گا؟

اعتراضات

اعتراض اور سوال میں فرق

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ سوال ہمیشہ جہالت ہوتا ہے۔ بندہ نہیں جانتا تو سوال کرتا ہے۔ جبکہ جواب علم ہوتا ہے۔ اگرچہ سوال تو کیا جاسکتا ہے لیکن اعتراض کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ وہ کسی دلیل پہ نہیں ہوتا، وہ آپ کی ذاتی سوچوں کا مظہر ہوتا ہے۔ کسی بندے کو اگر آپ اچھا نہیں سمجھتے تو وہ اپنا فرض ادا بھی کرے تو بھی آپ اس پر اعتراض کریں گے۔ کسی کو آپ صحیح نہیں سمجھتے تو آپ کے اعتراض کی بنیاد ہو یا نہ ہو وہ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

سوال تعلیم کیلئے ہوتا ہے۔ کچھ سمجھنے کیلئے پوچھنا ضروری ہے اور پوچھنے سے فائدہ ہوتا ہے، انشراحِ صدر ہوتا ہے، چیزوں کی سمجھ آتی ہے۔ لیکن اعتراض ٹوکنے کیلئے ہوتا ہے۔ اعتراض کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندہ کہتا ہے کہ جو وہ سمجھتا ہے وہ صحیح ہے اور جو شیخ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ یہ رویہ مانع فیض ہے۔ اس لیے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس قدر بھی سوال ہیں، سب پوچھ کر ذہن صاف کرلو، پھر بیعت ہونا۔ بیعت ہونے سے پہلے تحقیق کی گنجائش ہے، بعد میں یہ گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔

کیوں اور کیسے؟

جس دور میں ہم ہیں، یہ اپنی نوعیت کا بہت ہی عجیب دور ہے۔ اس میں ہر بات کے ساتھ 'کیوں' اور 'کیسے' کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ تعلق جو قلبی، باطنی اور کیفی ہے، یہ بہت دقیق، گہرا اور نفیس ہے۔ یہ روزِ اول سے، آقائے نامدار ﷺ کے دورِ مبارک سے ہمیشہ 'کیوں' اور 'کیسے' سے بالاتر رہا۔ آپ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں دیکھیں، صرف ایک چیز ملتی

ہے کہ وہ اس انتظار میں رہتے تھے کہ کیا حکم ہوتا ہے۔ 'کیوں' اور 'کیسے' کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔

جاننے کیلئے پوچھنا الگ بات ہے لیکن اب سوال جاننے کے لیے نہیں، لوگ سوال اعتراض کیلئے کرتے ہیں۔ علم کیلئے، جاننے کیلئے، علم میں اضافے کیلئے سوال کرنا، پوچھنا اچھی بات ہے۔ لیکن آج کی بدنصیبی یہ ہے کہ لوگ اعتراض کیلئے سوال کرتے ہیں۔ جواب مل جائے تو خاموش ہو جاتے ہیں، عمل نہیں کرتے، اور پھر کوئی اور سوال تلاش کرنے لگ جاتے ہیں تاکہ پھر کوئی اور اعتراض کیا جائے۔

اعتراض کیوں؟

علومِ ظاہری اور کیفیاتِ باطنی مل کر فیوضاتِ نبوت اور فیوضاتِ کتاب اللہ بنتے ہیں۔ اگر کوئی کتاب اللہ پڑھتا رہے اور اس کا دل کیفیاتِ ایمانی سے خالی ہو تو اس طرح کے پڑھنے والے کو سارا قرآن پڑھ کر بھی اعتراضات ہی سوجھتے ہیں۔ مستشرقین قرآن پر تحقیق کرتے ہیں، عربی زبان سیکھتے ہیں اور اس ساری محنت کا حاصل ایسے بودے اعتراضات ہوتے ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص مغرب میں پیدا ہوا اور اس نے مشکل سے اور محنت کر کے عربی گرائمر سیکھی اور اسے عربی پر عبور حاصل ہوا۔ پھر اس نے قرآن پڑھا، احادیثِ مبارکہ پڑھیں اور اس سب کا حاصل یہ ہوا کہ اسے ذاتِ باری، کلامِ باری اور عظمتِ نبوت ﷺ پر اعتراضات سوجھے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ دل ایمان سے خالی تھا، صرف الفاظ سے کھیلتا رہا۔

اعتراض ہی اعتراض۔۔طلب نہیں

اس گئے گزرے دور میں جب لوگوں کے پاس سوائے اعتراض کے کچھ نہیں بچا کہ یہ ایسا محرومی کا دور ہے کہ ہر بندے کی زبان پر اعتراض ہے لیکن دل میں طلب نہیں ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو طلب پر بھی گاہے ملتی ہے اور گاہے عمر طلب میں ہی گزر جاتی ہے، یہ ملتی نہیں ہے۔ اِس دور میں اگر اس نے ہمیں اپنا نام لینے کی توفیق دے دی ہے اور ایک طلب عطا کر دی ہے تو یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ صرف یہ ایک اتنی عظیم نعمت ہے کہ ہم اس کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔

تصوف کے بارے میں اعتراض

تصوف وسلوک اگرچہ اسلام کا نہ صرف رکنِ اعظم ہے بلکہ اسلام کی اساس ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمیشہ اعتراضات کی زد میں ہی رہتا ہے۔ لوگ اُسے سمجھنے کا تکلف نہیں کرتے یا لوگوں کو سمجھایا نہیں جاتا۔ بلکہ باتیں تو یہاں تک لکھی پڑھی گئیں کہ اس (تصوف) کا چھپانا ضروری ہے اور اچھے بھلے صاحبِ علم لوگوں نے لکھا کہ نبوت کا اظہار واجب ہے اور سلوک وتصوف کا اخفاء واجب ہے

حضرت جیؒ نے اس کا جواب یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اگر یہ دین ہے تو دین کا تو اظہار واجب ہے پھر تو چھپانا نہیں چاہیے۔ اور اگر یہ دین نہیں ہے تو اسے اختیار کیوں کیا جائے؟

ذکرِ الٰہی اور اعتراض

قرآنِ مجید میں بارہا ذکرِ الٰہی کا کسی نہ کسی رنگ میں بیان ہوا ہے اور اس کی تائید کی گئی ہے۔ رہی یہ بات کہ ''ذکرِ الٰہی کا کوئی خاص طریقہ بھی قرآن وسنت سے ثابت کریں'' تو اس سلسلے میں ایک اصول پیشِ نظر ہے۔ وہ یہ کہ:

- شریعت نے کچھ عبادتیں ایسی فرض کی ہیں جن کے اوقات، مقدار، ہیئت سب مقرر کردی ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اور
- کچھ عبادتیں ایسی فرض کی ہیں جن کا حکم دے کر فرض قرار دیا مگر وقت، مقدار اور صورت متعین نہیں فرمائی جیسے دین کا ضروری علم حاصل کرنا، دین کی تبلیغ، جہاد کرنا، ذکرِ الٰہی کرنا وغیرہ۔ اس لئے اِن عبادات میں کسی خاص صورت کو لازمی قرار دینا دراصل دین میں اضافہ کہلائے گا

ان سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ ایک ہوتا ہے مقصد اور ایک ہوتا ہے ذریعہ۔ کبھی تو حصولِ مقصد کے ذرائع مقرر ہوتے ہیں اور کہیں ذرائع کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ لہٰذا مقاصد نہیں بدلتے، ذرائع بدل سکتے ہیں۔ لہٰذا ذکرِ الٰہی مقصد ہے، اس کی کوئی خاص صورت شریعت میں متعین نہیں۔ چنانچہ اس میں اہلِ فن جس صورت کو حصولِ مقصد کیلئے مفید سمجھیں اور شریعت میں اس کی مخالفت نہ ہو، وہی درست ہوتی ہے۔

ایک اعتراض۔۔کیا صحابہ کرامؓ بھی صوفی تھے؟

ایک اعتراض جو بڑا وزنی سمجھا گیا وہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں مختلف اوصاف تھے، کسی کو بہادر کہا گیا، بعض جرنیل اور سپہ سالار بنے، بعض بطور فقیہہ مشہور تھے، بعض تفسیر میں مشہور تھے، بعض حدیث شریف میں زیادہ معروف تھے لیکن کوئی صحابیؓ صوفی نہیں بنا۔ یہ وصف آپ نے کہاں سے نکال لیا؟

یہ کہنا بڑی سادگی کی بات ہے کہ فقہ ایک الگ موضوع ہے، جہاد ایک الگ موضوع ہے لیکن دِل کی صفائی، تزکیہ قلب یہ کوئی الگ موضوع نہیں ہے۔ تزکیہ قلب کی انتہا یہ ہے کہ کسی کو براہِ راست صحبتِ پیغمبر ﷺ میسر آجائے اور وہ صحابیؓ بن جائے۔ کسی

صحابیؓ کو صوفی کہنا ایسے ہی ہے جیسے کسی جرنیل کو حوالدار کہا جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ جہالت ہے۔

یہاں آپ کوئی آتشی شیشہ لے کر سورج کی ایک شعاع منعکس کرتے ہیں، اُس سے آگ لگ جاتی ہے۔ تو ایک بندے کو جب لے جا کر سورج کے پاس بٹھا دیتے ہیں تو اس کا کیا حال ہوگا؟ جنہیں صحبتِ پیغمبر ﷺ نصیب ہوگئی وہ تو سراجاً منیراً کے پاس چلے گئے۔ آپ ﷺ سراج نہیں سراجاً منیراً ہیں۔ ایسا روشن چراغ جو قریب آنے والے کو بھی روشن کر دیتا ہے، منور کر دیتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے قلوب تو اتنے منور ہو گئے کہ وہ صحابیِ پیغمبر ﷺ کہلائے، پھر انہیں صوفی کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ تزکیہ کوئی الگ فعل نہیں ہے، تزکیے کی ضرورت فقیہہ کو بھی ہے اور مفسّر، محدّث اور مجاہد کو بھی۔

تشابہت قلوبھم

تشابہت قلوبھم کا مطلب ہے قلوب کی مشابہت۔ دل ایک جیسے ہوں تو خواہ صدیاں گزر جائیں خیالات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نیکی کی مشابہت بھی ہوتی ہے اور جن قلوب میں برائی دھنس چکی ہو، اُن میں بھی مشابہت ہوتی ہے خواہ وہ مختلف عہد کے لوگ ہوں۔

کفار و ملحدین کے اعتراضات کو اگر یکجا کیا جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ نہ صرف مفہوم وہی ہوتا ہے بلکہ الفاظ تک وہی ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کے قلوب میں کفر کی ایک مشابہت ہوتی ہے۔ پہلوں کو بھی شیطان سکھاتا تھا اور بعد والوں کو بھی شیطان سکھاتا ہے۔ لہٰذا دونوں کے دِل ملتے جلتے ہیں۔

یہ چیز اکثر دیکھی جاتی ہے کہ معترضین جب اسلام پر اعتراض کرتے ہیں تو ان کے الفاظ کم وبیش وہی ہوتے ہیں جو اس وقت کے مشرکین اور یہود کے تھے۔ انہوں نے یہ الفاظ اور تراکیب کہاں سے لئے؟ یہ شیطان کا کمال ہوتا ہے کہ وہی الفاظ ان کے ذہن میں ڈال دیتا ہے تاکہ ان پر بھی غضبِ الٰہی آئے۔ یہ اللہ کا بنایا ہوا ایک قاعدہ اور ضابطہ ہے۔ مثلاً جو الفاظ ابوجہل نے حضور ﷺ کے بارے میں کہے، اُن الفاظ پر غضبِ الٰہی کا اپنا ایک اثر ہے۔ جب بھی کوئی مخالفِ اسلام شخص ان الفاظ کو دہرائے گا، اُس پر اُسی طرح کا غضبِ الٰہی اُسی طرح بھڑکے گا جس طرح ابوجہل کیلئے بھڑکا تھا۔

اِسی طرح جن الفاظ میں آقائے نامدار ﷺ نے اللہ کی تعریف کی ہے یا جس انداز میں آپ ﷺ نے کوئی عمل کیا، تو جو شخص بھی اللہ کی رضا کیلئے حضور ﷺ کے انداز اپناتا ہے، اُسی طرح عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر اُسی طرح کی رحمتِ الٰہی متوجہ ہوتی ہے جس طرح حضور ﷺ پر متوجہ ہوا کرتی تھی (گو درجۂ رحمت میں بہت زیادہ فرق ہوگا)۔

اعتراضات کا نقصان خود معترض کو ہوتا ہے

سب سے خطرناک وہ اعتراضات اور سوالات ہوتے ہیں جو اُس ذات پہ کئے جائیں جس سے برکات کے حصول کی توقع ہو۔ جیسے نبی کریم ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات پر کسی کو اعتراض ہو یا آپ ﷺ کے صحابہؓ پر کسی کو اعتراض ہو، متقدمینؒ، سلف صالحینؒ پر اعتراض ہو تو اُن اعتراضات سے معترض کو فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہی سوالات اس ذات سے فائدہ اٹھانے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ معترض، اعتراض کر کے اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ لوگوں نے اپنی انا میں گرفتار ہو کر صحابہ کرامؓ پر اعتراض کئے۔ کمال ہے! اللہ اُن کی صداقت وامانت کی گواہی قرآن میں دیتا ہے۔ اپنی رضا اور مغفرت کی سند عطا کرتا ہے اور لوگوں کو اُن کی ذات پر اعتراض ہوتے ہیں۔

دعا اور وظائف

قرآن اور درود شریف۔۔۔ سب سے بڑا وظیفہ

کچھ لوگ ملنے آئے کہ جی ہمیں کچھ پڑھنے کے لئے بتائیں۔ میں تلاوت کر رہا تھا، میں نے کہا قرآن پڑھتے ہو؟ یہ تیس پارے پڑھنے کے لئے ہیں۔ کہنے لگے، ہمارا مطلب ہے کہ کوئی وظیفہ بتادیں۔ میں نے کہا، یہی وظیفہ ہے، روز پڑھو۔ ایک رکوع پڑھو یا ڈیڑھ رکوع پڑھو، ایک پارہ پڑھو یا دو پارے پڑھو، ترجمہ پڑھو، سمجھنے کی کوشش کرو۔ اللہ کا کلام ہے، اس سے بڑا وظیفہ کیا ہوگا؟

درود کا مطلب ہے، ایسی چیز جو ہر وقت جاری رہے، اس میں رکاوٹ نہ آئے۔ ایسی چیز یا کوئی چشمہ جو ہر وقت جاری رہے یا ایک دریا جو ہر وقت بہتا رہے۔ کوئی کام جو ہر وقت ہوتا رہے۔ اللہ رب العزت کیسے درود بھیجتے ہیں؟ عملاً اپنی رحمتیں نازل فرماتے رہتے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ فرشتے درود بھیجتے ہیں، اللہ سے دعا کرتے ہیں، اے اللہ! اپنے حبیب ﷺ پر برکتیں نازل فرما۔ مسلمان بھیجتا ہے، دعا کرتا ہے، اللھم صل علیٰ محمد.... اے اللہ! تو برکتیں اور رحمتیں نازل فرما۔ اس لئے جب مجھ سے کوئی پوچھتا ہے، وظیفہ بتاؤ، میں کہتا ہوں کہ درود شریف پڑھو۔ لوگوں کی تسلی نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ ٹال دیا، وظیفہ نہیں بتایا۔ اللہ اللہ! دعویٰ تو عشقِ مصطفےٰ ﷺ کرتے ہو لیکن اس نام کی عظمت سے آشنا نہیں ہو۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

میاں! یہ باریکیاں سمجھ آجائیں تو تمہاری آنکھوں میں بھی دریا آجائیں۔ سلام کہو تو آنسو پہلے ٹپکیں، نگاہ اٹھاؤ تو آنکھ پہلے وضو کرے۔ آج تم عظمتِ رسالت ﷺ کو بیچ

کر کھاؤ لیکن اس کا وہ محافظ، اس کی عظمت کا وہ رکھوالا، جس نے دَم بھی اونچا لینے سے منع کر دیا، وہ حساب لے لے گا۔

دعا عبادت کا حاصل ہے، رسم نہیں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا الدعاء مخ العباده دعا عبادت کا مغز ہے۔ عبادت کیا ہے؟ اللہ کی کبریائی کو تسلیم کرنا اور اپنی عاجزی کا اظہار۔ اور دُعا تو عبادت کا حاصل ہے۔ کہ بندہ اپنی ساری ضرورتیں اور حاجتیں اللہ کریم کے سامنے پیش کرے اور یہ یقین رکھے کہ وہ اتنا کریم ہے کہ بندہ خود اپنا بھلا اتنا نہیں چاہتا جتنا اللہ کریم خود چاہتے ہیں۔ ساری عبادت کا حاصل ہی دُعا ہے لیکن یاد رہے! عبادت کا حاصل ہے! عبادت کی جائے تو دُعا حاصل عبادت ہے۔ عبادت ہی نہ کی جائے تو حاصل کہاں سے آئے گا؟ عبادت کی ہی نہیں تو عبادت کا مغز کہاں سے آئے گا؟ بادام کا مغز بہت اچھا ہے مگر بادام بھی تو ہو، چھلکا توڑیں تو مغز ہوگا۔ بادام ہی آپ کے پاس نہیں تو آپ کہیں مجھے مغز مل جائے، کیسے مل جائے گا؟

ہمارے ہاں رواج بن گیا ہے کہ جب دینی اجتماعات ہوتے ہیں تو اُن اجتماعات میں لوگ کم جاتے ہیں۔ کہیں عرس کے نام پہ جو ڈھول بجاتے ہیں، اُچھل کود کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں ہم دینی کام کر رہے ہیں تو وہاں بہت لوگ جاتے ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو دُعا کے منتظر رہتے ہیں کہ ہم دُعا میں شامل ہو جائیں گے۔ تبلیغی جماعت کے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں، سالانہ بھی، ماہانہ بھی، بہت سے لوگ جاتے ہیں۔ لیکن بے شمار لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اِس انتظار میں ہوتے ہیں کہ دُعا کب ہے، اُس میں شامل ہو جائیں۔ اُن کا خیال یہ ہوتا ہے کہ دعا کے روز ہمیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو یہ لوگ پہلے حاصل کر چکے ہیں۔ اب چونکہ یہ رسم بنتی جا رہی ہے اور اسے ثواب بھی سمجھا جاتا ہے تو یہ ایک

بدعت ہے۔

میری گزارش یہ ہے کہ دُعا عبادت کا حاصل ہے لیکن اسے رسم نہ بننے دیں۔ کم از کم اپنے اجتماع میں یہ بات نہ پھیلنے دو کہ جی ہم بھی دُعا میں شامل ہو جائیں گے۔ جو نہیں آسکتے ان کے massage آتے ہیں، دُعا میں مجھے بھی شامل کر لیں۔ میاں! خود جاگو تو جاگنے کی لذت کا پتہ چلے گا۔ کبھی کھانے کے لئے کسی کو کہا ہے کہ مجھ سے تکلیف نہیں ہوتی، تم کھالو میرے لئے دُعا کر دینا، میرا پیٹ بھر جائے گا۔ دنیا کے معاملے میں تو کہتے ہو خود یہ کام نہ کریں تو کیسے ہوگا؟ دین کے معاملے میں دعاؤں پہ رہ گئے ہو کہ مجھ سے تو عمل ہوتا نہیں، دُعا میں مجھے شامل کر لیں۔ میاں! ایسی محبتیں، جھوٹی محبتیں ہم سے نہیں ہوتیں۔

عمومی دُعا ہم روز کرتے ہیں، سب کیلئے کرتے ہیں، کسی کیلئے خاص نہیں کرتے۔ جو ہم سے دشمنی کرتا ہے، اُن کے لئے بھی ہم دُعا کرتے ہیں لیکن ہم کسی ایسے خاص کیلئے دُعا نہیں کرتے کہ فلاں کا نام لے کر کہ اس کی بیٹی، فلاں کا بیٹا، فلاں کا بھائی، ''اے اللہ وہ بیچارہ تیرے دَر پر تو آ نہیں سکا اور اُس کے پاس ایک دن کی بھی فرصت نہیں تھی چونکہ ایک ہی دفعہ فارغ ہو کے تیرے پاس تو آ ہی جانا ہے پھر بیٹھا رہے گا، اِس وقت وہ فارغ نہیں ہے''۔ تو میرے بھائی یہ ہم سے ہو نہیں سکتا۔

دُعا بھی ایک کیفیت ہے، ایک دلی آرزو ہے۔ اور کیفیتیں تو حاصل کرنے سے حاصل ہوتی ہیں کہنے سے تو حاصل نہیں ہوتیں۔ دُعا کے معاملے میں سارے سیانے ہیں، کسی کو کہہ دو، تُو دود یہاڑیاں نہ لگایار! ہم دُعا کریں گے تجھے تنخواہ پوری مل جائے گی۔ وہ کہے گا، جانے دیجیے، تنخواہ میری کٹے گی، آپ کی دعا کا کیا جانا ہے۔ دین کے معاملے میں آپ نے کیسے سوچ لیا کہ عملاً حصہ نہ لو اور دُعا کرا لو۔ دعا کرنا ایک بہترین عبادت ہے لیکن دعا ہوتی ہے عمل کے بعد۔

دعا ہمارے لئے ایک رسم بن گئی ہے۔ دعا آبِ حیات ہے، اب افیون بنتی جا رہی ہے۔ جب آپ یہاں اجتماع پر نہیں آسکتے، رہ نہیں سکتے، بات سن نہیں سکتے، ذکر نہیں کر سکتے تو پھر دعا میں شمولیت کیسی؟ دعا تو ان لوگوں کے لئے ہوگی جن لوگوں نے محنت کی، اللہ نے انہیں شعور دیا کہ وہ اس کے مقصد کو سمجھے، اللہ سے آشنائی کی طلب لے کر آئے۔ اگر محنت تھوڑی کی تو اللہ سے دعا ہوگی کہ انہیں زیادہ اجر عطا فرما، ان کے قلوب کو اپنی یاد سے آشنا کر۔

ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ چند ہزار گوشہ نشین پیدا کر دیئے جائیں جو صبح شام کچھ نہ کریں، عبادات کریں، سوتے رہیں۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ وہ بندے بنیں جو با مقصد ہوں۔ میاں! یہاں تو عمل کی بات ہے اور وہ دولت الحمدللہ بٹ رہی ہے جو اس وقت شاید کہیں نہ مل سکے اور اگر ملی بھی تو یوں ڈھیروں نہیں ملے گی۔ تجربہ کر کے دیکھ لو، دنیا میں پھر کر دیکھ لو۔ بڑے بڑے نام ہیں، بڑے بڑے خانوادے ہیں، بڑی بڑی گدیاں ہیں، پھر کے دیکھ لو، تلاش کر لو۔

سو میرے بھائی! کچھ وقت نکالو، کچھ راتیں جاگو، چوٹ کھاؤ، کچھ کرو۔ تھوڑا کر کے زیادہ پالو گے لیکن کچھ کرو تو سہی۔

دعا کبھی گستاخی بھی بن جاتی ہے

دُعا عبادت کا حاصل ہے لیکن بعض اوقات گستاخی بن جاتی ہے۔ ایک بندہ جائز طریقے سے شادی نہیں کرتا، نکاح نہیں کرتا، دعا مانگے جا رہا ہے، یا اللہ! مجھے صاحبِ اولاد کر دے تو یہ دعا نہیں گستاخی ہے۔ کچھ نہ کر کے دعا کرنا گستاخی ہے، یہ ایک ایسا جرم ہے، جو ہم بحیثیتِ قوم کر رہے ہیں۔

رب العالمین سے مانگنے کا سلیقہ

دعا کا سلیقہ یہ ہے کہ بندہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرے، کسی بھی کام کے لیے تمام اسبابِ ظاہری ممکن حد تک اختیار کئے جائیں، اس کام کے لئے اپنی بہترین کوششیں صرف کی جائیں، پھر کامیابی کیلئے پورے خلوص سے، اللہ پر بھروسہ کر کے دعا کی جائے کہ بارِالٰہا! جو میرے بس میں تھا، میں نے کر دیا، اس سے آگے تیرا کام ہے۔ میری کوشش قبول فرما، اس پر بہتر نتیجہ مرتب فرما، تو بات بنتی ہے۔ جب دُنیوی اُمور میں یہ رویہ نہیں رکھا جاتا کہ کوئی روٹی کی دعا کرنے پر نہیں رہتا، دعا بھی کرتا ہے کہ کھانا مل جائے اور کھانے کے لئے کوششیں بھی کرتا ہے تو بھوک مٹتی ہے، اسی اصول کو دینی امور کے لئے کیوں لاگو نہیں کرتے؟

بدر کی فتح حضور ﷺ کی دعا کی وجہ سے ہوئی تو اگر صرف دعا ہی کرنا تھی تو نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں، مسجد نبوی ﷺ میں، اپنے حجرہ مبارکہ میں، کہیں پر بھی کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ دعا فرما دیتے تو کفار کو زمین نگل جاتی یا آسمان کھول کر اللہ ان پر مصیبت نازل کر دیتا، ان کا لشکر تباہ ہو جاتا۔ میدانِ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتے نازل ہوئے۔ فرشتوں نے کفار کو قتل کیا اور قید کیا تو وہی فرشتے مدینہ منورہ میں بھی یہی کام کر سکتے تھے۔ لیکن حضور ﷺ نے جنگ کی تیاری کی، سفر فرمایا، تمام اسبابِ ظاہری کو ممکن حد تک جمع فرمایا۔ بہترین جگہ منتخب فرمائی، پانی کے چشمے پر قبضہ فرمایا، لشکر کو ترتیب دیا، عمر، لباس اور قد و قامت کے لحاظ سے لوگ اکٹھے کئے۔ پورے لشکر کو نظم و ضبط میں پرو کر پھر عریشِ بدر میں جلوہ افروز ہوئے۔ وہاں حضور ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ مبارک اٹھائے۔ یہ ہے دعا مانگنے کا سلیقہ۔ بھئی! اگر صرف دعا سے کام ہونا تھا تو ایسے بے مثل لوگوں کو شہید کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ سفر کی صعوبتیں خود آقائے نامدار ﷺ کو برداشت کرنے کی کیا ضرورت

تھی؟ یہی دعا کا طریقہ حضور ﷺ نے بتایا کہ تمام ممکن جائز وسائل اختیار کرو اور پھر دعا کرو کہ بارالٰہا! تو نے کرنا ہے۔ میں نے تو تیرے حکم کی تعمیل میں جو ممکن ہے وہ کر دیا ہے۔

مانگنے کا سلیقہ ضرورتیں بھلا دیتا ہے

آدمی کو رب العالمین سے بات کرنے کا سلیقہ آجائے تو ضرورتیں بھول جاتی ہیں، باتوں میں ہی عمر بسر ہو جاتی ہے۔ میں نے اکثر دعا مانگتے ہوئے یہ دیکھا ہے کہ حاجت بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لئے نہیں چاہتا کہ میں اپنی حاجت سے اتنا واقف نہیں ہوں گا جتنا میرا رب واقف ہوگا۔ آپ ایک بات مجھے بتانا چاہیں اور میں اس معاملے میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں تو آپ مجھے کیا بتائیں گے؟ تو دعا مانگتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ خدایا! میں محتاج ہوں، تو زیادہ جاننے والا ہے تو میری حاجات کو پورا کر۔

مانگنے میں صرف شرفِ ہمکلامی ہے۔ مانگنے سے بڑھ نہیں جاتا، بن مانگے ساری دنیا کو دے رہا ہے۔ ہمارا وجود تھا ہی نہیں تو ہم نے کب مانگا تھا کہ ہمیں وجود عطا کرے۔ بن مانگے دے رہا ہے۔ مانگنے کا لطف نرالا ہے۔ مانگنے سے شرفِ ہمکلامی نصیب ہوتا ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا الدعاء مخ العباده کہ ساری عبادت کا نچوڑ اللہ سے بات کرنا ہے۔ دعا قبول کیسے ہوتی ہے، اس پر ثواب کیا بنتا ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ جن لوگوں میں دعا کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے وہ اس بات سے اوپر چلے جاتے ہیں، انہیں اس سے غرض نہیں رہتی کہ میں نے جو کہا تھا اس کا اثر کیا ہوا۔ انہیں وہ لمحے عزیز ہوتے ہیں جب انہیں بات کرنے کی فرصت نصیب ہو جاتی ہے۔ جب انہیں براہ راست رب العالمین سے بات کرنے کی سعادت نصیب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، انہیں اس سے غرض ہی نہیں ہوتی۔ شکوہ تو تب کریں کہ کسی بات سے انہیں غرض بھی ہو۔ اور اصل بات بھی یہ ہے کہ بندہ ہو کر اللہ سے ہمکلام ہونا بہت بڑا درجہ

ہے، بہت بڑا رتبہ ہے۔

دعا کیا ہے؟ اللہ سے بات کرنا۔ بزرگ جو لمبی لمبی دعائیں کرتے ہیں، اس کے پیچھے یہی لذت ہوتی ہے۔ یاد رکھیں! اللہ رب العزت کے نزدیک ضرورت مند کی اپنی دعا دوسروں کی سفارش سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہوئے شخص کے سامنے سے نہ گزرو انه يناجي ربه یہ اپنے رب سے سرگوشیاں کر رہا ہے۔ تو میاں! اپنے آپ کو رب جلیل کے روبرو لے جاؤ۔ بندہ اللہ کریم سے بار بار دعا کرے، بار بار مانگے، بار بار بات کرے۔ وہ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اس کا بندہ اس سے اپنے چھوٹے چھوٹے دکھ بیان کر رہا ہے۔

دعا کی حیثیت

بنیادی بات صرف اتنی ہے کہ بندہ اپنی حیثیت پہچان لے اور اپنی حیثیت کے مطابق اسے عظمتِ الٰہی کا ادراک ہو جائے۔ یہ زندگی کا ماحصل ہے۔ اگر عقیدہ یہ ہے کہ میں نے ایک کام میں اللہ کی اطاعت کی، اب اللہ پر واجب ہے کہ اس کے بدلے میں میرا کوئی کام کرے۔ یہ ایسا ہے جیسے برابری کی بات ہو۔ لین دین اپنے برابر کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ بندے اور اللہ کے درمیان برابری کا لین دین نہیں ہے۔

بندہ کی دعا کی حیثیت یہ ہے کہ کم از کم اس کا اللہ کریم سے رابطہ ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے بندہ عرض کرتا ہے اور اپنی گزارش پہنچاتا ہے۔ یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اسے دعا کی توفیق ارزاں ہوتی ہے۔ اب وہ اس بات پر رہے کہ میری دعا مانی ہی نہیں گئی تو پھر تو یہ برابر کا سودا ہو گیا۔ حالانکہ بندے کے علوم کی کیفیت یہ ہے کہ خود اسے اپنی بھلائی کا بھی پتہ نہیں۔ بعض اوقات وہ ایسی دعائیں کر رہا ہوتا ہے کہ اگر وہ پوری ہو جائیں تو اس کا اپنا نقصان ہو جائے۔ بندہ جب اللہ سے دعا مانگتا ہے تو رحمتِ الٰہیہ متوجہ ہوتی ہے اور اسے

لبیک یا عبدی کہہ کر نوازا جاتا ہے۔

بھئی کتنے لوگ ہیں کہ جو دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو اللہ کریم فرماتا ہے لبیک یا عبدی۔ میرے بھائیو! کسی کا یہ مقام ہونا کہ وہ ہاتھ اٹھائے اور بارگاہِ الوہیت سے صدا آئے لبیک یا عبدی تو انبیاءؑ کے علاوہ بڑے کم گنتی کے لوگ ہوں گے جنہیں یہ نصیب ہو۔ ہم تو بعض دعائیں ایسی کر رہے ہوتے ہیں کہ دعا کرنا بھی جرم بن جاتا ہے۔ ہماری خواہشات اور آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں جس میں ہزاروں اور لوگوں کے دکھ پنہاں ہوتے ہیں۔

دعا میں خلوص کا اثر

مولانا رومؒ نے حضرت موسیٰؑ اور چرواہے کے قصے کو منظوم کیا ہے، فرماتے ہیں!

دید موسیٰ یک شبانے را براہ کو ہمی گفت اے خدا وے الٰہ

حضرت موسیٰؑ نے ایک چرواہے کو راستے میں دیکھا اور کہہ رہا تھا، اے میرے اللہ!، اے میرے معبود!

تو کجائی تا شوم من چاکرت چارقت دوزم کنم شانہ سرت

تو کہاں ہے؟ تو مجھے مل جاتا، میں تیرا غلام بن کر رہتا، تیری خدمت کرتا، تیرے پھٹے ہوئے کپڑے سیتا اور تیرے بالوں میں کنگھی کرتا

دستکت بوسم بمالم پائیکت وقت خواب آید برو بم جائیکت

تیرے ہاتھوں کو چومتا اور تیرے پاؤں دباتا

نیند کے وقت وہ چرواہا اس طرح کی باتیں کر رہا تھا

زین نمط بیہودہ می گفت آن شباں گفت موسیٰ با کیستت اے فلاں

حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ اس طرح کی بیہودہ باتیں کس سے کر رہے ہو؟

گفت با آں کس کہ مارا آفرید ایں زمین و چرخ ازو آمد پدید

اس نے کہا، جس نے مجھے پیدا کیا، جو زمینوں اور آسمانوں کا مالک ہے۔

گفت موسیٰ ہائے خیرہ سر شدی خود مسلماں ناشدہ کافر شدی

موسیٰؑ نے فرمایا، تو پاگل ہو گیا ہے۔ تو مسلمان تو ہو نہ سکا، کافر ہو گیا ہے۔

جامہ بدرید، آہے کرد و تفت سر نہاد اندر بیاباں و برفت

وہ تو حیرت زدہ ہو گیا، صدمے سے اس نے کپڑے پھاڑ دیئے اور جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا بندۂ ما را ز ما کردی جدا

حضرت موسیٰؑ اللہ کی طرف سے وحی ہوئی کہ میرے بندے کو تو نے مجھ سے جُدا کر دیا۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

آپ ملانے کے لیے آئے ہیں، لوگوں کو جدا کرنے کے لیے نہیں آئے

تمہیں رسالت اس لئے دی گئی تھی کہ بندوں کو میرے ساتھ جوڑو، جو جڑے ہوئے ہیں انہیں تو بھگانے کے لئے نہیں دی تھی۔

اب اللہ کی مرضی، الفاظ سارے کفریہ ہیں، احمقانہ ہیں، لیکن پتہ نہیں اُس کی نیت میں کیا خلوص تھا، اُس کے شعور میں جو بات تھی، وہ کتنی گہری تھی، وہ حقیقتاً اللہ کو راضی کرنا چاہتا تھا۔

تو معاملہ بندے اور مالک کا ہے، میرے آپ جیسے اربوں کھربوں گزر جائیں گے، ہماری حیثیت کیا ہے؟ ہم اپنی حیثیت کو دیکھیں اور اس کی عظمت کو دیکھیں تو پھر بات کریں۔

میری دعا۔۔لذتِ آشنائی

احباب مجھے لکھتے ہیں کہ میرے لئے دعا کریں کہ میں نماز، ذکر اذکار کا پابند ہو جاؤں۔ یاد رکھیں! یہ میری دعا سے نہیں ہوگا، یہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے ہوگا۔ میں بھی دعا کرتا ہوں اور یہ کرتا ہوں کہ اے اللہ! اسے بھی درد آشنا کر دے۔ میں اس کی نمازوں کے لئے دعا نہیں کرتا۔ جب اسے ایک ذرہ، ایک قطرہ، درد کامل جائے تو وہ از خود نمازیں پڑھتا ہے، وہ خود سجدے سے نہیں اٹھتا، اسے خود مزے آنے لگتے ہیں۔ کیا ہم اس درد سے سجدے کرتے ہیں کہ میرا محبوب راضی ہوگا کہ میرا بندہ میری اطاعت کر رہا ہے؟ جب حبیب کبریا ﷺ راضی ہوگا تو اللہ راضی ہوگا۔ اِس ارادے سے کبھی ہم نے ہاتھ باندھے ہیں، کبھی اس ارادے سے ہم نے قیام کیا ہے، کبھی کوئی لقمہ حرام اس لئے چھوڑا ہے کہ یہ کھانے سے کوئی بدمزگی آئے گی اور یہ تو حرام ہے یہ تو مشکوک ہے، یہ کھا کر میں کیسے درود شریف پڑھوں گا؟ جب تک یہ بات نہ بنے، تب تک عبادت کی توفیق ارزاں نہیں ہوتی۔

وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:69)

میرے پاس کتنے ہی خط آتے ہیں کہ ذکر نہیں ہوتا، نماز چھوٹ جاتی ہے، یہ ہوتا ہے، وہ ہوتا ہے۔ اب بھلا اس کا کیا جواب دیں! بات یہ نہیں کہ ذکر نہیں ہوتا، بات یہ ہے کہ وہ کرنے نہیں دیتا، کہیں آپ نے کوئی اینچ پینچ کیا ہوگا، اسے پسند نہیں آیا۔ اس نے کہا، اچھا! تو چھوڑ دے۔ نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا تو آپ نے نماز میں کوئی سودا بازی کی ہو گی۔ اس نے بھی کہا ہوگا تو ایسی نماز رہنے دے۔ تیرے سجدے نہ کرنے سے کون سے عرش کو دراڑ پڑ رہی ہے۔ چونکہ یہ تو اس کا وعدہ ہے کہ جو خالصتاً مجھے چاہتا ہے، جو میرے لئے تڑپتا ہے لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں اس کے لئے ایک نہیں، ہزار راستے کھول دیتا ہوں۔ جب وہ فرماتا ہے کہ جو میرے لئے تڑپتا ہے، جو مجھے چاہتا ہے، جو میرے لئے محنت کرتا ہے، وَ

الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا تو اس کے لئے تو سبلنا اس نے ان رستوں کی تعداد نہیں بتائی جو وہ خلوص سے اپنی طرف آنے والے کے لیے کھول دیتا ہے۔ آپ لاکھوں کہیں تو بھی سما جائے گا، آپ کروڑوں کہیں تو بھی کہا جا سکتا ہے۔ ''اس کے لئے اپنی بارگاہ میں آنے کی بے شمار راہیں کھول دیتا ہوں''۔ تو پھر ہماری راہ میں رکاوٹ کیوں؟ اس فینا میں ہم نے کہیں کوئی گڑبڑ کی ہوگی، کہیں ہم نے سودے بازی کی کوشش کی ہوگی۔ اسے کیا ضرورت ہے ہم سے سودے بازی کرتا پھرے خالق کوئی مخلوق کا محتاج تو نہیں ہے۔ محتاج تو ہم ہیں، ہم اپنی حیثیت بھول گئے۔

بھائی! یہ جو ذکر میں کمی آتی ہے، نمازیں چھوٹتی ہیں یا معاملات میں کوتاہیاں اور غلطیاں ہوتی ہیں۔ گناہ صادر ہونے لگتے ہیں تو اس کے پیچھے طلب میں فتور آتا ہے، طلبِ الٰہی میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ تو جب کبھی ایسا ہو تو اللہ سے رجوع کرو، توبہ کرو اور دعا کرو کہ یا اللہ! میں تو نالائق ہوں، مجھے تیری طلب کی بھی سمجھ نہیں ہے کہ کیا کروں۔ مجھے طلب بھی دے اور طلب کی آرزو بھی دے اور اس کا شعور، ادراک اور احساس بھی دے۔

مجھے کہو گے تو میں کیا کر لوں گا، کسی اور سے کہو گے وہ کیا بگاڑ لے گا، سارے ہی تو ایک جیسے ہیں۔ سب محتاج ہیں اور سب نے وہیں درخواست کرنی ہے۔ اسے سب سے زیادہ بات پسند آتی ہے کہ جب کوئی بندہ اپنا دکھ لے کر خود اس کے حضور جاتا ہے۔ وہ بہت پسند کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر بندہ خود میرے پاس آئے۔ میرے ساتھ بات کرے، اپنی تکلیف مجھے بتائے، پھر میں جانوں اور وہ جانے۔

دعا کو مذاق نہ بنائیں

عرب شریف سے مجھے فون آیا کہ مجھ سے ذکر نہیں ہوتا، آپ دعا کریں کہ مجھ سے ذکر ہونے لگے۔

میں نے کہا کہ ذکر کرنے کا حکم تو خود اللہ نے دیا ہے۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرہ:152) میرا ذکر کرو اور ہر آن کرو۔ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (آل عمران:191) اب یہ کیسا مسئلہ ہے کہ اللہ حکم دے رہا ہے کہ اللہ کا ذکر کرو اور آپ کہتے ہیں کہ آپ سے ذکر نہیں ہو سکتا لہٰذا میں آپ کے لئے دعا کروں۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ سے بڑی کوئی طاقت ہے جس کے سامنے آپ کی دعا رکھی جائے کہ اس کی مدد کرو کہ یہ اللہ کا ذکر کر سکے۔ میرے علم میں تو کوئی ایسی ہستی نہیں ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اللہ سے بڑا کوئی ہے کہ اس سے کہا جائے۔ اس پر وہ صاحب فرمانے لگے "میرا یہ مطلب تو نہیں تھا" میں نے کہا، اس کا مطلب یہی نکلتا ہے۔ آپ سے ذکر نہیں ہو سکتا تو مجھے کیا بتاتے ہو، تم جانو اور تمہارا اللہ جانے۔ حرم میں بیٹھ کر تم سے اللہ کا نام نہیں لیا جا سکتا تو بتاؤ میں اس میں کیا کر سکتا ہوں، میں تو ایک جنگل میں بیٹھا ہوں۔

اس مکالمے کے بعد انہیں کچھ اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے انہیں کہا کہ اللہ سے اپنے لیے خود دعا کرو۔ اور میں نے انہیں سمجھایا کہ کیا آپ باقی سب کام کر لیتے ہیں مثلاً کھانا، سونا، ملازمت کرنا وغیرہ اور اگر یہ سب کام نہیں چھوٹتے تو اللہ کا ذکر کیوں چھوٹتا ہے؟ باقی سارے کام تو آپ خود ہمت کر کے کرتے ہیں اور یادِ الٰہی، ذکرِ الٰہی کیلئے آپ کہتے ہیں کہ یہ اللہ خود کروالے۔ ذرا سوچو! اللہ نے تمہارے مشورے کے بغیر تمہاری شکل وصورت بنائی، رزق تقسیم کیا۔ اگر نماز اس نے اپنی مرضی سے پڑھوانی ہوتی، ذکرِ الٰہی بھی خود ہی کروانا ہوتا تو اسے تمہاری فطرتِ ثانیہ بنا دیتا۔ تم قدرتی طور پر نماز پڑھ لیتے۔ جیسے سانس فطری طور پر چل رہا ہے، ایسے ہی ذکر اور نماز بھی ہو جاتی لیکن حیرت کی بات ہے جو کام اس نے تمہارے ذمہ لگایا ہے، تم وہی کام اس کے ذمہ لگاتے ہو۔ انسان کے خیالات بھی بڑے عجیب ہیں اور شیطان کے وساوس بھی بڑے حیرت انگیز ہیں۔ عجیب

عجیب الجھنوں میں ڈالتا رہتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ اس مسئلہ کی وجہ تلاش کی جائے۔ ہم سے اتباعِ رسالت ﷺ کیوں نہیں ہوتا۔ ہم سے اتباعِ شریعت کیوں نہیں ہوتا؟ اس لئے کہ ہمارا فیصلہ کمزور ہوتا ہے۔ اس میں جان نہیں ہوتی ورنہ سادہ سی بات ہے، اللہ نے قانون بنا دیا ہے کہ جس کا فیصلہ جتنا مضبوط ہوگا، اتنی ہی توفیقِ عمل اسے عطا کر دی جائے گی۔ اللہ سے توفیقِ عمل مانگو، محنت کرو۔

رزق کے معاملے میں تو سب کو پتہ ہے، کوئی بھی ہاتھ چھوڑ کر نہیں بیٹھتا کہ اللہ رازق ہے خود ہی لقمہ بنا کر منہ میں ڈالے گا۔ جیسے کسی کو اولاد چاہیے تو شادی کرتا ہے، اس کے بعد دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! مجھے نیک بیٹا دے۔ اگر شادی نہیں کرتا اور دعا کرتا ہے تو کیا یہ گستاخی نہیں ہوگی، تمسخر نہیں ہوگا، دعا کے ساتھ مذاق نہیں ہوگا؟ اسی طرح عملی زندگی میں جب ہم عمل نہیں کرتے، جب ہم محنت نہیں کرتے، جب ہم جائز وسائل اختیار نہیں کرتے اور کہتے ہیں دعا کرو، تو کیا یہ دعا کے ساتھ تمسخر نہیں ہوگا؟

اطاعتِ الٰہی عادتِ ثانیہ نہیں بنتی

یاد رکھو! اطاعتِ الٰہی عادتِ ثانیہ نہیں بن سکتی۔ ہر نیکی کے لئے ہمت اور محنت کرنا پڑتی ہے۔ پھر ان لوگوں کو میں کیا کہوں جو مجھے خط لکھتے ہیں کہ دعا کریں، مجھ سے نماز نہیں پڑھی جاتی۔ میں انہیں جواباً لکھتا ہوں بھائی! نماز کا حکم اللہ نے دیا ہے، نبی کریم ﷺ نے خود صلوٰۃ ادا فرمائی اور ادائیگی صلوٰۃ کا حکم دیا۔ اس کے بعد میری کیا حیثیت ہے کہ آپ میرے کہنے سے پڑھ لو گے، میں کون ہوتا ہوں۔ اگر آپ نے میری دعا سے نماز پڑھنی ہے تو اللہ یہ آپ کی فطرتِ ثانیہ بنا دیتا۔ آپ کی مجبوری بنا دیتا۔ جس طرح بلا اختیار سانس لیتے ہیں، بلا اختیار دل دھڑکتا ہے اسی طرح وجود بلا اختیار نمازیں بھی پڑھ لیتا۔ لیکن اللہ نے نماز کو ہمارے اختیار پہ چھوڑا ہے۔ ہمیں مکلف بنایا ہے کہ اللہ کے مجبور کرنے سے نہیں، اپنی

مرضی سے پڑھیں۔ یعنی اللہ نے حکم دیا ہے کہ میری عبادت کرو اور ہم اگر جواباً کہیں کہ اللہ تو ہی ہم سے کروالے تو کیا یہ تعمیلِ ارشاد ہوگی؟ پڑھنے کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کا حکم دل میں ہلچل پیدا کردے۔ حکماً پڑھوانی ہوتی تو وہ قادر تھا، ہر کوئی سجدے میں ہی پڑا رہتا۔ تو جب اس نے حکماً نہیں پڑھوائی تو ہمارے کہنے سے کیا ہوگا؟ میاں! یہ تو جب تک تم دل سے طے نہیں کرو گے، تم فیصلہ نہیں کرو گے کہ تمہیں صلوٰۃ ادا کرنی ہے، تب تک یہ ادا نہیں ہوگی۔

بس طے کرلو کہ مجھے یہ کرنا ہے تو پھر یہ ہوتی رہے گی۔ یہ عادتِ ثانیہ نہیں بنتی۔ آج بھی جب کہ الحمدللہ پڑھتے ہوئے پون صدی ہوگئی ہے، آج بھی تکلف کرنا پڑتا ہے۔ یہ عادتِ ثانیہ بن جائے تو نیکی نہیں رہتی۔ یاد رکھیے! نیکی کے لئے کوشش کرنا پڑتی ہے، وقت دینا پڑتا ہے، اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا کرنے کے کام کرو، جھوٹ بولنا چھوڑ دو، اپنے رزق کو حرام سے بچاؤ، سود کھانا چھوڑ دو، سود کھانے والا کبھی کوئی بھلائی نہیں پا سکتا۔

مجھ سے ایک دفعہ ایک شخص نے وضو کے بارے میں مسئلہ پوچھا کہ میری عادت ہے کہ میں وضو کرتا ہوں تو منہ دھونے کے بعد اسے تولیے سے خشک کرتا ہوں اور علماء اس سے منع کرتے ہیں کہ پہلے عضو کو خشک ہونے سے پہلے دوسرا دھوؤ لیکن میں یہ عادت بدل نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ میرے بھائی! تم نے عادتوں پر عمل کرنا ہے یا حضور اکرم ﷺ کے ارشادات پر۔ دینِ اسلام انسانی مزاج اور عادات کا نام نہیں۔ عادتیں بدلنا ہی تو دین ہے۔ اگر تم نہیں بدل سکتے تو تمہارا اسلام کیسا؟ سادہ سی بات ہے تمہیں اپنی عادتیں بدلنا ہوں گی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنا ہوگا۔

فیصلہ ہمیں خود کرنا ہے

ہماری توقعات یہ ہوتی ہیں کہ گناہ کے مواقع اور موانع اٹھ جائیں تو ہم اطاعت

کریں۔ کہا جاتا ہے کوئی تعویذ دے دیں، فجر کی نماز کے لئے اٹھنے کی عادت ہوجائے۔ کوئی تعویذ دے دیں، نیکی کی عادت ہوجائے۔ یاد رکھیں! نیکی اور عبادت تعویذوں سے نہیں ہوتی۔ ایک سودا ہے سیدھا سیدھا جو سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔ اگر تعویذوں سے اور دعاؤں سے عبادت کرانا ہوتی تو ازخود ہی جس کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، اس کے حکم پہ عبادت بھی کرتے۔ جس کے حکم سے بیمار اور معذور ہو جاتے ہیں، اس کے حکم پہ سجدے بھی کرتے۔ اس نے عبادت کو بندے کی پسند پر چھوڑ دیا ہے۔

یہ جو آدمی کہتا ہے کہ نماز کے لئے آنکھ نہیں کھلتی، اس نے گویا یہ فیصلہ لکھ دیا ہے کہ اے اللہ! تو کہتا ہے سونے سے نماز بہتر ہے لیکن میرا فیصلہ یہ ہے کہ میرے لئے نیند بہتر ہے۔ اب اس میں میرا تعویذ کیا کرے گا، فیصلہ تو اس کا ہے! جب تک وہ شخص خود اپنا فیصلہ نہیں بدلے گا اور یہ طے نہیں کرے گا کہ نیند آئے یا ساری رات جاگنا پڑے، میں نماز کو نہیں چھوڑوں گا۔ تب تک اسے توفیقِ نماز ارزاں نہیں کرے گا، چاہے اس کے سر کے ساتھ ایک تعویذ نہیں پورا قرآن باندھ دیں۔ ہاں! جو بندہ فیصلہ کرلیتا ہے، چاہے وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو، اُسے وہ طاقت دے دیتا ہے۔ فرماتا ہے! تم میری طرف ایک قدم بڑھاؤ میں دو قدم بڑھاؤں گا۔ تم چل کر آنا چاہو میں دوڑ کر تمہارا ہاتھ تھاموں گا۔ لیکن آنے کا فیصلہ تمہارا ہونا چاہئے۔ یہ فیصلہ بہرطور تم ہی کرو گے کہ تمہیں کس سمت جانا ہے۔

دعا

آج کی سائنسی تحقیق کے مطابق ہر وجود میں 10 ہزار کھرب سیل ہوتے ہیں اور ہر سیل میں بندے کے وجود میں آنے سے لے کر قبر میں جانے تک کا پورا نظام مرقوم ہوتا ہے۔ ہر سیل میں ایک کتاب ہے جس میں اس وجود کا سارا پروگرام درج ہوتا ہے۔ معمولی معمولی باتوں کی تفصیل تک موجود ہوتی ہے۔ تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک وجود میں

10 ہزار سیل ہیں، ہر لمحے ان میں سے پرانے سیل گر رہے ہیں، نئے بن رہے ہیں، جس قادر مطلق نے ہر سیل میں پروگرام طے کر کے رکھ دیا ہے تو دنیا کا کون سا تعویذ، کون سا جادو یا کوئی ایسی طاقت ہے جو اس پروگرام کو تبدیل کر دے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ پھر دعا کیا کرتی ہے؟ علماء حق نے لکھا ہے کہ دعا بھی ایک تدبیر ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ کسی کے لئے دعا کرتا ہے اور اسے فائدہ ہو جاتا ہے تو اس سیل کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ فلاں شخص اس کے لئے دعا کرے گا تو اس میں یہ تبدیلی آئے گی۔ سب فیصلے اسی کے ہیں۔ دعا اور نقش دنیا کے آسرے ہیں جس سے بندے کی ڈھارس بندھی رہتی ہے، اسے سبب سمجھ کر استعمال کریں۔

بندے میں عموماً یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ اللہ پر اعتبار کرے۔ میرا اس معاملے میں بڑا تجربہ ہے۔ کسی کو کہہ دیں کہ اس معاملے میں دعا کریں گے۔ اللہ بڑا کریم ہے، کرم فرمائے گا تو لوگ ناراض ہو جاتے ہیں کہ میرا کام نہیں کیا۔ اور اگر کسی بندے کی طرف رقعہ لکھ کر دے دیں تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے کہ اب اس کا کام ہو جائے گا۔ اس کا کام ہو نہ ہو، وہ اس بات پر خوش ہو جاتا ہے بلکہ کام نہ ہو تو اللہ کی مرضی پر ڈال دیتا ہے۔ اگر رقعہ نہ دو اور کہو کہ اللہ مشکل حل کر دے گا تو ناراض ہو جاتا ہے کہ انہوں نے انکار کر دیا۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ سے آشنائی نہیں، اللہ پر اعتبار نہیں۔

دعا کروانا اچھی بات ہے۔ دعا بجائے خود عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز ہے، یہ حاصلِ عبادت ہے۔ دعا تو اللہ سے تعلق بنانے کے لئے ہے۔ انسان کی تسلی و تشفی کے لئے ہے کہ اللہ اس کی بات سن رہا ہے۔ جس دعا نے قبول ہو کر اپنا اثر دکھانا ہے، وہ پہلے سے طے شدہ ہے۔ دعا اچھی بات ہے۔ دعا کرنا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ احساسِ ذمہ داری بھی تو ہو۔ عمل نہ کرنا اور دعا کروانا چہ معنی دارد؟

مومن کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی

نبی علیہ الصلوٰۃ السلام نے فرمایا کہ مومن کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی لیکن قبولیت کے انداز اپنے اپنے ہیں۔

۱۔ کبھی تو جو مانگا جاتا ہے، وہی دے دیتا ہے۔

۲۔ کبھی یہ ہوتا ہے، جو مانگا جاتا ہے دیتا وہی ہے لیکن اس میں وقفہ آ جاتا ہے کیونکہ وہ بہتر جانتا ہے کہ کون سی چیز اسے کب دینی ہے؟

۳۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ جو ہم مانگ رہے ہوتے ہیں وہ ہمارے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ جیسے بچہ چاقو مانگ رہا ہے تو اس کی ماں چاقو کے بجائے اسے کوئی اور خوش نما چیز دے دیتی ہے۔ اللہ کریم اس دعا کو رد نہیں کرتے بلکہ اس کے بدلے ہمیں بہتر چیز دے دیتے ہیں پھر فرمایا

۴۔ اگر دنیا میں اسے کچھ نہ ملے تو اللہ اسے اپنے خزانہ خاص میں رکھتے ہیں جس کی فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ وہ دعا میدانِ حشر میں اس کے کام آئے گی۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ دعائیں جن کا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا اور اس کے لئے سرمایۂ آخرت بنا کر جمع کر دی جاتی ہیں۔ تو بڑے بڑے مستجاب الدعوات اس وقت حسرت کریں گے کہ کاش! ہماری کوئی دعا نہ سنی جاتی اور ساری دعائیں آج ہمارے پلڑے میں ہوتیں۔

فرمایا! اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ:186) ہر دعا مانگنے والے کی دعا ہم قبول کرتے ہیں جب بھی وہ دعا کرتا ہے۔ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ تم بھی میری بات مان لو، صرف منوانے پر نہ رہو۔ یہ تو زیب نہیں دیتا کہ مخلوق اللہ سے کہے کہ تو جو فرماتا ہے وہ میں نہیں مانتا، جو میں کہتا ہوں وہ تو مان کیا یہ زیب دیتا ہے، یہ اصول ہے کوئی؟ یہ تو بڑے

شرم کی بات ہے کہ میں حکم دوں اور تم نہ مانو اور تم چاہو کہ میں تمہاری ہر بات مانوں فرمایا وَ لْيُؤْمِنُوا بِيْ مجھے اللہ مانو اور ایسا مانو جیسا میں ہوں لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ تا کہ تم بہتری کا راستہ، بھلائی کا راستہ اختیار کر سکو۔ ضمناً ایک اور بات بتاتا چلوں ! لوگ اکثر پیشہ ور گداگروں کی محض بد دعا سے ڈرتے ہوئے انہیں خیرات دے دیتے ہیں۔ یاد رکھیں ! نااہلوں کی بد دعا کبھی اثر نہیں کیا کرتی۔ ناکارہ لوگوں کی نہ دعا میں اثر ہوتا ہے نہ اُن کی بد دعا میں ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا شخص اپنی غرض سے دعا دیتا ہے اور اپنی غرض سے ہی بد دعا بھی دیتا ہے۔ جبکہ دعا کا اثر للّٰہیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ اپنی اغراض کے باعث نہیں۔

نقش وتعویذ

پیر کا یہ منصب نہیں کہ اس نے تعویذ دیا تو اولاد ہو گئی، اس نے تعویذ دے دیا تو ملازمت مل گئی، ہماری دنیوی مصیبتیں ٹل گئیں۔ یہ سب اللہ کا اپنا کام ہے۔ ہاں! جائز حدود کے اندر دعا کرنا، دوا کرنا، یہ مسنون ہے کہ حیلہ کیا جائے۔ لیکن یہ نہیں کہ جس نے دعا دی، دوا دی، نقش دیا، اس کی پوجا شروع کر دی جائے۔

یہ دم کرنا، نقش وتعویذ لکھنا مجھے پسند نہیں لیکن نقش وتعویذ اس لیے دیتا ہوں کہ اگر میرے پاس سے نہیں ملے گا تو لوگ کسی بدعقیدہ کے پاس چلے جائیں گے، جہاں دولت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ایمان سے بھی۔ میں بہت کم دَم کرتا ہوں لیکن اگر کرتا ہوں تو وہی واضح کلماتِ الٰہی ہیں جو اللہ کریم نے عطا کیے۔ اور یہ عطیۂ ربانی جب میں نے حضرت جیؒ کے سامنے پیش کیا تو حضرتؒ نے فرمایا! یہ اللہ کریم کا نام ہے، تمہیں عطا ہوا ہے، اسے اپنا لو۔ اسی سے تعویذ لکھتا ہوں اور اس میں بھی، میں کلماتِ الٰہی پڑھتا ہوں، لکھتا نہیں۔ الفاظ دل میں دہراتا ہوں اور کاغذ پر لکیر ڈال دیتا ہوں یہ اللہ کی مرضی وہ شفا دے دیتا ہے۔ اچھا علاج ہے، سستا بلکہ مفت علاج ہے۔ لیکن اجتماع کو اس علاج کی نذر نہ کیا

جائے۔ تیس دن بعد اجتماع ہوتا ہے۔ اجتماع کیلئے اپنی نیت کو خالص کریں۔ دنیوی بیماریاں تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایک کیلئے تعویذ لیتے ہو وہ اگر دس اور بیماریاں بھیج دے، پھر کیا کریں گے؟

میں تعویذوں کے خلاف نہیں ہوں لیکن میں اس بات کے خلاف ہوں کہ اللہ کو بھول کر مخلوق پر بھروسہ کر لیا جائے۔ تعویذوں کو بھی اس حد تک رکھیں جس حد تک آپ میڈیکل سائنس سے مدد لیتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں یہ حال ہے کہ ایک طبقے نے تعویذ کو شرک قرار دے دیا ہے، یہ ایک انتہا ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ لوگ علاج کے شرعی، طبی اور فطری طریقے چھوڑ کر نرے کاغذ کے ٹکڑے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ آپ علاج کیلئے تعویذ ضرور لیں لیکن علاج کا جو طریقہ قدرت نے بنا دیا ہے وہ بھی ساتھ کریں۔

مجھ سے تعویذ کافر بھی لے جاتے ہیں، بے دین بھی لے جاتے ہیں، بدکار بھی لے جاتے ہیں، بدمعاش بھی لے جاتے ہیں۔ اللہ کا نام لکھ کر دیتا ہوں، جس کا جی چاہے لے جائے۔ ٹھیک ہوتا ہے تو اللہ اسے ٹھیک کرتا ہے۔ نہ ٹھیک ہو تو ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میں خود بیمار رہتا ہوں، میں دوسروں کو کہاں سے ٹھیک کروں؟ دنیا بھر کی بیماریاں تو میرے ساتھ ہیں، دس دس بارہ بارہ گولیاں صبح وشام کھاتا ہوں، ایک ٹیکہ صبح لگاتا ہوں ایک رات کو لگاتا ہوں، دو ٹیکے روزانہ لگاتا ہوں۔ میں خود بیمار ہوں آپ کو صحت کہاں سے دوں؟ میں خود بندوق اٹھائے پھرتا ہوں اپنی حفاظت کے لئے، آپ کو میں کیا دوں گا؟ میں تو ایک محتاج عاجز بندہ ہوں، مجبور انسان ہوں، مزدور آدمی ہوں، کھیتی باڑی کرتا ہوں، کاروبار کرتا ہوں، دن بھر کے جھمیلے ہوتے ہیں۔ اچھا مزے کی بات ایک اور بھی ہے، میں بھی انسان ہوں میں دیکھتا رہتا ہوں۔ ہر آنے والے کو اپنا دکھ یاد ہوتا ہے، مجھے سر میں درد ہوتا ہے، میرے پیٹ میں درد ہوتا ہے، میرا بیٹا بیمار ہے۔ کبھی کسی کو یہ احساس نہیں

ہوتا کہ یار! تم بھی تو بیمار ہو! اسے اس سے غرض ہی نہیں ہے کوئی مرے یا جیے۔ یہ کبھی کسی نے نہیں پوچھا تو جب بندوں سے اتنی لاتعلقی ہے تو اللہ اللہ تک کب پہنچیں گے؟

میری خواہش، میری آرزو

میں چاہتا ہوں کہ اس کوشش کو رسومات کی نذر نہ ہونے دیا جائے۔ یہ بات بڑی واضح ہے کہ جو شخص عملاً کچھ نہیں کرتا، اس کے لئے کوئی بھی دعا کارگر نہیں ہوتی۔ یہ اجتماع اور اجتماع کی حاضری دعاؤں کے لئے نہیں ہے۔ یہاں دعا کروانے نہیں، دعا کا سلیقہ سیکھنے کے لئے آئیں۔ یہ عملی تربیت کی جگہ ہے، اپنی مقدور بھر محنت کریں۔ دین کو سمجھیں۔ امورِ دنیا پورے پورے انجام دیں اور سارا مجاہدہ کرنے کے بعد دعا بھی کریں کہ اللہ اس پر بہترین نتائج مرتب فرمائے۔

ہم میں سے اکثریت ساری زندگی اپنے لئے دعائیں ہی کرواتے رہتے ہیں کہ مجھ سے سحری میں اٹھا نہیں جاتا، دعا کریں۔ ذکر چھوٹ جاتا ہے، دعا کریں۔ وسوسے آتے ہیں، دعا کریں۔ کمال ہے! خود اپنے آپ کو سنبھالا نہیں جا رہا، سوئچ ڈھیلا ہو جاتا ہے تو روشنی کہاں سے آئے گی؟ جن کے ذمہ تھا کہ وہ روئے زمین پر ایک روشن راستہ ظاہر کریں، وہ خود نیند سے فارغ نہیں۔ اپنے دنیوی مسائل سے فارغ نہیں۔ حلال کھانے کے لیے محنت نہیں، پروا ہی نہیں۔ اس نظریے سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جسے یہ کنکشن ملا، اسے یہ شکایت رہتی ہے کہ آج تار ٹوٹ گئی، آج یہاں سے کمزور پڑ گئی، یہاں سے لنک گئی، یہاں سے جوڑنا پڑا، وہاں سے جوڑ لگانا پڑا۔ ساری زندگی لگا کر اپنے آپ کو ہی سنبھالتے رہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ اگر اللہ نے ہمیں ان کیفیات کا ذرہ نصیب کیا ہے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے کہ دوسروں کو بھی حق کا راستہ دکھایا جائے۔ روشنی ہو، ایک راستہ بنے۔ خود بھی

جادۂ حق پر چلیں، دوسروں کے لئے بھی آسانی پیدا کریں۔ برکاتِ نبوت ﷺ سے حصہ پانے کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسروں کے لئے راہِ حق کو واضح کرنے کا سبب بنا جائے۔ دنیوی ظلمتیں، کفر و شرک، برائی و بدکاری راہِ حق کو الجھا نہ دیں کہ عام مسلمانوں کیلئے کوئی راستہ نہ رہے۔ میری تمنا یہ ہوتی ہے کہ کوئی تو آئے جو صرف اللہ سے بات کرنا چاہتا ہو۔ کوئی تو آئے جسے صرف اللہ چاہیے ہو لیکن کوئی نہیں ملتا۔ کیا عجیب زمانہ آگیا ہے۔ کیا دنیا طالبانِ حق سے خالی ہوگئی ہے کہ یہ ایک دن جو اللہ کے ذکر کے لئے ہوتا ہے، یہ ایک دن بھی اللہ کیلئے نہیں رہا۔ یہ بھی تعویذوں ہی کے لیے وقف ہو رہا ہے۔ ہاں! میں نے عمر لگائی ہے اللہ اللہ سیکھنے کیلئے، جسے اللہ اللہ کی خواہش ہو وہ ضرور آئے۔ شاید آپ نے یہ نشہ چکھا ہی نہیں۔ آپ کو اس میں لطف آیا ہی نہیں، آپ نے ابھی دل کو اس طرف موڑا ہی نہیں، محض رسماً ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ اگر ایک لمحہ بھی لذتِ وصال نصیب ہو جائے تو اس کے سوا پھر کوئی یاد نہیں رہتا۔ اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ حضرت جیؒ نے کیوں منع فرما دیا تھا کہ لوگوں کو روکو، میری قبر پر نہ آیا کریں؟ اگر وہ نہ روکتے تو آج وہاں بھی ان کی پوجا ہو رہی ہوتی۔

حقیقت پسند بنیں

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے دینی پیشوا ہمیں دنیا ہی میں اتنا حقیقت پسند بننے میں مدد دیں جتنی حقیقت قرآن بتاتا ہے۔ لیکن آج ہمارے رہنما ہمیں اس کام کے لئے وظیفے بتاتے ہیں۔ ٹی وی پر ایک مولانا دو نفل پڑھنے کا طریقہ بتا رہے تھے کہ اس خاص ترتیب سے سورتیں پڑھیں تو حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ حرام کھاتا ہو، چوری کرتا ہو، بے دین ہو، بدکاری کرے، اطاعتِ پیغمبر ﷺ سے محروم ہو تو صرف دو نفلوں سے اسے زیارت نصیب ہو جائے۔ اِن مولانا سے کوئی پوچھے کہ لوگوں کو حقیقت پسند کیوں نہیں بناتے، جیسا قرآن بتاتا ہے ویسا کیوں نہیں بناتے؟

نوافل کی باری تو تب آتی ہے جب فرائض پورے ہو جائیں۔ سب سے مقدم فرائض ہیں۔ سنت کی باری فرائض کے بعد ہے، نوافل کی باری سنت کے بعد ہے۔ اور فرائض صرف نماز میں ہی نہیں ہیں، زندگی کے سارے فرائض اتنے ہی اہم ہیں جتنے نماز کے فرائض۔ بندے کے فرائض میں رزقِ حلال کمانا، جائز ناجائز میں فرق کرنا، اطاعت اور عدم اطاعت میں فرق کر کے اطاعت پر قائم رہنا سب شامل ہے۔

وظائف بھی دنیا کے حصول کیلئے

آج ہماری بدبختی یہ ہے کہ لوگ دین بھی دنیا کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اگر وظیفہ بھی پڑھیں گے تو آخرت کیلئے، نجات کیلئے، اللہ کی رضا کیلئے نہیں۔ بلکہ عموماً وظائف پوچھنے کا مقصد بھی یہ ہوگا کہ دولت زیادہ آئے، میرے بچے بھرتی ہو جائیں، دنیا کا فلاں کام ہو جائے۔ ایسا وظیفہ کسی کو بھی نہیں چاہیے کہ اس کا بھی پیسہ پائی اللہ کی راہ میں خرچ ہو جائے یا جس کے پڑھنے سے جان اللہ کی راہ میں خرچ ہو جائے۔ بیٹا شہید ہو جائے اور وہ بھی روزِ محشر شہداء کے والدین میں کھڑا کیا جائے یا بیٹا دینی عالم بن جائے۔ نہیں! سوال یہ ہوتا ہے کہ ایسا وظیفہ بتاؤ، میرا بچہ افسر بن جائے۔ یعنی قرآن کی وہ صورت بتاؤ جسے پڑھنے سے زیادہ پیسے آتے ہیں، کیا یہ مسلمانی ہے؟

وسائلِ رزق

رزق کا مفہوم

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرہ:3) اور جو رزق ہم انہیں دیتے ہیں، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ رزق لے کر قارون نہیں بن جاتے۔ رزق لے کر اس پر اتراتے نہیں۔ اب صحت بھی اللہ کا دیا ہوا رزق ہے۔ بصارت اللہ کا دیا ہوا رزق ہے۔ فہم و شعور اللہ کا دیا ہوا رزق ہے۔ دولت اللہ کا دیا ہوا رزق ہے۔ علم اللہ کا دیا ہوا رزق ہے۔ حکومت و اقتدار اللہ کا دیا ہوا رزق ہے اور ہر رزق کا انفاق اپنا ہے۔ دولت ہے تو اس کا انفاق یہ ہے کہ جائز پر خرچ کرے۔ اقتدار ہے تو انصاف کرے ظلم نہ کرے۔ عقل و شعور ہے تو دوسروں کی رہنمائی کرے۔ علم ہے تو دوسروں کی بھلائی چاہے، دوسروں تک علم پہنچائے۔ یعنی جو رزق ہم ان کو دیتے ہیں، وہ ہماری پسند کی جگہ پر خرچ کرتے ہیں۔

حصولِ رزق کے معروف ذرائع

حصولِ رزق کے معروف ذرائع چار ہیں۔ کھیتی باڑی، تجارت، ملازمت اور مزدوری۔ ان معروف ذرائع سے رزق حاصل کیا جائے تو وہ حلال ہے۔ غیر معروف ذرائع سے جو رزق حاصل ہوتا ہے وہ حلال نہیں ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں جیسے کوئی عملیات پڑھتا ہے کہ اسے پیسے ملتے رہیں۔ یہ معروف ذریعہ نہیں ہے۔ اسی طرح معروف ذرائع میں بھی حدود و قیود ہیں۔ جس کام کی اجرت لینی ہو، پوری دیانتداری اور پورا وقت لگا کر وہ کام کرو۔ اب حلال کے اوپر ایک قید ہے کہ رزقِ حلال اور پھر طیب بھی ہو۔ اس کے بنانے پکانے میں پاکیزگی کا خیال رکھا جائے۔

رزق وہی ملتا ہے جو مقدر ہے

یہ جو مزدوری ہم کرتے ہیں، کاشتکاری کرتے ہیں، دوکانداری کرتے ہیں، ملازمت کرتے ہیں۔ یہ محض عبادت اور اطاعتِ الٰہی ہے۔ اس میں رزق نہیں ہے۔ رزق وہی ملتا ہے جو اس نے مقدر کر دیا لیکن عالمِ اسباب میں پیدا فرما کر استعداد، قوت، عقل و شعور دے کر رزق کو حلال کرنے کیلئے سعی کرنے کا حکم دیا، کوشش کرنے کا حکم دیا۔ جس طرح نماز، روزہ فرض ہے، اسی طرح طلبِ رزقِ حلال فرضِ عین ہے۔ اس کے بعد رزق کتنا ملتا ہے، یہ اُس کی مرضی۔

ایک آدمی کو گاڑی چلانا نہیں آتی اور اُس کے پاس دس گاڑیاں ہیں۔ پچاس بندے اُس کی گاڑیاں چلانے اور صاف کرنے کیلئے ہیں۔ ایک ساری گاڑی کھول کر پھر اسے جوڑ کر بنا دیتا ہے، وہ بیچارہ چار، پانے، چابیاں لے کر سڑک پر بیٹھا ہے۔ اگر رزق دینا عقل پر منحصر ہوتا تو جو گاڑیاں بنانا جانتا ہے، وہ اس کے اپنے پاس بھی ہوتیں۔ جسے چلانا ہی نہیں آتی اس کے پاس کیوں ہوتیں؟ اگر روزی عقل سے وابستہ کر دی جاتی تو بے وقوف تو بھوکے مر گئے ہوتے۔ یہ اس کی اپنی تقسیم ہے، انسان خواہ مخواہ فخر کرتا رہتا ہے۔

یاد رکھیں! ہیرا پھیری سے، چور بازاری سے اور ناجائز خوشامد سے رزق میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اس ہیرا پھیری سے رزق ملتا ہے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ مجھے ہیرا پھیری سے زیادہ ملا۔ اگر وہ جائز وسائل اختیار کرتا تو بھی اتنا ہی رزق اسے مل جاتا کہ یہ اس کا حصہ اور مقدر تھا۔ یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ میں نے رشوت لی تو اتنے پیسے جمع ہو گئے ہیں۔ چوری کی تو جمع ہو گئے۔ بلیک مارکیٹنگ کی تو اتنے جمع ہو گئے۔ اگر وہ یہ بد دیانتی نہ بھی کرتا تو بھی اسے رزق اتنا ہی ملتا۔ کیونکہ رزق دینا اس کا اپنا کام ہے اور جو ذرہ جہاں پہنچانے کا اہتمام اس نے کیا ہے وہ وہیں پہنچتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فلسفہ کسی کو ایمان کے ساتھ

نصیب ہو جائے تو دنیا سے بدکاری، خوشامد اور بد دیانتی کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

مال و اولاد کی محبت

دنیا میں کہیں اولاد کی محبت راہِ راست سے ہٹا دیتی ہے اور کہیں مال کی ہوس راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔ پھر اگر کسی نے دینی حدود پر عمل کرتے ہوئے رزقِ حلال کمایا، رزقِ حلال کھایا، اولاد کی اچھی پرورش کی، اسے اچھے عقائد اور نظریات دیئے، اچھے اعمال کی تلقین کی تو یہ بجائے خود ایک ایسی نیکی ہے جو باقی رہ جاتی ہے اور اولاد کی نیکیاں بھی اس آدمی کو بعد میں پہنچتی رہتی ہیں، یہ ایسا کارِ خیر ہے۔ لیکن اولاد کو مقصدِ حیات بنا لینا اور ہر جائز و ناجائز ذریعے اور شریعت کے خلاف عمل کر کے انہیں امیر بنانا، یہ درست نہیں۔

میں مجموعہ احادیث دیکھ رہا تھا کہ ایک حدیثِ مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جلوہ افروز تھے۔ ایک شخص آیا۔ پریشان حال، بال بکھرے ہوئے، لباس فرسودہ اور میلا بھی تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا! کیا تمہارے پاس مال نہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہر قسم کا مال ہے یا رسول اللہ ﷺ! میں بڑا آسودہ حال ہوں۔ تو فرمایا! اللہ کو فرسودہ حال ہونا پسند نہیں بلکہ حکم ہے کہ اس نے بندے کو جتنی حیثیت دی ہے، اس کے مطابق نظر آئے۔ اگر تمہارے پاس مال ہے تو تم نے یہ حلیہ کیوں بنا رکھا ہے؟

عہدِ فاروقی میں جب حضور اکرم ﷺ کی پیشگوئی کے مطابق یمن اور قیصر و کسریٰ کے خزانے مالِ غنیمت میں آئے تو اسی مدینہ منورہ کی گلیوں میں سونے اور ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگ گئے اور اکابر صحابہؓ کے وظائف لاکھوں میں تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ انتہائی مالدار آدمی تھے۔ تو محنت کی کمائی سے مالدار ہونا بُرا نہیں ہے۔ لیکن مال جمع کرنے کو مقصد بنا لینا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال جمع کرتے چلے جانا غلط ہے۔

کیا مالدار ہونا خوش نصیبی کی علامت ہے؟

ہماری عمومی سوچ یہ ہو چکی ہے کہ کسی نیک آدمی کو ہم خوش نصیب نہیں کہتے بلکہ جس کے پاس دنیا کی دولت دیکھتے ہیں، اولاد دیکھتے ہیں، خوشحالی دیکھتے ہیں، اسے اللہ کا بڑا مقرب جانتے ہیں۔ اسے خوش نصیب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس پر اللہ کا احسان ہے خواہ وہ کفر ہی کر رہا ہو۔ وہ لوگ بدنصیب ہیں جو دنیوی زندگی میں اس قدر اُلجھ جاتے ہیں کہ خالقِ کائنات کو بھول جاتے ہیں۔ جب انہیں دنیوی مال نصیب ہو جاتا ہے، اولاد نصیب ہو جاتی ہے تو وہ اس پر پھولے نہیں سماتے۔ دنیا میں مالدار ہونا، صاحبِ اولاد ہونا، بہت بڑا خاندان ہونا، بڑی قوت و طاقت کا مالک ہونا، صاحبِ اقتدار ہونا، ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو کل قبر میں، یومِ حشر میں اللہ کی گرفت سے بچا سکے۔

دنیا کی چیزوں میں اثبات نہیں

دنیا میں تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو یقینی طور پر آرام پہنچا سکے۔ دنیا کی جن نعمتوں کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ حاصل ہو کر مصیبت بن جائیں۔ دولت حاصل کر لیں تو ڈاکو لوٹ لیں۔ مکان بنا لیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ گر جائے، اسے آگ لگ جائے۔ یعنی کوئی بھی چیز دنیا کی ایسی نہیں ہے جس کا نفع یقینی ہو۔ اس میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ آدمی یہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ کاش یہ میرے پاس نہ ہوتی۔ پھر میں ان مصیبتوں میں نہ پڑتا۔ لیکن جنت کی نعمتیں دائمی ہیں اور ان میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ان میں اضافہ تو ہوسکتا ہے لیکن کمی کا اندیشہ نہیں ہے۔

سکون دل میں ہوتا ہے، دولت میں نہیں

اب یہ ضروری نہیں کہ ڈھیروں دولت ہو تو سکون ہے۔ سکون قربِ الٰہی میں ہے۔ وہ مفلسی میں مل جائے تو وہیں لذت آجاتی ہے اور دولت میں مل جائے تو وہیں لذت

آجاتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فاقہ مستی میں لذت آگئی۔ حضرت عثمانِ غنیؓ کو کروڑوں کی دولت میں وہی لذت نصیب ہوگئی۔ اپنا اپنا نصیب ہے۔ یہ اللہ کی آزمائش ہے، کسی کو کیا دیتا ہے۔ لیکن یہ جو لذتِ آشنائی ہے یہ سرد و گرمِ زمانہ سے اوپر چلی جاتی ہے۔ امارت و مفلسی کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

عجیب بات ہے ہم سمجھتے ہیں کہ پر تکلف بستر ہو، اس پر لذت سے نیند آئے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اچھا مکان ہو تو بڑے مزے کی بات ہے۔ لیکن بڑے اچھے اچھے مکانوں میں، بڑے بڑے پر تکلف بستروں پر لوگ نیند کی گولیاں کھا کر سوتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو پتھروں پر سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔ اب لذت تو اس کے پاس ہے جس نے پتھر پہ بھی سر رکھا تو مزے سے سو گیا اُس کے پاس تو نہیں جسے کمخواب کے گدّوں پر بھی نیند نہیں آتی۔ لذت رضائے حق میں ہے، قربِ رسالت ﷺ میں ہے۔ لذت دنیوی حالات میں نہیں ہے، لذت کیفیاتِ قرب میں ہے پھر دنیوی طور پر جو حال بھی ہو، وہی لذت آفرین بن جاتا ہے۔ مر کر بھی لذت آتی ہے، زندہ رہ کر بھی لذت آتی ہے۔

دولتِ دنیا کی کوئی اہمیت نہیں

انسان کا رزق مقدر ہے کسی کو زیادہ کسی کو کم اور یہ اس کی آزمائش ہے۔ کسی کو اس طرح آزماتا ہے کہ اسے بے شمار دولت، بے شمار نعمتیں اور بے شمار عہدے دے دیتا ہے۔ کسی کی آزمائش اس طرح سے ہے کہ اس پر رزق کی تنگی بھیج دیتا ہے، صحت کم کر دیتا ہے، کاروبار میں کمی آجاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا وہ بندہ ان سب باتوں سے بالاتر ہو کر اللہ کی طرف بڑھتا ہے یا ان میں کھو کر اللہ کو بھول جاتا ہے۔

کسی نبیؑ نے یہ نہیں کہا کہ نمازی کو رزق زیادہ ملے گا اور بے نمازی بھوکا مر جائے گا۔ کسی رسولؑ نے یہ نہیں کہا کہ مومن کو حکومت مل جائے گی اور کافر دنیا سے راندہ جائے گا۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو یہ فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک دنیا اور دنیا کی دولت کی قیمت اگر ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافر ایک گھونٹ پانی کو بھی ترستا رہتا اور اسے کچھ بھی نہ ملتا۔ لہٰذا اگر کافر پر بھی عام کر دی تو اس کا مطلب ہے اللہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قیصر و کسریٰ کے تو فرش پر بھی وہ قالین ہوں جس پر ٹخنوں تک پاؤں دھنس جائیں اور محمد رسول اللہ ﷺ خالی بان کی چارپائی پر سوئیں اور جب آپ ﷺ آرام فرما کر اٹھیں تو بان کے نشان جسمِ اطہر ﷺ میں پیوست ہوں۔ دولتِ دنیا اگر اتنی محبوب ہوتی یا اس کی کوئی قدر ہوتی تو درِ مصطفیٰ ﷺ پر ملتی، قیصر کے گھر میں کیا لینے گئی تھی؟ یعنی انبیاءؑ نے اپنے بندوں کو ضرورتوں کا اسیر نہیں کیا بلکہ بندوں کی اس خصوصیت کو جو اللہ نے انہیں دے رکھی تھی اسے روشن کیا، صاف کیا، چمکایا، پاک کیا۔ یوں اس مشتِ غبار کو وہ جرأتِ رندانہ دے دی کہ اب یہ دیدارِ الٰہی کا طالب ہوا۔ جو دو لقموں پہ بک جاتا تھا، جو چند سکوں کے عوض آبرو بیچ بیٹھتا تھا، اُسے وہ جرات رندانہ دے دی کہ وہ ساری کائنات کو ٹھوکر مار کر اللہ سے اس کے دیدار کا طالب بن گیا۔

ہوسِ زر

ہمارے اس دور میں اور خصوصاً ہماری قوم میں یہ مصیبت پیدا ہو گئی ہے کہ لوگ صرف دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے اسباب کے جائز و ناجائز کی طرف توجہ دینا نہیں چاہتے۔ ایک دوڑ لگی ہوئی ہے جس میں ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس بے پناہ دولت ہو اور فوراً ہو، راتوں رات امیر بن جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ پہلے سے ارب پتی ہیں، وہ بھی ناجائز وسائل اور ناجائز ذرائع کی طرف لپک رہے ہیں۔ ہیروئن اور

چرس کی سمگلنگ میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

وسائل کے مطابق خرچ

ہر محنت کرنے والے کو اللہ کے نظام کے تحت رزق عطا ہو جاتا ہے۔ لیکن عام آدمی کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے وہ معیارِ زندگی پسند کر لیا ہے جو اس کے وسائل سے باہر ہے۔ وہ طے کر لیتا ہے کہ اسے خاص معیار کا لباس، کھانا اور رہائش چاہیے۔ جب اس کی آمدنی اجازت نہیں دیتی تو پھر وہ رشوت، چوری، چھینا جھپٹی پر اتر آتا ہے۔ حالانکہ آسان یہ ہے کہ جو جتنا کماتا ہے، اس کے اخراجات بھی اسی آمدن کے اندر ہوں۔ یہ مسئلہ نیک لوگوں کے ساتھ بھی ہے۔ اللہ کریم پر بھروسہ کر کے درست اسباب و ذرائع اختیار کر کے، محنت کرنے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ کے ہوئے دیئے رزق پر شاکر رہے۔

ایک مغالطہ

اس بات سے مسلمانوں کو ایک مغالطہ لگ گیا ہے اور ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کا مال کمانا اور اچھے معیارِ زندگی سے رہنا شاید دنیاداری ہے اور دنیا میں آرام سے رہنا شاید بری بات ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ بہتر اور جائز وسائل اپنانا، زیادہ سے زیادہ رزق کمانا اور بیوی بچے پالنا یہ سب دنیاداری نہیں ہے بلکہ جو چیز اللہ سے غافل کر دے وہ دنیا ہے۔ یعنی اس عالم میں رہتے بستے ہوئے اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت چھوڑ کر اپنی پسند سے جائز و ناجائز، حلال و حرام، ہر طرح سے حصولِ زر اور عیاشی و نفس پرستی کیلئے کوشاں رہے تو یہ دنیا ہے۔ لیکن اللہ کریم کی اطاعت کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق اُمورِ دنیا انجام دینا عبادت ہے۔ دنیا بنا کر اللہ کریم نے دنیا استعمال کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ اللہ کریم نے یہ فرمایا خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ:129) روئے

زمین پر جو کچھ پیدا کیا ہے، سب تمہارے لئے، تمہاری خدمت کیلئے پیدا کیا ہے۔ دنیا سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان اچھا گھر نہ بنائے، اچھا لباس نہ پہنے، اچھا کھانا نہ کھائے۔ شادی کرنا، بچے پالنا، اچھا گھر اور اچھا لباس پہننا یہ دنیا نہیں ہے۔ دنیا یہ ہے کہ ان لذات میں کھو کر انسان اللہ کو بھول جائے۔ اگر انسان عبادت کے وقت عبادت کرتا ہے، محنت سے حلال روزی کماتا ہے، اللہ نے جو وسعت دی ہے، اتنی حیثیت سے رہتا بستا ہے تو یہ سب دین ہے۔ اس پر اسے ثواب ملتا ہے، اجر ملتا ہے لیکن اللہ کریم کو بھول کر، نفس کے پیچھے لگ جانا، لوٹ کھسوٹ، افراتفری، فساد پیدا کرنا، دوسروں کے حقوق چھیننا یہ دنیا ہے۔ جو اس میں لگ جاتا ہے وہ اللہ کی عظمت کو بھول جاتا ہے، اسے آخرت میں کچھ نہیں ملتا۔

جو شخص آخرت کو مدنظر رکھ کر دنیا کے اُمور انجام دیتا ہے، اس کا مقصد دنیا داری نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ محنت مزدوری، ملازمت، تجارت، کاشتکاری ہر ایک کام میں اللہ کی اطاعت کو مقدم رکھتا ہے تو دنیوی معاوضہ اور دنیوی دولت اسے بھی ملتی ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے آخرت کا اجر بھی ملتا ہے۔

جو شخص انہی امور کو انجام دیتے ہوئے اپنی خواہشِ نفس کو مقدم کر لیتا ہے اور شیطان کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اللہ اسے بھوکا نہیں رکھتا، اولاد بھی دے دیتا ہے، حکومت و سلطنت بھی دے دیتا ہے۔ لیکن جتنا کچھ دیتا ہے، اتنا حساب بھی لے گا کہ میری عطا دیکھو اور اپنی اطاعت دیکھو۔ میں نے کیا دیا اور تم نے کیا کیا۔ آؤ حساب کریں۔

اگر پیسہ کمانا منع ہوتا تو پیسے پہ زکوٰۃ کیوں فرض ہوتی؟ کوئی پیسہ کمائے گا، اس کے پاس مال جمع ہوگا۔ زکوٰۃ، اس مال پر جو آپ کی ضرورت سے زیادہ ہے اور اسے آپ کی تحویل میں ایک سال گزر جاتا ہے، فرض ہوتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مال رکھنا، مالدار ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔ بلکہ اسلام نے مال کمانے کے یا خواہشات کی تکمیل کے

یا ضرورتوں کی تکمیل کے طریقے اور سلیقے خوبصورت انداز میں مقرر کر دیئے ہیں۔

اعتدال

ہماری مصیبت یہ ہے کہ جو شخص بہتر وسائلِ زندگی کے حصول میں لگ جاتا ہے پھر وہ جائز و ناجائز، حلال و حرام کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے برعکس جو کوئی جائز و ناجائز، حلال و حرام کا احساس کرنے لگ جائے، وہ کام ہی چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں باتیں درست نہیں۔ اسلام اعتدال کی راہ ہے۔ بندہ اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے محنت کرے اور دوسرے کے حقوق چھیننے سے پرہیز کرے۔

دولتمند کون؟

دولت مند وہی ہے جسے دردِ محبت، دردِ دل، دردِ عشق نصیب ہو گیا۔ یاد رکھو! وہی خوش نصیب ہیں۔ کوئی ارب پتی ہے تو اربوں چھوڑ کر مر جائے گا۔ کوئی حاکم ہے تو حکومت چھوڑ کر مر جائے گا۔ کوئی دولت مند ہے تو دولت چھوڑ کر مر جائے گا۔ کوئی جاگیردار ہے تو جاگیر چھوڑ کر مر جائے گا۔ لیکن جس کے دل میں ایک ذرہ بھی برکاتِ محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے وہ اپنی عزت، اپنا مقام اور اپنا ذرہ ساتھ لے کر جائے گا، گم کر کے نہیں جائے گا۔

دولتِ دنیا اور دولتِ آخرت

حضرت جیؒ نبی پاک ﷺ کی حدیثِ مبارکہ کا اکثر حوالہ دیا کرتے تھے کہ انسان کو دو میں سے ایک طرف نقصان اٹھانا پڑتا ہے، دنیا میں یا آخرت میں۔ آخرت کی پاسداری کرے تو اکثر اوقات دنیوی نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ اگر دنیا سمیٹنے میں لگ جائے تو پھر آخرت کے نقصانات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ دونوں طرف فائدہ ہو، دونوں طرف ایک سے تعلقات رہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ دین کا تقاضا الگ ہے، آخرت کا تقاضا الگ ہے۔ یا دنیا آخرت کے تابع ہوگی، نفع ہو یا نقصان، یا پھر آخرت بھول جاؤ گے۔ اگر

دنیا کے منافع کے پیچھے پڑ جاؤ گے تو کیا خبر وہ ملے یا نہ ملے، اس کا ملنا یقینی نہیں ہے۔ جو آخرت کو طلب کرتا ہے اسے آخرت کا ملنا یقینی ہے۔ جو دنیا کو طلب کرتا ہے اس سے آخرت چھوٹ جاتی ہے۔

دنیا تو ایک آزمائش ہے۔ دنیا کی زندگی میں کوئی شخص کسی وقت بھی بے فکر ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کوئی نہ کوئی مصیبت، کوئی نہ کوئی دکھ، کوئی نہ کوئی بیماری، کوئی نہ کوئی تکلیف موجود رہتی ہے۔ یہ خاصہ ہے دنیوی زندگی کا۔ سوائے ان لوگوں کے کہ جنہیں اللہ کی یاد میں فنا نصیب ہو جائے۔ وہ دنیوی لذات سے بالاتر ہو جائیں۔ دنیا کی زندگی بھی عملی طور پر گزاریں لیکن ان کا دل اس میں نہ اٹکا ہوا ہو، دل آخرت میں اٹکا ہوا ہو اور دنیا کو ایک فرض سمجھ کر اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہوں اور جب موت آئے تو اس کیلئے تیار ہوں۔

زمین، جائیداد، مکان، پیسہ، گاڑیاں ہماری تو نہیں ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ ہمیں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ جب چھوڑ کر جانا ہوا تو حکم ہوگا، اچھا بھئی! اب تم چھوڑ دو، اب فلاں استعمال کرے گا تو بات ختم ہوگئی۔ یہ فرق ہے مومن اور کافر میں۔

بندۂ مومن اور دنیا

انبیاؑ نے دنیا کے سارے اُمور انجام دیئے۔ جہاد بھی کئے، شادیاں بھی کیں، اولادیں بھی ہوئیں، جرنیل بھی ہوئے، فاتح بھی ہوئے، حکمران بھی بنے لیکن یہ ساری باتیں ثانوی ہوتی ہیں۔ پہلی بات رب العالمین کے ساتھ تعلق کی ہوتی ہے اور یہی چیز اہل اللہ کو اور اللہ کے بندوں کو نصیب ہوتی ہے۔

پانی کشتی میں نہیں آنا چاہئے

یاد رکھیں! کشتی پانی میں ہی چلتی ہے، ریت پر نہیں چلا کرتی۔ زندگی دنیا میں ہی

گزارنی ہے دنیا سے ہٹ کر نہیں۔ لیکن پانی کشتی میں نہیں آنا چاہئے ورنہ ڈوب جائے گی۔ دنیا میں رہو جس طرح کشتی پانی میں رہتی ہے۔ جب پانی کشتی میں آ گیا، جب دنیا دل میں آ گئی تو غرق کر دے گی۔ کشتی کو چلنا تو پانی میں ہی ہے، ریت پہ تو نہیں چلتی۔ لیکن پانی کو کشتی میں نہیں آنے دینا۔ دنیا میں رہو، کام کاج کرو، کھاؤ پیو، لباس اچھا پہنو، حلال کماؤ، حلال اور جائز طریقے سے مال جمع کرو اور پھر اس پر زکوٰۃ دو۔ مال جمع کرنا منع ہوتا تو پھر اس پر زکوٰۃ کیوں فرض ہوتی؟ لیکن حلال جمع کرو، حلال کھاؤ پیو، حلال بھی ہو طیب بھی ہو۔ یہ جو ہم سمجھ رہے ہیں کہ گزر رہی ہے، یہ گزارنے کیلئے نہیں ہے، یہ زندگی اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے کیلئے ہے، اس کو بگاڑو نہیں۔ یہ تو نبیوںؑ کا مقام ہے کہ جس طرح دنیا میں آئے، اس سے زیادہ پاک دامن لے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ میری، آپ کی، ہاشما کے بس کی بات نہیں ہے لیکن ویسے پاک دامن نہیں رہ سکتے تو کیا دامن کو کیچڑ سے لتھیڑنا ضروری ہے؟

جس طرح مرغابی پانی میں ہوتی ہے لیکن اس کے پَروں میں پانی نہیں جاتا۔ سارا دن پانی میں رہے، باہر نکلے تو اس کا وجود خشک ہوتا ہے۔ کشتی پانی میں ہوتی ہے لیکن کشتی میں پانی نہیں ہوتا۔ اگر کشتی میں پانی ہو تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا میں اللہ کے بندے رہتے ہیں لیکن دنیا ان کے اندر نہیں گھستی دنیا ہی مقصود بن جائے، دنیا ہی زندگی کا حاصل ہو جائے تو پھر تو بندہ بازی ہار گیا۔

حضرت عبید اللہ احرارؒ کے پاس بہت زمینیں تھیں، ان کی زمینوں میں سو ہل جوتے جاتے تھے۔ سو ہل ہوئے تو دو سو بیل بھی ہوں گے پھر اور مویشی بھی ساتھ ہوں گے۔ سو ملازم تو صرف ہل چلانے والے ہوں گے، باقی مویشیوں کی ذمہ داری، کاشت برداشت کی دیکھ بھال کرنا، تو یوں ایک بہت بڑا سلسلہ تھا۔ آپ کی رہائش بھی آپ کی

حیثیت کے مطابق تھی۔ اچھا لباس، اچھی خوراک، اچھا رہنا، اچھی بود و باش بلکہ جو کہا گیا

چوں فقر اندر عبائے شاہی آمد　　ز تدبیر عبید اللہ آمد

کہ فقر جب شاہی لباس میں آیا تو وہ حضرت عبید اللہ احرارؒ تھے جن کی وجہ سے آیا۔

سیدنا عبد القادر جیلانیؒ بحری جہازوں سے امپورٹ ایکسپورٹ (Import Export) کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ ایک دن خبر آئی کہ ہمارا جو بحری جہاز آرہا تھا وہ سامان سمیت غرق ہو گیا تو آپ نے فرمایا الحمد للہ۔ پھر بعد میں خبر آئی کہ جی نہیں، وہ غرق ہونے والا کوئی اور جہاز تھا۔ آپ نے تھوڑا سا تامل فرمایا اور کہا الحمد للہ۔ بعد میں کسی کے وجہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ جب مجھے خبر ملی کہ مال سے لدا ہوا جہاز غرق ہو گیا، میں نے اپنے قلب پر غور کیا تو میرے قلب پر اس خبر سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرا دل اس میں اتنا الجھا ہوا نہیں کہ پریشان ہو۔ اور جب اطلاع آئی کہ نہیں وہ کوئی اور جہاز تھا، ہمارا جہاز بچ گیا تو میں نے پھر اپنے قلب میں غور کیا کہ اسے کہیں زیادہ خوشی تو نہیں ہو رہی؟ میرے قلب کا تو وہی پہلے کا سا حال تھا۔ تو میں نے اس پہ الحمد للہ کہا۔

امیری میں فقیری

اسلام یہ ہے کہ بندے کا تعلق جب اللہ رب العالمین سے بطفیلِ محمد رسول اللہ ﷺ قائم ہو جاتا ہے تو پھر انتہائی تنگ دستی اور افلاس بھی اس کے اس رشتے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ تکلیفیں سہتا ہے لیکن اپنا تعلق اللہ سے قائم رکھتا ہے۔ غیر اللہ کے دروازے پہ نہیں جھکتا۔ جب فراخی آتی ہے، دولت آتی ہے، سہولت آتی ہے تو مال و زر دنیا، حکومت و سلطنت، اقتدار و اختیار اسے اللہ رب العزت سے دور نہیں کر دیتا۔

جب مال و دولت کا ڈھیر مدینہ منورہ آیا تو حضرت عمرؓ رویا کرتے تھے۔ فرماتے

تھے کہ افلاس اور تنگ دستی میں اللہ کی اطاعت کرنا تو آسان ہے لیکن اس مال و دولت کے ساتھ اللہ کی غلامی کرنا مشکل ہے۔ ہمارے نفس کہیں متکبر نہ ہو جائیں۔

صاحبِ مال و زر ہونا، حلال ذرائع سے رزق کمانا اور نیکی پہ اسے خرچ کرنا اور صاحبِ اقتدار ہو کر اللہ کی اطاعت کرنا، یہ مفلس کی اطاعت سے کروڑوں گنا اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ ایک آدمی کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں، وہ کسی کا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتا تو اچھی بات ہے کوئی گناہ نہیں کرے گا۔ لیکن جب وہ بگاڑ ہی کچھ نہیں سکتا تو اس کی نیکی کا درجہ کیا ہے؟ ایک آدمی دس آدمیوں کو قتل بھی کر سکتا ہے لیکن وہ خود کو روکتا اس لئے ہے کہ مجھے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اس لئے میں وہ کروں گا جو میرے رب کا فیصلہ ہے۔ اس کا درجہ بہت زیادہ ہے۔ ایک اندھا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں کسی کو بُری نظر سے دیکھتا ہی نہیں، اس کے پاس نظر ہی نہیں ہے۔ ایک شخص کی نظر درست ہے لیکن اس کی نظر جدھر بھی جاتی ہے، اللہ کے خوف اور محبت سے لبریز جاتی ہے، تو اس کا درجہ بہت زیادہ ہے۔

یہ تصور جو ہمیں دیا گیا ہے کہ نیک مسلمان صرف وہ ہیں جن کے پاس نہ کچھ کھانے کو ہے، نہ پینے کو، نہ پہننے کو، جنگلوں میں نکل جائیں، دنیا سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ بھوک میں، افلاس میں، بیماری میں، صحت میں، فراخی میں یا مال و دولت میں، اقتدار و اختیار میں مسلمان وہ ہے جو ہر حال میں اللہ کے تعلق اور نبی کریم ﷺ کی غلامی کو سب سے مقدم جانے۔ قصرِ سلطنت میں بستا ہو تو بھی اللہ کا بندہ ہو اور مزدوری کرتا ہو تو بھی اللہ کا بندہ ہو۔

افلاس و خوشحالی، دونوں امتحان

ہر بندہ امتحان سے گزر رہا ہے۔ جسے ہم خوشحال کہتے ہیں، یہی خوشحالی اس کا امتحان ہے۔ تندرستی اور طاقت کا ہونا امتحان ہے۔ بیماری اور کمزوری بھی ایک امتحان

ہے۔کبھی مال و دولت اور طاقت کے نشے میں چُور ہو کر بندہ نافرمان ہو جاتا ہے اور کبھی کمزوریوں اور بیماریوں سے گھبرا کر بندہ ناجائز آسرے اختیار کرنے لگ جاتا ہے۔زندگی کا ہر ہر قدم ایک آزمائش ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (الحج:11) لوگوں کا حال یہ ہے، کچھ ایسے ہیں اللہ کی عبادت تو کرتے ہیں لیکن ایک کنارے، ایک لائن پر کھڑے ہیں۔ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ اگر اس کی صحت ٹھیک ہوتی ہے، روزی زیادہ ملتی ہے تو بڑا خوش ہوتا ہے اور عبادت میں بھی جی لگا رہتا ہے۔وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ اور اگر آزمائش آجاتی ہے، اللہ کی طرف سے انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ پھر نمازیں گئیں، روزے بھول گئے، پھر ذکر اذکار چھوٹ گئے۔ بڑی عجیب بات ہے! جی نماز کئی دنوں سے نہیں پڑھ سکے، طبیعت خراب تھی۔ بھئی! طبیعت خراب تھی تو کیا کھایا نہیں، پیا نہیں، سوئے نہیں؟ تو زندگی کے سارے معمولات ہوتے رہتے ہیں، صرف عبادت کے لئے طبیعت خراب ہوئی ہے؟ باقی سارے کام تو چلتے رہتے ہیں وہ رشتہ جو رب العالمین کے ساتھ ہے، وہ ایمان جو اللہ کی عظمت پر ہے، اس میں دراڑ آگئی، وہ کمزور ہو گیا۔تو قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ لوگ بڑے عجیب ہیں، دنیوی فوائد ملتے رہیں تو تسبیح بھی چلتی رہتی ہے، ذکر بھی ہوتا رہتا ہے، تلاوت بھی ہوتی رہتی ہے، سجدے بھی کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اگر تنگی آجائے تو بھاگ گئے۔نماز بھی گئی، روزہ بھی گیا، ذکر اذکار بھی گیا، ہر چیز چھوٹ گئی۔صرف اس پر بس نہیں کرتے، کرتے پھر یہ ہیں کہ اپنے جیسے بندوں کے قدموں میں جا بیٹھتے ہیں۔کوئی بابا ڈھونڈیں گے، کوئی عامل ڈھونڈیں گے، کوئی تعویذ لکھنے والا ڈھونڈیں گے، کوئی جادوگر ڈھونڈیں گے۔فرمایا يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ (الحج:13) ایسے بندے کی منت کرتے ہیں جس کا نقصان اس کے نفع سے پہلے پہنچتا ہے۔یعنی جو جیب میں چار پیسے

ہیں وہ پہلے لے لیتا ہے۔نقصان تو ہو گیا، نفع ہو گا یا نہیں ہو گا وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ بیوقوف ہیں، اتنی بات نہیں سمجھتے کہ جو اپنی دال روٹی چلانے کے لئے تیری جیب سے پیسے نکال رہا ہے، وہ تجھے رزق کی فراخی کہاں سے دے گا؟

مال و دولت کی حرص

آج کا مسلمان بھی حرص و لالچ کی اسی روش کو اپنا چکا ہے۔ہم میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ جہاں بھی زیادہ مال و دولت ملتا ہے وہاں چلا جائے خواہ دین ہاتھ سے چلا جائے۔کیا ہر کوئی امریکہ اور یورپ کے ممالک کی طرف محض اسی خواہش میں نہیں چلا جا رہا؟ حالانکہ ملنا وہاں بھی اپنے نصیب ہی کا ہے۔پھر جب وہاں پہنچ جاتے ہیں تو سمجھ آتی ہے کہ یہاں تو ایمان بچانا مشکل ہے۔وہاں جانے کیلئے جتنے بیتاب ہوتے ہیں، وہاں پہنچ کر اتنے ہی بے چین۔تو اگر مشکل میں ہی گرفتار ہونا تھا تو کم از کم نماز، روزہ اور رزقِ حلال کو ہی ترجیح دے کر یہیں محنت کر لیتے، وہاں جا کر غلاظتوں میں پھنس کر مشکل میں تو نہ پڑتے اور جو دعائیں وہاں کرنا تھیں یہاں کیلئے کر لیتے۔

حرام کھانے کا اثر

حرام چیزیں کھانے سے جسمانی طور پر جو نقصان ہوتا ہے وہ سامنے ہے، جیسے خنزیر کا گوشت انسانی صحت کے لئے مضر ہے۔لیکن جو دولت حرام ذرائع سے آتی ہے، اس کے کھانے سے کوئی بندہ بیمار تو نہیں ہوتا، بخار نہیں ہوتا، کوئی پھوڑا پھنسی نہیں نکلتی لیکن اللہ کو پہچاننے کی استعداد جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے، اس پر زنگ جمنا شروع ہو جاتا ہے۔اگرچہ ہر طرح کا حرام صحتِ انسانی کیلئے بھی نقصان دہ ہے مگر بہت بڑا نقصان حرام کی وہ ظلمت ہے جو دل پر طاری ہو جاتی ہے اور دل شیطان کی باتیں سننے لگ جاتا ہے۔

شریعت نے جو چیزیں حرام کی ہیں۔ ان میں دونوں طرح کی خرابی ہے۔ وہ مادی طور پر بھی نقصان پہنچاتی ہیں اور روحانی طور پر بھی مضر ثابت ہوتی ہیں۔ رزقِ حرام اگر مادی طور پر نقصان نہ بھی پہنچائے تو اس کا روحانی نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہم جو رزق کھاتے ہیں اگر اس میں خرابی ہوگی، چوری کا ہوگا، حرام کا ہوگا تو جب وہ پیٹ میں جائے گا، پھر اس سے خون بنے گا، اس سے گوشت بنے گا، اس سے ہڈیاں بنیں گی، کھال بنے گی، بال بنیں گے۔ دل میں وہی خون دوڑے گا جو رزقِ حرام سے پیدا ہوگا۔ تو جب رگ رگ میں حرام رچ جائے گا تو شیطان کیسے قابو نہ کرے گا۔ ہمیں قابو کرنے میں شیطان کا کیا کمال ہے، یہ تو ہم نے اپنے آپ کو باندھ کر اس کے آگے ڈال دیا ہے۔

بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ دین کا اسّی فیصد (80%) حصہ رزقِ حلال پر منحصر ہے۔ حرام کھانے سے سو میں سے اسی حصے دین ضائع ہو جاتا ہے، پھر باقی جو بیس فیصد بچتا ہے اس میں سے پندرہ فیصد معاشرے کا دخل ہے، مجلس کا دخل ہے، ماحول کا دخل ہے۔ پھر تربیت کا حصہ پانچ فیصد ہے۔ جہاں پچانوے فیصد برائی ہوگی، پانچ فیصد کا وہاں کیا اثر ہو گا؟

تو میرے بھائی! یہ بات اس لئے بگڑ گئی کہ شیطان نے ہم پر قابو پا لیا ہے اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ (المجادلہ:19) شیطان نے اُن پر غلبہ پا لیا۔ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ہتھیار ہی چھین لیا۔ بندہ کیا خاک لڑے گا۔ شیطان نے اللہ کی یاد بھلا دی، ذکرِ الٰہی کا ہتھیار ہی بندے سے چھین لیا گیا۔

طیب رزق

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (المومنون:51) قرآن حکیم میں جہاں انبیاءؑ و رسلؑ کو خطاب ہوتا ہے، وہاں مراد یہ ہوتی ہے کہ اس حکم سے

کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ جیسے ملک میں قانون ہو کہ یہ صدر اور وزیراعظم پر بھی لاگو ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، یہ سب پر لاگو ہوگا۔

بنیادی بات یہ ارشاد فرمائی كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ کھانے کیلئے کمانا پڑتا ہے اور اگر کمانے کا طریقہ جائز نہ ہو تو حلال نہیں ہوتا۔ اگر حلال ہو لیکن اسے بنانے میں بھی ناپاکی آجائے، کوئی قطرہ ناپاکی کا شامل ہو جائے، کسی طرح کی ناپسندیدہ چیز شامل ہو جائے تو وہ حلال تو ہوتا ہے لیکن پاکیزہ نہیں رہتا۔ ارشاد فرمایا كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ کھاؤ، یعنی حلال بھی ہو اور طیب بھی ہو۔ طیب جو ہوگا وہ از خود حلال ہوگا، حرام تو طیب نہیں ہو سکتا، حرام میں تو یہ خصوصیت ہی نہیں کہ وہ پاکیزہ ہو سکے۔ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا کام بھلے اور اچھے کرو۔ ترتیب کتاب اللہ سے یہ بات اخذ ہوئی کہ کہ کھانا طیب ہوگا تو کردار صالح ہو گا۔ اگر غذا غیر صالح ہوگی یا حرام ہوگی یا غیر طیب ہوگی تو کردار متاثر ہوگا۔ اکلِ حلال و طیب اور اعمالِ صالحہ ان دو الفاظ میں انسانی زندگی کے تمام کاموں کو سمو دیا گیا ہے۔ زندگی بھر کے سارے اعمال اس میں آجاتے ہیں۔ حصولِ رزق کے تمام ذرائع، محنت مزدوری، کام کاج، لین دین اور دیگر معاملاتِ دنیا اس میں شامل ہیں۔ رزق کی خرابی سے اعمال صالح نہیں رہتے۔

تصوف میں ان دو باتوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے کہ ذکر اللہ سے وجود کے ذرے ذرے تک اللہ کے نام کی نورانیت پہنچتی ہے۔ اگر غذا حلال بھی ہو لیکن ناپاک ہو تو یہ نورانیت متاثر ہوتی ہے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی ہندو یا غیر مسلم کو طریقہ ذکر سکھا دو اور وہ اس طریقے سے اللہ کا ذکر کرے، اللہ کا نام لے تو اس پر بھی اللہ کے نام کا نور، روشنی اور اس کے نام کے انوارات دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ ذکر بند کرے گا تو وہ انوارات ختم ہو جائیں گے۔ جس وجود میں نورِ ایمان نہیں وہ وجود ان انوارات کا ٹھکانہ نہیں

بن سکتا۔ اسی طرح جب رزق حلال نہیں ہوگا تو ایسا وجود انوارات کا مسکن نہیں بنے گا۔ ذکر میں انوارات پیدا ہونا اللہ کی شان ہے، وجود کو انوارات کا مسکن بننا چاہئے۔ نس نس میں انوارات بس جائیں، ذکرِ الٰہی کی نورانیت وجود کے ذرے ذرے میں اپنا گھر بنالے۔ اس کیلئے اس وجود کا حلال اور پاک رزق سے نشوونما پانا ضروری ہے۔

قرآنِ حکیم نے تو سیدھی سیدھی طیب کی شرط لگائی کہ طیب میں حلال از خود آجاتا ہے۔ یعنی کھانا یا غذا اعمال پر بھی ایک اثر مرتب کرتی ہے اور کردار بھی تب ہی صحیح ہوتا ہے جب کھانا طیب اور پاکیزہ ہو۔ سو جو غذا جزوِ بدن بنتی ہے، اسی غذا سے دماغ کو بھی تقویت پہنچتی ہے، اسی سے نگاہوں میں بھی تاب آتی ہے، اسی سے ہاتھ اور پاؤں میں بھی سکت آتی ہے، اسی سے دل بھی دھڑکتا ہے، اسی سے گوشت پوست، ہڈیاں سب تعمیر ہوتی ہیں، اگر وہی غیر صالح ہوگی تو کردار صالح کیسے ہوں گے؟

ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر کھانے کو ناپاک کر دیتے ہیں مثلاً ہمارے گھروں میں نیل پالش جو ناخنوں پر بیبیاں لگاتی ہیں، اس کے لگانے سے ہاتھ پاک نہیں ہوتے۔ غسل واجب ہو، غسل ادا نہیں ہوتا کیونکہ ناخن تک پانی نہیں پہنچتا، ناخن تر نہیں ہوتا۔ اب اس ہاتھ سے جو پکے گا، وہ غیر طیب ہوگا۔ اسی طرح گھروں میں بیبیاں نماز نہیں پڑھتیں اور جان بوجھ کر نماز چھوڑ دینے والی بی بی کے ہاتھ کا پکا کھانا غیر طیب ہوتا ہے، طیب نہیں ہو سکتا۔ عمداً نماز چھوڑ دینا خود ایک نجاست پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ نماز کا چھوڑ دینا مفضی الی الکفر ہے اور مسلسل چھوڑ دینے سے ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

میرا تجربہ تو یہ ہے کہ جو کھانا بغیر وضو کے پکایا جائے، اس کے کھانے سے دل پر ایسا اثر پیدا ہوتا ہے کہ اس دن کے معمولات ضائع ہو جاتے ہیں اور وہ بات نہیں بنتی۔ بی بی نمازی ہو، رزق حلال ہو، لیکن پکانے میں اتنی احتیاط نہ کی جائے اور وضو کا خیال نہ رکھا

جائے تو وہ بات نہیں رہتی۔ کوئی شخص تجربہ کرنا چاہے تو آپ اسے بیشک کہیں کہ وہ حلال کی روٹی کو طیب کر کے کھائے، پھر عبادات کیلئے اس کا دل چاہے گا جس طرح ہمیں کھانے کی بھوک لگتی ہے، اسی طرح سجدوں کی بھی بھوک لگے گی۔

رزقِ حرام اور شرک

رزقِ حرام کھانا بھاری جرم ہے اور کفر و شرک بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن شرک بھی طاری ہوتا ہے ساری نہیں ہوتا۔ طاری ہونے کا معنی یہ ہے کہ یہ وجود پر چھا جاتا ہے۔ جب بھی اللہ کی توفیق سے وہ کلمہ شہادت پڑھ لے، دل سے تصدیق کر دے تو سارا شرک ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن رزقِ حرام، ناپاک کھانا یہ طاری نہیں ہوتا یہ ساری ہوتا ہے یعنی وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ خون میں شامل ہو کر گوشت پوست اور ہڈیوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ ایسا وجود لے کر جو میدانِ حشر میں پہنچا اور اس کی نجات بھی ہوگئی تو بھی ارشادِ پاک کے مطابق اسے جہنم میں رہ کے جلنا ہوگا تا کہ رزقِ حرام سے پرورش کیا گیا جسم ختم ہو جائے۔ پھر اللہ کریم جنت میں جانے کے لئے نیا جسم دیں گے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کا مفہوم ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ جن پر اللہ کریم رحم فرمائے گا، معاف کر دے گا لیکن وہ گوشت جو غیر صالح، غیر طیب غذا سے بنا ہے، اسے اللہ جنت میں داخل نہیں فرمائے گا بلکہ الفاظ آتے ہیں "نبت من السحت"۔ حرام کی کمائی سے جو گوشت بنا ہوگا "ان النار اولیٰ بہ" اس کی بہترین جگہ جہنم کی آگ ہی ہے۔ وہ جل جائے گا اور پھر اللہ کریم انہیں نیا گوشت عطا فرمائے گا اور بدن کو سلامت کر کے پھر انہیں جنت بھیجا جائے گا۔ سو لقمۂ حرام سے بچیں، زہرِ قاتل ہے۔

سُحت، (رشوت) کے معاشرے پر اثراتِ بد

اگر کوئی کسی کام کو کرنے کی اجرت لے رہا ہو لیکن پھر بھی اس کام کو کرنے کیلئے رقم

اور رشوت طلب کرے، اسے سُحت کہتے ہیں اور یہ بدترین حرام ہے۔ فرمایا، جو لوگ حرام کھاتے ہیں فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (المومنون:53) ان پر اللہ کا یہ عذاب آتا ہے کہ وہ الگ الگ رستوں پر بٹ جاتے ہیں۔ اپنے اپنے نظریات بنا لیتے ہیں، اپنا اپنا عقیدہ گھڑ لیتے ہیں، اپنا اپنا ایک گروہ بنا لیتے ہیں۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ اور ان میں سے ہر گروہ، اپنی بات پہ خوش ہوتا ہے کہ جو میرے پاس ہے وہی حق ہے، میں حق پر ہوں دوسرا واجب القتل ہے۔ جب قومیں حرام کھانا شروع کر دیتی ہیں، ان کے ذرائع روزگار حلال نہیں رہتے اور اکثریت جب حرام میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس پر یہ عذاب وارد ہو جاتا ہے کہ وہ قوم گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔

اب ہمارا جو حال ہو رہا ہے، لگتا یوں ہے ہم میں من حیث القوم غیر طیب کھانے والوں کی اکثریت ہو گئی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی زہر کھا لے اور اسے قے شروع ہو جائے تو اس کے بچ جانے کی امید ہوتی ہے لیکن اگر زہر ہضم ہو جائے یا کوئی اور بیماری نہ بنے تو پھر وہ مر جاتا ہے۔ یہی حال گناہ کا بھی ہوتا ہے۔ گناہ پر اگر کوئی چھوٹی موٹی گرفت آ جاتی ہے تو بندہ توبہ کر لیتا ہے لیکن جن لوگوں کو ڈھیل مل جاتی ہے، وہ تباہ ہو جاتے ہیں اور مزید گناہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا تو یہ فیصلہ ہے کہ جو حرام کھائے گا یا غیر طیب کھائے گا وہ عملِ صالح نہیں کر سکے گا۔ جب عمل غیر صالح ہوں گے تو قوم دھڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ تو کیا اس آیہ کریمہ نے ہمارے آج کے حالات کی منظر کشی نہیں کر دی؟ ہمارا اللہ سے تعلق اتنا کٹ چکا ہے کہ ہم کفر کی چھتری سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کی لذت سے آشنا ہی نہیں۔ یہ سب اللہ سے دوری کی وجہ سے ہے، عظمتِ الٰہی سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ حرام کھانے اور سود کھانے کا نتیجہ ہے کہ گلی گلی میں دہشت گردی ہو رہی ہے، بم پھٹ

رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو کیوں مار رہے ہیں؟ یہ وہ پھوڑے پھنسیاں ہیں جو خراب غذا کھانے کے باعث جب خون خراب ہو جاتا ہے تو بدن پر جگہ جگہ نکلتے ہیں۔ یہ خرابی حرام کھانے سے، کفر کے تابع رہنے سے، کافرانہ رسومات اپنانے سے قوم کے وجود میں در آئی ہے۔ یہ قوم کے وجود پر ناسور ہیں جو جگہ جگہ بن رہے ہیں۔

سادہ سی بات ہے، حرام کھاؤ گے تو مزاج بدل جائے گا۔ برائی برائی نہیں لگے گی، برائی کر کے لطف آئے گا۔ جس طرح گنجے کو سر کھجا کے مزہ آتا ہے اور خارش زدہ آدمی کو جسم کھجا کر۔ حالانکہ اس کا جسم پھٹ رہا ہوتا ہے، خون بہہ رہا ہوتا ہے لیکن وہ خارش کیے جاتا ہے۔ اسے اپنا ہی بدن ادھیڑنے میں مزہ آتا ہے۔ اسی طرح اگر حرام کھاؤ گے تو نیکی کرنا مشکل ہو جائے گا اور گناہ میں لذت ملنا شروع ہو جائے گی۔

میری بات یاد رکھیں قوم کا آپس میں لڑنا عذابِ الٰہی ہے۔ ہم اس عذابِ الٰہی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی بندوق اٹھاتا ہے تو وہ بہت ظلم کرتا ہے لیکن جو اسے بندوق اٹھانے پر مجبور کر رہا ہے وہ بھی کم ظالم نہیں ہے۔ میرے بھائیو! کم از کم اپنے کردار کو ایسا بناؤ کہ اس عذاب کا سبب نہ بنے بلکہ اس آگ کو بجھانے کا سبب بنے۔ اپنے ذرائع پاکیزہ اور حلال رکھو، جائز رکھو۔ تھوڑا کھاؤ مگر حلال کھاؤ۔ زندگی سوکھی روٹی پر بھی گزر جاتی ہے بشرطیکہ حلال ہو۔ اور بے شمار نعمتیں کھا لو تو بھی کچھ دیر بعد غلاظت ہی بن جاتی ہے تو حرام کھانے سے کیا حاصل؟ کھانے میں لذت نہیں ہوتی، لذت ہوتی ہے زندگی میں۔ اگر زندگی اللہ کی رضا کیلئے ہو تو ہر لمحے میں ایک نئی لذت ہوتی ہے، ہر رکوع، ہر سجدے، ہر سانس میں ایک نیا لطف ہوتا ہے، زندگی پر لطف بنتی ہے۔

آخرت گنوا کر دنیا کمانا سراسر گھاٹا ہے

جو دولتِ دنیا آخرت گنوا کر حاصل کی جائے وہ خواہ کھربوں میں ہی کیوں نہ

ہو وہ قلیل ہی ہوتی ہے۔ کھربوں روپے کوئی سونا یا ہیرے جواہرات یا جائیداد کی صورت میں ہی رکھے گا، ان چیزوں کو کھائے یا نگلے گا تو نہیں۔ کھانے کیلئے تو وہی چند لقمے جو صبح و شام نصیب ہیں وہی کھائے گا۔ باقی سب کچھ چھوڑ کر مر جائے گا۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو جتنی بھی دولت ہو وہ کم ہی ہوئی۔ ساری دنیا بھی مل جائے تو اللہ کی رحمت کے مقابلے میں یہ تمام بھی قلیل ہے۔

بیع و شراء کا اصول

ایک بڑا سادہ سا اصول فقہاءِ کرام نے ارشاد فرمایا ہے کہ

سود جس میں نفع یقینی اور نقصان کا اندیشہ ہو، وہ سود ہے۔ آپ کسی کو سو روپے دے کر کہتے ہیں کہ مجھے تم ایک سو دس روپے واپس کرو گے۔ اب اس نے سو کے بدلے ایک سو دس مجبوراً واپس کرنے ہیں۔ اب نفع یقینی ہے اور نقصان کا اندیشہ یہ ہے کہ شاید وہ بندہ مر جائے، شاید وہ پیسے اس کے پاس کبھی نہ آسکیں تو یہ ایک اندیشہ ہے۔

جوأ نقصان یقینی اور نفع کا امکان ہے تو یہ جوأ ہے۔ جو جوأ کھیلتا ہے اسے یقین ہوتا ہے کہ جو رقم داؤ پر لگ رہی ہے، مجھ سے تو گئی۔ لیکن ایک امکان ہوتا ہے کہ شاید میرا داؤ لگ جائے تو مجھے پیسے زیادہ مل جائیں۔

تجارت جہاں نفع و نقصان کے برابر برابر امکان ہوں، وہ تجارت ہے۔ نفع بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی ہو سکتا ہے۔

ارتکازِ دولت

سرمایہ اس طرح ہوتا ہے جس طرح بدن میں خون ہوتا ہے۔ اگر خون ایک جگہ جمع ہو جائے اور باقی بدن خالی رہ جائے تو بندہ مر جائے گا، اسی طرح معاشرے میں دولت کا ارتکاز یا کسی ایک جگہ جمع ہو جانا معاشرے کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔

دولت کی گردش (Circulation)

دنیا کے کسی نظام میں سرپلس (Surplus) سرمایہ کو واپس معاشرے میں رواں (circulate) کرنے کا کوئی نظام نہیں ہے سوائے اسلام کے۔ اسلام نے یہ معاشی نظام دیا ہے کہ جو سرمایہ بہر حال بچ رہتا ہے وہ بھی واپس آئے، معاشرے میں گردش کرے اور کوئی بندہ اگر بچا کر بیٹھا رہے اور اڑھائی فیصد سالانہ دیتا رہے تو چالیس سالوں میں اس کے پاس کچھ نہیں رہے گا، وہ سارا واپس آجائے گا۔ اس لئے وہ خود اس سرمائے کو بچا کر نہیں رکھے گا۔ جب زکوٰۃ دے گا تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ تو کم ہو رہا ہے، اس کو خرچ کرنا چاہیے۔ اس سے مزید کمانا چاہیے، اس سے سرمایہ خود معاشرے میں گردش کرے گا۔

دنیا کی نعمتوں کو خود تک روک لینا زندگی کے تسلسل کو روکنے کے مترادف ہے۔ اور یہ ایسی حرکت ہے کہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے بہت بڑا جرم بن جاتا ہے۔ کائنات کے نظام پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ زندگی کا اصول آگے کچھ دینے پر ہے۔ درخت کو دیکھ لیں، اس کی جڑ غذا حاصل کرتی ہے۔ اب اگر جڑ ہی غذا کو روک لے، آگے ترسیل نہ کرے بلکہ جڑ ہی پھولتی رہے تو درخت کے باقی حصوں کو غذا کہاں سے ملے گی؟ انسانی وجود میں ایسا ہی نظام رواں دواں ہے۔ دل سے خون بدن کے ہر حصے تک پہنچتا ہے لیکن اگر کسی مقام پر اسے روک لیا جائے تو وہی عضو بیکار ہو جائے گا۔ یوں ہی زندگی کے وسائل ہیں، ان کی روانی کو روکنا زیادتی ہے۔

سود۔۔ سب سے بدترین حرام

اسلام نے بنیادی طور پر شرطِ ایمان ہی یہ رکھ دی، فرمایا: اے ایمان والو! جنہیں نورِ ایمان نصیب ہوا ہے، سود مت کھاؤ۔ یعنی سود ایمان کے مقابلے میں آگیا کہ اگر ایمان ہے تو سود مت کھاؤ۔ کیسی حیرت انگیز صورتحال ہے کہ بندہ دن رات تسبیح بھی ہاتھ میں

رکھے، داڑھی سے چہرہ مزین ہو، نمازیں پوری پڑھے لیکن سود کو حرام نہ مانے جسے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے شدت سے حرام بتایا ہے۔ حرام کو حرام نہ سمجھنا بھی کفر ہے، حرام کو حلال سمجھنا بھی کفر ہے اور حلال کو حرام جاننا بھی کفر ہے۔

سود کھا کر لوگ اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ شاید ایک فیصد سرمایہ کار اپنا پیسہ بلاسود بنکوں میں رکھتے ہیں اور عجیب بات یہ کہ سود خور پکے نمازی بھی ہیں۔

ذکر کے ایک ساتھی ہیں۔ لاہور میں رہتے ہیں۔ سود سے بچتے ہوئے بزنس کرتے ہیں۔ ان کے شریک کار بھائیوں، بھتیجوں نے فیصلہ کیا کہ جو تاجر بل ادا کرنے میں دیر کرے گا اس سے سود کے ساتھ رقم وصول کی جائے گی۔ یہ سن کر وہ خاموشی سے اٹھ گئے اور بھائیوں سے کہا کہ مجھے گلبرگ میں ایک کوٹھی خرید دو، میں وہاں وسط ایشیائی ممالک سے چند نوعمر لڑکیاں خرید لاؤں گا اور پیشہ کرواؤں گا اور سب مزے سے یہ آمدنی کھائیں گے۔ وہ سب بھڑک اٹھے کہ آپ ہمیں ایسا رذیل سمجھتے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا، دیکھو! پیشہ کر کے کھانے والوں کے ساتھ اللہ نے جنگ کی وعید نہیں سنائی لیکن سود خور کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اعلانِ جنگ قرآن میں موجود ہے۔ اگر تم سود کھا رہے ہو تو پیشہ ور کا پیسہ کھانے میں کیا حرج ہے۔ حرام ہی کھانا ہے تو یہ حرام کھا لو اس پر اللہ کے ساتھ اعلانِ جنگ تو نہیں ہے۔ اس پر وہ سب تائب ہو گئے۔

ڈاکخانے میں بنک کی نسبت سود کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔ ڈاکخانے کے ملازم نے بتایا کہ ایک آدمی آیا اور کہا کہ اصل تو مجھے نکلوانا نہیں، میرے اصل پر جو سود بنتا ہے اس کا حساب کر دو۔ اس کا حساب کیا تو اس کے سود کی رقم ایک لاکھ دس ہزار بنی۔ اس نے کہا یہ مجھے دے دو اور دستخط کرا لو۔ ڈاکخانے کے کارندے نے پوچھا کہ تم اتنی رقم کا کیا کرو گے؟ اُس نے کہا کہ حج کی درخواست جمع کراؤں گا۔ انہی باتوں کی خبر حضور ﷺ نے دیتے

ہوئے فرمایا کہ ایک شخص دور دراز کا سفر کر کے بیت اللہ شریف پہنچے گا۔ اس سفر کے آثار اس کے وجود پر ظاہر ہوں گے، کپڑے میلے، بال پریشان، تھکاوٹ سے چُور ہو گا۔ بڑے درد سے پکارے گا، لبیک۔۔۔ لیکن اس کی پکار نہیں سنی جائے گی۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ! ایسا کیوں ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، اس لئے کہ اس کا لباس حرام کا ہو گا، غذا حرام سے بنی ہو گی، ایسے شخص کی بات اللہ کریم قبول نہیں فرمائیں گے۔

ہم کھاتے سود ہیں، نام ہم نے اس کا منافع رکھ دیا ہے، مارک اپ رکھ دیا ہے۔ یعنی کتے کا نام دنبہ رکھ دیں اور کھاتے رہیں تو کیا نام بدلنے سے کتا، دنبہ ہو جائے گا؟ کیا نام بدلنے سے سود حلال ہو جائے گا؟ گویا اتنی دلیری آ گئی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ جو سود نہیں چھوڑے گا اس کا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے اعلانِ جنگ ہے اور بندہ اتنا دلیر ہو جائے کہ سود کی رقم سے بیت اللہ بھی جائے، روضۂ اطہر ﷺ پر بھی جائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ دیکھ لیں، میں تو سود کھاتا ہوں، یہ اخراجات بھی سود سے پورے کر کے یہاں آ گیا ہوں، آپ نے کیا بگاڑ لیا ہے میرا، معاذ اللہ؟ سود وہ حرام ہے کہ جہاں جاتا ہے وہاں ایمان کی رمق باقی نہیں رہنے دیتا۔ یاد رکھو! اللہ جل شانہ کے ہوئے قانون کی خلاف ورزی نیکی کا مفہوم بدل دیتی ہے، عبادت اور سجدے گستاخی بن جاتے ہیں۔ کسی بھی بادشاہ کا آئین توڑ کر اس کے دربار میں جا کر کھڑا ہونا کیا گستاخی نہیں بنتی؟

سُود اور سؤر کی حرمت برابر ہے

سُود میں اور سور میں حرمت برابر ہے۔ سُود کی اصل میں حرمت ہے اور سؤر کی اصل میں بھی حرمت ہے، دونوں ایک جیسے حرام ہیں لیکن ہم سُود کھا رہے ہیں۔ اب اگر کوئی ویسے ہی کہہ دے کہ ہفتے میں ایک دن خنزیر کاٹ کے بانٹا کریں گے تو پورا ملک احتجاج پہ کھڑا ہو جائے گا اور لڑائی ہو جائے گی۔

اب امریکی فوج عرب سمیت سارے مشرقِ وسطی میں خیمہ زن ہے۔ان کیلئے امریکہ سے کٹے ہوئے خنزیر بھی آرہے ہیں اور زندہ بھی اس مقدس سرزمین پر کاٹے اور کھائے جارہے ہیں۔مسلمان آہستہ آہستہ برداشت کررہے ہیں۔پہلے لوگ کسی کو کھاتا دیکھ کر برداشت کریں گے، پھر کھانے میں خود بھی شریک ہوجائیں گے۔

سودخوری کی منفرد سزا

ہر جرم پر کوئی نہ کوئی سزا رکھی گئی ہے۔زنا کی سزا سب سے سخت ہے کہ اسے سنگسار کردیا جائے اور کوئی اس پر رحم نہ کھائے، پتھر مار مار کر ہلاک کردیا جائے۔لیکن اس کے ساتھ اعلانِ جنگ نہیں ہے۔سنگسار ہوجائے تو اس کا گناہ معاف ہوجاتا ہے۔چوری کی سزا، ڈاکے کی سزا، تمام گناہوں کی حدود مقرر ہیں، سزائیں مقرر ہیں۔ایک سودخور ایسا مجرم ہے جس کی سزا مقرر نہیں۔فرمایا: میں جانوں اور یہ جانے۔میرا اور اس کا میدان لگ گیا ہے۔میری اور اس کی لڑائی ہے۔اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ اس کا اعلانِ جنگ ہے۔اِس کے باوجود دنیا سُود کھارہی ہے۔مسلمان کھارہے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ کہتے ہیں جائز ہے۔حکمران ہیں تو وہ سُود کا نام مارک اپ رکھ دیتے ہیں، سُود کا نام بدلنے سے کیا وہ حلال ہوجائے گا؟ یہ وہی ابلیسی بہانے ہیں جیسے اس نے اپنی طرف سے یہ فیصلہ کرکے کہہ دیا کہ آگ مٹی سے بہتر ہے جبکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔اس جنگ کا اثر یہ ہے کہ وجود پلتا رہتا ہے اور روح مرتی جاتی ہے اور گناہ کرنا کوئی عیب نہیں لگتا۔عبادات محض رسم، عادت، اپنی پارسائی اور اپنی شہرت کیلئے کرتا رہتا ہے۔

سودخوری۔۔عجیب بہانہ

یہ دو بہانے بڑے عجیب ہیں۔

☆ بندہ بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور پھر بعد میں کہتا ہے کہ میں نے غصے میں دے

دی۔بھائی! یہ نتیجہ ہی غصے کا ہے، غصے میں ہی آدمی طلاق دیتا ہے۔بھلا بیوی خدمت کرے، اس کے پاؤں دبائے تو آدمی خوش ہوکر کیا طلاق دے گا؟

☆ اسی طرح سود کے لئے بھی بہانہ تراشا جاتا ہے کہ جی میں مجبور تھا۔مجبوری ہی تو سود کی اصل ہے، اسی لئے منع فرمایا گیا کہ دوسرے کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

حرام۔۔حرام ہے

ایک ساتھی کا سوال تھا کہ میں غیر ملک میں مقیم ہوں۔علالت کے باعث ملازمت نہیں کرسکتا۔اب صحت بہتر ہوئی تو ایک سٹور پر ملازمت مل رہی ہے اور یہاں کھانے پینے کے تمام سٹورز پر خنزیر اور شراب بکتی ہے تو میری مجبوری ہے۔کیا میں یہاں ملازمت کرلوں؟

میں نے جواب دیا کہ اپنے کندھے پر بندوق رکھ کر فائر کرو، میرے کندھے کے ساتھ کیوں لگاتے ہو؟ تم نے کیا بچپن سے لے کر آج تک یہ نہیں سنا کہ خنزیر کا کاروبار حرام ہے، شراب کا کاروبار حرام ہے۔اگر تم نہیں جانتے تو مجھ سے پوچھو، میں بتاتا ہوں کہ حرام ہے۔اور اگر اس کے حلال ہونے کا فتویٰ لینا چاہتے ہو تو یہ فتویٰ دینا دین فروشی ہے، حرام ہے۔یہ حال ہے۔وہ حرام کا کام کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ گناہ میرے ذمے پڑے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اگر وہاں حلال میسر نہیں تو پھر یہاں دال روٹی کھالو، وہاں کیا لینے جاتے ہو؟ اگر وہاں حلال نہیں ملتا تو سپین میں رہنے کی کیا مجبوری ہے، یہاں مزدوری کرلو۔ہم بھی انسان ہیں، جاپان سے امریکہ تک، چین سے افریقہ تک ساری دنیا پھرے ہیں لیکن واپس یہاں بیٹھے ہیں۔ساگ لسی سے روٹی کھاتے ہیں۔ہم بھی کسی ملک میں بیٹھ جاتے تو شائد زیادہ پیسہ بن جاتا لیکن حرام لے کر کیا کرتے؟

معیشۃ ضنکاً (طٰہٰ:124)

قرآن کریم میں سورۃ طٰہٰ کی یہ آیت ہے وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ: 124) جو شخص میری یاد سے غافل ہو جاتا ہے اس کی میں روزی تنگ کر دیتا ہوں۔ مَعِیْشَةً ضَنْكًا سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس وسائلِ زندگی ہوتے ہیں لیکن اُن سے استفادہ نہیں کر سکتا، اللہ کی نعمتیں استعمال نہیں کر سکتا۔ جیب میں رقم ہے لیکن ضروریاتِ زندگی بازار سے غائب، بجلی کا بل دینے کی استطاعت ہے لیکن بجلی ندارد۔ گاڑی ہے پٹرول نہیں مل رہا، وسائل ہیں لیکن چولہے میں گیس نہیں آ رہی۔ مَعِیْشَةً ضَنْكًا روزی تنگ کر دی جاتی ہے۔ ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ بندہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انہیں استعمال نہیں کر سکتا۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ اللہ کریم فرماتے ہیں ایسا تب ہوتا ہے جب لوگ میری یاد چھوڑ دیتے ہیں، بے لگام و بے مہار ہو جاتے ہیں۔

دنیا کی طلب

میرے بھائی! سب لوگ دنیا کو برا کہتے ہیں اور ہر بندہ دنیا پہ فدا ہے۔ ہر بندہ دنیا کی برائی بیان کرتا ہے۔ مولوی دنیا چاہتا ہے، پیر صاحب دنیا چاہتے ہیں، مرید نذرانے دے کر آتا ہے۔ ہر طرف دنیا ہی ہے۔ سارے چھوڑ چھاڑ کر مرتے بھی جا رہے ہیں۔ دنیا کی طلب نے عشقِ الٰہی کی جگہ لے لی، دنیا کی طلب نے وصولِ برکاتِ محمدی ﷺ کی جگہ لے لی، عشقِ محمدی ﷺ کی جگہ لے لی۔

یاد رکھو! یہ دنیا جس کے حصے میں ہے ہر حال میں اسے ملنی ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے حصے کا ایک قطرہ پانی نہیں پی سکتا، ایک دانہ غلہ نہیں کھا سکتا۔ پھر بھی لوٹ مچی ہوئی ہے، چھینا جھپٹی لگی ہوئی ہے، لوٹ لوٹ کر جمع کیے جا رہے ہیں۔ اس کا پتہ نہیں کیا ہو

گا؟ خطا ہو جانا اور بات ہے، نیت ہی خراب کر لینا بالکل اور بات ہے۔ اگر 'اللہ اللہ' کو روپے بٹورنے کا ذریعہ بنا لے، ''اللہ اللہ'' کو بھی دوسروں پر حکمرانی اور اپنی بڑائی جتانے کا ذریعہ بنا لے، تو یہ بڑی زیادتی ہے۔

اسلامی نظامِ معیشت سے ہماری بے خبری

ایک بات سوچیے کہ ایک آدمی اسلامی ملک کا وزیرِ خزانہ ہے اور وہ مسلمان ہے، اتنا پڑھا لکھا ہوا ہے کہ پورے ملک کی معیشت کو کنٹرول کرتا ہے۔ بات جب سودی معیشت کی آتی ہے، یہودیانہ نظام اور کافرانہ نظام کی آتی ہے تو وہ ماہر ہے۔ لیکن جب اسلام کی بات آتی ہے تو وہ کہتا ہے کوئی بتائے کیا کرنا ہے؟ یعنی کافرانہ نظام ہو تو آپ مشورہ نہیں لیتے، آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کرنا ہے۔ سودی نظام ہوتا تو وزیرِ خزانہ کو مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس طرح کرنا ہے۔ اگر اسلام ہے، اسلامی نظامِ معیشت کی بات ہے تو وہ پوچھتا ہے کہ کوئی بتائے وہ کیسا ہے؟ کیا یہ کسی مسلمان کیلئے کم شرم کی بات ہے کہ وہ یہ کہہ رہا ہو کہ مجھے کوئی بتائے کہ اسلام کیا ہے؟

رزق سے برکت کیوں اٹھ گئی؟

غور فرمائیں تو اس عہد میں ایک مسئلہ بہت عام ہے۔ میں نے یورپ اور مغربی ممالک میں دیکھا ہے کہ وہ لوگ سارا دن کھاتے رہتے ہیں۔ ہم ایک ایئر پورٹ میں بیٹھے تو وہاں لوگوں نے جی بھر کے کھانا کھا لیا۔ جہاز میں کھانا serve ہوا تو انہوں نے پھر پیٹ بھر کے کھانا کھا لیا۔ مختصر فلائیٹ تھی، اگلے ایئر پورٹ پر اترے تو انہوں نے پھر کھا لیا۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایک بندہ دو تین گھنٹوں میں کس طرح بار بار کھا لیتا ہے؟ سارا دن منہ ہلاتے رہیں گے، کچھ نہ کچھ منہ میں ڈالتے رہیں گے، کھاتے رہیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بندے تین ہیں اور کھانا دس بندوں کا کھا جاتے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جن چونکہ نظر نہ آنے والی مخلوق ہے اور غذا میں جو انرجی ہوتی ہے وہ ان کی غذا ہوتی ہے۔ تو یہ کھانے میں سے انرجی لے لیتے ہیں۔

☆ اگر کھانا حرام کا ہے تو پھر جنات کو کوئی روکنے والا نہیں۔

☆ اور اگر حلال ہے اور پھر اس میں ناپاک مل گیا تو پھر بھی انہیں کوئی روک نہیں سکتا۔

چونکہ ہم احتیاط نہیں کرتے، کھانا حلال نہیں ہوتا، اگر حلال ہو تو پھر پاکیزہ نہیں ہوتا تو اس میں سے جن انرجی حاصل کر لیتے ہیں۔ اب پیچھے پھوک رہ گیا۔ وہ جتنا مرضی کھاتا رہے۔ ایک بندہ دس بندوں کی خوراک کھائے گا، تب اس کی بھوک مٹے گی یا اس کے بدن کی ضرورت پوری ہوگی۔ جہاں یہ نہیں وہاں اتنا خرچ نہیں ہوتا۔ غذا کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے، تعمیرِ بدن بھی ہوتی ہے اور اخراجات بھی کم ہوتے ہیں۔

وقت کی قدر

آپ ﷺ کی تیرہ سالہ مکی زندگی کا لمحہ لمحہ شدائد سے پُر ہے۔ مدینہ منورہ کی دس سالہ حیاتِ طیبہ میں 80 سے زائد غزوات و سرایہ ہیں۔ دس سال میں آپ ﷺ نے ایک پورا نظام ''الف سے یے'' تک، ابتداء سے آخر تک، پورا نظام خرید و فروخت، نظامِ عدل، نظامِ سیاست، سارا فوجی وسول ایک پورا نظام ترتیب دیا۔ سارے دینی احکام بھی تلقین فرمائے۔ دنیا کے ہر کام کا سلیقہ بھی بتایا اور اس کے ساتھ 84 جنگیں بھی لڑنا پڑیں۔ آرام کا، کھانے پینے کا وقت کہاں بچتا ہے۔ جسے آپ فرصت کہتے ہیں، کہاں نظر آتی ہے؟ جب تک ہم ان فرصتوں کے اسیر رہیں گے، کام نہیں بنے گا۔

جو اللہ کیلئے خرچ ہوگا۔ وہ ذاتی ضرورتیں قربان کر کے خرچ ہوگا۔ فالتو وقت یا روپیہ اللہ کو چاہیے ہی نہیں۔ جب ہم فالتو یا جو بچتا ہے وہ لگاتے ہیں تو اس کا نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ جب ہم اپنے کاموں سے فارغ ہو کر وقت دیتے ہیں تو کوئی ہماری بات نہیں سنتا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ دو میں سے ایک چیز متاثر ہوگی۔ پوری توجہ ایک طرف ہوگی تو دوسرے کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ جو بھی ثانوی حیثیت میں ہوگا وہ متاثر ہوگا۔ اُمورِ دنیا ثانوی حیثیت میں ہیں تو وہ ضرور متاثر ہوں گے، اُمورِ دین ثانوی حیثیت میں ہیں تو پھر یہ متاثر ہوں گے۔ آدمی ارادے باندھتا ہے، اپنے طور پر فیصلے کرتا ہے۔ وہ مسبب الاسباب ہے، وہ اسباب پیدا فرما دیتا ہے۔ آپ اگر کمزوری کی طرف جائیں گے تو وہ پکڑ کر آپ کو طاقت کی طرف نہیں لے جائے گا۔ فیصلہ آپ پر ہے۔ آپ اگر نیچے کی طرف سوچیں گے تو نیچے اترتے جائیں گے۔ آگے جانے کیلئے اوپر چڑھنا پڑے گا۔

علم کی اساس عظمتِ الٰہی کی پہچان اور محمد رسول اللہ ﷺ سے تعلق کا قائم ہونا ہے۔

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی